

# عبدالله II

**PDFBOOKSFREE.PK**

[www.pdfbooksfree.pk](http://www.pdfbooksfree.pk)

ہاشم ندی

# فہرست

۷	عبداللہ
۹	جبروت
۱۶	دوسرا سورج
۲۳	خواب اور سراب
۳۰	لا حاصل کی کھوج
۳۸	روح کا عکس
۴۶	دشمن زندہ رہے
۵۴	دل سے دھواں اُٹھتا ہے
۶۳	نفس اور جبر
۷۱	کبھی ہم بھی خوبصورت تھے
۸۰	اک نئی جنگ
۸۹	معصوم سے معصومیت تک
۹۶	پہلا کفارہ
۱۰۴	دھانی
۱۱۲	لفظ گر
۱۲۱	میرا ہر لفظ تمہارا ہے
۱۲۹	لفظ رُوٹھ جاتے ہیں
۱۳۷	تم بھول جاؤ گے
۱۴۶	شائیسار
۱۵۳	قاتل

## عبداللہ

### عبداللہ کے پہلے حصے، 29 اقساط کا خلاصہ

شہر کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان، ساحر ایک کاررہیس کے اختتام پر خود کو ایک ساحلی درگاہ کے قریب پاتا ہے۔ قریب کھڑی ایک بڑی گاڑی کو دیکھنے کا شوق اسے درگاہ تک دھکیل لاتا ہے اور وہاں ایک پری دس زہرا کی ایک ہی جھلک اسے اپنی دنیا سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ لیکن زہرا کا من جیتنا ساحر کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ واضح الفاظ میں اس کا بھیجا گیا رشہ ٹھکرا دیتی ہے۔ ساحر کا جنوں اُسے درگاہ کے متولی عبداللہ تک پہنچ لاتا ہے، جہاں اُس کی سلطان بابا سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے جو عبداللہ کے استاد ہیں۔ ساحر سلطان بابا سے بحث میں الجھ کر اپنی تقدیر کا شکوہ کرتا ہے اور سلطان بابا جواباً اُسے اُکساتے ہیں کہ عشق کا حصول کچھ آسان کام نہیں۔ پہلے ساحر خود کو اس جنوں کا اہل ثابت کرے اور اپنی دنیا چھوڑ کر درگاہ پر عارضی بسیرا کر لے تو کوئی اس دعوے کی سچائی کو تسلیم بھی کرے۔ ساحر یہ چیلنج قبول کر لیتا ہے۔ لیکن جب اس پر یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ زہرا کسی اور کی نہیں خود درگاہ کے متولی عبداللہ کی نظر سے گھاٹل ہے۔ لیکن عبداللہ اُسے بتاتا ہے کہ وہ اب شادی شدہ ہے اور زہرا کبھی بھی اس کی منزل نہیں رہی۔ ساحر گھر والوں کی اجازت سے درگاہ پر آہیٹا ہے اور یہاں اسے اپنے نئے نام ”عبداللہ“ کی شناخت ملتی ہے۔

سلطان بابا پرانے عبداللہ کے ساتھ کسی سفر پر نکل جاتے ہیں اور ساحر مولوی خضر کی تربیت میں درگاہ پر اپنے شب و روز گزارنے لگتا ہے۔ مولوی خضر کی معیت میں اس پر کئی نئے اسرار کھلتے ہیں اور خود زہرا بھی ساحر کے جنوں کے آگے رکھی اپنی ڈھال کو زنگ زدہ پاتی ہے۔ لہذا ساحر سے درخواست کرتی ہے کہ وہ گھر واپس لوٹ جائے کیوں کہ ساحر کا جنوں اس کے راستے کی دیوار ہے۔ ساحر گھر تو لوٹتا ہے لیکن اپنا سب

۱۶۰	قص اور جنوں
۱۶۷	لہو کا لباس
۱۷۴	آدھا چہرہ
۱۸۰	رُوپ بہرُوپ
۱۸۷	ہم زاد
۱۹۴	آدھا جنوں، آدھا فراق
۲۰۱	گلابی دھند
۲۰۸	”ہوش والوں کو خبر کیا“
۲۱۴	کا سا بلانکا
۲۲۱	”ایک محبت اور سبھی“
۲۲۸	آخری محبت
۲۳۵	”من کی دیوار“
۲۳۲	پہلی قیامت
۲۳۹	21 دسمبر 2012ء
۲۵۶	صیہونی
۲۶۳	آخری میٹھا
۲۷۰	مناظرہ
۲۷۸	ایک اور عبداللہ
۲۸۵	جائشین
۲۹۲	فریفتہ
۳۰۰	”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے“
۳۰۸	”دوسرا رقیب“
۳۱۶	تار شکبوت
۳۲۳	دُھند لے اُجالے، اُجلے اندھیرے
۳۳۲	”بھی کسی کو کھل جہاں نہیں ملتا“



کچھ درگاہ ہی میں چھوڑ آتا ہے۔ آخر کار ساحر کے والدین اس کی بیٹی ہوئی زندگی اور تقسیم شدہ رُوح کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُسے دوبارہ درگاہ جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ لیکن اس بار اُس کی منزل درگاہ نہیں بلکہ سلطان بابا کا ساتھ ہے اور ان دونوں کا پہلا پڑاؤ دُور دراز کی سینٹرل جیل ہے جہاں سکندر نامی قیدی کی پھانسی اگلی صبح ملے ہے۔ مقتول کی بیوہ نائلہ خود کبھی سکندر کی زندگی کی ڈور تھی لیکن اب وہ سکندر کو پھانسی پر جھولتا دیکھنا چاہتی ہے۔ عبداللہ (ساحر) کی کوشش تو رنگ لے آتی ہے۔ نائلہ آخری وقت میں سکندر کو معاف تو کر دیتی ہے لیکن خود بھی سکندر کی سانسوں کے ساتھ اپنی زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔ سلطان بابا کا اگلا پڑاؤ رُباب کی حویلی بنتی ہے جہاں باقوت نامی ایک جن زادہ رُباب کی زلفوں کا اسیر ہے۔ وہ سلطان بابا کو نکست دینے کے لیے عبداللہ کے جسم پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے لیکن جیت آخر انسان ہی کی ہوتی ہے اور رُباب باقوت کے پختل سے آزاد ہو جاتی ہے۔ سلطان بابا عبداللہ کو جیل پور روانہ کر دیتے ہیں جہاں راستے میں زہرا کی سوتیلی بہن زریاب کو دیکھ کر عبداللہ دنگ رہ جاتا ہے اور پھر اُسے جگن نامی غنڈے کے عذاب سے بچانے کے لیے عبداللہ کو ایک بار پھر سلطان بابا کو پکارنا پڑتا ہے۔ زریاب تو جگن کی دست برد سے نکل آتی ہے لیکن خود جیل پور کے خان کریم کی آنکھوں کا تارا، لاریب عبداللہ کے ماں باپ کی زبانی ساحر اور زہرا کی لازوال داستان سن کر نادانستہ عبداللہ کو دل میں بسا لیتی ہے اور شدید پیار پڑ جاتی ہے۔ عبداللہ کو ایک بار پھر زہرا کے مرہم کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ زہرا کو جیل پور طلب کر لیتا ہے۔ لیکن خود زہرا اس مرتبہ عبداللہ کی مستقل مزاجی اور محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ لاریب کو زہرا کی سچائی اور اس جذبے کی طاقت دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیتی ہے اور زہرا عبداللہ سے کہتی ہے کہ اب اس کی رُوح عبداللہ کے بلاوے کی منتظر رہے گی۔ سلطان بابا اور عبداللہ جیل پور سے اپنے نئے سفر پر نکل پڑتے ہیں۔

## جبروت

میری آوارگی میں کچھ ڈھل ہے تمہارا بھی محسن  
تمہاری یاد آتی ہے تو گھر اچھا نہیں لگتا

ہمیں جبل پور سے نکلے آج تیسرا دن تھا اور اب تک ہم دو فریضے بدل چکے تھے۔ رفتہ رفتہ ہمارے آس پاس کے مناظر سے سبزہ اور پہاڑ اوجھل ہوتے جا رہے تھے اور تیسرے دن دو پہر تک باہر کا موسم یک سر بدل چکا تھا۔ ریت اور گرد کے گولے گاڑی کی ادھ کھلی کھڑکیوں اور سالوں سے زنگ خوردہ، جامد دروازوں سے ہمارے استقبال کو یوں اندر لپک رہے تھے جیسے کوئی صدیوں کا چھڑا اپنے گم شدہ محبوب کی طرف بڑھتا ہے۔ گرم لُؤ کے تھپڑے چروں کو جھلسانے لگے تھے اور باہر دوڑتی زمین کے آثار بتا رہے تھے کہ ہم کسی صحرا میں داخل ہو رہے ہیں۔ آس پاس کے مسافروں نے جلدی جلدی سامان سے تولیہ یا کوئی اور کپڑا نکال کر پانی میں بھگو یا اور سرد چہرے چھپانے لگے۔ سلطان بابا نے مجھے بھی یہ احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں مسکرا کر نال گیا۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اس سے کہیں زیادہ شدید ”لُؤ“ تو شاید ازل ہی سے میرے اندر چل رہی ہے۔ باہر چلتی ہوا کے یہ چند گرم جھوکے بھلا مجھ سے کرم جلے کا کیا بگاڑ پائیں گے۔ اور پھر بات باہر کے موسم کی تھی ہی کب، جن کے اندر ہی سدا کے لیے خزاں ٹھہر گئی ہو انہیں بیرونی تبدیلیوں سے کیا واسطہ۔ گاڑی اب باقاعدہ ایک وسیع صحرا سے گزر رہی تھی، جہاں اُڑتی ریت کی زیادتی سے گرم دھوپ میں چمکتی دے کی پٹری بھی جگہ جگہ ریت میں دھنس کر غائب ہو جاتی تھی۔ شاید اسی لیے ٹرین کی رفتار اب کافی مدہم پڑ چکی تھی۔ دو اہل کار ایک بڑی سی قات نما کپڑے کی رسی لیے گاڑی کے آگے آگے بھاگ رہے تھے، جسے نہوں نے زمین پر یوں ڈھلکا رکھا تھا کہ اس کے پونچھے کی رگڑ سے پٹریوں پر پڑی ریت پونچھی جا رہی تھی۔ شاید اسی مقصد کے لیے رسی کو اچھی طرح پانی میں بھگوایا گیا تھا۔ ایک تیسرا اہل کار ایک بڑے سے کین میں پانی لیے ان کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جیسے ہی لُؤ کے گرم تھپڑوں سے پونچھا خشک ہونے لگتا وہ جلدی سے دوبارہ اپنی کاچھڑ کاؤ کر کے اُسے بھگو دیتا۔ بعض جگہ ریت کے ٹیلے باقاعدہ لوہے کی پٹری کے اُوپر سرک آئے تھے، جنہیں ہٹانے کے لیے متعین عملے کو خاص بیلیوں کی مدد سے ٹرین رکوا کر ریت ہٹانا پڑتی تھی۔ کہیں پڑھا تھا کہ ریت بھی ہم انسانوں کی طرح سفر کرتی ہے اور صحرا کی منزل بھی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، تو بہت دیر تک کسرتی ریت اور بدلنے صحرا کے کھیل کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

رفتہ رفتہ شام ڈھلنے لگی۔ آفتق کے پار سورج ڈوبنے کے باوجود آتشیں گلابی رنگت کی ایک واضح لکیر یوں گاڑی کے ساتھ بہت دیر تک دوڑتی رہی، جیسے کسی دیاسلائی کا مختصر سا شعلہ رگڑ کھانے کے بعد لکڑی کی تیلی پر اپنے اختتام کی جانب دوڑتا ہے۔ صحرا کے آسمان کی حد پر قدرت نے بھی کوئی دیاسلائی سی جلادی تھی۔ جواب تیزی سے آفتق کے دوسرے پار تک اپنی گلابی آغچ پہنچا کر سارے فلک کو جلا دینا چاہتی تھی۔ مغرب کی نماز ہم نے چٹکولے کھاتی گاڑی ہی میں پڑھی اور مکمل اندھیرا ہونے تک ہمیں کسی انسانی بستی یا اسٹیشن کے آثار نظر نہیں آئے۔ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا، جب ٹرین نے ایک آخری ہچکی لی اور دیرے دیرے ایک ویران سے اسٹیشن پر رُک گئی۔ سلطان بابا نے مجھے اشارہ کیا ”چلو میاں..... ہماری منزل آگئی ہے۔“

میں اپنے خیالات کی ردوٹھنے پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور ہم نے جس زمین پر قدم رکھے، اسے پلیٹ فارم سے زیادہ ریت کا کوئی ٹیلا کہنا زیادہ مناسب تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک برآمدے کے پیچھے تین چار کچے کمرے ایستادہ تھے، جن میں سے ایک کے اندر میل خوردہ لائین کی کمزوری روشنی کھڑکی کے گلیجے شیشوں سے چھن کر باہر آرہی تھی۔ پلیٹ فارم کی ہر چیز کو گرد اور ریت کی موٹی تہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جب تک سلطان بابا اندر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے کچھ معلومات حاصل کر کے آئے تب تک میں نے پلیٹ فارم پر بچھے ایک لکڑی کے تختے نمائش کو دوبار اپنے ہاتھ سے جھاڑ کر اس کی سطح صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چند لمحوں ہی میں پھر سے تیز ہوا کے ساتھ اڑتی ہوئی ریت نے اُسے ڈھک لیا۔ ہم انسان ساری زندگی اس گرد سے خود کو بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن بالآخر ایک دن یہی مٹی ہمیں اپنی پناہ میں لیتی ہے۔ سچ ہے ”آخر کار سب مٹی ہو جاتا ہے۔“

دفعتاً مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، جیسے کوئی اور بھی پلیٹ فارم پر رات کے اس سنائے میں موجود ہو اور مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی تو دُور پٹریوں کے دوسری پار، جہاں اسٹیشن کی حد ختم ہو رہی تھی اور جہاں لوہے کی ایک بڑی سی راڈ کو بطور کھنٹی لٹکایا گیا تھا، ایک نوجوان لڑکی کا بیولا سا دکھائی دیا۔ لیکن ٹرین تو کب کی جا چکی تھی، پھر اس ویرانے میں اتنی رات گئے ایک تنہا لڑکی کیا کر رہی تھی۔ اس نے ایک کالی چادر اوڑھ رکھی تھی، جس پر سفید پھول کڑھے ہوئے تھے۔ لیکن فاصلہ زیادہ اور اسٹیشن کی دم توڑتی روشنی اتنی کم تھی کہ میں اس کے چہرے کے خد وخال کو ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پایا تھا اور تبھی اچانک اپنے عقب میں مجھے سلطان بابا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔

”کن سوچوں میں گم ہو..... ہمیں ابھی بہت سفر پیدل بھی طے کرنا ہے۔ اگر ممکن زیادہ ہے تو ہم رات بھر اسی اسٹیشن پر قیام کر سکتے ہیں لیکن پھر بہت سویرے نکلنا ہوگا، کیوں کہ صحرا میں سورج نکلنے ہی موسم بہت شدید ہو جاتا ہے۔“ سلطان بابا کو ہمیشہ میرے ہی آرام کی فکر کھائے جاتی تھی۔ میں مسکرایا۔ ”نہیں..... ابھی سفر کریں گے..... میں بالکل تازہ دم ہوں۔“ سلطان بابا نے میرا کندھا چھتپایا اور آگے بڑھ گئے۔

میں اپنے خیالات کی ردوٹھنے پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور ہم نے جس زمین پر قدم رکھے، اسے پلیٹ فارم سے زیادہ ریت کا کوئی ٹیلا کہنا زیادہ مناسب تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک برآمدے کے پیچھے تین چار کچے کمرے ایستادہ تھے، جن میں سے ایک کے اندر میل خوردہ لائین کی کمزوری روشنی کھڑکی کے گلیجے شیشوں سے چھن کر باہر آرہی تھی۔ پلیٹ فارم کی ہر چیز کو گرد اور ریت کی موٹی تہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جب تک سلطان بابا اندر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے کچھ معلومات حاصل کر کے آئے تب تک میں نے پلیٹ فارم پر بچھے ایک لکڑی کے تختے نمائش کو دوبار اپنے ہاتھ سے جھاڑ کر اس کی سطح صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چند لمحوں ہی میں پھر سے تیز ہوا کے ساتھ اڑتی ہوئی ریت نے اُسے ڈھک لیا۔ ہم انسان ساری زندگی اس گرد سے خود کو بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن بالآخر ایک دن یہی مٹی ہمیں اپنی پناہ میں لیتی ہے۔ سچ ہے ”آخر کار سب مٹی ہو جاتا ہے۔“

دفعتاً مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، جیسے کوئی اور بھی پلیٹ فارم پر رات کے اس سنائے میں موجود ہو اور مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی تو دُور پٹریوں کے دوسری پار، جہاں اسٹیشن کی حد ختم ہو رہی تھی اور جہاں لوہے کی ایک بڑی سی راڈ کو بطور کھنٹی لٹکایا گیا تھا، ایک نوجوان لڑکی کا بیولا سا دکھائی دیا۔ لیکن ٹرین تو کب کی جا چکی تھی، پھر اس ویرانے میں اتنی رات گئے ایک تنہا لڑکی کیا کر رہی تھی۔ اس نے ایک کالی چادر اوڑھ رکھی تھی، جس پر سفید پھول کڑھے ہوئے تھے۔ لیکن فاصلہ زیادہ اور اسٹیشن کی دم توڑتی روشنی اتنی کم تھی کہ میں اس کے چہرے کے خد وخال کو ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پایا تھا اور تبھی اچانک اپنے عقب میں مجھے سلطان بابا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔

”کن سوچوں میں گم ہو..... ہمیں ابھی بہت سفر پیدل بھی طے کرنا ہے۔ اگر ممکن زیادہ ہے تو ہم رات بھر اسی اسٹیشن پر قیام کر سکتے ہیں لیکن پھر بہت سویرے نکلنا ہوگا، کیوں کہ صحرا میں سورج نکلنے ہی موسم بہت شدید ہو جاتا ہے۔“ سلطان بابا کو ہمیشہ میرے ہی آرام کی فکر کھائے جاتی تھی۔ میں مسکرایا۔ ”نہیں..... ابھی سفر کریں گے..... میں بالکل تازہ دم ہوں۔“ سلطان بابا نے میرا کندھا چھتپایا اور آگے بڑھ گئے۔

دیرانی سے کیا رشتہ ہے؟“ آہٹ سن کر اندر سے ایک بوڑھا نکل آیا اور اس نے بڑے تپاک سے ہم دونوں استقبال کیا۔ سلطان بابا اسے اکرام اللہ کے نام سے مخاطب کر رہے تھے اور جب انہوں نے عبد اللہ کے نام سے میرا تعارف کروایا تو اس نے پہلے تو چونک کر ایک بار پھر سے میرا بغور جائزہ لیا اور پھر نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ”خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔“ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ کس مقصد کی بات کر رہا تھا؟ اگر زہرا ہی میرا مقصد تھی تو شاید اُسے تو میں حاصل کر چکا تھا۔ پھر زہرا کے بعد وہ کون سا مقصد تھا جو مجھے ان دیرانوں میں در بدر بھٹکا رہا تھا۔ یہ کیسی تلاش تھی، جو ختم ہونے کے بعد ہی شروع ہوتی تھی؟ کچھ ہی دیر میں فجر کا وقت بھی ہو گیا۔ اکرام اللہ صاحب نے اذان دی اور سلطان بابا کی معیت میں ہم دونوں نے باجماعت نماز پڑھ لی۔ کچھ ہی دیر میں پھر شفق سے قدرت کی وہ آن دیکھی دیا سلائی سنگلی اور مدھم شعلے جیسی اک گلابی روشنی افق کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی جانب لپکی۔ میں پل بھر کے لیے مبہوت سا رہ گیا۔ فلک پر ایسا چراغاں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اکرام صاحب پیتل کی چھوٹی سی کیتلی میں چائے اور ایک چنگیر میں روٹی کے چند ٹکڑے لیے اندر سے برآمد ہوئے۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی میرے منہ میں ریت کا ذائقہ اور ذرے بھر سے گئے۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں اس ریت بھری چائے کو نگلوں یا اُگلوں..... یہی حال گندم کے آٹے سے بنی اس روٹی کا بھی تھا۔ اکرام صاحب غور سے میری حالت دیکھ رہے تھے۔ دیر سے سے مکائے ”بھئی یہاں کی ہر چیز میں جنہیں اس ریت کا ازیلی ذائقہ ملے گا۔ آٹا اور چینی کتنے بھی ڈھانک کر رکھو، ریت کہیں نہ کہیں سے اندر چھن ہی آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم کال گڑھ والے اب اس ریتلے ذائقے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اب تو سالن میں نمک، مرچ اور دیگر مسالوں کے ساتھ ریت کا بھی باقاعدہ حساب رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں جنہیں گھر جیسا ناشتا نہیں پیش کر سکتا۔“ ان کا آخری جملہ سن کر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ایک وقت تھا کہ ساحر صاحب صبح کا ناشتا صرف اس لیے چھوڑ کر اٹھ جاتے تھے کہ فرانس کا مارملیڈ اور مصر کا شہد میز پر موجود کیوں نہیں۔ ہالینڈ کے بنے ہوئے دلیے کے علاوہ اگر کوئی دلی یا بدلیسی کارن فلیکس ہوتا تو سارا دن مزاج بگڑا رہتا۔ ہم انسانوں کی زندگی بھی کیسے کیسے انجان موڑوں اور غلام گردش جیسی اجنبی گولائیوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ کون، کب کیا ہو جائے..... کس کو خبر؟

تھی، جس کے نام کی وجہ تسمیہ بھی سدا کا کال اور قلعہ ہی تھا۔ یہاں برسوں سے بارش نہیں برسی تھی اور پانی یہاں آب حیات سے بھی بڑی عیاشی تھا۔ قصبے میں نوے فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے کی زندگی گزارتی تھی اور پوری بستی پر قلعے کے باسیوں کا قبضہ تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے اکرام اللہ صاحب سے پتا چلیں۔ جو خود کال گڑھ کے واحد اور برائے نام مل اسکول کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بستی کے بچوں کو درس قرآن دیتے تھے۔ ان کے خاندان میں ان کا اکلوتا بیٹا ہی بچا تھا، جو اپنے یوی بچوں کے ساتھ بڑے شہر میں رہتا تھا۔ اُسے کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی پسند نہیں تھی۔ لہذا وہ میٹرک کے بعد ہی باقاعدہ شہر منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ قلعے کے ذکر پر اکرام صاحب کچھ بے چین اور باقاعدہ خوف زدہ سے ہو جاتے تھے۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا۔ ”آپ نے ہر چیز کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا دیا ہے لیکن یہ قلعے اور اس میں بسنے والے قلعہ داروں کا سرا رکھ مجھے سمجھ نہیں آیا۔“ میرا سوال سنتے ہی اکرام صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ انہوں نے جلدی سے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ہم دونوں مزار کے برآمدے میں ستون کے گرم سائے میں چھپنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ سلطان بابا اندر کمرے میں آرام کرنے جا چکے تھے۔ اکرام صاحب نے سرگوشی کی ”عبد اللہ میاں..... ان قلعہ داروں کے سائے سے بھی بچ کر رہنا۔ بہت سفاک اور اذیت پسند ہے۔ وہاں کا بڑا قلعہ دار۔ سارا علاقہ کا پتا ہے جبروت کے نام سے.....“ ”جبروت.....؟ یہ کیسا نام ہے.....؟“ ”نام تو ماں باپ نے شاید جاہر رکھا تھا، جو پیار سے جبروہ اور پھر اس کے ظلم کی دہشت نے اسے جبروت بنا ڈالا۔ اور اب وہ اسی نام سے حکمرانی کرتا ہے۔“ جبروت جو کوئی بھی تھا، اس کی دہشت میں اپنے سامنے بیٹھے اکرام اللہ کے چہرے ہی سے محسوس کر سکتا تھا۔ انہوں نے مزید جو کچھ بتا دیا وہ اس جدید دنیا میں مجھے ایک ماورائی داستان سے کچھ کم محسوس نہیں ہوا۔ کال گڑھ جبروت کی کسی ذاتی جاگیر کی مثال بن چکا تھا۔ علاقے میں کوٹوالی یا پولیس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک سب انسپکٹر ایک برائے نام سی تھانہ نما عمارت میں پارچہ کانسٹیبلوں کی نفری کے ساتھ بیٹھتا تھا لیکن اس کی حیثیت بھی جبروت کے ذاتی غلاموں جیسی ہی تھی۔ کال گڑھ کا قانون، عدالت اور انصاف سب کچھ جبروت تھا۔ علاقے کے سارے مقدمے اُسی کے سامنے پیش ہوتے تھے اور وہی اُن فیصلہ کرتا تھا۔ اُس کی حکم عدولی کی سزا فوری اور انتہائی اذیت ناک تھی۔ قلعے کے اندر اس نے ذاتی جیل بھی، ناگرہ تھی، جس کی کال کوٹھڑیوں میں اس کے مجرم پڑے پڑے سڑتے رہتے تھے۔ ان سے دن بھر انہی زنجیروں اور بیڑیوں سمیت مشقت لی جاتی تھی اور پھر شام ڈھلے، ان ہی بندھے بھاری غمزدہ سمیت پھر سے وہ خانوں کے زندان میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ ان میں سے تو کئی ایسے تھے جنہیں قلعے سے باہر کا آسمان دیکھنے بھی برسوں بیت چکے تھے۔ سارا قصبہ جبروت کے دیئے ہوئے قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور ان کی دوسری نسل بھی اس قرض کو چکاتے چکاتے اپنی جوانی بڑھاپے میں بدل رہی تھی۔ برسوں کے طے نال گڑھ کے باسیوں کی کمر پہلے ہی توڑ رکھی تھی اور اب تو انہوں نے قرض کی اس غلامی سے باہر نکلنے کا

سے ملنا چاہے گا۔ اکرام صاحب نے پریشانی سے سر ہلایا۔ دفعتاً تب ہی ہمارے عقب میں آواز ابھری ”جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سو سوتا ہے۔“ میں اُچھل ہی تو پڑا۔ سلطان بابا جانے کب سے ہمارے عقب میں کھڑے جبروت نامی اس عجیب الخلق کردار کے فسانے سن رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر اُن کے چہرے کی جانب دیکھا، جہاں حسب معمول ملامت آمیز سکوت پھیلا ہوا تھا۔

اکرام صاحب ہمارے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے چلے گئے۔ اسی سوچ و بچار میں شام بھی دھل گئی اور پھر سے وہی خواب ناک صحرا کی رات تاروں بھرا آجکل لیے ہمارے سروں پر آکر ٹھہر گئی۔ اکرام صاحب مغرب سے کچھ پہلے ہی واپس لوٹ چکے تھے۔ عشاء کے بعد سلطان بابا نے مجھ سے کہا ”اب تم بھی ذرا کرنا کو عبد اللہ میاں..... میں بھی کمرے میں اپنی تسبیح پوری کروں گا۔“ لیکن میری جبر آکھوں میں بھلا نیند نے کب آبیاری کی تھی۔ سو کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد گرمی اور جس سے پریشان ہو کر میں حمار کے صحن میں نکل آیا۔ آسمان پر جھیلے ستاروں کا کارواں مجھے دیکھ کر سُکایا۔ میں ان تاروں میں اپنا اور زہرا کا تار تلاش کرنے کے لیے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے حمار کے صحن کے باہر میں نے کسی کے پھولوں بھرے آجکل کی ایک جھلک لہراتے دیکھی ہے۔ ہاں..... وہ وہی تو تھی، جسے میں نے کل رات ریلوے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا لیکن وہ میرے پیچھے یہاں اس دیرانے میں آدمی رات کو اس حمار تک بھی آ پہنچی، کیوں؟؟؟ مجھے لگا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن کل کی طرح آج بھی ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا اور پھر اس کا وہ لمبا سا صحرائی گھونگھٹ کل کی طرح پردہ بن کر اس کے خدو خال مجھ سے چھپا رہا تھا۔ آخر وہ چاہتی کیا تھی۔ حلیہ تو اسی ریگستانی بستی ہی کا تھا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فضا میں دو تین جب نما گاڑیوں کا شور گونجا۔ میری توجہ لمبے بھر کو صحرائی جانب بنی، جہاں دُور تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس جھلکاتی ہوئی حمار کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اگلے ہی پل میں نے دوبارہ وہاں نظر ڈالی، جہاں وہ کچھ دیر پہلے گھونگھٹ نکالنے کھڑی تھی تو اب وہ جگہ سنسان تھی۔ شاید کسی کو اتادیکھ کر وہاں سے بڑھ گئی ہو۔ تینوں گاڑیاں پرانے ماڈل کی ولیز جھپیں ہی تھیں جو اب بالکل حمار کے قریب پہنچ کر رُک گئی تھیں۔ دفعتاً میرے کانوں میں بہت سے کتوں کے غزانے کی آواز گونجی۔ جیپ سے کوئی کوڈر نیچے اُتر آیا اور اُس نے بھاگ کر پچھلی جیپ کا دروازہ کھولا۔ ایک دروازہ بھولا اندھیرے میں نیچے اُتر آیا۔ میری آنکھیں ابھی تک جیپ کی چلتی لائٹس کی وجہ سے چندھیاہی ہوئی تھیں لہذا روشنی کے پیچھے چھپے سائے بصارت کی پکڑ میں نہیں آ رہے تھے۔ باقی اشخاص پیچھے کھڑے رہے۔ دروازہ شخص روشنی میں آ گیا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اکرام اللہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق میرے سامنے کھڑا وہ شخص جبروت کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے۔ اچانک جبروت کے عقب سے ایک خون خوار کتا میری جانب لپکا۔

خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ قلعے میں جبروت کے پہرے داروں اور محافظوں کی فوج کے علاوہ اس کی تہ بیویاں اور کتوں کی ایک فوج بھی رہتی تھی۔ جبروت کو اگر دنیا میں کسی چیز سے پیار تھا، تو وہ اس کے پالے ہوئے خون خوار کتے تھے۔ جنہیں وہ اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ویسے بھی جبروت کی تمام اولاد بچپن ہی میں ماں کو گود ہی میں خدا کو پیاری ہو جاتی تھی۔ اسی اولاد کی خواہش میں اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں اور چوتھی بیوی کا انتقال بھی زچگی کے دوران ہی ہوا تھا۔ لیکن کچھ افسانے یہ بھی دہراتے تھے کہ جبروت نے خود کسی بات پر ناراض ہو کر اُسے زہر دے دیا تھا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو آج کل پھر جبروت کی چوتھی بیوی کا کمرہ اور نشست خالی تھی۔ ایسا پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا اور ہر بار پوری بستی کی اُس وقت تک جان پر بنی رہتی تھی جب تک جبروت کہیں نہ کہیں سے کوئی نئی نو بلی چوتھی بیوی بیاہ کر نہیں لے آتا تھا۔ چار کی اس کتنی کو تین کرنے میں جبروت کی کسی نہ کسی بیوی کو کبھی بیٹے، کبھی سانپ کے کاٹے، کبھی بخار اور کبھی کسی دوسری ”انہونی“ کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُترنا ہی پڑتا تھا۔ سچ ہے ”قدرت کے لکھے“ کو بھلا کون ٹال سکتا تھا۔ لیکن چار کی کتنی پورا کرنے کے چند دن بعد ہی جبروت پھر سے ان کھلونوں سے اُدب جاتا اور پھر سے قدرت کے لکھے کا انتظام کرنے لگتا۔ ہاں البتہ اس کی دل چسپی اگر سدا کی مشغلے میں برقرار رہی تو وہ تھی، خون خوار بھیڑی نما کتوں کا دیکھ بھال اور نشو و نما۔ سنا تھا کہ ان کے راتب اور خوراک وغیرہ میں غفلت کرنے والے نوکروں کو وہ انما بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دیتا تھا۔ دن میں تین مرتبہ ان کتوں کو خوراک، ورزش اور غسل کے بعد ٹھہرا کر کے لیے جب بستی میں نکالا جاتا تھا تو جبروت خود ان کے ساتھ ہوتا اور انہیں دیکھ کر ہی بستی والوں کا پتا پتا ہو جاتا۔ ان کتوں کے بارے میں ایک اور لرزہ خیز فسانہ بھی کال گڑھ میں زبان زد عام تھا۔ کہنے والے کہتے تھے جبروت اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ ایک عجیب کھیل کھیلتا تھا۔ اُسے خود کو انصاف پسند کہلانے کا بہر شوق تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا اُسے کبھی بے انصاف کا لقب نہ دے، لہذا اپنے دشمنوں کو مردانے پہلے وہ انہیں ایک پیش کش کرتا تھا کہ اگر اس کا دشمن چاہے تو اب بھی اس کی جان بخشی ہو سکتی ہے، بس اس جبروت کے ان لاڈلوں کو ہرانا ہوگا۔ کھیل یہ طے پاتا تھا کہ طزم کو کال گڑھ کا پتا صحرا بھاگ کر پار کرتے ہو۔ سات کوس کے فاصلے پر موجود ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ہوتا تھا۔ شکار کے سر پٹ صحرا میں دوڑنے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد جبروت کے خون خوار درندے بھی اس دشمن کے تعاقب میں چھوڑ دیے جاتے تھے۔ کہتے؟ کہ آج تک ایک بھی ایسا خوش نصیب ثابت نہیں ہو سکا تھا جس کی لرزہ خیز چیخوں سے کال گڑھ کا صحرا نہ گونج ہو۔ بستی میں داخل ہونے والے ہر ذی روح کو پہلی سلامی کے لیے جبروت کے حضور پیش ہونا پڑتا تھا، ورنہ شخص پہلے دن ہی سے باغی قرار پاتا تھا۔ اکرام صاحب کے بقول میں اور سلطان بابا اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ جبروت دو دن سے کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ لہذا اُسے فی الحال ہماری کال گڑھ میں موجودگی کا پتا چل رہا تھا، لیکن ساتھ ہی وہ اس بات سے بھی پریشان تھے کہ جب جبروت کی واپسی ہوگی تو وہ ضرور ہم



کہ ان کے اندر کی بے چینی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ہے لیکن وہ سلطان بابا کے احترام کی وجہ سے چپ ہی رہے اور میرے ساتھ سہ پہر کا وقت طے کر کے اُلٹے قدم لوٹ گئے۔

رفنہ رفتہ سورج کا گولا پھر سے وہی آگ برسانے لگا۔ جانے کیوں اس صحرا کا یہ آفتاب میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ یہ تو کوئی دوسرا سورج تھا، میری دنیا کے سورج سے بالکل جدا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجب سا خیال آیا، کہیں یہ اس سورج کا دوسرا رخ تو نہیں تھا۔ کہیں میں چلتے چلتے اپنے سورج کی دوسری جانب تو نہیں آپہنچا؟ ہاں شاید یہ ایسا ہی تھا۔ ورنہ یہ فلک مجھ سے کبھی اتنا اُن جان تو نہ تھا۔ سلطان بابا آنکھیں بند کئے۔ تسبیح پھیر رہے تھے۔ میرے آنے کی آہٹ ہوئی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ”کیوں میاں..... کبھی اپنی سوچ کے گھوڑے کو لگام بھی دیتے ہو یا نہیں، کبھی تو ان اعصابی ریشوں کو آزاد بھی چھوڑ دیا کرو۔“

جانے انہیں ہر مرتبہ میری سوچ کی خبر کیسے ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں اس وقت مزار کے برآمدے میں بنے بوسیدہ سے ایک کمرے میں موجود تھے، جہاں براہ راست لو سے بچنے کے لیے دروازے اور پچھلی جانب کھلتی لکڑی کی چھوٹی ہوئی کھڑکی کے اوپر ایک ٹوٹی پھوٹی چٹن اور چند کپڑے کی کترنیں لگا کر ڈھانپنے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔ کمرے میں فرش کی جگہ ریت کا بستر تھا اور ایک صراحی کمرے کے کونے میں ادھ بھری رکھی تھی۔ میں سلطان بابا کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پھر من میں بہت دنوں سے چلتا سوال میرے ہونٹوں پر آ ہی گیا۔ ”ایک بات بتائیں، ہم ان درگاہوں اور مزاروں کے ارد گرد ہی خدا کو کیوں کھوجتے پھرتے ہیں.....؟ میں آپ کی طرح اسے اپنی شہرگ کے قریب کیوں محسوس نہیں کر سکتا۔ اور ہر بار ہمارا امیر ایسی ہی کسی دیران درگاہ یا مزار سے متصل کیوں ہوتا ہے.....؟“ انہوں نے تسبیح ختم کر کے اپنے اور میرے چہرے پہ پھونکا۔ ”اسے کسی مزار یا درگاہ میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی اسے اپنی شہرگ سے بھی قریب ڈھونڈنے کے لیے کسی خاص وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس کائنات کے ہر گوشے میں یکساں موجود ہے۔ تمہاری یہ فکر کہ تم اسے محسوس کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ بھی تمہاری اس سے قربت ہی کی ہی ایک نشانی ہے۔ بس اتنا ضرور یاد رہے..... یہ فکر کبھی ختم نہیں ہونی چاہیے۔ رہی بات کہ ہم ہمیشہ ایسی ہی درگاہوں، مسجدوں یا مزاروں ہی میں کیوں قیام کرتے ہیں تو ہمارے دروازے اب مذہب کے نام پر کچھ کم ہی کھلتے ہیں۔ ایسے میں ان بستیوں میں موجود یہی درگاہیں اور خانقاہیں اپنی بانئیں پھیلائے ہر گھڑی ہمارے استقبال کو تیار ملتی ہیں۔ ہمارے سونے کو اطلس و کنوایں کے بستر نہ سہی، پر مسجد کا فرش ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یہی خاک ازل سے ہمارا مقصد اور ہمارا مقدر ہے اور ہمیں سب کو یاد دلاتے رہتا ہے کہ ہم سب نے آخر خاک ہی ہو جانا ہے۔“ میرے سوال ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ ”لیکن! اس بار آپ نے اس قدر دُور دراز علاقے کا انتخاب کیوں کیا۔ ہم راستے میں نہ جانے ایسی کتنی درگاہیں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔“ سلطان بابا نے گہرا سانس لیا۔ ”اس بار معاملہ بے اختیاری کا ہے۔ اب تک تم نے جو بھی جھیلنا اس میں کہیں نہ کہیں ہمیں کچھ اختیار ضرور حاصل تھا، لیکن اس مرتبہ

## دوسرا سورج

اس خوں خوار کتے کی لپک اتنی اچانک اور شدید تھی کہ میں نے اس کی غراہٹ سے گھبرا کر دونوں ہاتھ ہوا میں یوں بلند کیے کہ جیسے اس کے حملے کو روک ہی تو لوں گا، لیکن اچانک فضا میں جبروت کی گرج دار آواز گونجی ”ناں..... کالے!!“ اور اس آواز میں جانے کیا جادو تھا کہ زخمی ہونے کے لیے تیار اور اپنے خوں خوار جڑے کھولے اور اپنی اگلی ٹانگوں پر اپنے وزن کو تولتے ہوئے کتے کو سکتہ سا ہو گیا اور وہ وہیں زمین پر بنا آواز کے یوں بیٹھ گیا، جیسے اگر ذرا سی بھی جنبش ہوئی تو پتھر کا ہو جائے گا۔ جبروت نے ایک نگاہ غلط مجھ پر ڈالی۔ ”کون ہو تم..... اور میرے علاقے میں کیا کر رہے ہو؟“ ”عبداللہ..... مزار کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔“ جبروت کو جیسے کچھ یاد آیا۔ ”اوہاں! ہیڈ ماسٹر نے بتایا تھا، تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟“ ”وہ آرام کر رہے ہیں..... بے سفر کی تھکن ہے۔“ جبروت نے لمبا سا ہنکارا بھرا ”ہوں..... اور جانے کے لیے پلٹا۔ پھر اُسے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ”ہیڈ ماسٹر سے کہنا کل تم لوگوں کو قلعے سے ضرورت کا سامان دلوا دے۔ یہاں تم لوگوں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔“ جبروت نے بے ڈگ بھرتا ہوا اپنی جیب کی جانب بڑھ گیا اور پھر اس کے بعد مجھے بھی رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح سویرے اکرام صاحب پریشانی میں ہڑ بڑائے ہوئے سے تیز تیز چلتے مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ”کیا رات کو جبروت یہاں آیا تھا، اس نے کیا کہا؟“ سلطان بابا اس کی پریشانی دیکھ کر مسکرا دیئے۔ ”بھئی میں تو کمرے میں تھا۔ اس کی ملاقات صرف عبداللہ سے ہوئی تھی۔“ وہ در پردہ ہمیں قلعے میں حاضری لگانے کا حکم دے گیا ہے۔ میں نے اکرام صاحب کو ساری تفصیل بتادی جسے سن کر ان کے ماتھے پر بڑی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ میری مائیں تو آپ دونوں دو گھڑی کے لیے آج وہاں سے ہو ہی آئیں۔ دبا میں رہ کر مجھ سے بیراجھا نہیں ہوتا۔ جو چند دن آپ لوگوں نے یہاں گزارنے ہیں کم از کم وہ تو سکون سے گزر جائیں گے۔“ سلطان بابا پہلے ہی سے کسی گہری سوچ میں گم تھے، انہوں نے تسبیح کا آخری دانہ پڑھ کر سر اٹھایا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں، جتنا ممکن ہو شر اور فساد سے پہلو تہی کرنی چاہیے۔ عبداللہ میاں! آج سہ پہر تم اکرام صاحب کے ساتھ قلعے سے ہو آنا۔“ میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ اکرام صاحب ہڑ بڑائے۔ ”اور آپ..... آپ نہیں چلیں گے کیا؟“

”نہیں۔ ابھی میرے جانے کا وقت نہیں آیا۔ اگر میرا پوچھیں تو کہیں گا کہ میں بھی جلد ہی اس کے در دولت پر حاضری دوں گا۔ فی الحال میرا نمائندہ ہی سہی۔“ اکرام صاحب کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے



صاحب کے پیچھے بڑھتے ہوئے قلعے کی چار دیواری میں اپنا پہلا قدم رکھا تو ان کرب ناک چنوں کا راز بھی کھل گیا۔ وحشت اور بربریت کا ایک خوف ناک کھیل عین قلعے کی بیرونی چار دیواری کے وسط میں کھیلا جا رہا تھا۔ میرے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جبروت اپنے حواریوں کے جھرمٹ میں ایک اُونچے سے تخت پر براجمان وحشیانہ انداز میں بیٹھ رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا اور غصے میں گالیاں بک رہا تھا۔ اُس کے سامنے کھلے میدان میں ایک لمبی اور موٹی سی فولادی زنجیر گھلے میں ڈالے ایک عظیم الجثہ سیاہ رینچھ اپنا خون خون بدن لیے کھڑا جھول رہا تھا اور جبروت کے اٹھ خون خوار کتے چاروں طرف سے اُس بیڑیوں میں جکڑے قیدی رینچھ پر حملے کر رہے تھے۔ رینچھ کے جسم سے لپٹے کتے اُسے بھنبھوڑ رہے تھے اور گھائل رینچھ کا زخم زخم بدن خون کا فورارہ بنا ہوا تھا، لیکن رینچھ نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔ اب بھی وہ پوری قوت سے ان وحشی کتوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے زخموں سے عجیب سی خرخرہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کی ٹیکل کا کڑا زور لگانے کی وجہ سے اس کی ناک کی نازک جلد کو چھیدا ہوا ہڈی کے اندر تک دھنس چکا تھا، جس کی ناقابل برداشت اذیت نے رینچھ کو انتہائی حد تک خطر ناک کر دیا تھا۔ اور وہ کرب اور تکلیف سے بے حال، غصے میں پاگل ہو کر چنگھاڑ رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ آٹھ طرفہ حملے کو کسی طور روک پائے۔ یہ سارا وحشیانہ کھیل ایک بہت بڑے ہجوم کے دائرے میں ہو رہا تھا۔ تماشائی جبروت کے خوف کے سبب صرف کتوں ہی کو داد دے رہے تھے۔ خود جبروت کا وحشی پن بھی عروج پر تھا۔ وہ کتوں کی ہمت برہانے کے لیے انہیں چلا چلا کر ہشکار رہا تھا اور کتوں کے منہ سے بے کف کی طرح اس کی رال بھی فرط جوش سے بار بار پک رہی تھی۔ جب کوئی کتا رینچھ کو گہرا زخم لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو جبروت کی حالت مزید ہیجانی ہو جاتی اور اگر رینچھ کو گہرا زخم لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو جبروت کی حالت مزید ہیجانی ہو جاتی اور اگر رینچھ کی خوش قسمتی سے کوئی کتا اس کے بچے کے پیچھے بڑے یا گرفت میں آ جاتا تو جبروت بے قابو ہو کر اپنے کتوں اور اُن کے سدھارنے والے خدمت گاروں کو گندی گندی گالیاں دینے لگتا۔ اُن پر غرانا، چلاتا اور بالکل ہتھے سے اُکھڑ جاتا۔ مقابلہ اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور تھکن اور پیاس کے مارے کتوں کی زبانیں باہر لٹک آئی تھیں، لیکن شاید ایسے مقابلوں میں کتوں کو پانی کے قریب نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ تب ہی کتوں کے رکھوالے انہیں بار بار پانی سے دُور ہانک دیتے تھے۔ ان میں وہ کتا بھی شامل تھا جسے جبروت نے رات ”کالے“ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ دفعتاً رینچھ کو ایک موقع ملا اور ایک چتکبرے کتے کی غلط چھلانگ نے اُسے رینچھ کے بازوؤں کی لپیٹ میں دے دیا۔ رینچھ نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا اپنی گرفت شدید تر کر دی اور میں نے اتنی دُور کھڑے ہونے کے باوجود اس کا نچھاڑ دینے والے شور میں بھی اس کتے کی ریڑھ کی ہڈی کے چٹختے اور پھر ٹوٹ کر تڑکنے کی آواز سنی۔ کتے کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور زمین پر گر گئے

یہاں چند لمحے تڑپنے کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اسی اثناء میں رینچھ کا بچہ پوری قوت سے لہرایا اور ”کالا“ ہوا میں لہراتے ہوئے ہجوم کے دائرے سے باہر جاگرا اور گرتے ہی بے سُدھ ہو گیا۔ جبروت کا پارہ آسمان کو چھونے لگا اور وہ زور سے چلایا ”مرنے دے اس مردار کو۔ کوئی ہاتھ نہ لگائے اس حرام خور کو۔۔۔۔۔“ آٹھ میں سے دو

ہم دونوں کسی اور کے اختیار میں ہیں میاں۔“ میں نے چونک کر اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔ نہ جانے کیوں مجھے سلطان بابا کی آواز میں دُور کہیں کسی شدید پریشانی اور آنے والی پریشانیوں کا احساس ملا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کے در پہنچے داہوتے چلے گئے۔ ہاں! سچ ہی تو تھا۔ اس سارے علاقے پر ایک ظالم اور انتہائی سفاک شخص کی حکومت تھی۔ ایک طرف سرحد تھی اور دوسری طرف ایک وسیع و عریض تپتا صحرا۔ درمیان میں سات کوس کے فاصلے پر وہ بستی واقع تھی جس سے گزر کر ہی ہم کال گڑھ سے نجات کے واحد ذریعے، یعنی دن میں ایک بار گزرنے والی ٹرین کے اسٹیشن تک پہنچ سکتے تھے۔ جو کم از کم پیدل چار گھنٹے کی مسافت پر موجود تھا۔ ایک دم ہی میرے رونگھٹے، یہ سوچ کر ہی کھڑے ہونے لگے کہ اگر کبھی ہمیں اس بستی سے ہجرت کرنا بھی پڑی تو اس کی اجازت اور اختیار بھی صرف اس جلا کو حاصل تھا، جو اس پھانسی گھاٹ کا پہرے دار بھی تھا۔ میں نے اُلجھن آمیز نگاہوں سے سلطان بابا کو دیکھا۔ ”لیکن کیوں۔۔۔۔۔“ اس بے اختیاری کی منزل سے گزرتا اس قدر ضروری کیوں، اس امتحان اور اس کسوٹی سے کیا حاصل۔۔۔۔۔؟“ ”سارا کھیل ہی تو اس اختیار و بے اختیاری میں توازن قائم کرنے کا ہے۔ یاد رکھو، ہمارے اختیار کی حد وہیں ختم ہو جاتی ہے، جہاں سے ہمیں اپنے خود مختار ہونے کا زعم ہونے لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے سب سمجھ آ جائے گا۔ جاؤ تم تیاری کرو۔ ابھی ظہر کے بعد تمہیں قلعے بھی جانا ہے۔“ جانے کیوں، ایک دم ہی میرے ذہن میں نہ جانے کتنے سوالوں کے بچھوڑک مارنے لگے تھے۔ اختیار و بے اختیاری کے دھاگوں میں میرا من کچھ یوں اُلجھا کہ مجھے اکرام اللہ صاحب کے ساتھ بستی پہنچنے تک بھی کچھ ہوش نہ تھا۔ میں تب چونکا جب بستی کے پکی اینٹوں والے بازار میں اُونٹوں کی ایک لمبی قطار نے مجھے تقریباً مس کرتے ہوئے کراس کیا۔ کال گڑھ کے اس مختصر سے بازار میں سہ پہر کی اس شدید دھوپ کے باوجود اچھی خاصی چہل پہل نظر آرہی تھی۔ بازار کے بچوں بکریوں کے ایک ریوڑ کی خرید فروخت جاری تھی۔ جس کے ساتھ ہی ایک پرانی سی دکان میں جلیبیاں تلی جا رہی تھیں۔ دکان دار پرانے اخبارات کے بڈل پھاڑ پھاڑ کر گاؤں کو شیرے سے بھری نارنجی جلیبیاں پکڑا رہا تھا اور بالکل سامنے خشک گھاس اور بھوسے کے گٹھے بیل گاڑی سے اُتروائے جا رہے تھے۔ سنہری بھوسا نارنجی شیرے میں ضم ہو رہا تھا اور پچھلی جانب پرانی سائیکلوں کے انبار کے نیچے ایک کاریگر سامنے بٹ میں پانی بھرے، پرانی ٹیوبوں کو پچھلے گا رہا تھا۔ بازار کے سرے پر ایک دھنکیا پرانی رضائیوں اور لحافوں کی روٹی دھن رہا تھا اور فضا میں اُڑتے اُون اور روٹی کے ننھے گولے گرد اور ریت کے ساتھ ہمارے حلق میں پھنس رہے تھے۔ اگلے کدھر پر ایک ماشکی پرانی سی مشین میں انتہائی گدلا پانی نیچ رہا تھا۔ اُون دھننے والے کے اوزار کی دھن دھن، اُونٹوں کی جرس، بھینر بکریوں کا شور، گرم شیرے کے نیچے چلتے الاؤ کی دھونکی اور ماشکی کے آوازے۔۔۔۔۔ سب مل کر چند لمحوں کے لیے اس مردہ کال گڑھ کو کس قدر زندہ کر گئے تھے۔ موڑ مڑتے ہی قلعے کی آسمان سے باتیں کرتی خاکی چار دیواری شروع ہو گئی۔ جیسے جیسے ہم قلعے کے مرکزی دیویدیکل دروازے کی جانب بڑھتے گئے، ویسے ویسے قلعے کے اندر سے ایک عجیب سے وحشت ناک شور کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ اور پھر جیسے ہی میں نے اکرام

مغرب کے بعد سلطان بابا تسبیح ختم کر کے میرے پاس ہی آکر بیٹھ گئے۔ اس وقت ہوا بالکل بندھی اور دن کا سورج ڈھلنے کے بعد چاند ایک دوسرے تپتے سورج کے روپ میں طلوع ہونے کی تیاری میں تھا۔ انہوں نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیوں میاں..... کچھ سمجھ میں آیا یہ اختیار اور بے اختیاری کا کھیل۔ آج دوپہر کو جو کچھ تم نے دیکھا، وہ بھی اسی معنی کی ایک کڑی ہی تھی۔“ میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ ”وہ کیسے؟“ ”بھئی ذرا غور کرو تو وہ بے بس جانور بھی ہماری زندگی کا ایک استعارہ ہی تو تھا۔ اور آٹھ جانب ہے لپکے وہ حملہ آور وہ مجبوریاں، جرم گناہ اور فریب کے وہ حملے تھے جو ہم ساری عمر جھیلے ہیں اور ریچھ کی آخر کار وہ موت اختیار سے بے اختیاری کی جانب سے اس کا آخری سفر تھا۔ اس کے پیروں سے بندھی وہ زنجیر اور اس کے ناک میں ڈلی نکیل ہمارے معاشرے کی پابندیاں اور قانون سمجھ لو۔ کبھی کبھی یہ بیڑیاں رشتوں کی صورت میں بھی ہمیں جکڑے رکھتی ہیں۔ زندگی خود اختیاری کی ایک قسم ہے اور موت بے اختیاری ہے۔ ہاں البتہ اس جانور اور انسان میں ایک واضح فرق ضرور ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے اختیار کی حدیں کسی بھی مخلوق سے بہت زیادہ ہیں۔“ مجھے سلطان بابا کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وقت آنے پر یہ معنی بھی از خود مجھ پر کھل ہی جائے گا۔ اچانک مجھے وہ لڑکی یاد آئی جس کا ہیولا میں دو مرتبہ کال گڑھ آنے کے بعد دیکھ چکا تھا۔ میں نے سلطان بابا سے ذکر کیا تو وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ”بعض مرتبہ یہ صحرا ہم انسانوں سے عجیب خواب و سراب کے کھیل کھیلتا ہے۔ لیکن سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہے۔ خاص طور پر اگر یہ کسی انسانی ہولے کا معاملہ ہے۔ اگر تیسری مرتبہ پھر وہ ہیبتناک نہیں دکھائی دے تو اس کے قریب جانے کی کوشش کرنا، لیکن یاد رہے، صحرا کافسوں بڑا گمراہ ہوتا ہے۔“

عشاء کے بعد سلطان بابا اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں پھر سے اپنے نصیب کے چند ستاروں کے ساتھ اس کالی رات میں مزار کے صحن میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ ہماری زندگی کی زیادہ تر انہونیوں کا تعلق رات ہی سے کیوں ہوتا ہے؟ کیا دن کا اوجلا بہت سے حقائق کو ڈھانپ لیتا ہے۔ حالانکہ عموماً ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ ڈھانپنے اور پردہ ڈالنے کا واسطہ اندھیرے سے ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر تو زیادہ تر رات ہی کھلتی تھی اور دن ہمیشہ سے ہی میرے لیے ایک دبیز پردے کا کام سرانجام دیتا رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ہوائے دوش پر مجھے دُور سے کسی بانسری کی لے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں تک تو میں اس آواز کو بھی اپنا دواہم ہی سمجھتا رہا لیکن پھر سلطان بابا کی کبھی ہوئی بات نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ”ہاں..... واہموں اور سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہوتا۔“ لیکن یہ بدھ لے تو لگا تا اور مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مزار سے نکل کر اس ٹیلے کی جانب قدم بڑھائے جہاں سے آواز آرہی تھی۔ قریب پہنچنے پر آہٹ کی آواز سننے ہی بانسری تھم گئی اور کوئی جیسی سے آواز میں بولا ”نوری..... تم ہو.....؟“ میں ٹیلا پار کر کے دوسری جانب آ گیا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اندازے سے آواز لگائی۔ ”میرا نام عبداللہ ہے۔ میں صحرا کے مزار کا

کتوں کو ریچھ نے مکمل پچھاڑ دیا تھا لیکن اسے اب بھی چھ طرفہ حملے کا سامنا تھا اور ریچھ کے جسم سے تیزی سے بہتا خون اب اسے دھیرے دھیرے نڈھال کر رہا تھا۔ جروت نے جھولنے اور ڈمگاتے ریچھ کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ اس نے پاس کھڑے ڈھولکے کو ڈھول پیٹنے کا اشارہ کیا۔ ڈھول کی پہلا تھاپ سننے ہی ادھر سے کتوں میں جیسے بجلی کی لہری کو گونگی اور ان سب نے اپنے گھائل جسم سینے اور ایک ساتھ ہی ریچھ کے شکستہ جسم پر حملہ آور ہو گئے۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے وہ اذیت و کرب سے لہرا تا ریچھ روشن دور کے ان جنگجوؤں کی یاد دلا گیا، جنہیں گلیڈی ایٹر (Gladiator) کہا جاتا تھا اور جنہیں رومن بادشاہ سزا کے طور پر اسی قسم کے اکھاڑوں میں بھوکے شیروں کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ایک ڈھال اور نیزے کے بل پر اتار دیتے تھے۔ لیکن یہاں تو ڈھال اور نیزے کا تکلف بھی نہیں تھا۔ بالآخر ایک کتا ریچھ کے زخروں میں اپنے خونی جہزے گاڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ریچھ کے زخروں سے خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور آس پاس کئی تماشاخیوں کے کپڑے سرخ چھینٹوں سے داغ دار ہو گئے۔ دوسرے کتے موقع پا کر ریچھ کی تھو تھنی اور نکیل والے حصے کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ گلیڈی ایٹر ہار چکا تھا۔ زمین پر گرنے سے پہلے اس نے ایک بے کسی کی نگاہ اکھاڑے کے بے حس تماشاخیوں پر ڈالی اور اس کا عظیم جُش بے دم ہو کر زمین چھونے کے لیے آخر بار جھول کر ڈھلکا، لیکن اس سے پہلے ریچھ کے مالک کی آنکھ سے ٹپکے دو آنسو زمین کو اپنی آخری سلامی پیش کر چکے تھے۔ ایک زوردار دھپ کی آواز کے ساتھ ریچھ زمین پر گرا اور گرد کا ایک طوفان اٹھا۔ چھ کتوں میں سے دو مزید شدید زخمی حالت میں ایک جانب پڑے تڑپ رہے تھے اور باقی چار کی حالت سے بھی ایسا لگتا تھا کہ انہیں پھر سے اپنے معمول کی حالت تک پہنچنے کے لیے ہفتوں درکار ہوں گے۔ جروت نے فتح کا نعرہ لگایا اور ڈھولکے نے ڈھول کی تان تیز کر دی۔ تماشاخی آگے بڑھ بڑھ کر جروت کو مبارکباد پیش کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک نے مٹھائی کے ٹوکڑے کا منہ کھولا اور ایک شاندار حریف کی موت کے جشن میں مٹھائی تقسیم کرنے لگا۔ اکرام صاحب نے رش میں سے راستہ بنایا اور مجھے کھینچتے ہوئے جروت کے قریب لے گئے۔ نہ جانے اس شور میں جروت کو ان کی بات سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن اس وقت وہ خوشی سے اس قدر سرشار تھا کہ اس نے میرے وجود کی طرف نظر بھی نہیں ڈالی اور اپنے کسی کارندے کو چلا کر راش دینے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں جب ہم قلعے سے باہر نکل رہے تھے تو اکرام صاحب کے ہاتھ میں آئے، چادل اور گڑ کے چند تھیلے موجود تھے۔ جروت اس ہنگامے کی وجہ میرے دوسرے ساتھی یعنی سلطان بابا کی کمی محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اور اس بات پر اکرام صاحب سارا راستہ اللہ کا شکر ادا کرتے آئے کہ چلو بلا ٹلی تو سہی۔

میرا من اس وحشیانہ کھیل کو دیکھنے کے بعد اس قدر پڑمرہ ہوا کہ میں شام تک ایک گھونٹ پانی بھی اپنے حلق سے نیچے نہیں اُتار سکا۔ بار بار میری نظروں کے سامنے اس بے بس اور لاچار ریچھ کی وہ پُرتم آنکھیں اور اس کا ہار کر زمین پر گرنے کا منظر آ جاتا۔ سلطان بابا بہت دیر تک مجھے یوں گم سم میٹھا دیکھتے رہے۔ انہیں اکرام صاحب نے واپس جانے سے پہلے ساری کہانی سنادی تھی کہ میں کیوں اتنا کم صدم سا واپس لوٹا ہوں۔

## خواب اور سراب

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔ ”وہ..... لڑکی.....“ سانول نے بھی جلدی سے پلٹ کر دیکھا یہی وہ چند لمحے تھے جب میری توجہ اُس کی جانب مبذول ہوئی ہوگی۔ لیکن اب جب ہم دونوں نے سانول کے عقب میں دیکھا تو وہاں صرف سناٹا ہی تھا۔ سانول کچھ دیر تک حیران نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے پیچھے مڑ مڑ کر اُن دیکھے وجود کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ”تم بھی اس صحرا کے چکر میں آگئے نا۔ معاف کرنا مزار کے پچھلے خدمت گار کو میں حافظ جی کہتا تھا لیکن تم تو میرے ہی ہم عمر ہو۔ نمرانہ مانو تو میں تمہیں عبداللہ کہہ کر ہی پکارا کروں.....؟“

”تم جو چاہو مجھے پکار سکتے ہو۔ لیکن میں کسی وہم کا شکار نہیں ہو رہا۔ میں پہلے بھی دوسرے اس لڑکی کو دیکھ چکا ہوں۔“ اب سانول کے چونکنے کی باری تھی۔ ”اچھا.....؟؟؟ ذرا مجھے اس کا حلیہ تو بتاؤ۔“ میں نے جلدی جلدی جو کچھ میرے حافظے میں محفوظ تھا، اس کے سامنے دہرایا۔ سانول میری بات سن کر ایک بار پھر زور سے ہنس پڑا۔ ”بڑا سا پلو، پھولوں والی چادر، ہاتھ میں کہنیوں تک سفید چوڑیاں، سانولا سارنگ، ماتھے پر بندیا..... تم کہو تو ایسی دودرجن لڑکیاں میں کال گڑھ کے بڑے میدان میں آج صبح ہی بلوالوں۔ ارے بھئی، یہ تو اس علاقے کی ہر دوسری لڑکی کا حلیہ بتا دیا ہے تم نے۔ یہاں سب ہی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کوئی خاص نشانی یاد ہو تو بتاؤ؟“ میں سانول کی بات سن کر مجھے میں پڑ گیا۔ ”خاص نشانی.....؟ ارے ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کسی نوری کو پکارا تھا، کہیں یہ وہی تو نہیں تھی؟“ سانول نوری کا نام سنتے ہی کچھ ہٹسا سا گیا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ پھر وہ شرما کر بولا۔ ”نہیں جی..... وہ نوری نہیں ہو سکتی..... میں تو یونہی ہر آہٹ پر اُس کا نام پکار بیٹھتا ہوں۔ وہ بھلا اس دیرانے میں آدھی رات کو کہاں سے آئے گی۔ اس پر تو دن میں بھی ہزار چہرے لگے رہتے ہیں۔“ میں نے شرم سے لباتے سانول کو چھیڑا۔ ”اوہ..... تو یہ بات ہے۔ پر یہ نوری ہے کون؟“ ”نوری میری منگ ہے جی! یہیں کال گڑھ میں رہتی ہے۔ آپ مزار پر ہیڈ ماسٹر اکرام اللہ سے تو ضرور ملے ہوں گے، نوری اُن ہی کے بھائی کی بیٹی ہے۔ پوری آٹھویں جماعت تک پڑھا ہے اُس نے۔ پھر اُس کے باپ نے گھر بٹھالیا۔ ویسے بھی آگے پڑھنے کے لیے کال گڑھ سے بیس کوس دُور، دوسری بستی کے ہائی اسکول تک جانا پڑتا ہے۔“ سانول شرما شرما کر اپنے اور نوری کے رشتے کی بابت بتا رہا تھا کہ کیسے، اُس کے گھر والوں نے سانول کی نشانی تو رکھ لی، لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ جب تک سانول برسرِ روزگار نہیں ہو جاتا

نیا خدمت گار ہوں تم کون ہو.....؟“ چند لمحے دوسری جانب خاموشی رہی اور پھر ایک نوجوان لڑکا بانسری ہاتھوں میں تھامے ٹیلے کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کی آواز میں مایوسی تھی۔ ”اوہ..... میں کچھ اور سمجھا تھا۔ نیچے آ جاؤ۔ میرا نام سانول ہے۔ میں یہی کال گڑھ کا رہنے والا ہوں۔ مجید مستری کا بیٹا۔“ لڑکے نے صحرا کی روایت کے مطابق اپنا مکمل تعارف کروا دیا تھا اور اب میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا نام اور مزار سے تعلق دوبارہ دہرانے کے بعد کہا ”تم بانسری اچھی بجالیتے ہو۔ لیکن اتنی دُور ویرانے میں اور یوں آدھی رات کو.....“ اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ”میرے باپ کو میرا بانسری بجانا پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں بھی اس کی طرح قلعہ داروں کے ہاں مہینے بھر کی گندم اور گڑ کے بدلے نوکری کر لوں۔ پر مجھے وہ غلامی پسند نہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں بھی تمہاری طرح کسی مزار کا مجاور بن جاؤں۔ ویسے بھی میرا یہاں دل نہیں لگتا۔“ مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ ”مجاور بن کر کیا کرو گے؟ مجاور تو بانسری بھی نہیں بجاسکتے۔“ وہ بھی میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ”ہاں واقعی۔ یہ تو ہے۔ پر تم مجھے کچھ دوسری قسم کے مجاور لگتے ہو۔ میں تمہیں بانسری سناؤں۔ تم نے کبھی موسیقی سنی ہے۔“ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ ابھی کچھ عرصے پہلے تک دنیا کا کوئی چارٹ ٹاپر (Chart topper) ایسا نہیں تھا جو میرے ذاتی کلکیشن میں شامل نہ ہو۔ بیک اسٹریٹ بوائز اور وٹنی ہیوسٹن کی اہل ڈیز سے میرے کمرے کے شیف بھرے رہتے تھے اور دنیا کے ہر کونے سے میرے دوست میرے لیے نئی تخلیقات بھیج کر میرا خزانہ بڑھاتے رہتے تھے۔ گھر، گاڑی، یونیورسٹی، پارٹی، کلب، ڈسکو ہر جگہ ہر لمحہ یہ تانیں میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ سانول مجھے سوچ میں گم دیکھ کر ہنچکپایا۔ ”اگر تمہیں پسند نہیں تو میں نہیں بجاتا۔“ نہیں نہیں۔ تم بجاؤ۔ مجھے بانسری کی اتنی سمجھ تو نہیں لیکن پھر بھی تمہاری لے تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔“ سانول کا چہرہ خوشی سے چمک سا گیا۔ اُس نے جلدی سے بانسری اپنے ہونٹوں سے لگائی اور ایک پرانے گیت کی تان چھیڑ دی۔ اُس کی نظریں بانسری بجاتے ہوئے بھی مستقل مجھی پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ اپنی دھن کا اثر میری آنکھوں میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دنیا کا ہر ہنر، ہر فن، اک ستائش ہی سے تو متصل ہوتا ہے۔ ایسے دیوانوں کی ہر کوشش خود کو منوانے اور ہجوم میں الگ و ممتاز رہنے کی ایک پروانہ دار کوشش ہی تو ہوتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے اپنے ہنر کی تعریف کا بھوکا رہا ہے۔ میرے ذہن میں ”خدا اور محبت“ کا ایک جملہ گونجا۔ ”اپنے ہنر کی تعریف کی یہی بھوک انسان کو کچھ انوکھا، کچھ الگ کر دکھانے پر مجبور کرتی ہے۔ تب ہی انسان سے تاج محل جیسے شاہ کار سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہ تعریف اور سرا ہے جانے کا جذبہ ہم میں نہ ہوتا تو شاید ہم اب تک پتھر کے دور ہی میں زندہ ہوتے۔“ انہیں سوچوں میں گم میں سانول کی بانسری کی مدھرتان سن رہا تھا کہ اچانک مجھے سانول کے عقب میں کچھ دُور اُسی لڑکی کا سراپا لہراتے ہوئے نظر آیا۔ ہاں..... وہی تھی..... بڑا سا پلو۔ میں ایک دم جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ سانول کے ہاتھ سے بوکھلا ہٹ میں بانسری چھوٹ گئی اور وہ گھبرا کر بولا۔ ”یا اللہ خیر..... کیا ہو گیا.....؟“

پلوں پر بھانے والے سچا ہو کر سرفراز کرنے لگتے ہیں۔ نہ جانے یہ محبت ہمیشہ ہمارے ارد گرد کا ہر موسم، رویہ ہمارے خلاف کیوں کر دیتی ہے۔ ہر بہار کو خزاں میں بدل دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمیں اپنے آپ تک سے جدا کر دیتی ہے۔ یہی سب کچھ سانول کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ رات گئے تک مجھ سے اپنا درد بانٹتا رہا۔ جانے اس نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر اتنا بھروسہ کیوں اور کیسے کر لیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت بھی اُس نے مجھ سے کئی بار وعدہ لیا کہ میں روز رات کو کچھ دیر کے لیے صحرائ میں اُس سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔

میں جب سانول کو الوداع کہہ کر مزار کے صحن میں داخل ہوا تو صبح کی اذان کا وقت قریب ہی تھا۔ سو وہیں کچی اینٹ کے صحن کو بستر بنا کر اور ہاتھوں کے نیچے پر سر رکھ کر کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے لیٹ گیا اور پتا نہیں، کس گھڑی میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں مجھے عجیب سے سائے ڈراتے رہے۔ میں نے اچانک خود کو اُسی وسیع و عریض اور لقی و دق صحرا کے بچوں سچ کھڑا پایا۔ سوانیزے پر آیا سورج میرے سر پر اپنی چلتی کرنوں کی برچھیاں لیے کھڑا ہے اور پھر اچانک ہی مجھے بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں گھبرا کر ایک طرف دوڑتا ہوں تو آٹھوں کتوں کو اپنے تعاقب میں دیوانہ وار بھاگتے پاتا ہوں اور پھر اُن میں ایک کتا اُچھل کر میرے زرخرے میں اپنے دانت گاڑ دیتا ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں..... یا اللہ..... یہ خواب تھا یا کوئی عذاب.....؟ سلطان بابا صحن ہی میں ایک برتن سے پانی لے کر وضو کر رہے تھے۔ انہوں نے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا۔ اُن کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت احتیاط سے پانی کا استعمال کر رہے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد میں نے انہیں اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔ میں نے سنا تھا کہ صبح کے قریبی خواب سچے ہوتے ہیں۔ سلطان بابا میرا خواب سن کر کچھ خاموش سے ہو گئے۔ میں نے اصرار کیا تو دھیرے سے بولے، ”خواب تقدیر نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی مستقبل کی ایک جھلک ضرور ثابت ہو جاتے ہیں اور اگر یہ جھلک سچی ہے تو آنے والے دنوں میں یہ صحرائیں بہت بڑی امتحان گاہ ثابت ہوگا۔ نہ صرف تمہارے لیے بلکہ خود میرے لیے بھی..... لیکن ہمیں ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہوگا۔ یاد رہے کہ یہ جسم صرف اس دنیاوی زندگی کا ایک استعارہ ہے۔ اصل حیات تو موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔“

نہ جانے سلطان بابا کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ میں سر سے پیر تک پسینے میں شرابور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ صحرائے بے رحم دھوپ نے مزار کی ردوشوں پر ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے۔ میں ابھی تک رات کے خواب کے اثر سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا کہ کوئی کتا درد سے بے چین ہو کر رد رہا ہے۔ چند لمحے تو میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ بھی رات والے خواب ہی کا کوئی تسلسل ہے۔ لیکن جب ایک ہی آواز وقفے وقفے سے مزار کی عقبی دیوار سے ابھرنے لگی تو مجھے خود کو مجتمع کر کے اٹھنا ہی پڑا اور پھر میں چلتی ریت میں پیر دھنسائے ہوئے عقبی سمت تک پہنچا تو اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ دیوار کے نامکمل سائے میں ادھ مرا ”کالا“ پڑا ہوا تھا۔ ہاں، جبروت کا وہی لاڈلا کتا جس نے پہلی رات مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اور گزشتہ روز جسے رچھنے نے

وہ بیٹی کو رخصت نہیں کریں گے۔ لیکن کال گڑھ میں روزگار کے نام پر صرف قلعے داروں کی غلامی ہی تھی، جو سانول کو کسی صورت منظور نہیں تھی۔ کیوں کہ قلعے کے قرضے کے چنگل میں ان لوگوں کی تیسری نسل پس رہی تھی اور سود و سود کا یہ جال کال گڑھ والوں کو کسی اُن دیکھے خون آشام عفریت کی طرح جکڑے ہوئے تھا۔ سانول کا باپ بھی اس سے بچ نہیں پایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نوری کو اب تک بیاہ کر گھر نہیں لاسکا تھا، کیوں کہ بستی کے تمام رشتوں کا فیصلہ ہر سال قرض ادا کرنے کے موقع پر جبروت کی بیخباتی ہی کرتی تھی۔ لوگ اپنا پرانا قرض چکاتے اور اپنے پیاروں کے رشتے کے لیے نئے قرض کی گھڑی اپنے شانوں پر ڈالے قلعے سے نکل آتے۔ اسی لیے سانول کا باپ چاہتا تھا کہ سانول بھی قلعے داروں کی نوکری کر لے تاکہ باپ بیٹا دن رات محنت کر کے قلعے کا سارا قرض اسی سال چکاتا کر دیں اور سانول کا رشتہ پکا ہو سکے۔ لیکن خود سانول کو یوں رشتے کے بہانے بار بار نوری اور اُس کے گھر والوں کا قلعے بلایا جانا ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ نوری کو سات پردوں میں زمانے کی نظر اور ہر دید کی آنچ سے بچا کر چھپا رکھتا۔ لیکن وہ اس وقت بے بس تھا کیوں کہ نوری پر اُس کا پورا حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور یہی بات سانول کو ہر دم پریشان رکھتی تھی۔ اُس نے نوری کو بھی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اپنے باپ یا چچا کے بغیر کبھی اپنے گھر کے آگن سے قدم بھی باہر نہیں دھرے گی کیوں کہ جبروت کے حواری اور گرگے آوارہ کتوں کی طرح سارا دن کال گڑھ کی گلیوں میں منڈلاتے رہتے تھے۔ سانول کے بقول، جب سے نوری کے ساتھ اُس کی منگنی طے ہوئی تھی وہ ویسے بھی دہرے عذاب کا شکار تھا۔ پہلے تو پھر بھی کبھی کبھار اُسے نوری کی ایک آدھ جھلک نصیب ہو جاتی تھی، لیکن اب تو وہ اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں سانول کو بتاؤں کہ کوئی بھی منگنی یا دوسرا بندہ اُس کا قصور وار نہیں۔ یہ سارا قصور تو اُس محبت کا ہے جو اپنے جلو میں ہر بار جانے ایسی کتنی بے چینیوں، درد اور لا حاصل پن کی جھن لے کر آتی ہے۔ جب تک ہمیں کسی سے محبت نہیں ہو جاتی، وہ شخص ہمارے لیے کس قدر عام ہوتا ہے۔ ہزاروں کی بھیڑ میں سے کوئی ایک، ہمارے آس پاس باقی لوگوں کی طرح چلتا پھرتا اور ہماری دسترس میں۔ لیکن جیسے ہی ہمیں اُس سے محبت ہو جاتی ہے، پل بھر میں وہ ہمارے لیے کس قدر ناممکن، کتنا لا حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ جو پہلے پہروں ہماری محفل میں سامع بنا بیٹھا رہتا تھا، اب اُس کی قربت کی دو گھڑی کے لیے بھی ہم ترس جاتے ہیں۔ یہ محبت آخر ہے کیا بلا..... کیا اپنے ساتھ ہی یہ مجبور یوں، پریشانیوں، دور یوں اور کرب کا ایک دریا لیے وارد ہوتی ہے؟ پہلے میں سمجھتا تھا کہ محبت کا نزول ہی ہمیشہ دوا ایسے افراد کے درمیان ہوتا ہے، جن کا ملن ناممکنات کا دوسرا نام ہو۔ لیکن اب مجھ پر یہ راز دھیرے دھیرے آشکار ہونے لگا کہ اصل میں محبت خود اپنے ساتھ ایک ایسا سحر لیے نمودار ہوتی ہے کہ جو ہمارے محبوب کو ہمارے لیے پری زاد بنا دیتا ہے۔ جانے کوہ قاف کے بلند و بالا پہاڑ خود بخود ہمارے درمیان کہاں سے اکھڑے ہوتے ہیں۔ زمانے کی نظر بدل کر برجی کیوں بن جاتی ہے۔ اپنے بھی پرانے ہو کر طعنے مارنے لگتے ہیں، ہمدردی طعنے بدل جاتی ہے۔ کل تک



پوری قوت سے اپنے پنجے کے ایک ہی تھپیڑے سے ہوا میں اچھال کر جھوم کے دائرے سے پرے پھینک دیا تھا۔ مجھے اکرام اللہ صاحب نے بتایا تھا کہ جبروت اپنے ہار جانے والے یا شدید زخمی کتوں کو مرنے کے لیے صحرا میں بھیجا دیتا ہے۔ شاید کالے کو بھی ادھ مرا سمجھ کر وہ لوگ صحرا میں پھینک گئے تھے، لیکن وہ اس حالت میں یہاں تک کیسے آ پہنچا۔ کتے کا جسم بُری طرح زخمی تھا اور پچھ کے خون خوار پنجوں نے کالے کا پیٹ بُری طرح سے اُدھیر دیا تھا۔ وہ گرم ریت پر کچھ اس طرح پڑا ہوا تھا کہ اس کی دھوکنی جیسی چلتی سانس اور منہ سے نکلتی زبان ریت چاٹ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ریت میں جذب ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کتے نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ صرف ایک کراہ کے بعد نڈھال ہو کر پھر وہیں پڑ کر رہ گیا۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں میں جلدی سے بھاگ کر مزار کے احاطے میں پڑی پرانی مشک اٹھا لیا جس کی تہ میں ابھی کافی پانی موجود تھا۔ میں نے چند قطرے جانور کے چہرے پر پڑائے تو اُس نے جلدی سے زبان باہر نکال دی اور پانی کی گرتی بوندوں کو بے تابی سے اپنے حلق سے نیچے اُتارنے لگا۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے زخم کا اصل گہرائی کا اندازہ ہوا۔ لیکن افسوس میرے پاس اس وقت وہاں کوئی ایسا مرہم نہیں تھا، جسے میں زخم پر لگا دیتا۔ اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں دوبارہ اندر کی طرف دوڑا۔ ایک پرانا ٹاٹ کا ٹکڑا صحن کی دیوار کے پاس پڑا نظر آیا۔ میں نے دیوار کے بنے طاق کے اندر سے پاجامے اٹھائی اور ٹاٹ کو آگ لگا دی۔ بچپن میں ایک بار کاشف کی بلی کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا، تب میں نے اپنے لنگوٹے یا ر کو یہی نسخہ آزماتے دیکھا تھا۔ ٹاٹ کی راکھ میں کالے کے زخم کے اوپر بکھیر دی۔ پتا نہیں اُسے اس سے سکون ملا یا نہیں۔ میں رات کی بچی ہوئی روٹی کے چنانچہ خشک ٹکڑے بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ روٹی ٹنگنے اور پانی پینے کے بعد وہ مجھے کچھ سکون میں دکھائی دیا۔ لیکن مسئلہ اب بھی وہی تھا۔ بے زبانی..... اچانک ہی مجھے اس زبان اور ان لفظوں کی شدید اہمیت کا احساس ہوا۔ ہمارے پاس یہی ایک لفظ ہی تو ہوتے ہیں، سب سے خاص، سب سے ممتاز کر دینے والے..... اور اگر ہمارا زندگی سے یہ لفظ نکال دیئے جائیں تو ہم کس قدر نامکمل، کس قدر کھوکھلے ہو جائیں۔ بے زبانی کا کرب جبر شدت سے اس لمحے میں نے محسوس کیا، شاید ہی کبھی کیا ہو۔ کالے نے اپنے جسم کو تو لا اور تقریباً گھسنے ہوا۔ ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا، یہیں پڑا رہے۔ لیکن میں تو اشاروں کی زبان بھی نہیں جانتا تھا اور پھر بات اشاروں کی زبان تک ہی کہاں مخصوص تھی میں بول کر بھی بعض مرتبہ اپنے لفظوں کو گونگا ہی پاتا تھا۔ کالے نے اُونچے نیلے سے پلٹ کر ایک بار تشکر بھرا نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر ریت کے اُڑتے گرم گولوں میں غائب ہو گیا۔ اتنے میں اندر مزار کے صحن سے کسی کے باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں پلٹ کر واپس صحن میں داخل ہوا تو اکرام صاحب ایک بوڑھے جوڑے کے ساتھ سلطان بابا کے قریب بیٹھے دکھائی دیے۔ بوڑھے کی نظر شاید بالکل ہی جواب دہ چلی تھی، لہذا وہ بڑھیا کے سہارے ٹول ٹول کر سلطان بابا سے مخاطب تھا۔ میں بھی سلام کر کے خاموشی سے

لوگوں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بڑھیا گزارے لائق بھی اُردو نہیں بول سکتی تھی۔ سو بوڑھے ہی کو اُس کے حصے کے الفاظ بھی ادا کرنا پڑ رہے تھے۔ خود بوڑھا بھی اپنا دعائوٹی پھوٹی اُردو اور صحرائی زبان کی آمیزش میں بیان کر رہا تھا۔ اکرام صاحب بھی درمیان میں لقمے دیتے رہے۔ ماجرا کچھ یوں تھا کہ بوڑھے اور بوڑھی کی نواسی چھ ماہ پہلے بیاہ کر اپنے گاؤں سے میاں سمیت کال گڑھ سے دو گاؤں آگے رحمان گڑھ کے لیے روانہ ہوئی تھی لیکن وہ اور اُس کا شوہر کبھی رحمان گڑھ نہیں پہنچے۔ لڑکی کے گاؤں اور رحمان گڑھ کے بیچ صرف کال گڑھ ریلوے سٹیشن ہی پڑتا تھا اور تلاش کے دوران چند ریلوے ملازمین نے اتنی گواہی تو ضرور دی کہ انہوں نے اُس رات ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کو کال گڑھ کے ریلوے سٹیشن پر اترتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس کے بعد وہ دوبارہ ٹرین پر سوار ہوئے یا کہیں اور نکل گئے، اس کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ لڑکی کے ماں باپ تو چند سال پہلے ہی خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ لڑکی کے نانائے نے ہی پال پوس کر اُسے بڑا کیا اور بیاہا تھا۔ لڑکا رحمان گڑھ میں کوئلے کی کان میں مزدور تھا اور ہفتے بھر کی چھٹی لے کر صرف بیاہ کے لیے اپنی دہن کے گاؤں آیا تھا۔ بوڑھا اور بوڑھی اپنی نواسی کی خدائی میں بے حد نڈھال تھے۔ خاص طور پر بڑھیا کے تو آنسو ہی نہیں رکتے تھے۔ بقول اُس کے اُسے کال گڑھ کی مٹی میں سے اُس کی سیکنے کی خوشبو آتی تھی اور گزشتہ چھ ماہ ہی سے وہ دونوں در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے لیکن ابھی تک اُن کی نواسی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا، نہ ہی اُس کے شوہر کا کوئی پتا تھا۔ کال گڑھ کا کارہ پولیس بھی چند دن کی دیکھا ہے کی دودھوں کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی تھی اور اب تو حوالدار نے باقاعدہ ان دونوں کا داخلہ بھی تھانے میں بند کر دیا تھا کہ کون روز اندان دو خطی بوڑھوں کی تکرار سنتا پھرے۔ اکرام صاحب نے سلطان بابا کو یہ بھی بتایا کہ شروع میں سب سے پہلے سیکنے کے نانائے نے علاقے کی روایت کے مطابق جبروت سے بھی رابطہ کیا تھا اور جبروت نے چند دن اپنے ہر کارے اُس پاس کے علاقوں میں دوڑائے بھی کہ شاید کہیں لڑکا لڑکی کا کچھ پتا چل سکے، لیکن چند دن بعد کارندے بھی تھک ہار گئے۔ اب تو جبروت نے بوڑھے اور بڑھیا سے ملنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس کتے لڑانے جیسے اور بھی بہت سے اہم کام ہوتے تھے، وہ کب تک اپنے وفاداروں کو بلکان کرتا۔ لیکن سیکنے کی نانی نے علاقہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اُسے اب بھی اُمید تھی کہ اُس کی لاڈلی کی اگر کوئی خبر ملے گی تو وہ یہیں کال گڑھ سے ملے گی۔ بڑھیا نے بوڑھے کے کان میں کچھ کہا اور بوڑھے نے اُسے ڈانٹا۔ بڑھیا نے پھر منت کی۔ بوڑھا بادل ناخواستہ گڑ گڑایا۔ ”میری لگائی ٹھیا گئی ہے پیر صاحب۔ آپ سرکار لوگ ہو، مگر انہیں انٹا۔ پر یہ کہتی ہے کہ اُسے روزانہ کئی مینوں سے ہر رات ایک ہی عجیب سا خواب آتا ہے کہ ہماری سیکنے اس صحرا میں دوڑ رہی ہے اور اس کے پیچھے بہت سے کتے لگے ہوئے ہیں۔ سیکنے دوزر دوزر سے رو رہی ہے اور ہمیں پکار رہی ہے.....“ میں زور سے چونکا۔ کچھ ایسا ہی خواب تو میں نے بھی رات کو دیکھا تھا۔ یہ صحرا کیا اپنے سبھی اہیلوں کو ایک جیسے ہی خواب دکھاتا تھا۔ بوڑھا گڑ گڑا رہا تھا۔ ”آپ ہمارے لیے دعا کرو پیر جی..... ہم بہت

مجبور اور بے کس ہیں۔ بڑی دُور سے چل کر آئے ہیں۔ یہاں کوئی ہماری فریاد سننے والا نہیں ہے۔“ بوڑھے بولتے بولتے بھرا سا گلیا اور اس کی آنکھوں سے دواؤں ٹپک کر مزار کی بنجر زمین میں جذب ہو گئے۔ بڑھیا اپنے مرد کو روتے دیکھا تو جلدی سے اپنا دکھرا بھول کر پلو سے اُس کی آنکھیں پونچھنے لگ گئی۔ عجیب نظارہ تھا دو مجبور اور بے بس انسان ایک دوسرے کو دلا سادے رہے تھے، حالانکہ دونوں اس بات سے باخبر تھے کہ ان دلا سا جھوٹا ہے۔ پتا نہیں کیوں ایک دم ہی میرا دل بھرا آیا اور میں نے وہاں سے اُٹھ جانے کی ٹھان لی۔ اسے میں مزار کے دروازے سے زوردار آواز کے ساتھ سلام کی آواز سنائی دی۔ آنے والا سانول تھا، جو دروازے کے قریب کھڑے ہو کر مجھے پاس آنے کے اشارے کر رہا تھا۔ مجھے تو ویسے بھی وہاں سے ٹلنے بہانہ چاہیے تھا۔ سانول کے قریب پہنچ کر میں نے اُس سے پوچھا۔ ”خیر تو ہے..... کہیں نوری کے لیے کو منت مانگتے تو نہیں آئے۔“ وہ مسکرایا۔ ”منتوں سے اگر پیار ملتے تو کال گڑھ کا یہ مزار اتنا دیران نہ ہوتا جتنا.....“ ”واہ..... بڑی بات کہہ دی تم نے۔ کہو کیسے آئے؟“ سانول نے کچھ رازدارانہ انداز میں میرے قریب ہو کر بتایا کہ نوری کی کسی سہیلی نے اُسے پیغام بھجوایا ہے کہ نوری عصر کے بعد اپنے والدین کے ساتھ مزار پر کرنے آئے گی۔ شاید چچا اکرام بھی ساتھ ہوں۔ سانول بھی اُس وقت کسی بہانے مزار پر آنا چاہتا تھا۔ وہ یہی بتانے کے لیے اس جھلسا دینے والی دھوپ میں دوڑتا ہوا یہاں تک آیا تھا کہ میں اس کی مدد کروں اور اس کے ذمے کوئی ایسا کام لگا دوں کہ وہ جب مزار پر آئے تو نوری کے گھر والوں کو شک نہ ہو اور وہ نہ نہ مانیں بقول سانول نوری کے گھر والے اس معاملے میں بہت سخت تھے، خاص طور پر اپنے پرانے اُستاد ہیڈ نام اکرام صاحب سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ میں نے اُس کی رام کہانی سننے کے بعد مسکرا کر اُس سے پوچھا۔ ”جہاں اُس نے اتنی محنت کی ہے، وہیں ضرور کوئی اچھا سا بہانہ بھی خود ہی سوچ لیا ہوگا۔“ سانول بھی ہنس دیا۔ ”اُس کا انتظام بھی میں نے کر دیا ہے۔ آج جمعرات ہے۔ میں یوں ظاہر کروں گا کہ جیسے تمہارے کہنے مغرب کے بعد پڑھ کر بانٹنے کے لیے پنے اور گڑ وغیرہ لے کر آیا ہوں۔ پچھلے حافظ جی بھی ہر جمعرات کو نیاز بانٹا کرتے تھے۔“ یہ محبت کرنے والوں کو ہمیشہ ایسے بہانوں کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ میں نے سانول کو تسلی دی کہ وہ بے فکر ہو کر واپس جائے۔ میں اس ”معاونت عشق“ کے جرم میں اُس کا پورا ساتھ دوں گا۔ سانول کو پریشان دیکھ کر میں بھی سوچتا رہا کہ یہ پیارا اپنے ساتھ اتنی کڑی پابندیوں کے کاٹنے کیوں لے کر ہے۔ ہفتوں صحرا میں سر بیٹھنے اور پاؤں میں چھالے پڑنے کے بعد آج جب محبوب کا دیدار نصیب ہو بھی رہا تو وہ بھی صرف چند گھنٹوں کے لیے۔ اور اس کے لیے بھی سو بہانے اور تاویلیں گھڑنا پڑ رہی تھیں۔ یہ پیار محبت کا جذبہ ہماری رگوں سے سارا خون نچوڑنے کے بعد ہی خوشی کی دو بوندیں ہماری رُوح کے کشتوں کیوں ڈالتا ہے۔ جاتے جاتے سانول کی نظر سلطان بابا کے قریب بیٹھے بوڑھے اور بڑھیا پر پڑی۔ ”واہ یہ بے چارے یہاں بھی آپہنچے.....؟“ ”تم جانتے ہو انہیں.....؟“ کال گڑھ میں کون ہے جو انہیں نہیں جانتا

پہلے چھ ماہ سے علاقے کے ہر گھر کی چوکت پر دستک دے چکے ہیں یہ دونوں۔ بڑا ظلم کیا ہے قدرت نے ان کے ساتھ۔ جانے ان کی نواہی کہاں کھو گئی ہے۔ علاقے کے سب ہی جوانوں نے چپ چاپ چھان مارا لیکن ان دنوں کا آج تک کہیں پتا نہیں چلا۔ اب تو باقی سب کی طرح میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ضرور وہ لوگ کال گڑھ سے کہیں آگے بڑھ گئے ہوں گے۔ یہاں ہوتے تو اُن کا کچھ نشان تو ملتا؟“ جاتے جاتے سانول ایک بار پھر باپورا منصوبہ دھرا کر اور مجھ سے تصدیق کروا کر واپس پلٹ گیا۔ سلطان بابا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ میں بھی اکر دعا میں شامل ہو گیا۔ دعا ختم کر کے سلطان بابا نے سیکنے کے نانا تانی کو تسلی دی کہ انشاء اللہ جلد اُن کی لاڈلی کا کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔ اکرام صاحب نے دعا کے بعد واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ بڑھیا نے بوڑھے کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور سلطان بابا سے رخصت ہو کر جانے کے لیے پلٹے۔ بڑھیا کی گود سے پڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی پھسل کر نیچے گر گئی لیکن اُسے شاید اس کی خبر نہیں ہوئی۔ میں بھی انہیں جاتا دیکھنے اس قدر رنجو تھا کہ پہلے میری نظر بھی وہاں نہیں گئی۔ پھر جب احساس ہوا، تب تک وہ مزار کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے اکرام صاحب کو آواز دے کر روکا اور جلدی سے پوٹلی اٹھا کر انہیں تھمانے کے لیے دروازے کی جانب دوڑا۔ پوٹلی کی گرہ شاید نرمی سے لگائی گئی تھی، تب ہی وہ بیچ راستے ہی میں کھل گئی اور دو چار پڑے نکل کر صحن میں بکھر گئے۔ ریت کا تیز جگولا مزار کے صحن میں داخل ہو گیا اور میں نے جلدی جلدی پڑے سمیٹنا شروع کر دیئے۔ ریت میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ کپڑے کیا تھے، چند کتہیں ہی تھیں۔ بڑھوانے ایک زمانہ دوپٹے کو ڈور پھینک دیا۔ میں باقی کپڑے سمیٹنے کے بعد اُس جانب بڑھا، جہاں مزار کے صحن میں اُس کے کپڑے کے ایک جھاڑ میں وہ دو پٹا انکا ہوا تھا۔ ریت کے اڑتے ذروں نے اُس پاس سب ہی کچھ ہندلا کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی میری نظر دوپٹے پر پڑی اور میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے دئے۔ یہ..... یہ تو وہی پھولوں والی چادر کا ایک حصہ تھا، جو میں نے اُس انجان لڑکی کو اوڑھے دیکھا تھا۔ لڑکی تو تھا..... لیکن یہ دوپٹا..... یہاں کیسے.....؟ میں نے جلدی سے کپڑے پکڑا لیے اور اسے لے کر تقریباً دوڑتا ہوا دروازے کے قریب کھڑے جوڑے تک پہنچا۔ اکرام صاحب بھی میری ہڑبواہٹ دیکھ کر گھبراے گئے۔ میں نے جڑی سے پوچھا، ”یہ کپڑے کس کے ہیں؟“ اکرام صاحب نے جواب دینے کے لئے بوڑھے کی جانب دیکھا۔ بوڑھے نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”یہ ہماری سیکنے کی چادر کا آدھا حصہ ہے۔ شادی کے بعد آتے ہوئے اُس نے اپنی بد نصیب نانی کو اپنی نشانی کے طور پر دیا تھا۔ اب یہ اسے اپنے سینے سے لے بھر رہی ہے جی۔ کہتی ہے اس میں سے اُسے اپنی لاڈلی کی خوشبو آتی ہے۔“ میرے ذہن میں بیک وقت نے کتنی آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب تک جو انجان لڑکی رات کے اندھیرے میں اس صحرا میں دکھائی دیتی رہی، وہ سیکنے ہی تھی۔

## لاحاصل کی کھوج

پرے سانول کو لے لے ڈگ بھرتے مزار کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی زور دار انداز میں ہم سب کو سلام کیا اور ایک بڑا سا کپڑے کا تھیلا ایک جانب رکھتے ہوئے بولا ”چھوٹے پیر جی..... آپ نے دعا کے لیے جو سامان منگوایا تھا، سب لے آیا ہوں۔“ اُس کی اس ”چھوٹے پیر جی“ کی اصطلاح نے مجھے بے ساختہ مسکراتے پر مجبور کر دیا۔ نوری نے چونک کے پلٹ کر دیکھا اور اُس کے چہرے پر بیک وقت حیا، شرم اور کچھ کچھ غصے کی لالی بکھر گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سانول کی اس ”سعادت مندی“ کے پیچھے کیا راز ہے۔ سانول نے باقی سب لوگوں سے بھی علیک سلیک کی اور میرے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ اُس کی نظر بار بار پھسل کر نوری کے چہرے کا طواف کر رہی تھی اور چند لمحوں پہلے کسی گہری جھیل کی طرح پُر سکون نظر آنے والی نوری کسی سمندر کے بے چین مدوجز کی طرح بل کھانے لگی تھی۔ دعا ختم کرنے کے بعد وری کے والدین نے سلطان بابا سے چند لمحوں کی ملاقات کی۔ اکرام صاحب نے ان سب کا تعارف کروایا۔ اس تمام عرصے میں نوری مستقل سر جھکائے کھڑی رہی۔ سانول کا دیا ہوا لقب نوری کے ماں باپ کی زبان پر ہی چڑھ گیا تھا اور وہ رخصت ہوتے وقت تک مجھے ”چھوٹے پیر“ کے نام ہی سے پکارتے رہے۔ گویا سلطان بابا کا گڑھ کے بڑے پیر تھے اور میں اُن کا معتقد، چھوٹا پیر۔ سانول کی بے چینی ظاہر کر رہی تھی کہ اُس کی منت صرف نوری کی اک نظر ہے۔ لیکن اس پیکر حیا نے بھی جیسے صرف مزار کی زمین پر پچھی ریت ہی کو نہار نے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ نوری نے آخری وقت تک اپنی نظر جھکائے رکھی، حتیٰ کہ اُس کے ماں باپ اور چچا مزار کے دروازے تک پہنچ گئے۔ سانول بالکل ہی پرشورہ سا ہونے لگا۔ میرے دل سے بے اختیار ایک صدا نکلی کہ اس کے حصے کی نظر اسے نصیب کر دے اور ٹھیک اُسی لمحے نوری نے مزار سے نکلتے نکلتے ایک پل کے لیے پلٹ کر سانول کی جانب دیکھا۔ کیا کچھ نہیں تھا۔ اُس ایک نظر میں۔ حجاب، ستائش، سرزنش اور ایک لوداع..... تب تک کے لیے جب قدرت ایک بار پھر ان دونوں کا سامنا کرا دے۔ سانول اپنی جگہ بُت سا کھڑا رہ گیا اور نوری پلٹ کر چل دی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک نظر سانول کو کیا کچھ دے گی۔ لیکن مجھے یہ بھی پتا نہ کہ اب اگلی ملاقات تک سانول کے جگر میں نوری کی یہ آخری نظر، زہر میں بجھے ہوئے ایک تیر کی طرح بست رہے گی۔ نہ جانے کتنے جگ راتے اور دھوپ کے کتنے پہر اسی ایک نظر کی کک اور تڑپ کے اثر میں لڑ جائیں گے۔ صورت چاہے کوئی بھی ہو، یہ محبت ہر حال میں ایک دودھاری تلواری تو ثابت ہوتی ہے۔ نہ تو جہان کی کاشی ہے اور ملاقات ہو جائے تو محبوب کا جلوہ جلا کر رکھ دیتا ہے۔ سانول بھی اب صرف اپنی کک کی صورت ہی میں اس مزار کے احاطے میں موجود رہ گیا تھا اور گرم ہوا کے تیز گولے اور ریت کا طوفان لارا کھ کو پورے مزار کی چار دیواری میں اُڑا رہا تھا۔ یہ جذبے بھی کتنے منہ زور ہوتے ہیں۔ ایک لمحے ہی کا سب کچھ کیسے زندہ دلوں کو خاک کر دیتے ہیں۔ سانول بھی کچھ دیر بعد اپنے اس ریزہ ریزہ اور خاستہ وجود کو لیے واپس پلٹ گیا۔ مغرب کے بعد جب سلطان بابا نے اپنی تسبیح ختم کی تو میں نے انہیں سیکہ کے دوپٹے والی

میرادل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر اُن دونوں کو بتاؤں کہ میں نے سیکہ کو دیکھا ہے لیکن نہ جانے وہ کواہ احساس تھا جس نے مجھے اس اعلان سے باز رکھا۔ بوڑھا اور بڑھیا اکرام صاحب سمیت اپنی نواسی کپڑوں کی پوٹلی لیے پلٹ کر چل دیے اور میں وہیں ریت کے شدید طوفان میں مزار کے دروازے کے قریب گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب ریت کی چادر نے میرے سارے وجود کو اپنی جلتی چا سے ڈھک دیا۔ یہ کیسا اسرار تھا؟ اگر وہ لڑکی سیکہ ہی تھی، جو مجھے ایک آدھ نہیں، پورے تین بار دکھائی دی تھی پھر وہ گزشتہ اتنے عرصے میں کال گڑھ کے دوسرے باسیوں کو کیوں نظر نہیں آئی تھی؟ لیکن کیا صرف ایک پھولوں والی چادر کی مشابہت کی بنا پر مجھے اتنا بڑا دعویٰ کرنا بھی چاہیے یا پھر مزید کسی ثبوت کا انتظار کرنا چاہیے میں انہی سوچوں میں گم رہا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب عصر کا وقت گزر گیا۔ سلطان بابا نے نو کا تو میں۔ جلدی سے سورج ڈھلنے سے کچھ قبل نماز ادا کی۔ آج مزار پر ہلکی پھلکی چہل پہل بھی تھی۔ شاید جمعرات کی ہ سے۔ کچھ ہی دیر میں اکرام اللہ صاحب ایک کچی عمر کے مرد اور عورت کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے جھجھکتی سی، چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ایک سانولی سلونی سی نوجوان لڑکی علاقے کی ریت کے مطابق بڑا سا پٹو نکالے اندر چلی آئی۔ اچھا تو یہ تھی، سانول کی نوری..... واقعی سانول! تڑپ اور بے چینی بلا وجہ نہیں تھی۔ نوری کے نور سے مزار چند لمحوں کے لیے جگمگا سا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کی ساد میں کس قدر کشش ہوتی ہے۔ کچھ سراپے خود سراپا ایک گہنا ہی ہوتے ہیں۔ انہیں مزید کسی زیور کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نوری نے بھی سادہ سفید چوڑیاں کبھی تک ڈال رکھی تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ اور اکرام چچا ساتھ دعا میں مشغول تھی اور میں بار بار باہر صحرا کی طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ نہ جانے سانول کہاں رہ گیا تھا اُس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ نوری کی خاص سیکلی نے نوری سے بھی چھپ کر اس کے مزار آنے کی یہ خبر سانولا تک پہنچائی تھی۔ نوری کی سب سہیلیاں سانول کی اس بے قراری سے واقف تھیں اور سب ہی کی دلی خواہش تھی کہ نوری جلد از جلد سانول کی ہو کر اُس کے گھر چلی جائے۔ اس لیے وہ نوری کی ناراضی کا خطرہ مول لے بھی ایسی حرکت کر گزرتی تھیں۔ جس سے ان دونوں کو دو گھڑی ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع مل سکے نوری کا سکون بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے سانول کی آمد کی خبر نہیں، ورنہ ایسے شفاف آئینے کہاں کچھ پاتے ہیں۔ نوری نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور میں نے دُور صحرا میں نوری کی ہتھیلیوں کے حلقے

دیکھنے لگا۔ پھر کسی کے نہ ہونے کا اطمینان کر کے سرگوشیانہ انداز میں بولا ”میری ایک بات مانو گے اس بات کو یہیں ختم کر دو۔ یہ کھوج تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔“ مجھے اس کے رویے پر شدید حیرت ہوئی۔ ”کیوں.....؟ ایسا کیا ہے اس کھوج کے انجام میں۔ دیکھو اگر تمہیں اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی پتا ہے تو مجھے ضرور بتاؤ۔ کیوں کہ اب تو دھیرے دھیرے مجھے بھی یہ یقین ہونے لگا ہے کہ میری کال گڑھ آمد کا مقصد ہی صرف یہ کھوج ہے۔“ سانول نے بات ٹالنے کی بہتری کوشش کی، لیکن میرے معمم ارادے کے آگے اُسے ہار ماننا پڑی۔ ”میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتا لیکن شاید دوسروں سے کچھ بڑھ کر معلومات رکھتا ہوں۔ لیکن اپنے شوہر کے ساتھ کال گڑھ کے اسٹیشن پر کیوں اُتری، اس کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن وہ ایک رات بستی کے کس مکان میں ٹھہری تھی، مجھے اس جگہ کا پتا ہے۔ میں اور میرا دوست پیرل وہاں گئے بھی تھے۔“ سانول بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ میں نے اُسے نوکا ”تم لوگ وہاں کیوں گئے تھے اور اب تمہارا دوست کہاں ہے؟“ سانول نے گہری سانس لی ”پیرل کو اُس کے باپ نے اگلے ہفتے ہی شہر بھجوا دیا تھا، کیوں کہ اُسے ڈر تھا کہ یہاں اُس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“ اب میری بے چینی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ”خدا کے لیے یہ پہیلیاں بھجواند کر اور مجھے پوری بات بتاؤ۔“ سانول نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”کبھی کبھی مجھے تم وہ نہیں لگتے جو تم ہو..... لیکن پتا نہیں پھر بھی جانے کیوں تم پر اعتبار کرنے کو دل کرتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں پوری بات بتا ہوں۔“

سانول نے ایک بار پھر اچھی طرح اطمینان کیا کہ ٹیلے کے آس پاس صحرا میں کوئی دوسرا ہماری گفتگو سننے کے لیے موجود نہ ہو۔ پھر اُس نے دھیمے انداز میں بھید کھولنا شروع کیا۔ میں دم بخود سا بیٹھا سنتا رہا۔ سانول کے مطابق وہ اور پیرل اُس رات گھر والوں سے چھپ کر قریبی قصبے میں نوٹسکی دیکھنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اپنی پرانی دیر ہو گئی اور آدھی رات کے وقت جب وہ بستی کی طرف لوٹ رہے تھے تو بستی کی مشرقی سمت جہاں صحرا میں کچے گھر ڈور ڈور فاصلے پر بنے ہوئے ہیں اور جن میں سے ہر گھر کے آگے کچا آنگن اور پھر آدھی بجی چار دیواری کی آڑ بنائی گئی ہے، وہاں ایک گھر کے قریب انہیں چند سائے لپکتے نظر آئے۔ سانول اور اُس کا دست ڈر کر وہیں دبک کر بیٹھ گئے اور پھر چند لمحوں بعد یہ بالکل ختم ہوئی تو وہ جلدی جلدی اپنے گھروں کو لئے۔ دو دن بعد یہی بوڑھا بوڑھا کال گڑھ پہنچے اور انہوں نے اپنی سیکڑی تلاش کی دہائی میں ہر دروازے پر تنک دینا شروع کر دی۔ اسی تلاش میں وہ سانول کے دوست پیرل کے در تک بھی گئے۔ پیرل کا باپ ایک کھوجی ہے، لہذا انہوں نے اپنی نوایں کے کھوج کی التجا بھی کی۔ میں نے کھوجی لفظ پر سانول کو ٹوکا۔ ”یہ کھوجی کیا ہوتا ہے.....؟“ سانول نے حیرت سے میری جانب دیکھا ”کیا تمہیں کھوجی کا نہیں پتا۔ یہ تو بڑے گنی لوگ دتے ہیں۔ ان کے باپ دادا سے یہ فن اُن کے اندر نسل در نسل چلتا ہے۔“ سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی وہ دتا ہے جو زمین پر پڑے نشانات کے ذریعے گاؤں میں ہوئی کسی بھی واردات کا سراغ لگانے میں مدد کرتا

ساری بات بتائی کہ اسی چادر کا دوسرا حصہ پہنے ہوئے میں نے صحرا میں اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ سلطان بابا میرا بات سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بولے تو لہجہ تب بھی کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ ”گویا وہ صرف ایک سراب ہی نہ تھی۔ قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینے والی ہے ساحر میاں! خیال رہے کہ اب قدم ڈمگانے پائیں۔ دیسے میرا قیاس ہے کہ اب وہ لڑکی تمہیں دوبارہ دکھائی نہیں دے گی۔ اس نے تمہیں جو اشارہ دینا تھا دے چکی۔ اب آگے کی کھوج تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔“

ہمیشہ کی طرح میں سلطان بابا کی پوری بات سمجھ نہیں پایا اور ہمیشہ کی طرح چپ ہی رہا کیوں کہ مجھے اندازہ تھا کہ سلطان بابا مجھے اتنا ہی بتاتے ہیں جتنا میرے لیے جاننا ضروری ہوتا ہے۔ رات ڈھلنے لگی تھی اب میری ازلی وحشت اور بے چینی کا دور بھی شروع ہونے ہی کو تھا کہ مجھے باہر سے وہی مخصوص غراہٹ سنائی دی مجھے اندازہ تھا کہ ”کالا“ بھوک لگنے پر اب ہمیشہ مزار پر چار دیواری ہی کا رخ کیا کرتے گا کیوں کہ اس نے پرانے مالک نے تو اسے اس کی زندگی بھر کی وفاداری کا صلہ ایک ”دیس نکالنے“ کی صورت ہی دیا تھا۔ وہ وہ اپنی مخصوص جگہ پر پاؤں پمارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک پرانے برتن میں پانی کا مستقل انتظام کر دیا تھا۔ رو کے چند کلوے نلگے کے بعد کالا وہیں پیر پیر کر بیٹھ گیا۔ جانے اسے اتنی سمجھ کیسے آگئی تھی کہ وہ مزار کی دیواری کے اندر پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ اتنے میں صحرا کی طرف سے سانول کی پُرسوز بانسری کی لے ہوا کے دوش بکھری۔ اُس کی تان میں جو درد آج تھا۔ اُسے شاید صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ شاید شیلے نے کہا تھا ”ہمارے سب سے پیٹھے نفے وہی ہوتے ہیں جو ہمارے اندر کے شدید غم کو بیان کرتے ہیں۔“ آج سانول بانسری بھی شیلے کے اس قول کو جابج ثابت کر رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اُس نے ہونٹوں سے بانسری لی۔ میں نے قریب جا کر اُسے چھیڑا۔ ”مجھے نہیں پتا تھا کہ نوری کی ایک جھلک تمہاری دھن کو اتنی زندگی دے گی۔ ورنہ اُس کے ماں باپ سے کچھ دیر مزار پر غمخیزنے کی التجا ضرور کرتا۔“ سانول پھسکی ہی مسکراہٹ ساتھ بولا ”میں ہر لمحہ اُسے دیکھنے کے لیے تڑپتا ہوں، لیکن جب بھی کبھی اُس کی ایک آدھ جھلک پالیتا ہوں پھر ہفتوں یونہی اداس اور بے چین رہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے عبداللہ.....“ ”پہلے تو تم یہ فیصلہ کر لو کہ عبداللہ ہوں یا چھوٹا پیر۔ پھر اس کے بعد ہم مل کر اس درد کا مرہم بھی ڈھونڈ لیں گے۔“ اس مرتبہ سانول کھلکھلا کر ہنسنے سے روک نہیں پایا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ میں اُسے یاسیت کے اس دور سے باہر نکالنا تھا۔ اب میں اُسے کیسے سمجھاتا کہ اس محبت نے آج تک خوشی کم ہی بانٹی ہے۔ کیکر کا مقدر صرف کانٹے ہو ہیں، مگلاب نہیں۔

میں ابھی تک سیکڑے کے بھید میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے سانول سے دوبارہ اُس کا تذکرہ کیا کہ مجھے لگتا ہے کہ جس لڑکی کی جھلک میں نے صحرا میں تین مرتبہ دیکھی ہے، وہ سیکڑے ہی تھی۔ لیکن اس بار سانول عمل بہت چونکا دینے والا تھا۔ اُس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر اپنی انگلی کی مہر لگا دی اور گھبرا کر ادھر



نے باہر ہی روک دیا۔ سانول اور پیرل دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے چپکے کھڑے رہے۔ کھوجی نے اپنے کرتے کی جیب سے لکڑی کی دو عجیب سی لمبی اور پتلی ڈنڈیاں نکالیں اور اُن سے مچن کی جکی زمین کو پھونکیں مار مار کر صاف کرنے لگا۔ مچن میں اُترنے سے پہلے اُس نے ایک کام اور بھی کیا کہ اپنے جوتے اُتار دیئے اور اپنے پیروں میں مخصوص ساخت کے بنائشان والے اُونی موزے پہن لیے۔ شاید اس کا مقصد مچن کی ریتیلی زمین پر اپنے پاؤں کے نشانات سے بچنا ہوگا۔ میں حیرت زدہ سا سانول سے فکڑ پٹس اُٹھانے کا یہ انوکھا واقعہ سن رہا تھا۔ سانول نے بتایا کہ کھوجی نے بڑی احتیاط سے تمام مچن اور پھر دونوں کچے کسروں کی زمین پر پڑی ریت کو صاف کیا اور اس تمام عرصے میں سیکنے کی چادر کی خوشبو سے بھی مدد لیتا رہا۔ پھر ایک خاص جگہ پہنچ کر کھوجی نے اپنی کلائی پر بندھی ایک خاص سفید ڈوری کھولی اور اس کی مدد سے زمین پر پڑی مٹی کو مخصوص طریقے سے یوں کھرچا کہ ڈوری کے دونوں سرے کھوجی نے اپنے ہاتھوں کے دو انگلیوں سے باندھ رکھے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو اس طرح کھول رکھا تھا کہ جب وہ اپنے ہاتھ زمین پر پھیرتا تو دھاگے کی ڈوری زمین پر رگڑ کھاتی، چند مخصوص نشان مٹی میں ابھار دیتی۔ کھوجی نے اپنا کام ختم کر کے ایک لمبی سی سانس لی اور مچن سے باہر نکل کر بوڑھے سے پوچھا ”کیا تمہاری نواسی بانئیس سے جوئیں سال کی درمیانی عمر کی تھی اور کیا اس کے دائیں پاؤں میں کوئی چوٹ یا زخم تھا۔“ بوڑھے سے پہلے بڑھیا چلا اُٹھی ”ہاں ہاں! مہندی کی رات پلنگ سے اُترتے وقت اُس کے پاؤں میں موج آگئی تھی، اس لیے وہ کچھ تکلیف میں تھی۔ لیکن تمہیں کیسا پتا؟“ کھوجی نے ایک نظر آس پاس ڈالی اور پھر آہستہ سے بولا ”اس مچن میں اور کسروں کے اندر پڑے چند نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ایک بانئیس تیس سالہ نوجوان لڑکی جو اپنے داہنے پاؤں پر پورا بو جھنٹیں ڈال سکتی، موجود تھی۔ لیکن اس لڑکی کے علاوہ بھی یہاں کم از کم چار مردوں کے چلنے پھرنے کے نشانات موجود ہیں۔ ہو سکتا ان میں سے ایک اس کا شوہر بھی ہو۔ بہر حال ابھی تمہاری نواسی کی خوشبو اس گھر میں موجود ہے۔ اب رات سر پر ہے۔ لہذا ہم اب کل صبح گھر کے باہر سے نشان اُٹھانا شروع کریں گے تاکہ یہ پتا چل سکے کہ یہاں سے سیکنے کس طرف گئی ہے۔“ سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی کے منہ سے اتنا ہی سن کر وہ بوڑھا بوڑھی اس قدر خوش ہوئے کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ ساری رات اسی ویران مکان کی چوکھٹ ہی پر گزاردیتے۔ بڑی مشکل سے سانول نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ ابھی صبح ہونے میں صرف چند ہی گھنٹے بچے ہیں، لہذا کچھ دیر مزید انتظار میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ رات میں دیے بھی کھوجی نشان نہیں اُٹھا پائے گا۔

اُن کے جانے کے بعد راستے میں کھوجی نے دبے لفظوں میں اپنے بیٹے پیرل اور سانول کو اس بات کا اشارہ دیا کہ اُسے شک ہے کہ لڑکی کو اُس کی مرضی کے بغیر اس گھر سے کہیں اور لے جایا گیا ہے کیوں کہ کھوجی نے مچن میں واضح طور پر گھسیٹے جانے کے چند نشان دیکھے تھے۔ سانول نے کھوجی کو کریداکہ اُسے اس بات کا یقین کیسے ہوا کہ جس ذی روح کو گھسیٹا گیا تھا وہ سیکنے ہی تھی۔ کھوجی نے بتایا کہ چونکہ گھسٹنے وقت بھی لڑکی اپنے

ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی حیات تو اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ صرف عورت یا مرد کے جسم یا کپڑوں کی بو کھونج کر سراغ نکال سکتے ہیں۔ کھوجی اگر اعلیٰ نسل کا ہو تو وہ زمین پر پڑے نشان دیکھ کر یہ بھی بتا سکتا ہے کہ پر پاؤں کا نشان کسی عورت کا ہے یا مرد کا، بچے کا ہے یا کسی بوڑھے کا۔ عورت کا ہے تو کیا وہ جوان تھی یا بوڑھی۔ حتیٰ کہ عورت کے حاملہ یا غیر حاملہ ہونے کا سراغ بھی، وہ مٹی پر پڑے انہی بے جان نشانوں سے ڈھونڈ نکالے تھے۔ اس ساری جمع تفریق اور نشان پہچاننے کا ایک گہرا تعلق عورت یا مرد کے وزن سے بھی ہوتا تھا اور کھوجیوں کی تربیت میں کچھ ایسے خاص کیے شامل ہوتے تھے، جو انہیں مرد و عورت کی چال و حال اور رہن بہن تک کے بارے میں سراغ دے جاتے تھے۔ بہر حال یہ ایک خداداد صلاحیت تھی، جو آج بھی چند مخصوص لوگوں کو حاصل ہے۔ میں سانول کی بتائی ہوئی کھوجیوں کی تفصیلات میں کچھ ایسا کھویا کہ چند لمبے کے لیے سیکنے کو بھی بھلا بیٹھا۔ پھر سانول نے اپنی بات کا سلسلہ وہیں سے جوڑا کہ سیکنے کے نانائانی پیرل کے کھوجی باپ کے سامنے بھی اپنی فریاد لیے آن پہنچے۔ اُن کی گریہ و زاری سے کھوجی کا دل پہنچ گیا اور اُس نے حامی بھری۔ اگلے دن طے یہ پتا کہ کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن سے سیکنے اور اُس کے شوہر کے پیر کے نشان اُٹھانے کا سلسلہ شروع کیا جائے گا، کیوں کہ پہلا سراغ وہیں سے مل سکتا تھا۔ لیکن کھوج اور نشان اُٹھانے کے لیے ایک بہت اہم نکتہ زمین کی ساخت بھی تھا۔ کال گڑھ کا ریلوے اسٹیشن چوں کہ صحرا کے بچوں تھا اور شدید تیز ہوا اور رات بھر چلتی آندھی تو پہلے بھر پہلے کے بنے نشان بھی زمین پر جسنے نہیں دیتی تھی اوپر سے وہ ہر لمحہ سرکتی ریت۔ نتیجتاً کھوجی کو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے مایوس لوٹنا پڑا۔ سانول نے مجھے بتایا کہ وہ، اُس کا دوست پیرل اور سیکنے کے نانائانی بھی کھوجی کے ہمراہ ہی تھے، جب وہ ریلوے اسٹیشن سے تھکے ہارے ہستی میں داخل ہو رہے تھے۔ سیکنے کی ناں بار بار سیکنے کی چادر کو جومتی، اپنی آنکھوں سے لگاتی اور روتی ہوئی اُن کے پیچھے چلی آ رہی تھی کہ اچانک کھوجی کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ وہ پہلے بھی سیکنے کی چادر کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا لیکن اس بار اُس نے خصوصی طور پر بڑھیا سے چادر جھپٹ کر اُسے خوب اچھی طرح سونگھا اور ایک کچے مکان کے سامنے گر ڈک گیا۔ سانول اور پیرل کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ یہ تو وہی مکان تھا، جہاں تین دن پہلے رات کو انہوں نے کچھ لپکتے سائے اور کچھ کھٹی کھٹی سی آوازیں سنی تھیں۔ مکان کا دروازہ بھڑا ہوا تھا لیکن آدھی جکی چادر دیواری کے پار آگن کی ویرانی اور شاننا دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ مگر سے پرے لکڑی کی بلیوں والے چھت کے برآمدے میں کھٹنے والے اندر کے کسروں کے دروازے بھی ادھک ہلے پڑے تھے۔ شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے بعد کا جھپٹا چھار ہوا تھا۔ آخر سانول ہی نے سب سے پہلے ہمت کی اور دروازہ کھول کر اندر مچن میں داخل ہو گیا۔ لیکن کھوجی کی تیز آواز نے اُسے اپنی جگہ کھڑا رہنے پر مجبور کر دیا۔ کھوجی چلایا ”اپنی جگہ پر کھڑے رہنا سانول۔ مچن کی طرف نہ جانا۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی نشان باقی ہو۔“ سانول کے پیچھے کھوجی اور پیرل بھی دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ بوڑھے جوڑے کو انہوں

کچھ دیر بعد ہی ہم بستی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک پرانے سے بوسیدہ مکان کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ سانول کی تیسری دستک پر اندر سے کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی چپل گھسیٹتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا ہاتھ میں لائینن تھامے سر باہر نکال کر کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا، ”اس وقت کون ہے بھی؟“ دفعتاً اُس کی نظر پہلے سانول اور پھر مجھ پر پڑی اور وہ ہڑبڑا کر بولا ”تم؟“

دائیں پاؤں کا پورا وزن زمین پر نہیں ڈال پارہی تھی اور پھر ایک مقام پر آکر جب وہ صحن میں گر پڑی تھی تو اُس کے وزن اور مردوں کے پیروں کے نشانات اور کش کش کے آثار اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں کہ اس صحن میں کوئی اُن ہونی ضرور ہوئی ہے۔ کھوجی کو وہاں زمین پر لڑکی کی ایک بالوں والی پن اور ایک ٹوٹا ہوا ناخن بھی ملا تھا۔ جو اس نے نانائانی کو دکھائے بغیر ہی اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ بہر حال راز جیسا بھی تھا، اُسے اگلی صبح کھل ہی جاتا تھا۔

سانول اتنی کہانی سنا کر چپ ہو گیا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ ”پھر اس کے بعد..... آگے کیا ہوا..... وہ بھی تو بتاؤ نا.....“ لیکن سانول خاموش ہی رہا۔ میں نے اُسے تجھوڑا تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔ ”اس کے بعد کی کہانی بے حد مختصر ہے۔ میں اگلی صبح پیرل کے گھر پہنچا تو وہ دونوں بوڑھا بوڑھی پہلے ہی سے کھوجی کے دروازے پر نظر میں جمائے بیٹھے تھے، لیکن دروازے پر پڑا مونسا سانا لاہم تینوں کا منہ چڑا رہا تھا۔ تین دن تک سکینے کے بد نصیب نانائانی کھوجی کے بند درہی پر پڑے رہے اور جب چوتھے دن وہ لوٹا تو پیرل اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اُس نے گول مول سا جواب دے کر ہمارے منہ بند کر دیا کہ بڑے شہر میں اُس کی خالہ نے کسی بنگلے میں چوکیدار کی نوکری ڈھونڈ نکالی تھی، لہذا اُسے جلدی میں پیرل کو لے کر جانا پڑا۔ سکینے کی تلاش کے سلسلے میں بھی وہ بالکل ہی سر دروے کا اظہار کرتا رہا کہ اب اتنے دن بعد کہاں کوئی نشان بچا ہوگا۔ البتہ بڑھیا کی حد سے زیادہ آہ و زاری سے تنگ آکر وہ دگھڑی کے لیے ہمارے ساتھ اُس ویران مکان تک چلا گیا، لیکن کچھ دیر باہر میدان کی خاک چھانسنے کے بعد حتیٰ اعلان کرویا کہ روزانہ کی چلتی آندھی اور تیز ہوا سے اُس پاس کا ہر نشان مٹ چکا ہے لہذا اب یہاں سکینے کی تلاش لا حاصل ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ اس کے چاہنے والے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کریں۔“ سانول نے بات ختم کر کے کچھ اس طرح میری جانب دیکھا، جیسے اُسے خود بھی اس نامکمل داستان کے انجام سے شدید کوفت ہوئی ہو۔

”لیکن کھوجی نے ایسا کیوں کیا۔ تم نے اُس سے کچھ تو پوچھا ہوتا۔“ سانول نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”کھوجی نے اُس دن کے بعد سے اپنے لب کچھ اس طرح سے سی لیے ہیں کہ اب وہ شاذ و نادر ہی کسی سے کوئی بات کرنے کے لیے منہ کھولتا ہے۔ نہ جانے پیرل کو بھی اس نے کہاں بھیج دیا ہے۔ میں تو گزشتہ چھ مہینوں سے اپنے جگری یار کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترس گیا ہوں۔“ ہم نے ساری رات باتوں میں گزاردی تھی۔ بستی کی جانب سے اذان کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال کسی کوندے کی طرح لپکا۔ ”کیا ہم اس وقت اُس کھوجی کے گھر جا سکتے ہیں؟“ سانول میری بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ ”اس وقت..... کھوجی کے گھر، کیوں خیر تو ہے۔ وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ اپنا وقت ضائع مت کرو، عبد اللہ۔“ ”میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے۔ چلو دیر نہ کرو، مجھے روشنی ہونے سے پہلے واپس مزار بھی پہنچنا ہے، ورنہ سلطان بابا پریشان ہوں گے۔“

## روح کا عکس

دروازے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ ”ٹھیک ہے..... آپ کہتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا کہ آپ کے پاس یہ فن اور یہ خداداد صلاحیت قدرت کی ایک امانت ہے اور آپ نے امانت میں خیانت کی ہے۔ اُوپر والے نے آپ کا اندر اس لیے روشن کیا کہ آپ دوسروں کو اندھیرے میں راستہ دکھائیں اور اُن کی مدد کریں لیکن آج آپ نے اپنے فرض اور کام سے انصاف نہیں کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ بے ایمانی آپ کی آنے والی نسلوں کے اندر سے یہ وجدان و صلاحیت ختم نہ کر دے۔“ میں بات ختم کر کے واپسی کے لیے پلٹا تو کھوجی بیچانی انداز میں چلایا۔ ”نہیں میں نے اپنے فن کے ساتھ کبھی بے ایمانی نہیں کی..... لیکن بعض دفعہ مصلحت بھی آ جاتی ہے۔ میں ایک غریب انسان ہوں اور میری ساری پونجی میرا جوان بیٹا پیرل ہے۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں۔ پر اُسے اگر کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا.....“ سانول نے حیرت سے پہلے میری طرف دیکھا۔ میں نے یہ آخری کوشش اسی امید پر کی تھی کہ شاید کھوجی کے دل و دماغ پر جی کچھ برف پگھلے۔ ہر فرض شناس کارِ مگر کی طرح وہ اپنے فن اور ہنر پر آیا الزام برداشت نہیں کر سکا اور تملکار بول اٹھا۔ میں نے اُسے تسلی دی۔ ”زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے کہیں زیادہ کمزور اور اس علاقے میں صرف ایک اجنبی ہوں لیکن پھر بھی اس لڑکی کی کھوج میں آپ تک چلا آیا۔ کیا آپ کو ان بد نصیب اور لاچار بوڑھوں پر ترس نہیں آتا جو اپنی زندگی کے آخری دن یوں اس تپتے صحرا کی چلتی ریت چھانتے ہوئے گزار رہے ہیں۔ ان دنوں میں تو انہیں اپنے گھر کے آگن میں آرام اور سکون کی زندگی گزارنی چاہیے تھی۔ جیسے میں اور آپ گزار رہے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ دونوں اسی صحرا میں سسک سسک کر اپنی جان دے دیں۔“ کھوجی نے بے بسی سے سر پٹا۔ ”تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میرے باپ دادا نے بھی انگریزی پولیس میں کھوجی کی ڈیوٹی دی ہے۔ اگر میرے سرکار نے میرے باپ کو اس کی خدمت کے صلے میں بڑی عزت، بڑا مان دیا۔ خود میں نے بائیس سال کھوجی کی نوکری کی ہے لیکن کبھی خود کو اتنا بے بس نہیں پایا۔ میں اپنے بیٹے کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن.....“ کھوجی کچھ بولنے بولتے چپ ہو گیا۔ پھر لمبی سی سانس لے کر بولا، ”اچھا غور سے سنو..... میں اگلی صبح اُس مکان کے باہر نشان اٹھانے کا ٹکٹا گیا تھا۔ نشان اٹھانے کا بہترین وقت صبحِ شبنم اور کمرے کے خشک ہونے سے پہلے ہی کا ہوتا ہے جب تک وہ بوڑھی اور بوڑھا نہیں پہنچتے۔ لڑکی کو گھر سے نکالنے کے بعد قریباً 30 فٹ تک گھسنا گیا تھا اور پھر اُسے کسی اُونٹ پر لا دوایا گیا تھا۔ بس اس جگہ سے اُسے لڑکی کے جسم کے نشان ختم ہو گئے تھے۔ اب تو تم بھی سمجھ ہی گئے ہو گے کہ لڑکی کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ میں یہ بات اگر لڑکی کے نانا نانی کو بتا بھی دیتا تو وہ بے چارے اس پردہ میں کیا کر لیتے۔ اسی لیے میں چپ رہا اور بس.....“ میں نے غور سے کھوجی کی جانب دیکھا۔ ”لیکن اُس اُونٹ کے پیروں کے نشان بھی تو کسی جانب گئے ہوں۔ آپ نے اس کا کھوج نہیں لگایا؟“ کھوجی نے خود کو جیسے ہمارے حوالے کر دیا۔ وہ بالکل ہی ہار کر بولا۔ ”وہ ایک نہیں تین اُونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے اور

مجھے اس بوڑھے کھوجی کی ہڑبڑاہٹ پر مزید حیرت ہوئی۔ ”آپ مجھے جانتے ہیں.....؟“ ”ہاں..... اُس دن تمہیں ہیڈ ماسٹر کے ساتھ ہستی کے بازار میں دیکھا تھا تم مزار کے نئے مجاور ہوتا..... لیکن اس طرح منہ اندھیرے میرے دروازے پر..... سب ٹھیک تو ہے نا؟“ اب سانول نے بات سنبھالی۔ ”ہاں چاچا! سب ٹھیک ہے۔ اس کا نام عبداللہ ہے۔ میری اس سے بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے۔ یہ تم سے ملنا چاہتا تھا۔“ میں اسے یہاں لے آیا۔ ”کھوجی کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سانول کی یہ ”خدائی خدمت گاری“ ایک آنکھ نہیں بھائی۔ لیکن وہ چپ رہا اور بادل خواستہ اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا اور سانول صحن میں بڑی جھلنگ سی چارپائی کی پابنتی پر ٹپک گیا۔ باہر گلی میں اکاؤنٹ نمازیوں کے کھنکھارنے اور چلنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر براہ راست سوال داغ دیا۔ ”آپ سکیزن کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“ میرا سوال سن کر کھوجی بوڑھے کے ہاتھ سے لائین گرتے گرتے بچی اور وہ سانول کی طرف دانت پیس کر بولا۔ ”اچھا..... تو یہ تمہاری شرارت ہے، بد معاش لڑکے۔ اسی لیے میں نے پیرل کو بھی تمہارے سامنے سے دُور بھجا دیا تھا، لیکن تم اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ نکل جاؤ تم دونوں یہاں سے..... میں پہلے بھی ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے بارے میں مزید کچھ نہیں پتا۔“ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ”سانول نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا جس سے آپ کسی مصیبت میں پڑ جائیں۔ میں نے خود سکیزن کو صحرا میں دیکھا ہے۔“

یہ دوسرا دھماکا تھا جو عین کھوجی کے سر پر کسی بم کی طرح پھٹا۔ ”کیا.....؟ تم نے اُس لڑکی کو دیکھا ہے۔ مگر کیسے۔ میرا مطلب ہے کہ پھر تم مجھ سے اس کا پتا کیوں پوچھ رہے ہو۔ جا کر اُسی سے پوچھ لو نا۔“ میں کھوجی کے سامنے جا کھڑا ہوا وہ مجھے صرف چند لمحوں کے لیے ایک جھلک کی طرح نظر آئی اور پھر غائب ہو گئی لیکن آپ اس کے بارے میں ضرور کچھ ایسا جانتے ہیں جس سے مجھے اُس کی کھوج میں کچھ مدد مل سکے۔ لیکن شاید آپ کچھ بتانا نہیں چاہتے۔“ کھوجی غصے سے پھر گیا۔ ”کتنی دفعہ کہوں کہ مجھے اُس کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔ اب تم دونوں یہاں سے چلتے بنو۔ اپنی جوانی پر نہیں تو میرے بڑھاپے پر کچھ رحم کھاؤ۔“ کھوجی کے حتمی انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اس مدعا پر مزید کوئی بات نہیں کرے گا۔ وہ صحن کا دروازہ کھولے کھڑا ہماری روانگی کا انتظار کر رہا تھا۔ سانول نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو کھوجی

”جب تم کسی کو چاہتے ہو تو کائنات کی ہر چیز تمہیں ملانے میں جٹ جاتی ہے۔“ اگر آج وہ میرے سامنے موجود ہوتا تو میں اُسے بتاتا کہ جب ہم کسی کو چاہنے لگتے ہیں تو پوری کائنات ہمیں خدا کرنے کی سازش میں جٹ جاتی ہے۔ ہمارے خلاف منصوبے بنانے لگتی ہے، ہمیں براہ کرد دیتی ہے۔ سانول اور نوری کے خلاف بھی سازشیں شروع ہو چکی تھیں۔ محبت بھلا ہمیں کب چین کے دوسانس لینے دیتی تھے۔ جلد ہی ہماری سانسیں گھونٹنے کے لیے آس پاس کی فضا میں جڈائی کا زہر پلا ڈھواں بھر دیتی ہے۔ ہماری آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ اس عشق کو شاید خشک آنکھیں پسند ہی نہیں۔ وہ انہیں ہر لمحہ بہتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ آج سانول کی آنکھیں بھی عشق کی اس سدا سے پیاسی زمین کو سیراب کر رہی تھیں۔ میں نے اُس سے آگے کے منصوبے کے بارے میں پوچھا تو وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ صحرائیں کسی کارپوز چر کر گزارا کر لوں گا۔ کاش کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی کے علاوہ بھی کوئی دوسرا روزگار ہوتا تو آج میں اتنا بے بس نہ ہوتا۔“ مغرب سے کچھ پہلے سانول واپس لوٹ گیا۔

اندھیرا ہونے سے کچھ دیر قبل ”کالا“ بھی مزار کے باہر آکر مخصوص غراہٹ سے مجھے بلانے لگا۔ اُس کا رخم دھیرے دھیرے بھرنے لگا تھا۔ چال میں بھی کچھ توازن آ گیا تھا۔ وہ انتہائی حد تک سدھایا ہوا کتا تھا۔ اُس نے پہلے دن ہی محسوس کر لیا تھا کہ میں اُس سے اپنے کپڑے مس کرنے میں احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ تب ہی شروع دن سے وہ اپنی شکر گزاری کا اظہار بھی کچھ فاصلے سے کرتا تھا۔ کالے کے جانے کے بعد میں پھر اس دیران مزار کی منڈیر کے قریب آ بیٹھا۔ جانے وہ کس کا مزار تھا۔ اندر کروں میں بنی ایک گننام قبر کے اوپر کسی نے پھولوں کی جو آخری چادر چڑھائی تھی، اب اس کے پھول بھی خشک ہو کر ہوا کے ساتھ ادھر ادھر بکھرے جاتے تھے۔ سلطان بابا اندر سے نکلے اور مجھے یوں گم سم بیٹھا دیکھ کر میری طرف آگئے۔ ”کیا سوچ رہے ہو میاں! کبھی اپنے اندر کی اس وحشت کو نگام بھی دے دیا کرو۔ جنوں حد سے بڑھ جائے تو دیوانگی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔“ میں نے اُن کی جانب براہ راست دیکھنے سے گریز کیا۔ ”آپ میرے لیے دعا کیوں نہیں کرتے۔ نصف جنوں سے مکمل دیوانگی کبیں بہتر ہے۔ میں خود اپنے اندر کی اس پل پل بڑھتی بے چینی سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔“ سلطان بابا مسکرا دیئے۔ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ کسی کو خدا اس آئے تو کسی کو جنوں۔ اب دیکھو عبد اللہ کے مقدر میں دیوانگی ہے یا فزرا نگی؟ انہوں نے میری نظروں کے تعاقب میں مزار کے گنبد پر نگاہ ڈالی اور پھر کچھ دیر بعد بولے۔ ”بہادر شاہ ظفر کو پڑھا ہے؟“ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ”کون؟ وہ آخری مغل شہنشاہ..... نہیں۔ بس اُس کی شاعری کے بارے میں یونیورسٹی میں تھوڑا بہت سن رکھا تھا۔“ سلطان بابا نے مزار کے گنبد کی طرف اشارہ کیا۔ ”شاید اُس کا یہ قطعہ بھی ایسے ہی کسی مزار کے لیے ہوگا۔ سنو اور اسے اپنی زندگی سے جوڑ کر دیکھو۔ یہ ہم سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔“

تمام نشانات دوبارہ صحرا کی طرف ہی پلٹ گئے تھے۔ ”مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔“ تو پھر آپ نے یہ بات سیکینڈ گھر والوں کو کیوں نہیں بتائی۔“ کھوجی نے بے بسی سے سرچٹا۔ ”کیسے بتانا، انوکھ کنڈگان کو کچھ جلی شام ہی ہمارا ساری سرگرمی کی اطلاع مل چکی تھی اور صبح جب میں اُس مکان کے سامنے سیکینڈ کے نشان اٹھا رہا تھا، تب ہی وہ اندھیرے دو تین نقاب پوش میری بے خبری میں، میرے سر پر آ پٹپٹے۔ اُن کے ہاتھ میں لڑکی کے شوہر کے خور آلود کپڑے تھے جو انہوں نے میرے سامنے پھینک کر دھمکی دی کہ اگر میں نے اس معاملے میں زیادہ بھڑا دکھانے کی کوشش کی تو اسی رات اپنے اکلوتے بیٹے کا سر بھی اپنی چوکت پر لٹکا ہوا دیکھوں گا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کرتا؟ میں اُسی لمحے گھر پلٹا اور سب سے پہلے پیرل کو شہر چھوڑ آیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے کہ میرے اندر کھوجی ایک مجبور باپ کے سامنے آ گیا۔“

کھوجی اپنی بات ختم کر کے لمبے لمبے سانس لینے لگا، جیسے برسوں کا بھرا غبار اندر سے نکل گیا ہو۔ م سانول کو اس کے گھر چھوڑتے ہوئے مزار لوٹا تو سلطان بابا فجر کی نماز ختم کر کے سلام پھیر رہے تھے۔ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”کیوں میاں! کہاں تک پہنچی تمہاری کھوج۔ کچھ کامیابی ہوئی یا پھر مز اُبھنیں سمیٹ لائے ہو۔“ ہمیشہ کی طرح سلطان بابا مجھ سے پہلے میری تہ تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے رات تک کی تمام روداد انہیں سنادی۔ کھوجی کی باتوں سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے سیکینڈ کا معاملہ کسی قبائلی ریشہ داری کی خلش کا شاخسانہ بھی ہو سکتا ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں لڑکی کا رشتہ نہ ملنے پر یا ٹھکرائے جانے پر انہوں ان ہونیاں عام تھیں۔ لیکن اُسی دن جب میں نے اکرام صاحب کے ذریعے بھانے سے سیکینڈ کے تانی تان کریدا تو یہ بھی محض میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ اُن کے بقول سیکینڈ بہت پہلے ہی اپنے شوہر جیم بخش منسوب تھی اور بنا کسی اُلجھن کے اُن کا رشتہ ہنسی خوشی طے پایا تھا۔ دھاگے مزید اُلجھتے جا رہے تھے اور ہر جانہ سے میرا راستہ ایک بندگی میں آکر ختم ہو جاتا تھا۔ سارا دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ شام کو عصر کے بعد انہی سوچوں میں گم مزار کے صحن میں بیٹھا، سورج کے جلنے کو لے دو دھیرے دھیرے ریت کے ٹیلوں کے پیچ چھپتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ سانول ہڑبڑایا ہوا سا مزار کے احاطے میں داخل ہوا۔ میں بھی اُسے دیکھ کر چونک گیا۔ ”خیریت تو ہے۔ تمہارے چہرے کا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے.....؟“ سانول نے سرچٹا۔ یہ لوگ مجھے سکا سے کہاں رہنے دیتے ہیں۔ نوری کے باپ نے آج میرے ابا کو اپنے گھر بلایا تھا۔ انہوں نے رشتہ کے شرط لگا دی کہ اگر لڑکا کال گڑھ میں کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تو اُسے شہر جا کر محنت مزدوری کرنی ہوگی تاکہ سال بھر میں اپنی بیٹی رخصت کر دیں۔ اب تم ہی بتاؤ میں یہ صحرا چھوڑ کر کہیں اور کیسے جا سکتا ہوں۔ میرا بانی کا ہر ساز و آساریت سے زندہ ہے اور میری ہر دھن اسی ایک کے لیے۔ میں تو مر جاؤں گا اُس سے ڈ جا کر..... مجھے تو یہاں کی ہوا میں بھی اُس کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ کسی دوسری فضا میں تو میری سانس ہی گھ جائے گی۔“ میں چپ چاپ سانول کو اپنے رخم ادھیڑتے دیکھتا رہا۔ ال کیسٹ میں پاؤلوں نے غلط لکھا ہے۔



نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں  
نہ کسی کے دل کا قرار ہوں  
جو کسی کے کام نہ آ سکا  
وہ ایک مشت غبار ہوں  
پڑے فاتحہ کوئی آئے کیوں  
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں  
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں  
میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

جانے اس قلعے میں کیا بات تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا دل بہت دیر کے لیے ڈوب سا گیا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے بہادر شاہ ظفر نے خاص میرے لیے یہ سطرین کہی ہوں گی۔ خود میری حالت بھی تو دن بدن کسی ایسے مزار جیسے ہی ہوتی جا رہی تھی۔ رات ڈھلتے ہی صحرا کی طرف سے سانول کی بانسری کی آواز فضا کے دوش پر بکھرنے لگی۔ لیکن آج اُس کی تان میں کچھ عجیب ہی کک اور کرب تھا۔ یہ محبت کس قدر قابض اور زور آور ہوتی ہے کہ ہمارے ساز اور ہماری تانیں بھی اُسی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ آج میں سانول کو اس کی اپنی آگ میں جلنے کے لیے تنہا چھوڑنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ یہ گرم جس زدہ رات مجھ کی کسی نئے روپ میں کھلنے والی ہے۔ شاید میرے اندر کہیں یہ خواہش شدید طور پر انگڑائیاں لے رہی تھیں کہ میں کسی بھی طرح ایک بار پھر سینکڑی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ اس بار میں نے پہلے ہی سے خود کو ذہنی طور پر تیار رکھا تھا کہ میں اُسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ میں اندھیرے میں باہر صحرا پر یوں نظریں گاڑا بیٹھا تھا جیسے ابھی یہ سیاہ پردہ چھاڑ کر کوئی معجزہ رونما ہونے والا ہو۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ کئی بار میرا آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہوئیں اور ایک آدھ بار مجھے جھونک بھی آئی، لیکن رات کا کالا پردہ میرا مقدر کی طرح بند ہی رہا۔ صبح سے کچھ پہلے میں تھک کر اندر کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور تب ایک عجیب سی آواز میرے کانوں سے نکل کر آئی۔ شاید اُونٹوں کا کوئی قافلہ صحرا سے گزر رہا تھا۔ ہاں..... یہ قافلہ کی بجتی جرس کی آواز ہی تھی۔ لگتا تھا کہ بہت سے اُونٹوں کے گلے میں بندی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ آواز قریب آنے لگی۔ میں دم بخود سا کھڑا انتظار کرتا رہا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ صحرائیں قافلے صبح اندھیرے سے بھی پہلے روانہ ہوتے تھے، کیوں کہ مسافر شب کو اُٹھتے ہیں..... جو جانا دور ہوتا ہے.....“ لیکن یہ کیا..... قافلے کی آواز اب بالکل قریب آ چکی تھی اور مجھے اب بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بھاگ مزار سے باہر کھلے صحرا میں ایک اُونچے نیلے پر چڑھ گیا۔ دُور دُور تک وہی ازلی ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔

میں اپنی سماعتوں کا کیا کرتا.....؟ میرے کانوں میں اب تک قافلے کا شور گونج رہا تھا اور ان آوازوں کی ہر ایک تفصیل مجھے کسی ریڈیو پر پیش کیے جانے والے کھیل کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ دُور کوئی پھر رو رہا تھا۔ اُونٹوں کے کوہانوں پر رکھا سامان حرکت کی وجہ سے کھڑک رہا تھا۔ کوئی دُور سے ہانکا لگا رہا تھا۔ کچھ لوگ سرگوشیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، اُونٹ خرخرارہے تھے۔ حتیٰ کہ اُن کے ریت پر پڑنے والے اُونٹوں کی دھمک بھی مجھے علیحدہ سنائی دے رہی تھی۔ کچھ پازیبوں کی جھنکار، کچھ شریر بچوں کے ہنسنے اور دوڑنے کی آوازیں اور قافلے کے پھرے داروں کی وقفے وقفے سے سب کو ہوشیار کرنے کے لیے نثارے پر چوٹ کی آواز تیز ہو گئی۔ ریت کا ایک طوفان سا اُٹھا اور میں اُسی نیلے پر کھڑا ریت کا حصہ بن گیا۔ میری آنکھیں ریت کی چھن سے جلنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ قافلہ اس وقت میرے آس پاس، بلکہ میرے اندر سے ہو کر گزر رہا ہے۔ سرگوشیاں تیز ہو گئیں۔ جیسے لوگ مجھ سے فاصلہ کر دائیں بائیں سے گزر رہے ہوں لیکن بری جلتی ہوئی آنکھوں کے پردے پر اب بھی صرف میلوں دُور پھیلتا ہوا دیران صحرائی اپنا عکس بکھیر رہا تھا۔ دُور تک کسی ذی رُوح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یا خدا..... یہ کیا ماجرا تھا؟ یا تو میری سماعتیں ناکارہ ہو کر دُور آوازیں تخلیق کرنے لگی تھیں یا پھر میری بصارت نے ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کیا میری دیوانگی آخری دور شروع ہو چکا تھا۔ قافلہ جانے کب کا گزر چکا تھا۔ ریت کا طوفان ختم کیا تھا۔ لیکن میرے اندر اُٹھا دفان کی ریت کے جلنے بگولے کی طرح تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں کون تھا، یہاں کیا کر رہا تھا.....؟ برے ساتھ ہی یہ ساری ان ہونیاں کیوں ہوتی تھیں۔ کیا واقعی میرا رخو سے جنوں کا سفر مکمل ہونے کو تھا۔ خرا کیا حد تھی میرے اس سفر کی۔ میری وحشت کا اختتام کہاں تھا۔ میں دوسرے عام لوگوں کی طرح اپنی محبت کو نئے کے بعد اس کے ساتھ اپنی باقی زندگی آرام اور سکون سے کسی گھر کے آگن میں کیوں نہیں گزار سکتا تھا۔ ہر اکی رُوح نے تو کب سے اپنی سپردگی کا اختیار مجھے دے دیا تھا، پھر بھی میں ان دیرانیوں کی خاک کیوں مان رہا تھا۔ میں جانے کتنی دیر اس نیلے پر کھڑا ریت میں گھلتا رہا اور مجھے اس بات کی خبر بھی نہیں ہوئی کہ نئے کب سے تہجد کے لیے جاگے سلطان بابا مزار کے محن میں نکلے اور مجھے یوں گم سم کھڑا دیکھتے رہے۔ میں ب چونکا، جب انہوں نے میرے کا ندھے پر ہاتھ رکھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرے اندر کا آتش فشاں پھٹ ا۔ میں نے وہ سارے سوال، جو کچھ دیر پہلے میرا اندر کاٹ رہے تھے، اُن کے سامنے اُگل دیئے اور قافلے کا راجہ احوال بھی بیان کر دیا۔ میرے سوال سن کر سلطان بابا بہت دیر تک خاموش رہے۔ لیکن انہیں اس بات کا ساں ہو گیا تھا کہ اب کچھ جواب ناگزیر ہو چکے ہیں۔ بہت دیر بعد وہ بولے تو اُن کا لہجہ تھا ہوا سا تھا۔ ”میں تم کو کس دور سے گزر رہا ہوں۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ کچھ رستے اور منزلیں صرف کچھ خاص لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔ قدرت نے تمہارے لیے عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی راہ چنی ہے، تو ضرور تم میں کچھ خاص ہو۔ لیکن قصر سلطانی کے گنبد کو چھوڑ کر ہمارے کی چوٹی پر بسیرا کرنے کے لیے اپنی اُڑان بھی اُونچی رکھنی پڑتی

خج انسانی خدو خال کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ سیکنہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے.....؟“

”ہاں..... ہو بھی سکتا ہے کہ یہ وہی سیکنہ ہو۔ لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو کہ ٹھیک اسی وقت تمہارے اچھ سانول بھی تھا، جسے وہ دکھائی نہیں دی۔ خود میں ریلوے اسٹیشن پر اُس کی جھلک سے چوک گیا تھا۔ اگر سارے معاملے سے پھولوں والی وہ خاص چادر نکال دی جاتی تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کسی عام صحرائی لڑکی کا بلا ہو، جو صحرا میں بھٹک رہی ہے۔ لیکن اطمینان رکھو جلد یا بدیر تم اس ہولے کی حقیقت تک بھی پہنچ جاؤ گے۔

رہے، ایک بار تم نے خود ہی ایک مفروضے کا ذکر کیا تھا۔ اگر خلا میں ماضی کی لہر زندہ رہ سکتی ہے تو پھر ماضی کی دیر کی جھلک کیوں نہیں؟ ہو سکتا ہے جو تمہیں نظر آ رہا ہو، وہ بھی اس حال کی نہیں بلکہ ماضی کی کسی تصویر کی لک ہو۔ اور قدرت نے ہی تمہاری سماعت کی طرح تمہاری بصارت کے پردے کو بھی چند لمحوں کے لیے یہ تانت عطا کی ہو کہ تم نے اس صحرا کے ماضی کی کوئی جھلک اس لڑکی کی تصویر کی صورت دیکھ لی ہو۔ یہاں کچھ بھی ن نہیں کہ اس قدرت کے کارخانے میں ”جب جو جو ہوتا ہے..... جب تب سو سو ہوتا ہے.....“ سلطان بابا ابات ختم کر کے اندر پلٹ گئے اور میں اپنی مخصوص جگہ گم سم سا کھڑا رہ گیا۔ میرا سارا وجود ایک ارتعاش سے پر رہا تھا اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ سوال تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے اور جواب تھے کہ مستقل ن بجائے جاتے تھے۔

اچانک صحرا کی جانب سے ایک تیز نسوانی چیخ نے میرے سارے خیالات بکھیر دیے۔ میں گھبرا کر چیخ دوسری مرتبہ بلند ہوئی۔ سامنے مزار کے صحن میں نماز پڑھتے سلطان بابا بھی سلام پھیر کر چوٹے تو مجھے اسانگا۔ مطلب یہ صرف میرا واہمہ نہیں تھا۔ آواز سلطان بابا نے بھی سنی تھی۔ تیسری چیخ نے مجھے جگہ کا تعین کرنے کے بارے میں ہر شک سے آزاد کر دیا۔ آواز اُسی جانب سے بلند ہو رہی تھی، جہاں سانول رات بھر رہا نری بجایا کرتا تھا۔ میں بے تحاشا اُس جانب دوڑ پڑا۔ صحرا کی ریت میں میرے پاؤں دھسنے جا رہے۔ دُور سے میں نے اس اُونچے نیلے پرفر کے جھٹپٹے میں کسی عورت کا بیولا دیکھا، جو مسلسل نیچے کی طرف لڑچر رہی تھی اور اپنی مخصوص زبان میں کسی مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ نیلے کو دیکھتے ہی میری سانس رکنے۔ یہ وہی ٹیلا تھا جہاں سانول گزشتہ رات بانسری بجا رہا تھا۔

ہے۔ جان جو حکم میں ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ یاد رہے ابھی تمہیں ایسے مزید عذاب جھیلنے ہوں گے۔“ میں دو چلا اٹھا۔ ”لیکن میں ہی کیوں.....؟“ وہ مسکرائے۔ ”میں نے کہا تھا..... کچھ چنناؤ قدرت صرف اپنے میں رکھتی ہے۔ اس نے تمہیں کیوں چنا۔ اس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن فیصلہ تو ار تمہارے اپنے ہاتھ ہے۔ تم چاہو تو ابھی اسی لمحے یہ سب ترک کر کے واپس پلٹ سکتے ہو۔ تم پر کوئی جبر تم سے پہلے بھی جانے کتنے پلٹے ہوں گے۔ تم تو پھر بھی اس سفر میں بہت دُور تک چلے آئے ہو۔ کوئی ابا ہیں جو قدرت کی طرف سے واضح اشارہ ملنے اور چنے جانے کے باوجود پہلا قدم تک نہیں اٹھا سکے اور کی بھیڑ میں گم ہو کر رہ گئے۔ یہ تمہاری ہی ہمت تھی کہ تم اس راہ کا ہر کانٹا چھتے ہوئے آج اس مقام تک ہو۔ اتنا زور ابھی ایک زندگی کے لیے کافی ہے۔ جانا چاہو تو سلطان تمہیں خوشی سے رخصت کرے گا۔ نے بے بسی سے سرچٹا۔ ”آپ جانتے ہیں۔ واپسی میرے بس میں نہیں ہے۔ نہ ہی میری ایسی کوئی خ ہے۔ لیکن میں خود کو اس بوجھ سے ٹوٹا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اتنا ظرف نہیں ہے مجھ میں، جس کی توقع ق کئے بیٹھی ہے۔“ انہوں نے میرا کندھا دیا۔ ”اپنے ظرف کے پیمانے کا حساب خود نہیں کیا جاتا۔ آزمانے والے پر چھوڑ دو۔“ میں نے تھک کر ہتھیرا ڈال دیے۔ ”لیکن یہ بھرے پرے قافلے کی صدا کیا ماجرا تھا.....؟“ سلطان بابا نے گہرا سانس لیا۔ ”صحرا کا اپنا فوں اور اپنا ہی جادو ہوتا ہے، البتہ ہو سکا کہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے واقعی کوئی قافلہ گزرا ہو۔ جب سے انسانی بستیاں بے تحاشا بڑھنے لگی ایسے صحرا اور دیرانے ہی جنات اور دوسری مخلوقات کی آماج گاہ بنی گئیں۔ ہماری بصارت کا پردہ کسی سے روشنی کی لہر ٹکرانے کا محتاج ہے، لیکن اگر دوسری مخلوق کثیف نہ ہو، بلکہ لطیف ہو، یعنی ایسے مادے سے کہ جس کے اندر سے روشنی بنا ٹکرانے گزر جائے تو ہماری آنکھ کے پردے پر اس شے کی تصویر نہیں بن گی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تمہارا واسطہ بھی کسی ایسی مخلوق کے قافلے سے پڑا تھا۔ عام حالات میں ہم انسانو سماعت بھی ان کی آواز کی لہروں کو پکڑ نہیں سکتی، لیکن تم نے اُن کی دنیا کی آوازیں سنیں ہیں تو اس کا ما ہے خاص اس لمحے میں قدرت نے تمہاری سماعت کا پردہ اتنا حساس کر دیا تھا کہ تم نے اُن غیر مرئی صدا بھی سن لیا۔ دھیان رہے کہ یہ سارا معاملہ فریکوئنسی کا ہے۔ ہماری بصارت اور سماعت کی فریکوئنسی اُن کی د فریکوئنسی سے جدا ہے۔ لہذا ہم انہیں عام حالات میں دیکھ یا سن نہیں سکتے۔ ہاں البتہ کچھ خاص لوگ ارتعاش تک بھی پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے لیے وہ خاص فریکوئنسی پکڑنا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ میری د کہ دو جہانوں کا مالک تمہیں اپنے خاص بندوں میں ہمیشہ کے لیے شامل کر دے۔“

میں حیرت سے سلطان بابا کی بات سنتا رہا اور اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی سی لپکی۔ ”اگر تصویر ہ ہماری بصارت کے پردے پر روشنی کی لہر کے کسی کثیف مادے سے ٹکرانے ہی سے ہے تو پھر اس کا مطلب کہ سیکنہ کا وجود بھی اسی صحرا میں کہیں موجود ہے۔ کیوں کہ میں نے اُس کی واضح تصویر دیکھی ہے۔ دھندلی

## دشمن زندہ رہے

پر بیٹھا بانسری کی تانوں سے کھیل رہا تھا کہ اچانک ہی اندھیرے سے چار نقاب پوش سائے اُس کی جانب لپکے اور پھر کھینچا تانی کے دوران کوئی کند فولا دی چیز اُس کے سر سے ٹکرائی جس کے بعد سانول اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ ان نقاب پوشوں کی ٹکرار سے صرف اتنا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سانول کو کال گڑھ میں مزید ایک لمحہ بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ بہر حال اس وقت تو سانول کا ہوش میں آ جانا ہی اُس کے پیاروں کے لیے غنیمت تھا۔ سانول کی دیگر گوں حالت اس بات کا اشارہ تھی کہ اُسے فی الحال بستر سے اٹھنے میں چند دن مزید لگیں گے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ سانول زیادہ دن تک خود کو پابند نہیں رکھ پائے گا۔ شام کو جب میں مزار واپسی کے لیے اٹھنے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے کچھ دیر مزید رکنے کا اشارہ کیا۔ عبادت کے لیے آئے ہوئے چند دیہاتی جب کمرے سے باہر نکل گئے تو اُس نے دھیرے سے پوچھا ”وہ اُنھی تھی.....؟“ مجھے اُس کی حالت سے زیادہ اُس کے سوال پر ہنسی آ گئی۔ ”کہیں اُسے بلانے کے لیے خود ہی تو اپنا سر نہیں پھوڑ ڈالا؟“ میری بات سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔ ”اُسے بلوانے کے لیے تو یہ سر کا ندھوں سے اُتار کر نیچے بھی رکھ سکتا ہوں۔“ پھر اُس نے صحرائی زبان میں ایک مصرعہ پڑھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے سانول کی طرف دیکھا تو اس نے لمبی سی آہ بھرتے ہوئے مجھے ترجمہ سنایا کہ ”عاشق چاہے جیسا بھی درد اٹھالے۔ کتنی ہی گہری چوٹ کیوں نہ کھالے، دنیا والے اُس کے زخموں کو ایک ڈھونگ ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی عاشق جسم پر زخموں کے داغ سجاتا ہی رہتا ہے۔ تاکہ جب کبھی محبوب سے ملاقات ہو تو اس سے داد پاسکے۔“ میں حیرت سے سانول کی زبانی اس صحرائی قلعے کا ترجمہ سنتا رہا۔ کچھ چیزیں اس پوری کائنات میں کس قدر یکساں ہوتی ہیں۔ ہوا، پانی، دھوپ، بارش اور یہ محبت کا جذبہ..... صرف لفظ اور لہجہ ہی رہتا ہے۔ باقی ہر کک ایک سی ہی رہتی ہے۔ کائنات کے ہر ذرے کی طرح محبت بھی شاید وحدت ہی کی قائل ہوتی ہے۔ درد، تڑپ، جھپٹ اور کک کی وحدت۔ رُوح کو آری سے دھوون میں چیر دینے کی یکسانیت، قطرہ طرہ کر کے جان نکالنے کی مماثلت۔ جانے ہم نے دنیا کی ہر اذیت اور درد دینے والی چیزوں کے اتنے مختلف مول کیوں رکھ ڈالے ہیں۔ ہم ایسی سب ہی اذیتوں کا ایک ہی نام ”محبت“ کیوں نہیں رکھ دیتے؟

سانول بھی اس وقت اپنے سر کے زخم اور گھائل وجود کے درد سے زیادہ عشق کے زہریلے ڈنک کے اثر سے تڑپ رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اس کے زندگی کی طرف لوٹنے میں نوری کی منت ہی کا سب سے زیادہ لہجہ ہے۔ گزشتہ تین دنوں سے وہ اپنی ماں سمیت کسی نہ کسی بہانے سے سانول کے کمرے کے آس پاس ہی ٹپکتی رہی ہے۔ اگرچہ مردوں کی موجودگی کے سبب وہ سانول کے اتنے قریب نہ آ سکی، لیکن میں نے ہر لمحہ اُس کے لیے چھین آنکھوں اور بے تاب رُوح کو سانول کے سر ہانے ہی موجود پایا۔ شاید اب بھی یہیں قریب کسی بار سے پرے اپنے من کے ہاتھ اپنے مالک کے سامنے پھیلائے بیٹھی ہو۔ سانول دم بخود سمیری بات سنتا نہ اس کا محبوب اس قدر قریب موجود تھا، یہ سن کر اُس کی حالت مزید ہیچانی سی ہو گئی۔ دیواروں سے پار

کچھ لمحے کے لیے تو جیسے میرے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ جب تک میں دوڑ کر ٹیلے تک پہنچا، اگر عمر کی چوڑاھن کے ہاتھوں کے اشارے مجھے کچھ آچکے تھے۔ ٹیلے کی پرلی جانب سانول بے سدھ پڑا تو اس کے سر سے بہتا ہوا خون نہ جانے کب سے جم کر ریت کو سیراب کر رہا تھا۔ سلطان بابا بھی شاید میرے ہی صحرا کی جانب لپکے تھے۔ جس وقت میں سانول کی سانسیں ٹول رہا تھا، تب تک وہ بھی وہاں پہنچ چکے۔ زندگی اگر صرف سانس لینے کا نام ہے تو سانول ابھی زندہ تھا، لیکن اس کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔ جب اور سلطان بابا اُسے لے کر بستی پہنچے تو سب سے پہلے بستی کے مضافات میں بکریوں کا دودھ دوہتے، اُس گوالے کی نظر ہم پر پڑی، جسے میں پہلے بھی ریچھ کے مقابلے کے دوران جروت کے قلعے میں دیکھ چکا تو پھر چند لمحوں ہی میں پورا کال گڑھ سانول کے کچے آنگن میں جمع ہو چکا تھا۔ بستی کے واحد طبیب نے نو، سانول کا زخم دھو کر مرہم پٹی تو کر دی اور کچھ دوائیں بھی اس کے حلق سے نیچے اُنڈیل دیں، لیکن فی ا سانول بے ہوش ہی تھا۔ بڑی مشکل سے سانول کے باپ، مجید مستری اور طبیب کی درخواست پر لوگوں نے جھک جھکا۔ سانول کو ہم نے آنگن سے اندر کمرے میں پہنچایا ہی تھا کہ اکرام اللہ صاحب اور اُن کے پیچھے کا باپ ہڑبڑاتے ہوئے سے سانول کے گھر داخل ہوئے۔ وہی چند روایتی سوال ”کیا ہوا؟..... کیسے ہوا۔ کس نے کیا.....؟“ اور وہی ایک جواب کہ ”اللہ جانے.....؟“ کچھ ہی دیر میں نوری بھی چند دوسری عورتوں اور اپنی ماں سمیت صحن میں داخل ہوئی اور تیزی سے عورتوں والے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ پریشانی سانول کے باپ کو سلام کرتا بھی بھول گئی تھی اور پھر برآمدے کے قریب ماں کے کہنی مارنے پر چونکی تو وہ صحن میں بیٹھے مجید کو سلام کر کے اندر پلٹ گئی۔ سچ ہے کہ محبت آداب بھلا دیتی ہے۔ طبیب اپنا کام کر جا چکا تھا اور اُس کے بقول اب سانول کو دوا کے ساتھ دعا کی بھی اتنی ہی ضرورت تھی۔ سانول کی دعا تو نوری اور نوری خود سراپا دعائی اُسی کے گھر کے آنگن میں ماتھا ٹیکے سجدے میں پڑی تھی۔ پھر بھی قدرت کو رحم آتے تین راتیں بیت گئیں۔ سانول کی طویل بے ہوشی تیسری فجر سے کچھ پہلے ٹوٹی۔ اس اثناء میں، سلطان بابا باری باری مزار سے ہو کر آتے رہے۔ اس وقت اتفاق سے میں ہی سانول کے سر ہانے موجود تھا۔ جب اُس نے دھیرے دھیرے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ نوری کی دعا آخر کار فلک میں چھیا ہوئی مقام قبولیت سے جا ٹکرائی تھی۔ سانول کو صرف اتنا یاد تھا کہ وہ اُس رات بھی حسب معمول اپنی مخصوص

بول پڑے۔ ”چلو میاں! تمہارے دوست کی عیادت کو ہو آئیں۔ اسی بہانے وہاں اکرام صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ زیادہ تر سلطان بابا کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہمہ وقت مزار پر موجود رہے اور ویسے بھی وہ زیادہ تر بستی کی جانب جانے سے گریز ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن آج نہ جانے ایسی کیا خاص بات تھی کہ انہوں نے خود ہی سانول کے گھر چلنے کی فرمائش کر دی۔

ہم سانول کے گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو کافی بھیڑ تھی۔ پتا چلا کہ سانول کے باپ نے اُس کے ہوش میں آنے کی خوشی میں شکرانے کے طور پر نیاز بانٹنے کا ارادہ کیا ہے اور اسی لیے بستی کے سب ہی مرد وہاں چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ”بڑے اور چھوٹے پیر صاحب“ کو بیک وقت اپنے درمیان پایا تو سب ہی خوش ہو گئے۔ کال گڑھ کی واحد جامع مسجد کے مولوی صاحب بھی کچھ دیر میں آ پہنچے۔ نیاز کے چاول ابھی دم پر تھے درختے میں کچھ دیر باقی تھی کہ بستی کے چند بزرگوں میں کال گڑھ کے سدا کے کال اور سوکھے کی بات چل پڑی۔ کسی جانب سے ایک بوڑھے نے تشویش زدہ انداز میں سب کی توجہ اس جانب دلائی کہ بستی کے اُس اِس قریبی جوہڑ اور تالاب تو تین سال پہلے ہی خشک ہو چکے تھے، لیکن اب دُور دراز کے پانی کے ذخیرے بھی میرے دھیرے خالی ہوتے جا رہے ہیں اور اگر چند ایک دن میں علاقے میں بارش نہ ہوئی تو کال گڑھ میں بیٹے کے پانی کا شدید بحران پیدا ہو جائے گا۔ بوڑھے کی بات سن کر محفل میں کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا در پھر سب ہی اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ قلعہ داروں کی منت کر کے ان سے مزید کچھ رخص لیا جائے اور ایک آخری کوشش کے طور پر مشرقی سمت جہاں پانی ملنے کی کچھ امید ہے، وہاں پھر سے لنواں کھود کر پانی تلاش کیا جائے۔ لیکن اکثریت نے اس مشورے کو یک سرہ رد کر دیا۔ ایسی بارہا کوششیں پہلے ناکام ہو چکی ہیں اور قرض کا بوجھ پہلے ہی اتنا بڑھ چکا ہے کہ مزید ایسی کوئی سعی لا حاصل، صرف وقت کے بیاں ہی کا باعث ہوگی۔ اچانک کوئی کسی کو نے سے بولا ”تو پھر بڑے پیر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بارش کی دعا کریں۔ اب اور کوئی چارہ نہیں۔“ اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ سب ہی جانب سے سلطان بابا کے سامنے فریاد پیش کی جانے لگی۔ ایک شور مچ گیا۔ مولوی صاحب نے بھی بارش کے لیے دعا کی خواست دائر کر دی۔ سلطان بابا نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کروایا اور دھیمے لہجے میں بولے ”اگر آپ سب یہی مشورہ ہے تو پھر دعا بھی ہم سب اجتماعی طور پر ہی کریں گے۔ آج عصر کی نماز کے بعد بڑے میدان میں رکی بستی کے مرد نماز استسقاء کے لیے جمع ہو جائیں۔ ہم سب پیش امام صاحب کی معیت میں باجماعت نماز کر کے اللہ کے حضور اپنی درخواست پیش کریں گے۔“ سلطان بابا کی بات سن کر نوجوان طبقے نے تو زور و شور اُن کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن بزرگ کچھ خاموش ہی رہے۔ میں نے پاس بیٹھے اکرام صاحب سے آہستہ اُن کا خاموشی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواباً میرے کان میں جو سرگوشی کی۔ اس سے میں صرف اتنا ہی لمبہ اخذ کر سکا کہ جبروت کے علم میں لائے بنا بستی کے باہر ایسا کوئی بھی عوامی جھگڑا اس کی ناراضی کا سبب

جھاکنے کی اتنی شدید خواہش اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کی آنکھوں سے جھلکتی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن دیوار کا دوسرا نام ہی زکاوٹ، پابندی ہے اور ہم انسان خود ہی تو ایسی کئی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ اپنے لیے، نہ جذبول کے لیے۔۔۔۔۔

سانول کے گھر سے مزار کی جانب لوٹتے ہوئے جانے کیوں مجھے سیکڑے کو اٹھالے جانے والے چار نقارہ پوش یاد آتے رہے۔ ان میں اور سانول پر حملہ کرنے والے نقاب پوشوں میں کوئی ایسی مماثلت تھی جو میرے ذہن کی کنڈی ہلاتی رہی۔ کہیں وہ سانول کو بھی سیکڑے کے معاملے میں میری رہنمائی کرنے کی سزا دینے تو نہیں آئے تھے۔ یہ کیسا معرہ تھا، جو سلجھنے ہی میں نہ آتا تھا۔ مزار کے صحن میں سلطان بابا تسبیح پڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد فراغت پائی تو کہنے لگے ”تمہارا دوست آیا تھا۔ میں نے اُسے روٹی ڈال دی تھی، لیکن شاید اُسے تمہارا عادت پڑ گئی ہے۔ ناراض ہو کر پلٹ گیا۔“ وہ شاید کالے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے انہیں سانول پر حملہ کرنے والوں کے بارے میں اپنے خدشے سے آگاہ کیا تو بولے ”ہاں۔۔۔۔۔ ایسا ممکن ہے۔۔۔۔۔ سانول کو ہم اب احتیاط کرنی چاہیے۔ تقدیر شاید پھر بھی ایک موقع اور دے دیتی ہے، لیکن سچا دشمن کبھی نہیں۔“ میں نے اُس عجیب اصطلاح پر انہیں حیرت سے دیکھا۔ ”کیا دشمنی بھی خالص اور ناخالص کے پیمانے پر تو لی جاتی ہے۔ اُ دشمن کبھی کبھی سچا یا جھوٹا ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے دوسری تسبیح ختم کر کے مجھ پر پھونک ماری۔ ”سچائی اور خالص پن کی جتنی ضرورت دشمنی کے جذبے میں ہوتی ہے اتنی تو شاید یہ دوستی میں بھی نہ ہوتی ہو۔ دشمن خالص اور معیار ہی نہ ہو تو اعلیٰ ظرف حریف کے لیے مقابلہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ قدیم منگول نسل کے کچھ لوگ شاید آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہیں، جو دشمنی اور انتقام کو ایک اعلیٰ جذبہ سمجھتے ہیں اور دشمن ان کے لیے جینے آگے بڑھنے کی تحریک کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لیے ان کا ایک قول ان میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ سلطان بابا کسی آہٹ کی آواز سن کر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو کر باہر صحرا کی جانب متوجہ ہو گئے میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی ”کون سا قول۔۔۔۔۔؟“ سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا اور تو دہرایا ”دشمن زندہ رہے۔“ وہ اپنی بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں یونہی سا کت سا بیٹھا رہ گیا برآمدے کے قریب رک کر وہ میری جانب چلے۔ ”لیکن یاد رہے۔۔۔۔۔ یہاں اس بستی میں ہمارا واسطہ شاید اعلیٰ ظرف دشمن سے نہ پڑے، لہذا اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔“ سلطان بابا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور ہم ہمیشہ کی طرح اُن کے الفاظ کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا۔ میں آج تک محبت ہی کو طاقت و ترین انسان جذبول میں شمار کرتا تھا لیکن آج میرے اندر کئی دروازے مزید کھل گئے تھے۔ واقعی، کتنی بڑی بات کہہ رہے تھے، سلطان بابا۔ ”دشمن زندہ رہے۔“ جانے یہ قول دعا تھا یا بدوعا۔ حسرت تھی یا نفرت کی انتہا۔ میں سا رات کالے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ واپس نہیں پلٹا۔ صبح کچھ دیر کے لیے آنکھ لگی تو بھی نیند میں بے چینی تھی ہمیشہ کی طرح کسی اُن ہونی کا خوف مجھ پر طاری ہونے لگا تھا۔ صبح نہ جانے سلطان بابا کو کیا سوچھی کہ خود



سے اٹھ بیٹھا۔ صحرا میں بادل، کتنا عجیب تضاد! میز لیکن خوش گوار تجربہ تھا۔ سلطان بابا بھی صحن میں نکل آئے۔ میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ کو اس قدر یقین کیسے تھا۔ مجھے تو جو نعمت میری دسترس میں، میرے سامنے موجود ہوتی ہے، اُس کے پانے کا بھی کامل یقین نہیں ہوتا اور آپ ایک اُن ہوتی پر بھی اس قدر اعتبار کیسے جمع کیے رکھتے ہیں۔“ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا ”سارا اکیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں..... اور یقین جانو کہ تم اس کامل یقین کے بہت آس پاس ہو۔ بس ثابت قدمی ہی آخری شرط ہے۔“ سلطان بابا کی بات ختم ہوتے ہی پہلی بوند نے میری پیشانی چوم کر سلامی دی اور پھر چند ہی لمحوں میں وہ جل تھل ہوئی کہ کال گڑھ کی برسوں سے پیاسی اور سوکھی زمین کے ساتھ ساتھ میرا اندر بھی پوری طرح ڈھل گیا۔ کچھ بارشیں ہمارے اندر بھی برستی ہیں۔ کال گڑھ کے لوگوں کو خوشی سے چلاتے اور اچھلتے کودتے دیکھ کر میرے من میں بھی بوندوں کا جلت رنگ بننے لگا۔ کال گڑھ کی بارش صرف بیس منٹ کے لیے تھی، لیکن میرے اندر کا سادہ بہت دیر تک برستا رہا۔ کچھ ہی دیر میں بستی کے تمام لوگ مزار کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ وہ سلطان بابا کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے آئے تھے کہ اُن کی دعا سے کال گڑھ کے نصیب کی بدلی آج کھل کر برسی تھی، لیکن سلطان بابا نے مسکراتے ہوئے بات انہیں پر اُلٹ دی کہ ”میں نے اللہ سے صرف اتنی دعا کی تھی کہ کال گڑھ میں جو بھی تجھے سب سے زیادہ عزیز ہے، اُس کے صدقے بارش بھیج دے۔ اب تو یہ تم ہی سب ل کر کھو جو کہ تم میں سے اللہ کا وہ سب سے پیارا کون ہے؟“ یہاں بستی میں سب ہی کے من کی کلی کھل رہی تھی، مگر کوئی ایسا بھی تھا جو قدرت کو اپنی سلطنت میں دخل اندازی کرتے دیکھ کر تھلا رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے اُسی روز احساس ہو گیا تھا کہ جبروت کبھی سلطان بابا کے لیے لوگوں کی آنکھوں کی یہ محبت اور عقیدت برداشت نہیں کر پائے گا اور اسی خدشے کا اظہار اسی شام سانول نے بھی کر دیا جب میں اُس سے ملنے اُس کے گھر پہنچا تو مغرب کا وقت ڈھل چکا تھا، گھر میں چہل پہل بھی کم تھی۔ سانول نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے سر ہانے بٹھالیا۔ اُس کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی اور زخم بھی بھر رہا تھا، لیکن اُس کے باپ نے اُسے اپنی قسم دے رکھی تھی کہ اب وہ تنہا صحرا میں بانسری بجانے کبھی نہیں جائے گا۔ سانول اس بات پر بھی کافی جھنجھلا ہوا تھا لیکن فی الحال اُس کی پریشانی کی وجہ کچھ اور تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ جس دن سے اُس پر حملہ ہوا ہے بستی کا بوڑھا کھوجی بھی اپنے گھر سے غائب ہے۔ اُس کے گھر کو بھی تالا لگا ہوا ہے اور بستی میں کوئی نہیں جانتا کہ کھوجی کہاں چلا گیا ہے۔ میں بھی چونکا تب ہی وہ بوڑھا اتنے دنوں سے مجھے بھی دکھائی نہیں دیا تھا نہ ہی وہ سانول کی مزاح پر سی کے لیے اُس کے گھر آیا تھا۔ مطلب میرا شک ٹھیک تھا کہ اُن نقاب پوشوں کا تعلق ضرور سیکنے کے انخوا سے بھی رہا ہوگا۔ سانول نے میرے خدشات دو چند کر دیے تھے۔ لیکن میں اُسے اپنی پریشانی بتا کر مزید الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں گھنٹہ بھر کال کے پاس بیٹھنے کے بعد اٹھنے لگا تو سانول نے اصرار کیا کہ کھانا کھا کر جاؤں۔ آج نوری کے گھر سے اُس کے لیے خاص طور پر گڑ کے چاول بن کر آئے تھے۔ میں نے مسکرا کر اُسے چھیڑا کہ تب ہی آج وہ باتیں بھی گڑ

بن سکتا ہے، لہذا بزرگ یہی چاہتے ہوں گے کہ قلعے داروں کو بھی باقاعدہ دعا میں شرکت کی دعوت دی جائے تب تک سلطان بابا مجھے وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کر چکے تھے اور یہ طے پایا تھا کہ بستی کے تمام مرد و عورتوں کے وہاں ہر والے بڑے میدان میں جمع ہو جائیں گے۔ ہم محفل کو کھینچ کر طرح بھینھتے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے چھوڑ کر وہاں سے نکل آئے۔ جانے ان میں سے کوئی بعد میں جبروت سے باقاعدہ اجازت لینے یا میں شرکت کرنے کی درخواست لے کر قلعے کی جانب گیا یا نہیں۔ ہم بہر حال عصر سے کچھ پہلے بستی۔ مضافاتی میدان میں پہنچے تو دعا کے لیے اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔ مجھے اُسی دن راستے میں سلطان بابا۔ بارش کے لیے خصوصی طور پر مانگی جانے والی دعا اور نماز استسقاء کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ شاید یہی واحد اور منفرد التجا ہے، جو سیدھی ہتھیلیوں کے بجائے ہاتھ کی پشت آسمان کی جانب بلند کر کے دعا کی صورت میں کی جاتی ہے۔ میرے لیے یہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ بستی کے لوگوں، بشمول امام مسجد نے سلطان بابا سے بار در خواست کی کہ وہ جماعت کی امامت کریں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ یہ بستی کی جامعہ کے امام کا حق ہے۔ بلا خرا امام صاحب ہی امامت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلام کے بعد سب نے ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کر کے دعا مانگی اور مولوی صاحب نے اپنی چادر پلٹ دی۔ دعا کے بعد نمازی رخصت ہونے لگے، تب اچانک میری نظر بے ساختہ دھوپ کا قہر برساتے آسمان کی جانب اٹھ گئی۔ سورج اب اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دُور دُور تک کسی بدلی تو کیا کسی مٹی یا ریت کے گبولے کے آگے بھی نمایاں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سلطان بابا کے چہرے پر کوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کی۔ وہاں حسب معمول صرف سکون کا ڈیرہ تھا۔ وہ تو دعا مانگنے کے بعد اس طرح بے فکر اور لا پرواہ ہو گئے تھے، خدا ان کی ہر دعا سن ہی تو لے گا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوند سا لپکا۔ کہیں یہ اٹل یقین ہی تو کسی دعا قبولیت کا اصل کلیہ نہیں۔ کہیں ہماری دعائیں اسی لیے تو رد نہیں ہو جاتیں کہ ہم اندر سے بے یقین اور بلا ہوتے ہیں۔ ہم جس سے مانگ رہے ہوتے ہیں، خود اسی کی سخاوت اور خزانے پر ہمارا اعتماد متزلزل ہوتا ہے پھر دعا قبول نہ ہونے کا شکوہ کیسا۔ یہ تو اعتبار اور توکل کا سودا ہے اور سچ ہی تو ہے کہ انسان ہی سدا کا خسار میں ہے۔

رات کو بھی کئی بار میں نے اٹھ کر آسمان کو دیکھا۔ میرے اندر کا تول مول کرنے والا سوداگر آج یقین اور بے یقینی کے پلڑے دلیل اور جواز کے پتھروں سے برابر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آدمی رات قریب جب مجھے پہلی چمکی آئی تب تک آسمان بالکل صاف تھا۔ ایمان اور بے یقینی کی جنگ میں سوداگر شک کی جیت ہوئی اور میں تھک کر سو گیا۔ لیکن صبح بہت سے بچوں کے شور سے میری آنکھ اچانک کھلی تو نظر سیدھی آسمان پر پڑی۔ سارا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بستی کے سارے بچے کاغذ اور پلاسٹک چٹائیاں، لمبی لمبی ڈوروں سے باندھے صحرا میں چلتی تیز ہوا کے دوش پر اڑائے پھر رہے تھے۔ میں ایک

نولے میں سے تو نہیں تھے لیکن ان کے تئیر بھی اس وقت کچھ دیسے ہی تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ بچپن سے میرے اندر چھپا کتوں کا خوف ایک دم ہی میرے سارے وجود پر طاری ہو گیا ہے اور میں ٹھیک اُسی طرح اپنی جگہ جمجھد ہو گیا، جیسے بچپن میں کسی کتے کے غرانے پر اپنے پیروں سے جان نکل جانے پر ہو جاتا تھا۔ کتوں نے رقد بھرنے کے لیے اپنے جسم کو تولا، میری رگوں میں بہتے گرم خون نے پل بھر میں ہی میرے سر سے لڑکر میرے پاؤں کے تلوؤں تک کا دوران یہ طے کر لیا اور تب اچانک ہی کسی طرف سے کالا دوڑتا ہوا آیا اور میرے پاؤں کے قریب آ کر لوٹنے لگا۔ میں ابھی تک سکت ہی کھڑا تھا۔ کالے کو یوں میرے پاس قلابازیاں کھاتے دیکھ کر دوسرے دو کتوں کے تنے جڑے بھی کچھ ڈھیلے ہو گئے۔ شاید کالے نے صحرا میں بھی اپنا گروہ بنالیا تھا اور باقی دو بھی اُسی کے ساتھی تھے۔ میں نے ایک گہری سی سانس لی اور آگے بڑھ گیا۔ جانے یہ جانور آپس میں کون سی بولی بولتے ہوں گے، کیسے ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہوں گے۔ ان کے لفظ کیسے ہوتے ہوں گے۔ ابھی ابھی کالے نے میری جان کے دشمن بنے ان خوف ناک کتوں کو یہ کیسے سمجھایا ہوگا کہ یہ تو میرا دوست ہے..... تم بھی اسے کچھ نہ کہنا اور کتنی جلدی وہ کالے کی بات مان بھی گئے۔ ہم انسانوں کی طرح کسی کج بخشی یا نکرار میں پڑے بنا، انہوں نے کیسے اپنے دوست کی بات مان لی۔ شاید اس دور کے انسانوں کو بہت سی باتیں ان جانوروں سے سیکھنے کی ضرورت تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سالہکا کہیں یہ لفظ صرف ہم انسانوں ہی کی مجبوری تو نہیں ہوتے۔ رابطے کے کئی اور ذرائع بھی تو ہوتے ہوں گے۔ جیسے ان جانوروں کا آپس میں رابطہ، اور پھر وہ رابطہ، وہ جذبہ اور وہ پیام ہی کیا جسے لفظوں کی یا زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہو؟ تب تو تب ہے جب بنا کچھ کہے ہی وہ ہم سب جان لے۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی کالے کا اپنے ساتھیوں کو بھیجا گیا وہ خاموش پیام تھا۔ شاید یہ لفظ ہم کم طرفوں ہی کی پہچان ہوتے ہیں۔ انہی خیالوں میں گم میں مزار کے سامنے والا بڑا ٹیلا طے کر کے جیسے ہی نیچے اترا تو میرے پاؤں جیسے ریت پر گر کر رہ گئے۔ مزار کے باہر روت کی جیب کھڑی تھی۔ اتنی رات گئے جبروت یہاں کیا لینے آیا تھا.....؟؟

کے شیرے جیسی میٹھی کر رہا ہے۔ ہائے یہ جذبے..... پل میں ہمیں کتنا کڑوا اور دوسرے پل میں کر شیریں کر دیتے ہیں۔ کچھ ایسی الٹ پلٹ چاتے ہیں ہمارے اندر کے ہم خود اپنا اصل بھی بھول جاتے ہیں میں بھی سانول کی آنکھوں سے پھوٹی محبت کی وہ میٹھی آنچ پورے کمرے میں پھیلتی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا سانول کو میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ سلطان بابا مزار پر میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ لہذا میں کل پھر آؤں گا اور نوری کے گھر سے آئے گڑ کے چادل بھی ضرور کھاؤں گا۔ میں سانول کے کمرے سے باہر نکلا تو چ عورتیں لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ ساتھ سانول کی ماں بھی تھی۔ میں جھکا کر سلام کر کے آگے بڑھنے لگا تو سانول کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ”شالا چھوٹا جیوے.....“ کائنات کی ساری مائیں شاید ایک ہی میٹھی سے گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ آنسوؤں، دعاؤں اور خدمت کی میٹھی۔ مجھے ممایا د آگئیں اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں دروازے سے نکل ہی رہا تھا کہ میرا عقب سے ایک سہمی اور ڈری ہوئی سی نازک سی آواز ابھری۔ ”چھوٹے پیر جی.....!!“ میں ٹھٹھک کر ہا اور حیرت زدہ برآمدے کے ستون کی آڑ میں نوری کو اپنا سراپا سمیٹنے ہوئے دیکھا۔ اُس نے بھی علاقے ا ریت کے مطابق لمبا سا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا اور میں اُس کے وجود کی لرزش اتنی دُور سے بھی محسوس کر سکتا تھا باقی عورتیں اندر کی جانب بڑھ چکی تھیں اور اُس وقت صرف ہم دونوں ہی صحن میں موجود تھے۔ اُس نے بچ روک تو لیا تھا، پر خود اُس کا بس چلتا تو اگلے لمحے ہی وہاں سے ہوا ہو جاتی۔ میں نے ہلکے سے کھار کر اُنے متوجہ کیا۔ وہ ہڑبڑاسی گئی۔ ”وہ جی..... چھوٹے پیر جی.....“ آپ اس سے کہیں ناکہ وہ شہر چلا جائے یہاں اس کی جان کو بہت خطرہ ہے۔ آپ کہو گے تو نہ نہیں کرے گا۔ بہت سنتا ہے آپ کی۔“ مجھے نوری ا تشویش کا اندازہ تھا۔ ”آپ اطمینان رکھیں۔ میں سانول سے بات کر دوں گا۔“ میں بات ختم کر کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ عورت کا دامن کچھ یوں بھی سدا ہی سے کورا ہوتا ہے، لیکن ان علاقوں میں تو زور سے چلتی، بھی اسے داغ دار کر دیتی ہے۔ وہ معصوم لڑکی سانول کی محبت میں شاید چند لمحوں کے لیے یہ بھول گئی تھی، لیکن مجھے ریت اور رواج کی حدیں یاد تھیں۔ ساری بستی ہی کو چند دن میں اندازہ ہو گیا تھا کہ سانول کی مجھ سے گاڑی چھنتی ہے اور وہ ضدی لڑکا میری بات کا بہت مان رکھتا ہے۔ یہ اسی مان کا بھروسہ تھا، جس نے نوری آج مجھ سے بات کرنے کا حوصلہ بخشا تھا۔ میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ سانول سے کہوں کہ کچھ عرصے کے یہاں سے دُور چلا جائے۔ دشمن اگر اُن جانا ہو تو وہ دہرا خطرناک ہو جاتا ہے اور ہمیں اس وقت ایسے ہی ک چھپے ہوئے دشمن کا سامنا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم صحرا کے اُونچے ٹیلے پار کرتا ہوا مزار کی جانب بڑھ رہا تھا اچانک مجھے داہنی طرف کے ٹیلے کے پیچھے سے چند غراہٹیں سنائی دیں۔ میں ٹھٹھک کر رُک گیا۔ غراہٹ رُک گئی۔ میں نے کالے کو آواز لگائی۔ لیکن کالا ہوتا تو ایسے چھپتا ہی کیوں۔ میں نے پھر قدم بڑھائے ہی کہ ٹیلے کے پیچھے سے دو خوف ناک قسم کے کتے ایک دم ہی میرے سامنے آ گئے۔ یہ جبروت کے کتوں

مہر سے نکلنے کی ضد شروع کر دی ہے۔ اب بڑے پیر جی ہی اسے کچھ سمجھائیں کہ اپنے بوڑھے باپ کو اس عمر میں اواز نہ کرے اور اس کی بات مان کر شہر چلا جائے۔ سانول نے اپنے باپ کو سلطان بابا کے سامنے فریاد سناتے چھوڑ کر میرا تھ پکڑا اور مزار کی منڈیر کی طرف چلا آیا۔ میں نے سب سے پہلے اُسے جبروت کے رات والے پیغام کی زوداد سنائی جسے سن کر وہ مزید پریشان ہو گیا۔ ”اوہ..... یہ تو بہت فکر کی بات ہے۔ پھر بڑے پیر صاحب نے انہیں کیا جواب دیا۔“ ”وہی جو انہیں دینا چاہیے تھا۔ سلطان بابا جس مقصد سے کال گزھ آئے ہیں اُسے پورا کیے بناوہ یہاں سے کوچ نہیں کریں گے۔“ سانول نے مجھے سے پھر وہی سوال کیا۔ ”لیکن ایسا کیا مقصد ہے اُن کا۔ اس ویران بستی میں ان درندوں سے دشمنی مول لے کر کیا ملے گا انہیں؟“ میں نے لمبی سی سانس لی۔ ”یہ تو وہی جانیں۔ ویسے بھی میں اُن سے زیادہ سوال نہیں کرتا۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اُن ہی کو دے رکھا ہے میں نے۔ لیکن تم اپنے گھر والوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ وہ سب تمہاری بھلائی کے لیے ہی تو کہتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ اسی میں تمہارے اپنوں کی فوٹی ہے۔“ سانول نے تنک کر سر پٹا۔ ”جانتے ہو میں ایک پل کے لیے بھی اُس سے دور نہیں جاسکتا۔ اس کے بنا تو میری بامسری سے بھی سر نہیں نکلتا۔“ ”اور اگر تمہاری ذہن اور تمہارے من کی تان بھی تم سے یہی التجا کرے تب.....؟“ سانول نے چونک کر میری جانب دیکھا ”کیا مطلب؟“ میں نے گزشتہ شام نوری سے ہوئی ساری بات بتادی۔ سانول مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ دل گیر بھی ہو گیا۔ ”وہ بھی یہی چاہتی ہے کہ میں بستی چھوڑ کر چلا جاؤں۔ وہ جس کے لیے میں سارے زمانے سے لڑتا پھرتا ہوں وہ بھی زمانے کے ماتھل گئی ہے۔“ میں نے سانول کو ڈانٹا۔ ”بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ وہ تم سے شدید محبت کرتی ہے۔ تب ہی تمہاری فکر میں گھلتی رہتی ہے۔ اب اور ضد نہ کرو اور پھر تم خود بھی تو یہاں قلعہ داروں کی غلامی سے چڑتے دو۔ تو پھر اپنی نوری کو پانے کے لیے یہ عارضی جدائی تو برداشت کرنی ہی پڑے گی۔“ سوچو وہ بھی تمہاری جدائی ہی اتنی ہی پریشان ہوگی جتنا تم، لیکن وہ بے چاری تو لڑکی ہونے کی وجہ سے کسی سے اپنا درد بھی نہیں کہہ سکتی۔ تم نا کچھ احساس کرو۔“ سانول نے بے بسی سے میری جانب دیکھا۔ آخر کار گھٹنہ بھر کی بحث کے بعد اُس نے تھکا ہوا ڈال دیئے اور میں اُس کا ہاتھ پکڑے اُس کے باپ کے پاس چلا آیا۔ ”آپ کو مبارک ہو۔ سانول نے ہر جانے کی ہامی بھری ہے۔“ سانول کے باپ کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ پہاڑ اتنی آسانی سے سر ہو گیا ہے۔ اُس نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ سلطان بابا مسکرائے ”حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے عبداللہ میاں ایسے کرشمے دکھاتے رہتے ہیں۔ بھی میں تو کہتا ہوں کہ اس کا نام عبداللہ کی جگہ ساحر ہونا چاہیے تھا۔ لگتا تمہارے بیٹے پر بھی اس کا جادو چل گیا ہے۔“ سلطان بابا کی اس شرارت پر مجھ سمیت سانول اور اُس کا باپ بھی مسکرا دیئے۔ مزار سے نکلنے ہوئے سانول نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔ ”لیکن مری بھی ایک شرط ہے۔ میں نوری سے ملاقات کیے بنا یہاں سے نہیں جاؤں گا اور یہ ملاقات کل شام ہی ہو

## دل سے دھواں اُٹھتا ہے

مجھے جبروت کی جب مزار کے باہر کھڑی دیکھ کر جو پہلا جھٹکا لگا تھا میں اُسی کے زیر اثر تقریباً دوڑ۔ ہوئے مزار کے بیرونی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اندر سے جبروت کا خاص کارندہ، اکرم لے لے لے لے لے لے لے اُٹھاتے ہوئے باہر نکلا اور مجھ پر ایک نگاہ غلط ڈالتا ہوا چیپ میں سوار ہو گیا جہاں ڈائیر سمیت ایک دو محافظ پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ جب آگے بڑھ گئی۔ سلطان بابا صحن ہی میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے تسبیح گ رہے تھے۔ میں پھولی ہوئی سانس لے لے اُن کی جانب بڑھا۔ ”یہ لوگ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟“ ”دھکا نہ آئے تھے..... لیکن ڈھکے چھپے لفظوں میں.....“ میں مزید الجھ گیا۔ ”پوری بات بتائیں.....“ سلطان بابا اُٹھ کھڑے ہوئے ”جبروت کا پیغام لائے تھے کہ یہاں اُس کا سکھ چلتا ہے، لہذا آئندہ کوئی اجتماع کرنے سے پہلے اُس سے اجازت ضرور لے لی جائے۔“ میں نے تشویش بھری نظروں سے سلطان کی جانب دیکھا، گویا میرے خدشات ایک ایک کر کے سچ ثابت ہو رہے تھے۔ ”تو آپ نے کیا جواب دیا؟“ وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا کہ ہم فقیر لوگ ہیں۔ ہمارا تو گزرا ہی مانگ کر ہوتا ہے۔“ گویا انہیں سانول کا سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں تھا۔ سلطان بابا کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ٹیل جنگ بچ چکا ہے اور اب جلد یا بہ ہماری جبروت سے حتمی ملاقات ہونے والی ہے۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سلطان بابا کمرے میں آرام کے لیے چلے گئے۔ لیکن میری قسمت میں آر کہاں..... پھر وہی رات، وہی بے خوابی، وہی میری جگہ راتوں کی محفل اور وہی میرے ساتھی تارے۔ کہ ہیں پرانے زمانوں میں کا بن اور جادوگران تاروں کی چال سے حال اور مستقبل کی کروٹ کا اندازہ لگایا کر۔ تھے۔ میں بھی بہت دیر تک ان شرارتی تاروں میں اپنے مقدر کا تار اکھوجتا رہا۔ لیکن وہ مجھے کیسے دکھائی دیتا۔ گردش میں سدا رہتے ہوں انہیں تو فلک بھی اپنے دامن میں جکد نہیں دیتا۔ ایسے ستاروں کا آسمان بھی شاید کہ دوسرا ہی ہوتا ہوگا۔

اگلے روز میں مزار سے باہر سانول کی زور زور سے باتوں کی آواز سے چونکا۔ جلدی سے اُٹھ کر مزار منڈیر سے باہر جھانکا تو سانول اپنے باپ کے ساتھ لڑتا بھگڑتا اور بحث کرتا مزار کی جانب بڑھا چلا آ رہا تھا اُس کے باپ نے صحن میں داخل ہوتے ہی سلطان بابا کو سلام کے بعد اپنا دکھڑا سناٹا شروع کر دیا کہ وہ۔ لڑکے کے ہاتھوں بے حد پریشان ہے۔ ابھی کل ہی اس کی حالت کچھ سنبھلی ہے اور آج ہی سے اس نے دو:

شریر بگولوں کو چھیڑ دیا اور وہ نیند سے جاگ کر صحرا میں ایک دوسرے کے پیچھے لپک کر ”کوکلا چھپا کی“ کھیلنے لگے۔ سانول ریت میں پیر دھنسا تا نوری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نوری سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھ سے ریت کے ایک شریر بگولے نے کہا ”جانتے ہو وہ آپس میں کیا بات کر رہے ہیں؟“ ”ہاں.....“ میں جانتا ہوں۔ سب ہی پھڑنے والوں کی بولی ایک جیسی ہوتی ہے۔ کچھ گلے، کچھ شکوے۔ کچھ دعوے اور کچھ وعدے۔ کبھی نہ پورے ہونے والے وعدے.....“ سانول بھی نوری سے کچھ ایسے ہی وعدے کر رہا تھا۔ جانے مجھے اتنی دُور سے بھی ایسا کیوں محسوس ہوا کہ جیسے نوری رو رہی ہو۔ سانول اُسے تسلیاں دے رہا تھا۔ یہ لڑکیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ پہلے تو خود ہی اپنے سے دُور بیچنے کی جتن کرتی ہیں اور پھر خود ہی جُدائی کا سوچ کر رو پڑتی ہیں۔ اچانک ہی زہرا کی یاد نے میرے وجود کے ہر رُو میں پر اپنا قبضہ جمالیا۔ وہ پورا صحرا جیسے زہرا کی یاد کا اک دریا بن گیا۔ کیا اُسے بھی میری یاد آتی ہوگی۔ کیا وہ بھی نوری کی طرح آنسو بہاتی ہوگی۔ زمانہ چاہے صدیوں ہی پر محیط کیوں نہ ہو۔ محبوب سے ہوئی ملاقات ہمیں ہمیشہ بل بھر کی ہی لگتی ہے۔ سو، نوری اور سانول کی ملاقات کے وہ چند بل بھی پلک جھپکتے ہی بیت گئے۔ نوری اپنی سبیلی کے ساتھ ٹیلے سے اُتر کر سبیتی کی جانب چل پڑی اور جاتے جاتے پلٹ کر ٹیلے پر کھڑے گم سم سے سانول کو دیکھتی رہی، جس کی آنکھ سے ٹپکتے اسے آنسو کی چمک، میں ڈوبتے سورج کی کرنوں میں یہاں اتنی دُور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ خود نوری بھی بار بار پلو سے اپنی بھنگی پٹلیں پونچھ رہی تھی۔ ایک اور الوداع..... ایک اور عذاب جو سانول اور نوری کی جُدائی کی صورت میں میری رُوح کو قہیلنا پڑ رہا تھا۔

نوری کے جانے کے بعد بھی سانول وہیں ٹیلے پر کھڑا اُس جانب دیکھتا رہا، جہاں ریت پر نوری کے مذموں کے نشان گئے تھے۔ میں نے اُس کی تنہائی میں دُخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت صرف اُس کا جسم ہی اس ٹیلے پر موجود ہے۔ اُس کی رُوح تو نوری کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسوؤں کو چھنے، ان سے وضو کرنے کے لیے نوری کے ساتھ ہی صحرا پار کر گئی تھی۔ سورج ڈھلنے کے بعد سانول بھی اپنی محبت کے اردب ہوتے آفتاب کی طرح ٹیلے سے نیچے اُتر آیا۔ وہ بہت مضحل لگ رہا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ دماغی مل کے لیے کبھی کبھی یہ عارضی جُدائی ضروری ہوتی ہے۔ سانول کو اگلی صبح روانہ ہونا تھا۔ وہ رات دیر تک برے ساتھ بیٹھا رہا اور پھر اُس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں اُسے گھر تک چھوڑ آیا۔ لیکن اگلی صبح میرے بعد اصرار کے باوجود اُس نے مجھے ریلوے اسٹیشن تک ساتھ چل کر اُسے وداع کرنے سے منع کر دیا۔ بقول ک کے وہ پہلے ہی بہت اداس تھا اور اگر میں اسٹیشن تک ساتھ آیا تو کہیں وہ اپنا ارادہ ہی نہ بدل دے۔ وہ صبح دیر سے ہی مزار پہنچ گیا تھا۔ اُس کی گاڑی دو پہر کی تھی۔ میں خود اُسے رخصت کرتے ہوئے بہت اداس تھا۔ ل کے ساتھ کال گڑھ میں اتنے دن کیسے کٹ گئے، کچھ چٹا ہی نہیں چلا۔ جاتے ہوئے مجھ سے گلے مل کر وہ رو۔ میں نے جلدی سے اُس کے آنسو پونچھے ”ارے..... یہ کیا؟“ ”تم مجھے بہت یاد آؤ گے عبداللہ۔ میں

گی۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ کل کسی طرح مجھے گھر سے تنہا نکلنے کی اجازت دلو اور۔ باقی انتظام میں خود کدو لالو گا۔“ میں نے مسکرا کر اس کی پیٹھ پیٹھ پائی تو تم نے بھی سودے بازی سیکھ لی ہے۔ ٹھیک ہے کل عصر کے بعد تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔

سانول کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی مزار کی بیرونی دیوار سے پرے کا لے کی مخصوص غراہٹ گونجی۔ میر روٹی اور پانی لے کر باہر آیا تو دُور کالے کی پشت پر، میں نے اُس کے دونوں دوستوں کو بھی ٹیلے کے اُپر کھڑے دیکھا۔ میں نے اُس کے لیے روٹی ڈالی اور انہیں بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی آکر اپنے دوست کے ساتھ شریک ہو جائیں، لیکن شاید فی الحال وہ دونوں کچھ شرمیلے تھے۔ میں اندر سے اور روٹی لے آیا اور پانی میں بھگو کر دُور مزار کی دیوار کے پاس چلا گیا۔ مجھے مزار کی طرف بڑھتے دیکھ کر کالے کے دوست بھی ٹیلے سے اُتر آئے۔

اگلے روز عصر کے بعد میں سانول کے گھر پہنچا تو وہ پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ سانول کو میرے ساتھ گھر سے باہر نکلنے دیکھ کر اُس کے ماں باپ کے دل میں جو تھوڑا بہت تذبذب تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے پہلے سے باہر نکلنے ہوئے اُس سے پوچھا ”اب کیا ارادہ ہے۔ کیا سیدھے نوری کے دروازے پر جا بیٹھو گے؟“ سانول زور سے ہنس پڑا ”نہیں! جو سودا میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا، وہی نوری کے سامنے بھی اُس کی سکا کے ذریعے پیغام کی صورت بھیج دیا تھا کہ اگر وہ چاہتی ہے کہ میں شہر جا کر محنت مزدوری کروں جو آج شام اُسے مجھ سے ملنے کے لیے مزار کے پچھلے بڑے ٹیلے پر آنا ہی ہوگا۔“ میں نے حیرت سے سانول کو دیکھا۔ ”تو کیا؟“ مان گئی۔ اُس نے تمہیں کوئی جواب بھی دیا کہ نہیں.....؟“ سانول مسکرایا ”نہیں..... جواب تو کوئی نہیں آیا اگر کی طرف سے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ضرور آئے گی۔“ میں نے غور سے سانول کی جانب دیکھا۔ ”تمہیں اتنا یقین کیسے ہے۔“ سانول اپنی ہی دُھن میں گن گن تھا۔ ”ساری بات ہی یقین کی ہے چھوٹے پیر جی.....“ زور سے چونکا..... میرے ذہن میں سلطان بابا کا جملہ گونجا ”سارا کھیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں..... کیا ہمارے یقین میں واقعی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ہمارے مجبور اور معاشرے کے قیدی محبوب کو بھی گھر نکال کر اس ویران تپتے صحرا میں ہمارے سامنے کھڑا کر سکتا ہے.....؟ اگر زمین والوں پر اس یقین کا اتنا گہرا ہے تو پھر عرش بریں والے کی آمد کا کیا حال ہوگا، جو ہمارے ایک قدم کے بدلے ستر قدم ہماری جانب بڑھ چلا آتا ہے.....؟ اور پھر میں نے دُور ہی سے مزار سے پرے ٹیلے پر نوری کی سرخ اوڈھنی کو سانول کے کا یقین کی صورت میں لہراتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ شاید اپنی کسی سبیلی کے ساتھ آئی تھی، جو بظاہر ٹیلے پر اُگی اب خاص جنگلی بوٹی چھنے میں مشغول تھی، جسے جوڑوں کے درد کی دوا میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ محبت بھی ہمیں بہانے سکھا دیتی ہے۔ شاید محبت خود دنیا کی سب سے بڑی ”بہانے باز“ ہوتی ہے۔ میں مزار کی منڈ پر قریب ہی رُک گیا۔ سانول کو نوری کی جانب آتے دیکھ کر اُس کی سبیلی نے نوری کے کان میں کوئی سرگوشی اور ہنسی ہوئی کچھ فاصلے پر چلی گئی۔ ٹیلے اور مزار کی منڈ پر میں کافی فاصلہ تھا۔ اچانک تیز ہوانے ریت کے



ناید کہیں سے یہ کپڑا اٹھالایا تھا اور مجھے یہی دکھانے کے لیے بار بار بھونک کر باہر بلارہا تھا۔ ارے یہ تو میرا ہی رہا تھا، جو دو دن پہلے ریت کے شدید طوفان کی وجہ سے مزار کی اگلی سے اڑ کر نہ جانے صحرا میں کہاں کھو گیا، لیکن یہ کالے کو کہاں سے ملا۔ مجھے سانول نے بتایا تھا کہ جروت کے سب ہی پالتو کتے انتہائی حد تک مدھائے ہوئے اور اپنی حیات میں کمال حد تک ہوشیار ہوتے ہیں۔ اوہ..... تو پھر ضرور کالے نے گرتے سامبرے جسم کی پاس پائی ہوگی، تب ہی وہ یہ گرتا یہاں اٹھالایا۔ کہتے ہیں کہ کتے کی سونگھنے کی حس اس قدر زہوتی ہے کہ وہ سینکڑوں لوگوں میں سے اپنے مالک کے جسم کی بو شناخت کر لیتا ہے۔ آج میں نے اس کا عملی ظاہر بھی دیکھ لیا تھا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے اور میں اندر کی نب دوڑا۔ ایک ہمہی امید نے میرے اندر جیسے بجلیاں ہی بھردی تھیں۔ میرے کمرے میں ابھی تک سیکڑے کی اودھنی پڑی تھی، جو آج اُس کی ثانی سلطان بابا کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اگر سیکڑہ اُسی صحرا میں کہیں بھٹک رہی ہے تو شاید کالا اُس کے دوپٹے میں بسی خوشبو کو پا کر اُس کا بھی کوئی کھوج نکال لائے۔ میں اودھنی لے کر اسی مارے دوبارہ بھاگتا ہوا باہر آیا اور کالے کے سامنے اس بھٹی ہوئی چادر کو ڈال دیا۔ وہ کچھ دیر چاروں طرف بوم کر اس کو سونگھتا رہا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں کہ میں اس اودھنی والی کی تلاش ہے۔ لا اودھنی سونگھنے کر پھر سے میرے ارد گرد چکر لگانے لگا۔ شاید اُسے میری بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ میں نے در زمین سے اٹھا کر اُس کا ایک گولا سا بتایا اور اُسے دُور صحرا میں اُچھال دیا۔ کالا فوراً بھاگا اور چادر کے قریب جا کر بھاگنے لگا۔ اس بار شاید وہ میرا مدعا جان گیا تھا۔ اب وہ زور زور سے بھونک کر چادر کے گرد چکر کاٹ کر راکی جانب دوڑ جاتا اور پھر واپس اپنی جگہ آکر بھونکنے لگتا۔ میری رگوں میں خون کا دورانیہ بڑھنے لگا، گردش ہو کر میری نسلوں میں انگارے سے بھر گئی۔ میں صحرا میں کالے کے پیچھے لپکا۔ وہ جس طرح خاص سدھائے نئے کتوں کی طرح کچھ قدموں کے بعد رک کر میرا انتظار کرتا اور پھر بھاگنے لگتا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ لا اودھنی والی کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ میں اُس کے نقش قدم پر دوڑتا ہوا صحرا پار کر رہا تھا۔ کالے کا رخ نی کی جانب تھا اور کچھ ہی دیر میں ہم نصف شب کے وقت خواب خرگوش کے مزے لیتے ہوئے کال گڑھ کی ان گلیوں میں دھول اُڑا رہے تھے۔ کالا بناڑے آگے بڑھتا گیا۔ میرا سانس پھول چکا تھا اور قدم جواب دے رہے تھے۔ پھر بھی میں ایک اُن جانی قوت کے زیر اثر کالے کے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر بستی کے آخر میں لے کے قدم ایک جگہ جم سے گئے اور اُس نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ میں بھی اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ کالا اپنے پنجوں سے جس دیوار کو بار بار کھرچ رہا تھا، وہ جروت کے قلعے کی چادر دیوار کی تھی۔ مطلب ند دیوار کے اس پار موجود تھی۔ اس وقت میرا بھی دل شدت سے یہ آرزو کرنے لگا کہ کاش میرے ناخن بھی ہ جائیں اور میں کالے کے ساتھ مل کر اس پتھری کی دیوار کو کھرچ کھرچ کر ڈھادوں یا اس میں نقب لگا کر اس فی قلعے کے اندر گھس کر سیکڑہ کو کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالوں، لیکن اس وقت ہم دونوں ہی شدید بے بس تھے۔

روز تمہیں ایک خط لکھا کروں گا اور تم جواب میں مجھے اس بستی، اس صحرا اور نوری کی خبر لکھنا۔ میں نے ماحول بدلنے کے لیے اُسے چھیڑا۔ ”اچھا تو گویا خط میں بھی اُسی کی باتیں..... میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تم میرے لیے خط لکھا کرو گے، پر اپنے ایسے نصیب کہاں؟“ سانول میری بات سن کر مسکرا دیا۔ ”اگر میرا خط اُس تک پہنچ پاز تو یقین کرو میں اُسے ہر خط میں عبد اللہ کی باتیں لکھا کرتا۔ میں نے نوری کو پیغام کر دیا ہے کہ تم سے اُسے میری خیر خیریت پتا چلتی رہے گی اور اگر اُسے کوئی ضروری پیغام دینا ہو تو وہ بھی تمہارے ذریعے مجھے دے سکتا ہے۔ میں ڈاک بابو سے بھی خاص التجا کر کے آیا ہوں کہ مزار والی ڈاک کا خاص خیال رکھے۔“ میں نے سانول کو اطمینان دلایا کہ وہ نگر نہ کرے۔ میں اُس کے ساتھ رابطے میں رہوں گا۔ جانے سے پہلے وہ خصوصی طور پر سلطان بابا کے کمرے میں جا کر اُن کی دعا بھی وصول کر آیا تھا۔

سانول کے جانے کے بعد ایک دم ہی جیسے ساری فضا اداس اور میری تنہائی اور دشت دو چندی ہو گئی تھی۔ دل پھر سے ہوکنے لگا تھا۔

گاہے دل سے دھواں اٹھتا ہے

ابھی رہتا ہے اس مکان میں کوئی

اگلے روز سیکڑہ کے بوڑھے نانا ثانی سلطان بابا سے ملنے چلے آئے۔ جانے کیوں انہیں دیکھ کر اب میر کہیں چھپ جانے کو دل کرتا تھا۔ مجھ سے اب اُن کی فریاد برداشت نہیں ہوتی تھی۔ بڑھیا کا آج یہ اصرار تھا کہ اگر سلطان بابا سیکڑہ کی اودھنی پر تین بار دم کر کے اور دعا کر کے پھونکیں گے تو وہ ضرور واپس لوٹ آئے گی۔ سلطان بابا نے شاید اُسی کے اطمینان کی خاطر اُس سے کہا کہ وہ سیکڑہ کی پھولوں والی چادر یہیں چھوڑ جائے۔ ضرور سیکڑہ کی بازیابی کی دعا کریں گے۔ وہ دونوں یوں خوش ہو گئے، جیسے واقعی انہیں سیکڑہ مل گئی ہو۔ مزار سے نکلتے ہوئے بڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے دعا دی کہ خدا میری ہر مراد پور کرے اور ٹھیک اُسی لمحے میرے من کی صرف ایک ہی مراد تھی ”یا خدا اس لاچار بڑھیا کو اس کی نواسی سے دے.....“

کچھ دیر میں سورج ڈوب گیا۔ آج میں کالے اور اُس کے دوستوں کے لیے پہلے ہی پانی اور روٹی باہر رکھ آیا تھا تاکہ اُس کے دوست میری وجہ سے کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔ تھوڑی دیر بعد ہی اُن کی غرابٹوں کی آواز بھی باہر سے بلند ہونے لگیں۔ لیکن خلاف معمول ”کالا“ مزار کے سامنے آکر بھونکنے لگا۔ اُس نے پہلے بھی ایسا نہیں کیا تھا، جانے کیا بات تھی۔ جب تو اُتر سے آتی آواز نہڑکی تو مجبوراً مجھے اٹھ کر مزار سے باہر جانا پڑا۔ وہ مزار کے مرکزی دروازے سے کچھ ہٹ کر کھڑا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ مسئلہ کیا ہے؟ پھر اندھیرے میں اُس کے سامنے ریت پر پڑے سفید کپڑے پر میری نظر پڑی تو میں چونک کر آگے بڑھا۔

بلکہ شاید ٹھیک اُس لمحے اس جانور کے اختیار کی حدیں مجھ سے کہیں بڑھ کر ہی تھیں۔ تھکے قدموں سے ہم دو صحرا کی طرف لوٹ گئے۔ میں جب مزار کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا، تب سلطان بابا تہجد کی نماز ادا کر اٹھ ہی رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں سیکنہ کی چادر دیکھ کر کچھ چوکنے ”کیوں میاں؟ کس کھوج میں رہے بھر؟“ میں نے انہیں ساری زوداد سنا دی۔ پوری بات سن کر انہوں نے گہری سانس لی ”لگتا ہے کوئی بڑا کام سر پر ہے..... یا اللہ ہمیں ثابت قدمی عطا کر۔“ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور میں یہی سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ اگر سیکنہ واقعی جبروت کے قلعے میں کہیں قید ہے تو اُسے نکالنے کے لیے پوری فوج د ہوگی، کیوں کہ اس علاقے میں پتا ہلانے کے لیے بھی جبروت کی اجازت درکار ہوتی تھی۔ اس سوچ میں غم نہیں ہوئی کہ جانے کب سورج نکلے گا اور میرے وجود میں دھوپ کے نیزے گڑنے لگے۔ میں تب چونکا، میرے ماتھے سے بہتا پسینہ شپ شپ مزار کے محکم میں بھیجی ریت پر گر کر جذب ہونے سے پہلے ہی فضا تحلیل ہونے لگا۔ سلطان بابا کے ٹوکے پر میں جتنی دھوپ سے ہٹ کر گرم سائے میں جا بیٹھا لیکن ابھی میرے مقدر میں بہت کڑی دھوپ باقی تھی۔

کچھ ہی دیر میں مزار کے باہر کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور اکرام صاحب نوری کے والد اور کسی دوسرے بزرگ کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ اُن سب کے چہرے سستے ہوئے تھے اور ماتھے پر شکنیں اندر کا حال بتا رہی تھیں۔ سچ ہے کہ چہرے کا آئینہ شیشہ ہوتا ہے اور دل کا آئینہ چہرہ۔ لیکن آج اُن کا آئینہ دھندلایا ہوا تھا۔ نوری کا باپ بے حد مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان بابا کے استفسار پر مشکل کے منہ سے صرف ایک جملہ نکلا ”جبروت نے نوری کا رشتہ مانگ لیا ہے۔“ میرے ہاتھ میں اکرام صاحب دینے کے لیے پکڑا پانی کا گلاس چھوٹے چھوٹے بچا۔ جملہ کیا تھا، ایک ایسا شدید دھماکا تھا، جو پل بھر پورے صحرا کو تہس نہس کر گیا۔ میں بے ساختہ چلا اٹھا۔ ”لیکن..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ساری بستی جانتی ہے نوری سانول کی منگیت ہے اور سانول صرف اسی رشتے کی تکمیل کی خاطر ابھی کل ہی محنت مزدوری کے لیے گیا ہے، پھر یہ سب کچھ.....“ میرے لفظ میرے اندر ہی گھٹ کر رہ گئے۔ نوری کا باپ تو اس قدر رو ہوا تھا کہ اس نے اسے جواب میں کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ البتہ کچھ لمحوں بعد اکرام صاحب ایک لمبا سانس لے بولے۔ ”کاش ہم سانول کے ساتھ ہی نوری کو بھی دو بول پڑھا کر شہر زرخشت کر دیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نورا سانول کے گھر والوں نے اُس کے لیے مانگ رکھا تھا، لیکن ابھی تک باقاعدہ کوئی رسم تو ادا نہیں کی گئی تھی۔ کی تو ممکن بھی نہیں ہوئی اور ایسی صورت میں کسی بھی طرف سے لڑکی کے لیے رشتہ آ سکتا ہے۔ ہاں بستی والے اس زبانی رشتے کا بھی سدا احترام کرتے لیکن کسی کی نیت ہی اگر بُری ہو تو پھر اس کا کیا علاج.....؟“

میں نے چونک کر اکرام صاحب کی طرف دیکھا، انہوں نے سلطان بابا کو جو تفصیل بتائی، اس کے مطابق جبروت شاید بہت پہلے سے اس رشتے کی تاک میں تھا اور اُس نے مناسب موقع پر یہ تیر چلایا تھا۔

جی وہ یہ تکلف صرف نوری کے ماں باپ کے اطمینان کے لیے کر رہا تھا، ورنہ بستی میں جس کسی گھر میں جب کبھی قلعے کی طرف سے کوئی رشتہ آیا تھا، تب اُس کے بعد نہ تو کسی کو انکار کی جرأت ہوتی اور نہ ہی کبھی بستی میں سے کسی دوسرے گھر نے جبروت کے مانگے ہوئے رشتے پر کندھانے کی ہمت کی تھی۔ اس لیے اگر کبھی جبروت کی طرف سے بستی میں کسی گھر کی پیری کی طرف پتھر آتا تو وہاں ماتم اپنے ڈیرے ڈال دیتا تھا اور پھر ہمیشہ کے لیے اس گھر میں موت کا سناٹا چھا جاتا تھا۔ میں نے جلدی سے اکرام صاحب سے پوچھا ”سانول کے باپ کا کیا کہنا ہے؟“ وہ بے چارہ کیا کہے گا۔“ اُس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے یہ سنتے ہی۔ غریب کا احتجاج کیا ہوتا ہے، صرف بددعا اور کڑھ کر اپنے اندر ہی کو مار دینا، وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی اُسے اپنے بیٹے کی فکر بھی کھائے جا رہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سانول یہ سنتے ہی اُلٹے پاؤں بستی دوڑا چلا آئے گا اور سانول کا باپ یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو لے۔ لہذا اس کی پوری کوشش ہوگی کہ یہ خبر سانول تک نہیں نہ پہنچے۔ کیوں کہ یہاں جس نے بھی قلعے داروں سے جھگڑا مول لیا اس کے کاندھے ہمیشہ کے لیے سر کے بوجھ سے آزاد ہو گئے۔ اکرام صاحب کی بات ختم ہوتے ہی مزار میں سناٹا سا چھا گیا۔ صرف آس پاس چلتی لوکی سائیں سائیں اور ریت کے گبولوں کے رقص کا شور فضا میں باقی رہ گیا۔ کچھ باتوں کی سنگینی کا احساس ہمیں یک دم نہیں ہوتا، لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، اعصاب کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور ہمیں دھیرے دھیرے اپنی بے بسی اور اس حادثے کے مضمرات کا پتا چلتا ہے۔ ٹھیک یہی حال اس وقت میرا بھی تھا۔ میرے پاس سانول کا پتا نہیں تھا اور اُس کے گھر والے اب کسی حال میں مجھے اس کی کوئی خبر نہ دیتے۔ شاید نوری کو شہر میں سانول کے رہنے کی جگہ کی کچھ خبر ہو، لیکن میں نوری سے اس کا پتا کیسے لے سکتا تھا۔ وہ دو سات پردوں میں چھپی ہوئی تھی۔ میں تو صرف سانول کے پہلے خط ہی کا انتظار کر سکتا تھا، جس کا اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔

لیکن تب تک تو بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ جانے نوری کا کیا حال ہوگا۔ وہ بھی تو کسی بے بس چڑیا کی طرح بڑبڑا رہی ہوگی۔ میں اپنی ہی سوچوں میں گم تھا کہ سلطان بابا کی آواز نے مجھے ڈرائی دیا۔ ”آپ لوگوں نے کیا سوچا ہے۔ کیا پوری بستی میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بلند کر سکے؟“ ان نینوں بزرگوں کے سر اندامت سے جھک گئے۔ ”کاش کسی میں اتنی جرأت ہوتی۔ ہم تو بس آپ سے دعا کی التجا کرنے آئے ہیں۔ آپ دریا کیجیے کہ اللہ ہمیں اس طرح ظالم شخص کے قہر سے بچالے۔“ سلطان بابا کی آواز بلند ہوئی۔ میں نے انہیں اتنی تیز آواز میں بات کرتے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ ”یہ دعا کا نہیں، عمل کا وقت ہے۔ خدا بھی اُن کی حالت کبھی نہیں بدلتا جو خود کو بدلنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔“ تیسرے بزرگ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں دخل دیا۔ ”آپ بجا فرماتے ہیں، لیکن اس بستی کی تیسری نسل تک قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان کی زوچیں تک جبروت کی غلام ہیں۔ ان بوسیدہ جسموں سے آپ ایسی کوئی توقع نہ رکھیں۔ شاید ہم سے زیادہ بے بس کوئی اور نہ ہو۔“ سلطان بابا نے تسبیح رکھ دی اور گرج کر بولے ”ٹھیک ہے..... اگر ساری بستی کی زوچ

غلام اور جسم بوسیدہ ہو چکے ہیں تو پھر یہ فریضہ بھی اب مجھے ہی سرانجام دینا ہوگا۔ چلو عبداللہ..... مجھے ج کے قلعے لے چلو۔ وقت آ گیا ہے کہ اس سے دو بدو بات کر لی جائے۔“ سلطان بابا نے پاؤں اپنی کمر میں ڈالے اور جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں بزرگ حواس باختہ سے ہو گئے۔ ”یہ آپ ک رہے ہیں؟“

## قفس اور جبر

اکرام صاحب نے جواب تک سلطان بابا کے اس اچانک فیصلے سے بوکھلائے ہوئے تھے، مدد مانگنے کے انداز میں یوں میری جانب دیکھا جیسے میں واقعی سلطان بابا کو روک ہی تو لوں گا لیکن میں خود اپنے حواس میں کب تھا اور پھر میرا کام تو صرف قہیل تھا لہذا میں سلطان بابا کے حکم کی قہیل میں اُن کے پیچھے پیچھے مزار سے نکل پڑا۔ راستے میں نوری کے والد نے ایک بار پھر سلطان بابا سے درخواست کی کہ اس طرح براہ راست جبروت کی مخالفت میں کھڑے ہو جانا شاید ٹھیک نہ ہو لیکن سلطان بابا کا کہنا بھی ٹھیک ہی تھا کہ آج نہیں تو کل اس سے کسی نہ کسی کو تو بات کرنی ہی ہوگی تو پھر آج ہی کیوں نہیں۔ بستی قریب آئی تو سلطان بابا نے رُک کر ان تینوں بزرگوں کو مخاطب کیا۔ ”میں آپ لوگوں کی مجبوری سمجھتا ہوں لہذا بستی کی اس سرحد سے آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ تینوں کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔ نوری میرے لیے بھی بیٹی ہی کی طرح ہے لہذا آپ سب یہ اطمینان رکھیں کہ میرا کوئی بھی فیصلہ میری اپنی ذات کے لیے ہوگا اور نہ ہی آپ کو مزید کسی مشکل میں ڈالے گا البتہ جو مشکل پہلے سے سر پر آن پڑی ہے اس کا تدارک اب ضروری ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ ظلم کو چپ چاپ سہنے والا غلام سے بھی بدتر ہے۔“ کچھ دیر کے لیے ماحول پر سناٹا سا چھا گیا، صرف فضا میں اڑتی پیلوں اور کال گڑھ کے تاریخی آسمان میں بھٹکتے گدھوں کا شور باقی رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اکرام صاحب ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آخر کسی کو تو پہل کرنی ہی ہوگی۔ آپ بستی کے سکے نہیں لیکن پھر بھی آپ صرف ہم سب کی خاطر یہ زبان بندی توڑنے کے لیے یہاں تک چلے آئے۔ میں اور لڑکی کا باپ بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔“ تیسرے بزرگ کو انہوں نے بڑی مشکل سے بستی کے باہر ہی سے رخصت کر دیا اور کچھ دیر بعد ہم سب کال گڑھ کے بازار میں جبروت کے قلعے کے سامنے کھڑے تھے۔ بازار میں لوگوں نے نوری کے باپ کو ہمارے ساتھ جاتے دیکھا تو وہ تجسس کے مارے ہمارے ساتھ ہی چل پڑے۔ کال گڑھ کی آبادی مختصر سی تھی اور ظاہر ہے کہ جبروت کے نوری کے لیے بھیجے گئے رشتے کی ان سب ہی کو خبر ہوگی۔ لیکن جب انہوں نے سلطان بابا کو قلعے کے سامنے رُکتے دیکھا تو اُن سب کے قدم وہیں اپنی اپنی جگہ جتے چلے گئے اور کچھ ہی دیر میں، میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے باپ سمیت ایک ایسے گول محلے کے درمیان گھرے ہوئے تھے جو ہم چاروں سے کچھ فاصلے پر یوں کھڑا تھا جیسے ان سب کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ اندر سے قلعے کے دیو ہیکل چوبی دروازے کے دربان نے بھی باہر کوئی غیر معمولی بات

اُس کی سوجی ہوئی آنکھیں  
 تھر تھر کے اشکوں کی کہانی سناری تھیں۔ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی ”چھوٹے پیر جی..... آپ کسی طرح سانول کو  
 باغ کروادیں ورنہ میں جیتے جی مرجاؤں گی۔“ گویا اُس نے مجھ سے وہی مانگ لیا جس کی توقع میں اُس  
 کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے نوری سے سانول کے شہر کا پتا پوچھا تو اُس نے ہاتھ میں پکڑا ایک مزارا سا  
 ہندو میرے حوالے کر دیا۔ اس پر سانول ہی کی کچی تحریر میں قریبی شہر کے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک کسی مسافر  
 نے کا پتا درج تھا۔ لیکن یہ قریب ترین شہر بھی کال گڑھ سے پورے ایک دن کی مسافت پر ریل کے راستے  
 پر ہنسکتا تھا۔ میرے جی میں آیا کہ نوری کے باپ سے کہوں کہ ابھی اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے اور میرے ساتھ  
 لگڑھ سے نکل پڑے۔ جبروت کی واپسی سے پہلے ہم ٹرین کے ذریعے سانول تک پہنچ سکتے تھے لیکن  
 غان بابا کو یہاں اکیلا چھوڑ کر بھی تو میں کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے نوری کے باپ کی  
 ف دیکھا۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم مزار کی دیوار سے پرے غلامیں گھور رہا تھا۔ میں نے اُسے پکارا تو  
 سٹ پٹا سا گیا۔ ”یہاں سے اگلی گاڑی کتنے بجے چھوٹے گی.....؟“ میرا سوال سنتے ہی اُس کے چہرے کا  
 اڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ذہن میں کون سا منصوبہ کلک رہا ہے۔ ”نہ چھوٹے پیر جی۔ کال گڑھ سے  
 ریلوے لگانے کا مطلب ہمیشہ کے لیے یہاں سے علاقہ بدر ہونا ہے۔ پھر میری سات نسلیں بھی یہاں دو بارہ  
 اجائیں تو یہ ظالم ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔“ ”سوج لو! تمہیں اپنی اگلی سات نسلیں بچانی ہیں یا اپنی اکلوتی بیٹی  
 ازنگی..... فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ بیٹی  
 رہے گی تو.....“ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ نوری کے باپ نے بے بسی سے سر پٹا اور پھر آدھے  
 ٹٹے کے طویل وقفے کے بعد اُس نے نظر اٹھائی تو وہ ایک ایسے ہارے ہوئے جواری کی نظر تھی، جس نے اپنا  
 ب کچھ آخری داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ طے یہ پایا کہ رات ساڑھے گیارہ بجے والی گاڑی کو پکڑا جائے  
 نوری کی ماں کو اس سے پہلے ہی اکرام صاحب کے ساتھ اُونٹوں کے قافلے کی ہمراہی میں آج شام اُس کی  
 ناکے پاس کسی دوسرے بستی کے لیے روانہ کر دیا جائے گا اور نوری صرف اپنے باپ کے ہمراہ رات دس بجے  
 پہلے مجھے بستی کے باہر ریلوے اسٹیشن کی راہ پر ملے گی۔ میں انہیں گاڑی پر سوار کروا کر واپس کال گڑھ لوٹ  
 آں گا۔ میں نے سوج رکھا تھا کہ جبل پور والے خان صاحب کے نام ایک خط بھی نوری کے باپ کے حوالے  
 دوں گا اور انہیں مکمل تفصیل اور پتا لکھ کر سمجھا دوں گا کہ وہ شہر پہنچنے ہی سانول کو لے کر آگے جبل پور کے لیے  
 اُتار دے گا۔ مجھے یقین تھا کہ خان صاحب کو ان مظلوم لوگوں کو پناہ دینے میں کوئی تاثر نہ ہوگا۔ ساتھ ہی  
 مانے یہ بھی سوج رکھا تھا کہ نوری کے باپ کو اپنے دوست کا شرف اور پایا کے تمام ٹیلی فون نمبرز بھی احتیاط  
 سے الگ کاغذ پر لکھ کر دوں گا تاکہ کسی ہنگامی صورت میں وہ پہلا ٹیلی فون میسر آتے ہی اُن سے بات کر سکے۔  
 مانے نوری کے باپ کا کاندھا تھپک کر اُسے ہمت دلائی اور انہیں رخصت کیا تاکہ وہ گھر جا کر اس ”ہجرت“

محسوس کر کے دروازے کے ایک پٹ میں بنی چھوٹی سی کھڑکی کی درز سے باہر جھانکا اور پھر ہمیں یوں راہ  
 میں کھڑا دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ”کیا بات ہے، یہ بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے یہاں.....“  
 دربان کی جھاڑن کر جمع میں کمیوں کی جھنجھناہٹ جیسا ایک شور مگنجا اور سب ہی لوگ چند قدم مزید پیچھے ہ  
 گئے۔ سلطان بابا ٹھہری ہوئی آواز میں بولے ”مجھے تمہارے مالک سے بات کرنی ہے۔ جا کر اُسے اطلاع آ  
 کہ باہر کچھ ملاقاتی آئے ہیں۔“ دربان کے چہرے پر حیرت کا تاثر ابھرا۔ اُسے شاید اس لہجہ اور اس بے با  
 کی عادت نہیں تھی۔ ”مالک سے ہر کوئی یوں نہیں مل سکتا۔ مالک اُسی سے ملتا ہے جس سے اُس کی مرضی ہوگی  
 ویسے بھی وہ اس وقت یہاں نہیں ہے، شکار کے لیے صحرا کی طرف گیا ہوا ہے۔ شاید کل تک واپسی ہوگی  
 لوگوں کو اگر ملنا بھی ہے تو پہلے مالک سے وقت طے کرنا ہوگا پھر آنا.....“ دربان اپنی بات ختم کر کے نگوشت  
 منہ بناتا ہوا واپس اندر پلٹ گیا۔ بھیڑ کے لیے اب مزید کوئی دلچسپی یہاں باقی نہیں رہ گئی تھی لہذا لوگ بھی ادا  
 ادھر جھننے لگے۔ بہر حال ہماری آمد کا نصف مقصد تو حل ہو ہی گیا تھا۔ دربان جبروت کی واپسی پر اُسے  
 اطلاع ضرور دے گا کہ مزار کا بزرگ متولی اُس سے ملنے کے لیے قلعے کے دروازے پر دستک دے چکا ہے  
 اب ہمارے پاس انتظار کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ لہذا میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے  
 سے رخصت لے کر واپس مزار کی جانب پلٹ آئے۔ راستے میں میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آ  
 اگر میں کسی طرح نوری کے گھر والوں کو اس بات پر قائل کرنا چاہوں کہ وہ لوگ معاملہ منٹے تک نوری کو  
 کہیں روپوش ہو جائیں تو کیا یہ عارضی حل انہیں قابل قبول ہوگا۔ لیکن پھر خود میرے ہی دماغ نے اس خیال  
 رد کر دیا۔ پہلے تو نوری کے گھر والے میری ایسی کوئی بات سنیں گے ہی کیوں؟ اور پھر اگر میں کسی طر  
 انہیں قائل کر بھی لوں تو کیا جبروت نے ایسے کسی متوقع اقدام کے لیے پیش بندی نہیں کر رکھی ہوگی۔ میں  
 قدر سوچ رہا تھا اتنا ہی اُلجھتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف سے پھندا نوری کے گرد جنگ ہوتا نظر آ رہا تھا اور شاید  
 اسی پھندے کی کھٹن ہی تھی کہ جس نے نوری جیسی سبھی ہوئی چڑیا کو بھی اپنے پنجے میں پھنسا پھنسانے پر  
 کر دیا۔

عصر سے کچھ دیر بعد میں نے جب اُسے اپنے شکستہ قدم باپ کے ساتھ صحرا عبور کر کے مزار کی جا  
 آتے دیکھا تو پہلے تو کچھ دیر تک میں اُسے بھی سراپ ہی سمجھتا رہا لیکن پھر جب وہ ایک حقیقت کی طرح مزار  
 دہلیز عبور کر کے میرے سامنے آکھڑی ہوئی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا ہی پڑا۔ میں بے یقینی کے عالم  
 ان دونوں کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ سلطان بابا عصر کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور اس  
 مزار کے صحن میں صرف میں تھا یا آس پاس چلتی گرم لوکی سرگوشیاں۔ نوری کے باپ نے سلام کے بعد نو  
 ہوئے لہجے میں کہا، یہ بد نصیب آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے، میں اسے لے کر یہاں کبھی نہ آتا کہ اب  
 اس کے گھر سے باہر نکلے قدموں سے بھی ڈر لگتا ہے۔ لیکن بالآخر ایک مجبور، لاچار باپ اپنی لاڈلی کی آ



کے دس بج چکے تھے اور ابھی ہمیں گھنٹہ بھر کی مسافت طے کر کے ریلوے اسٹیشن بھی پہنچنا تھا۔ اس لیے ان دونوں کو آج سہ پہر کے بڑھنے کا اشارہ کر کے چل دیا۔ اب وہاں صرف صحرا تھا، چاندنی تھی اور ہمارے ریت میں دھنستے قدموں کی چاپ.....

میری کوشش تھی کہ ہم صحرا کے مرکزی بجائے آس پاس ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں۔ ہر آہٹ پر ہم تینوں بُری طرح چونک جاتے اور ریت کی غیر معمولی سرسراہٹ سے بھی ہمارا دم اٹکنے لگتا۔ اسٹیشن اب تھوڑی دُور رہ گیا تھا، لیکن منزلوں کا تعلق بھلا فاصلوں کے گھنٹے یا بڑھنے سے کب ہوا ہے اور پھر میری کمند تو ہر بار جب ہی ٹوٹی تھی، جب دو چار ہاتھ باقی تھے باؤم کو۔ اچانک ہی صحرائیں جیب کے زوردار انجن کی فراٹے بھرتی آواز یوں گونجی کہ ہم تینوں ہی اُچھل کر رہ گئے۔ جیب کسی قریبی ٹیلے کے پیچھے ہی چھپا کر کھڑی کر رکھی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی کے دائرے میں ہمارے پاؤں جم کر رہ گئے۔ نوری کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں نے چند ہیائی ہوئی آنکھوں سے روشنی کے دائرے سے پرے جھانکنے کی کوشش کی۔ فضا میں چند بھدے قہقہے ابھرے اور جیب میں بیٹھے چار ہیولوں میں سے ایک ترنگ میں بولا۔ ”کہاں جا رہے ہو چھوٹے پیر جی..... کہو تو ہم چھوڑ آئیں۔“ وہ سب لوگ پھر سے ہنسے اور ایک ہیولا جیب سے نکل کر روشنی کے سامنے آ گیا۔ وہ اکرم تھا۔ جروت کا خاص کارندہ۔ میرے سینے میں جیسے ایک تیر سا گڑھ کر رہ گیا۔ میں جسے غافل سمجھ رہا تھا، مجھ سے زیادہ ہوش و حواس میں ثابت ہوا۔ جروت نے پہلے ہی نوری کے گرد پھراٹھا رکھا تھا اور اُسے شاید مزار سے شروع ہوئی اس کہانی کی ہر تفصیل کی خبر تھی۔ وہ صرف ہم سے کھیل رہا تھا اور کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا کہ جب ہمیں رنگے ہاتھ پکڑ سکے اور میں نے یہ موقع اُسے پلیٹ میں رکھ کر فراہم کر دیا تھا۔ جیب کے ڈرائیور نے نوری پر ایک بھر پور نظر ڈالی اور زور سے ہنسا ”کیوں پیر جی، تم اسے بھگا رہے تھے یا یہ تمہیں لے کر بھاگ رہی تھی۔ ویسے معاملہ چاہے کچھ بھی ہو، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ جوانی چیز ایسی ہے کہ انسان خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔“ وہ چاروں پھر سے زوردار قہقہہ لگا کر ہنسے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہم تینوں کو ہانک کر جیب میں بٹھا کر واپس کال گڑھ کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ نوری اور اُس کے باپ کے چہرے پہلے پڑ چکے تھے، خاص طور پر نوری کی حالت بہت بُری تھی۔ مجھے لگا کہ وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ وہ ان چاروں کے سردار کی منظور نظر نہ ہوتی تو شاید وہ اُس سے مزید بدتمیزی کرتے ہیں لیکن شاید انہیں اتنا ہی حکم دیا گیا تھا کہ ہمیں قابو کر کے قلعے تک پہنچا دیا جائے۔ نوری کے باپ اور میری مشکلیں البتہ وہ پہلے ہی کس چکے تھے۔

جیب قلعے میں داخل ہوئی تو جس احاطے میں ریچھ کی لڑائی ہو رہی تھی، اس کے بائیں جانب ایک تنگ کی راہ داری سے ہوتے ہوئے گاڑی قلعے کی پچھلی جانب ایک صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف بلند مہتمروں کے ستونوں والے برآمدے تھے اور چاروں جانب کمرؤں کی قطاریں۔ پھر اوپری منزل میں روشنی

کی تیاری کر سکیں۔ نوری اس تمام گفتگو کے دوران سر جھکائے خاموش کھڑی رہی لیکن واپس پلٹنے سے پہلے شکرگزاری کے بول بولنے کی کوشش میں رو ہنسی ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں جھلک اٹھیں۔ کبھی کبھی یہ لفظ ہمارا احساس کو منتقل کرنے کے لیے کس قدر کم یاب ہو جاتے ہیں۔ یا شاید بعض جذبے اور احساسات ہوتے ایسے ہیں کہ دنیا کی بہترین نعت بھی ان کے احاطے کے لیے ناکافی ہو جاتی ہے۔

ان کے جاتے ہی میں نے کمرے میں جا کر عبادت میں گم، سلطان بابا کو ساری صورت حال سے کیا۔ وہ میری بات سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر صرف اتنا ہی بولے۔ ”ٹھیک ہے، اگر ان سب پر یہ زمین ہی تنگ ہو گئی ہے تو پھر ان کا یہاں سے ٹل جانا ہی بہتر ہے۔ تم سے جو دم ممکن ہو ضرور کرو۔“

رات نو بجے تک میں اپنی تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ خطوط کو علیحدہ علیحدہ لفافوں میں بند کرنے کے میں سلطان بابا سے اجازت لے کر بستی کی جانب چل پڑا۔ اچانک ہی مجھے شدت سے اس بات کا احساس کہ اپنا گھراں چھوڑنا، اپنی جائے جنم ترک کرنا کس قدر مشکل اور اذیت ناک عمل ہوتا ہے۔ شاید اس مذہب میں ہجرت کا اس قدر اعلیٰ درجہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ تو گویا ایک بار پھر سے جنم لینے کے مترادف ہی ہے۔ میں بستی کے باہر اسٹیشن کی راہ کو جانے والی صحرائی پگ ڈنڈی پر پہنچا تو مجھے مزار سے نکلے ٹھیک آدھے بیت چکا تھا۔ چاند پوری طرح کھل کر آسمان سے نور برسا رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں آج یہ چاندنی مجھے نہ رہی تھی۔ اُجالے کا واسطہ شناخت سے ہوتا ہے اور جب مقصد ہی اپنی شناخت کو دوسروں سے اوجھل رکھنا اُجالا کبھی کبھی کس انسان کا سب سے بڑا دشمن بن جاتا ہے۔ ہم انسان بھی کس قدر مطلبی ہوتے ہیں۔ کبھی اسی چاند کی چاندنی کے لیے مہینہ بھر انتظار کرنے کے کرب میں مبتلا رہتا تھا اور ٹھیک ہر چاند کی چودھویں کو اپنے تمام دوستوں سمیت ساحل پر، یا کھلے سمندر میں کسی بحری جہاز کے عرشے پر حملہ لگا کرنے اور سجانے کے لیے پہنچ جاتا تھا۔ تب یہ چاندنی مجھے کس قدر زور و مان پرور محسوس ہوتی تھی اور آج میرا دل چاہہ کہ پورے صحرا کے آسمان پر ایک سیاہ چادر ڈال دوں یا کال گڑھ پر ہی کوئی چھتری تان دوں تاکہ چھوڑنے والوں پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ لیکن ایسی چھتریاں اگر کہیں میسر ہوتیں تو جانے کتنے سیاہ نصیب ا مقدر کے سورج پر تاننے کے لیے بازار سے خرید نہ لاتے۔ کچھ ہی دیر میں ٹیلے سے پرے کچھ آہٹ سی ہوئی۔ میں نے ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا تو دُور ٹیلے سے پرے نوری اور اُس کا باپ تیز قدموں سے ریت کا عبور کرتے نظر آئے۔ نوری کے ہاتھ میں شاید اُس کے کپڑوں کی ایک گھڑی تھی، جسے اپنے سینے سے لگا اور لمبا گھونگٹ نکالے وہ اپنے باپ کی تیز رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی تھی، جو ہر چند قدم بعد در اپنی بیٹی کو جھڑک کر تیز چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ ٹیلے تک پہنچے تو نوری کا سانس بُرا پھول چکا تھا لیکن اپنے باپ کے خوف سے اپنی اُلجھی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی تمام تفصیل نوری کے باپ کو سمجھائی اور خط اُس کے حوالے کر دیا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔

وہاں نہیں گزار سکتا تھا اور کہاں آج میرے قدموں سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ایک ایسی ہی مخلوق میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑے بیٹھی تھی۔ شاید میں نے جس جگہ دیوار سے ٹیک لگائی تھی اس چوہے کا گھریا راستہ تھا، لیکن اب میرے مجبور یہ تھی کہ اپنے بندہ ہاتھوں کی وجہ سے میں گھٹنے نیچے بغیر دوبارہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور اگر میں گھٹنے نیچے کی کوشش کرتا تو ڈر تھا کہ کہیں وہ کچلا نہ جائے۔ لہذا میں یونہی ساکت بیٹھا رہا اور ہم دونوں اس طرح ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ شاید وہی لمحہ تھا جب ”جبر“ کی صحیح تعریف مجھے سمجھ میں آئی۔ جبر صرف قید و بند کا نام نہیں۔ نہ صرف جسم کا پابند سلاسل ہونا جبر کہلاتا ہے۔ اصل جبر تو روح کی اسیری ہے۔ ہماری روح اور ہمارے اندر کو کسی ایسے کام کے لیے پابند کرنا، جو ہماری سرشت اور فطرت کے خلاف ہو، پھر چاہے، روح کی وہ بندش کسی عالیشان محل میں کواب کے بستر پر ہو یا پھر کسی ایسی کال کوٹھڑی میں، جہاں آج میں بند تھا۔ قدرت نے آج مجھے ایک ایسے جان دار کے ساتھ اس زندان میں لا ڈالا تھا جس کی موجودگی کے احساس ہی سے میری آنتیں اٹھنے لگی تھیں۔ اور آج وہ میرے اس قدر قریب تھا کہ اس کی تیز دھوکنی جیسی سانس کی آواز بھی میں سن سکتا تھا۔ اس سے بڑا جبر میرے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔ چند لمحوں ہی میں یہ خوف ناک قلعہ، جبروت کی قید، اس رات کی تنہائی اور یہ کال کوٹھڑی سب ہی کچھ میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اب اصل امتحان اس چوہے کی جسم کو کس کرتی ہوئی موجودگی میں ساری رات بتانا تھا۔ شاید کچھ ایسی طرح کے جبر کا شکار وہ چوہا بھی تھا۔ ہم دونوں اسی خیال سے گھنٹوں اپنی جگہ ساکت جے رہے کہ اگر پہلے نے حرکت کی تو دوسرا بھی رد عمل ظاہر کرنے کا اور اسی جبر میں وہ ساری رات گزر گئی۔ روسونے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انسان بظاہر آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن تمام عمر اُن دیکھی زنجیروں میں بندھے گزار دیتا ہے۔ آج مجھے اُن اُن دیکھی زنجیروں کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔ جانے کب چاند بڈا اور کب کال گڑھ کے اس ناراض سورج نے اپنی بھٹی سلگائی، باہر قدموں کی چاپ سن کر میری بیتی رات کا وہ ساتھی، شب گرد جلدی سے دوڑ کر قید خانے کی ایک ابھری ہوئی اینٹ کی اوٹ میں جا کر چھپ گیا۔ آنے والے جبروت کے دو غلام تھے۔ انہوں نے گھسیٹ کر مجھے کھڑا کیا اور کوٹھڑی سے باہر دھکیلا۔ زندان سے نکلنے سے پہلے میری نظر چوہے کی نظر سے ٹکرائی۔ میرے دل نے کہا ”شکریہ دوست تم نے مجھے زندگی کا ایک نیا سبق دیا۔ اگر قسمت میں کچھ سانس مزید لکھی ہیں تو اب بڑے سے بڑے جبر کا سامنا بڑی آسانی سے کر سکوں گا۔“ وہ دونوں غلام مجھے دھکیلے ہوئے اسی احاطے کی طرف بڑھنے لگے، جہاں میں نے جبروت کا پہلا تماشا دیکھا تھا۔ جیسے جیسے ہم تنگ راہ داریوں سے گزرتے ہوئے قلعے کے بیرونی احاطے سے نزدیک ہوتے گئے، ویسے ویسے کسی ہجوم کی مکھیوں جیسی جھنڈا ہٹ کا شور بڑھتا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم دیواروں کی پرلی جانب جمع ہو رہا ہے۔ میں فی الحال برآمدوں کے اندر سایوں سے گزر رہا تھا اور پھر جیسے ہی میں نے آخری غلام گردش کے ختم ہونے پر، کھلے احاطے میں آگ برساتے سورج کی روشنی میں، پہلا قدم رکھا تو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ احاطہ لوگوں

ہوئی اور ایک کرخت چہرے والا بوڑھا ہاتھ میں بڑا سا گیس لیپ لیے برآمدے میں نکل آیا۔ وہ اوپر ہی سے چلا کر بولا۔ ”لے آئے ہو انہیں۔ بند کردو، الگ الگ کمروں میں۔ صبح سردار لوٹ کر ان کا فیصلہ کرے گا۔“ اکرم کے ساتھ کھڑے کارندے نے مجھے ایک جانب دھکیلا اور دوسرے نے نوری کے باپ کو دوسری جانب دھکا دیا۔ اوپر سے بوڑھا چلا یا۔ ”لڑکی کو چھوٹی سرکار کے پاس لے جاؤ اور بوڑھے کو بند کر دو۔“ نوری چلائی۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ لیکن اتنی دیر میں نہ جانے اندھیرے میں کہاں سے دو عورتیں برآمد ہوئیں اور نوری کو کھینچے ہوئے ایک جانب لے گئیں۔ قلعہ نوری کی چیخوں سے کچھ دیر کے لیے گونجا اور پھر نوری کی آواز اندھیرے میں ڈبٹی چلی گئی۔ مجھے اور نوری کے باپ کو پہلے ہی چاروں کارندے قابو کر چکے تھے۔ نوری کے باپ نے بہت دہائی دی، فریاد کی لیکن ان لوگوں پر بھلا ایسی فریادوں کا کیا اثر ہونے والا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ہم دونوں کو کال کوٹھڑی نما چھوٹے علیحدہ کمروں میں دھکیل کر باہر سے تالا ڈال کر واپس جا چکے تھے۔ بوڑھے کی باتوں سے تو یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ جبروت فی الحال کال گڑھ میں موجود نہیں تھا اور کل اس کی واپسی متوقع تھی۔ لیکن وہ اس قدر شاطر تھا کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی نوری کے پہرے کا تمام بندوبست کر کے گیا تھا۔ نوری اور اُس کے بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی اور پھر وہاں سلطان بابا بھی تو میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اور جب میں رات بھر مزار نہیں پہنچوں گا، تو وہ بھی تو پریشان ہو جائیں گے۔ سچ ہے کہ تقدیر ہمارا تدبیروں سے ایک چال، ہمیشہ آگے ہی رہتی ہے۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ اس چھوٹے سے خانے نما کمرے میں صرف ایک مختصر سا روشن دان موجود تھا، جس میں گلوہے کی سلاخوں سے باہر آسمان پر چمکتا چاند مجھے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی گول روٹی کو چھری سے چار حصوں میں افقی رخ پر تقسیم کر دیا گیا ہو۔ ابھی کچھ گھنٹوں پہلے مجھے اسی چاند کی روشنی سے شکایت تھی اور اب اس اندھیری کوٹھڑی میں پھر اسی کی چاندنی اپنا نور بکھیر کر میری وحشت کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلو اچھا ہے کہ قدرت کی نعمتیں بھی انسانوں کی طرف ہماری ناشکری پر ہم سے رُوٹھ نہیں جاتیں، ورنہ آج تک ہم میں سے نہ جانے کتنے بارش، ہوا، بادل، دھوپ، خزاں، بہار اور اس جیسی نہ جانے کتنی سوغاتوں سے محروم ہو چکے ہوتے، کہ انسان کی تو فطرت ہی شکوہ ہے۔ میرے ہاتھ اس مضبوطی سے پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے کہ رسی کے سخت ریشتے کلائیوں کی جلد میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ میں اسی طرح بندھے ہاتھوں کے ساتھ اندھیرے میں دیوار ٹٹول کر ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ دفعتاً سامنے والی دیوار کی جانب ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور اندھیرے میں دو دیا سلاخیاں سی جلتی ہوئی نظر آئی۔ میرے جسم کو پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک ایک سردی لہر جھوڑ گئی۔ یہ کی جہاز ی ساز کے چوہے کی ”آنکھیں تھیں جو اندھیرے میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ بالکل میرے پیروں کے قریب بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے بچپن ہی سے جن چیزوں سے شدید کراہت محسوس ہوتی تھی، چھپکلی اور چوہا اُن میں سرفہرست تھے۔ کہاں تو ان جان داروں کی صرف کمرے میں موجودگی کے احساس ہی سے میری رگیں تن جاتی تھیں اور میں ایک لمحہ بھی

## کبھی ہم بھی خوبصورت تھے

اچانک وہ زور سے دھاڑا ”تو تم ہو عبد اللہ..... جسے سولی چڑھنے کا شوق اس بستی تک کھینچ لایا ہے۔ دینے کی بات ہے تمہاری ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی۔ جبروت کی پسند کو بھگالے جانے کی کوشش کرنے والا یا کوئی دیوانہ ہو سکتا ہے یا پھر وہ جسے خودکشی کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ سوجھا ہو۔ کب سے چل رہا ہے یہ پکر..... لڑکی کی رضا مندی بھی شامل تھی، تمہارے ساتھ بھاگنے میں یا تم ہی نے اُسے درغلا یا تھا۔؟“ مجھے بس سنا چھایا ہوا تھا۔ میں اتنی دُور سے بھی سلطان بابا کی تسبیح کے دانے گرنے کی آواز سن سکتا تھا۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا ”میں اسے بھگا کر نہیں لے جا رہا تھا۔ لڑکی کا باپ بھی میرے ساتھ تھا اور وہ شہر جانا چاہتے تھے، کیوں کہ لڑکی کو تمہارا رشتہ منظور نہیں۔ ساری بستی یہ بات جانتی ہے۔“ میری بات سنتے ہی جہت کے منہ سے غصے کے مارے کف پہنے لگا۔ اُسے شاید اتنے براہ راست جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ زور سے پلایا ”سب بکواس ہے۔ مزار کے متولی اور مجاور کے بھیج میں تم لوگ یہ دھندے کرتے ہو۔ بردہ فروشی کے لیے یہی جگہ ملتی تھی تم لوگوں کو..... میں جانتا ہوں ہماری بستی کی عورتیں بہت معصوم ہیں۔ ضرور اس کا باپ بھی نہمارے بہکاوے میں آگیا ہوگا۔ بہر حال لڑکی بھی تمہارے ساتھ جرم میں برابر کی شریک ہے اور میری عدالت تم دونوں کو.....“ اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ سلطان بابا کی آواز گونجی ”کوئی بھی عدالت فیصلہ دینے سے پہلے ملزم کو صفائی کا پورا موقع دیتی ہے۔ تو پھر یہ تمہاری کیسی عدالت ہے، جو خود ہی وکیل ہے اور خود ہی منصف.....“ جبروت چونک کر پلٹا۔ یہ آج کی دوسری انہونی تھی کیوں کہ آج تک جبروت کے دربار میں کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کی بات کاٹ سکے۔ وہ پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا ”اودہ..... چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ..... میں بھول گیا تھا کہ گروہ کا سرغنہ بھی یہیں موجود ہے۔ اتفاقاً ایک بارش کیا برس گئی تم نے تو خود کو اس بستی کا مسیحا ہی سمجھ لیا۔ چلو کیا یاد کرو گے، جبروت کی عدالت تمہیں تمہارے ساتھی کی وکالت کا موقع بھی دیتی ہے۔ پھر نہ کہنا کال گڑھ میں تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔“ جبروت نے داد طلب نظروں سے مجمع کی طرف دیکھا جہاں کچھ بزرگ ندامت کی وجہ سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ جبروت جہوم کی خاموشی سے چڑسا گیا۔ اُسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ بستی کے بہت سے لوگ دل ہی دل میں اس تماشے سے خوش نہیں ہیں۔ اب یہ خود اس کی اپنی انا کا مسئلہ بھی بننا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی اگر ہمیں مہرت کی مثال نہ بناتا تو اس کی سلطنت کے قلعے میں یہ پہلی نقب ہوتی، جو ایک کمزور اور بے بس بوڑھے کے

سے کھپا کچھ بھرا ہوا تھا۔ اور سب ہی لوگ اُسی طرح ایک گول دائرے میں کھڑے تھے جیسے رپچھ کے تمارے والے دن وہ سب یہاں جمع تھے۔ ایک جانب نوری کا باپ بھی میری طرح پشت پر بندھے ہاتھ لیے سر جھکائے کھڑا تھا۔ ان میں سے چند چہروں کی آنکھوں میں، جنہیں میں بستی میں سانول کی بیماری اور نماز استسقاء کے موقع پر دیکھ چکا تھا، تاسف اور بے بسی کی ایک لہری تھی۔ البتہ جبروت کے کارندے ہماری حالت پر خوش تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک جانب سے شور سا اٹھا اور لوگوں کے بچے ایک رستہ سامنا گیا۔ مجھے میں کچھ بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور میرا دل اٹنے لگا۔ اکرم اور دونے کارندے سلطان بابا کو لیے قلعے میں داخل ہو رہے تھے۔ سلطان بابا کے چہرے پر وہی ازلی سکون طاری تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اُن کی حالت کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دی۔ سلطان بابا نے اندر آتے ہی رُعب دار آواز میں سارے جہوم کو سلام کیا اور اطمینان سے تسبیح گھماتے ہوئے ٹھیک میرے سامنے دوسرے جانب آکر کھڑے ہو گئے۔ وہ میرے بندھے ہاتھ اور حالت دیکھ چکے تھے۔ ہم دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور مجھے لگا کہ جیسے انہوں نے مجھ سے پوچھا ہو..... ”کیسے ہو عبد اللہ میاں؟“ میں نے بھی اسی غیر مرئی رابطے سے سر ہلکا کر انہیں اپنے اچھے ہونے کا اطمینان دلایا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر زیر لب دعا دی، لیکن جانے کیوں مجھے اُن کی پلکوں کے گوشے بھیگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے جلدی سے نظر جھکا لی کہ یہ لوگ کہیں میری بیٹی پلکوں کا اس قید اور تکلیف کا شاخسانہ نہ سمجھ لیں۔ کاش دل کی کاٹ سے نکلے آنسوؤں کا رنگ عام درد کے آنسوؤں سے کچھ مختلف ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا.....

اچانک بھیڑ پر جیسے سکتے سا طاری ہو گیا۔ پہرے داروں نے جلدی جلدی اپنی جگہ سنبھالی اور پھر اچالے میں بچے تخت کے پیچھے سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا جبروت نمودار ہوا اور اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ اُس نے پہلے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس کی وہ سرد، سفاک اور تہر بھری نظر میرے چہرے پر آکر ٹھہر گئی۔ میری نظر اُس کی نظر سے ٹکرائی اور کچھ دیر ہم دونوں یونہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ مجھے اُس کی نظر میں چھپی چنگاریاں فضا میں بکھرتی سی محسوس ہوئیں۔

ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ ”خوف“ کا واسطہ دراصل ”پوشیدگی“ سے ہوتا ہے۔ جو چیز ظاہر اور واضح ہو جائے، وہ اپنا اصل خوف اور ڈر کھودتی ہے۔ اور شاید ٹھیک اسی وقت یہی کلیہ جبروت کے ذہن کے کسی کو نے میں بھی سر اٹھا رہا تھا۔ اُسے سمجھ آ گیا تھا کہ مجھ سے اور سلطان بابا سے کسی قسم کی مزید بحث اُس کا خوف، اُس کی رعایا کے دلوں سے مزید کم کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ لہذا اُس نے دربار ختم کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”تمہاری تبلیغ کا وقت ختم ہوا۔“ افسوس تم اپنے ملزم کا دفاع نہیں کر سکتے۔ لہذا میری عدالت اس لڑکے کو کال گڑھ کی لڑکی کو درغلا کر بھاگالے جانے کا مجرم سمجھتی ہے۔ لیکن اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا آخری موقع ضرور دوں گا۔ کل صبح سورج نکلنے ہی عبداللہ کو صحرا میں چھوڑ دیا جائے گا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میرے چھ پالتو کتے بھی اس کے پیچھے چھوڑے جائیں گے۔ اگر ملزم میرے شیروں کی گرفت میں آئے بغیر یہ صحرا پار کر کے اسٹیشن تک پہنچ گیا تو بے قصور سمجھا جائے گا اور باعزت بری ہوگا۔ دوسری صورت میں یہاں موجود یہ بوڑھا بھی اپنی جان سے جائے گا۔ اگر کسی کو اس فیصلے پر اعتراض ہے تو بولے۔“ مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ پیش امام نے کچھ ہمت کی اور حلق تر کر کے بولا ”میری آپ سے درخواست ہے کہ ان دونوں پر رحم کیجیے۔ یہ اس علاقے کے نہیں ہیں۔ انہیں علاقہ بدر کر دیجیے، پراقتی لڑی سزا نہ دیں۔ ہم سب کی یہی التجا ہے آپ سے۔“ جبروت کے ماتھے پر ٹٹلیں بڑھ گئیں۔ پیش امام کی دیکھا دیکھی چند اور بزرگوں نے بھی جبروت کو دہائی دی، اور اُس کے والد اور دیگر بزرگوں سے اپنے تعلق کے واسطے دیئے۔ اُس نے ہاتھ اٹھا کر سب کو یک لخت خاموش کر دیا۔ ”ٹھیک ہے۔ کل کو کوئی یہ نہ کہے کہ جبروت بے انصاف ہے۔ اگر عبداللہ اپنے جرم کا اقرار کر لے اور مجھ سے رحم کی اپیل کرے تو میں اس کی سزا میں کمی کا سوچوں گا۔“ سارے جہوم کی نگاہیں میری جانب اٹھ گئیں۔ بھیڑ کی پچھلی غلاؤں میں سے چند ایک نے اشاروں سے اپنے ہاتھ جوڑ کر آنکھوں میں آنسو بھیج دیے۔ جبروت کے معافی مانگ کر یہ قصہ ختم کر دوں۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا ”اگر میری بے گناہی کی سند یہ صحرا دے لتا ہے تو میں تمہارے پاؤں پڑنے سے یہی بہتر سمجھوں گا کہ میری قسمت کا فیصلہ یہ صحرا ہی کرے۔“ بزرگوں نے سر بیٹ لیے۔ جبروت کے اشارے پر مجھے اور سلطان بابا کو وہاں سے دھکیلتے ہوئے پھر سے ان ہی غلام لردشوں کی جانب روانہ کر دیا گیا۔ البتہ دوسری راہ داری مڑتے ہی سلطان بابا کو مجھ سے علیحدہ کر کے وہ کسی درجہ لے گئے اور مجھے دائیں جانب بنی کوٹھڑیوں میں سے ساتویں قید خانے میں بند کر دیا گیا۔

یہ کراہی گزشتہ رات والے زندان کی طرح مختصر اور تنگ تھا۔ اس میں باہر کی جانب کھلنے والا کوئی روشن لنگھی نہیں تھا۔ البتہ اوپر کی جانب دیوار میں ایک آدھا اینٹ کی جگہ خالی رکھی گئی تھی، جو شاید ساتھ والی کوٹھڑی کی جانب کھلتی تھی۔ غالباً ہوا کے گزرنے کے لیے یہ انتظام رکھا گیا ہو، کیوں کہ اس کمرے کا دروازہ بھی ناخول والا نہیں تھا لہذا سخت لکڑی کا بھدرا سا بڑا دروازہ بند ہونے کے بعد دن میں بھی اس کوٹھڑی میں آدھی تھیں جیسا گھناؤں اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں ٹٹول ٹٹول کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مھرے کانوں میں

ہاتھوں لگتی۔ لہذا اُسے اپنے تیور کڑے کرنے پڑے۔ وہ زور سے چلایا ”لیکن یاد رہے کہ اگر تم دونوں صفائی میں کچھ ثابت نہیں کر سکتے تو پھر میں تم دونوں کا وہ حال کروں گا کہ تمہاری اگلی سات سلیس یاد رکھیں بولو، کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔۔“ سارے مجمع کی توجہ سلطان بابا کی جانب ہو گئی۔ یہ اُن سب کے لیے بھی انتہائی حیرت انگیز تجربہ تھا کہ انہوں نے آج تک لوگوں کو جبروت کے قدموں میں گرتے اور گڑگڑا کر زہا بھیک مانگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ سلطان بابا کی تسبیح لگا تار گھوم رہی تھی، وہ ٹھہرے ہوئے سب بولے ”عبداللہ کی صفائی کے لیے لڑکی اور اُس کے باپ کا بیان ہی کافی ہے۔ لڑکی تم سے رشتہ نہیں کرنا اور اپنے باپ کے ساتھ شہر جا کر اپنے منگیتر سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔ تم اُسے نہیں روک سکتے۔ یہ لڑکی ہے۔ اسے شہر جانے دو۔“ جبروت نے زور کا قبضہ لگایا۔۔۔۔۔۔ بہت خوب! اسے کہتے ہیں مدعی ستا چست۔ جس لڑکی کے حق کے لیے تم مجھے نصیحتیں کر رہے ہو، اُس کا باپ تو وہاں کونے میں سر جھکا رہا ہے۔ چلو کوئی تو ہے جو جبروت کو بھی نصیحت کر سکے۔ مرنے سے پہلے کوئی اور حسرت ہو تو وہ بھی بیان کر کوشش کروں گا تمہارے ہر حکم کی تعمیل ہو۔“ کارندوں نے اپنے آقا کی حس مزاح پر مسکرا کر اُسے داد سلطان بابا نے جبروت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”ہاں۔۔۔۔۔۔ ایک خواہش اور ہے میری، اگر پورہ سکوت۔ مجھے اس بزرگ جوڑے کی نوا سی سکین کا پتا بتا دو۔ انہیں اس عمر میں مزید در بدر اور خوار نہ کرو۔“ جب ہنسنے ہنسنے ایک دم ہی چپ ہو گیا اور اُس نے اپنی تہ بھری نگاہ سلطان بابا کی اٹھی ہوئی انگلی کے تعاقب میں کی طرف دوڑائی۔ بھیڑ جبروت کی اٹھتی نگاہ سے گھبرا کر ایک دم درمیان سے یوں چھٹی، جیسے کوئی تیر کمان نکل کر اُن کی جانب لپکا ہو۔ لوگ دونوں اطراف اس طرح ہٹے جیسے کوئی ساکت پانی میں لکیر کھینچ د۔ لوگوں کی آخری قطار میں سکین کے نانا، نانی کھڑے تھے۔ پتا نہیں، وہ پہلے ہی سے اس بھیڑ کا حصہ تھے جب سلطان بابا کو لایا جا رہا تھا تو وہ بھی اسی وقت اُن کے ساتھ آ گئے۔ جبروت کی ساری زندہ دلی پل! میں ہوا ہو گئی اور وہ شدید پیش کے عالم میں چلایا۔ ”بس! بہت سن لی تمہاری، بکواس! تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارا وعظ سن کر یہاں کے لوگ میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا اُن کون ہے۔“

”نہیں یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔ اس ساری کائنات کا اُن کا اتنا صرف ایک ہی ہے۔“ سلطان بابا نے آسمان کی جانب اُٹھائی۔ ”اب بھی وقت ہے، اپنے گناہوں سے تائب ہو کر معافی مانگ لو۔ تو بہ کرلو۔ اُس کی رحمت تمہارے گناہوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ابھی تمہاری سانس چل رہی ہے لہذا وقت بھی باقی ہے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤ۔“ جبروت کے صبر کا پیمانہ اب بالکل ہی لبریز ہو چکا تھا۔ تک کسی نے اُس کے سامنے یوں سر اٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن آج اُسے ہماری آنکھوں سے اپنا مفقود دکھائی دے رہا تھا جب کہ اس کی حکومت کی تو اصل بنیاد ہی یہ ”خوف“ تھا۔ اس لمحے مجھ پر ایک اور



بار بار کال گڑھ پہنچنے کے بعد سلطان بابا کا کہا ایک جملہ گونج رہا تھا۔ ”یاد رکھنا، موت صرف جسم کے فنا ہو جانے کا نام ہے۔ موت کے بعد ہی اصل زندگی کی ابتداء ہوتی ہے۔“ تو کیا میری اس فانی جسم سے رخصتی کا وقت بھی قریب آچکا ہے۔ لیکن کیا میرے ذمے اس دنیا کے جتنے فرائض تھے، میں نے وہ سب پورے کر دیے ہیں۔ کیا میری ہر تلاش کی آخری حد یہی موت تھی۔ میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھا ہوا تھا اچانک دیوار کے اُپ والے حصے میں جہاں ایک اینٹ کی درز خالی تھی، آہٹ سی بلند ہوئی اور ایک سرگوشی سنائی دی۔ پہلے تو میرے اُسے اپنا وہم سمجھا۔ لیکن پھر جب دوسری مرتبہ کسی نے دھیرے سے پوچھا۔ ”کوئی ہے؟“ تو میں چونک کر کہہ ہو گیا۔ ”میں عبداللہ ہوں، تم کون ہو.....؟“ دوسری جانب سے آواز آئی ”شش..... آہستہ بولو۔ جبروت کے کتے نے اگر تمہاری آواز سن لی تو غضب ہو جائے گا۔ میں پانچ مہینوں سے اس قید تہائی میں پڑا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری باتوں کی آواز سن کر کوئی تمہاری کوٹھڑی بدل دے۔ ترس گیا ہوں میں کسی کی آواز سننے کسی سے بات کرنے کے لیے۔“ مجھے حیرت ہوئی ”لیکن تم کون ہو اور تمہیں کس جرم میں اتنی لمبی قید دی گئی ہے.....؟“ ”میرا نام خانو ہے۔ پانچ ماہ پہلے میں بھی جبروت کے وفادار کتوں میں شامل تھا۔ ایک ذرا چوک ہوئی اور اس ظالم نے مجھے یہاں لاپھٹک لایا۔ سب میرے گناہوں کی سزا ہے۔ اب ساری زندگی مجھے کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے ہم سے پہلے یہاں نہ جانے کتنے اپنی سائیس ہار چکے ہیں۔“ اچانک دُور کہیں آہٹ سنائی دی۔ وہ جلدی سے بولا ”کوئی آ رہا ہے، اندھیرا ہونے کے بعد بات کروں گا۔“ وہ بولا بھی تھا، دیوار سے دُور ہٹ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی نے خشک روٹی کے چند ٹکڑے اور عجیب سے رنگ کا ٹھوس ایک ٹرے میں رکھ کر دروازے کے نیچے، درز سے اندر کھسکا دیا۔ اور زور سے ہنسا ”کھانا کھا لو جو ان اکل نہیں صحرا بھی پار کرنا ہے اور خالی ٹرے واپس کھسکا دینا۔“ پھر دوسری ٹرے سرکانے کی آواز آئی ”لے بھائی خانو بھی عیش کر۔ پھر نہ کہنا یاد اور یاروں کا خیال نہیں رکھتا۔“ جواب میں خانو نے شاید یاد رہی بندے کو کوئی دی۔ آواز مہم تھی، لیکن یاد کے قہقہے مجھے راہ داری کے آخر تک سنائی دیتے رہے۔ میں نے کھانے کی ٹرے واپس باہر کھسکا دی اور آنکھیں بند کر کے دیوار کے ساتھ کمر کا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد بھی تو اُجالے ہمارے اندر اُتر آتے ہیں۔ خاص طور پر جب آس پاس ایسا گھناؤنا پ اندھیرا ہو۔ سو میں بھی باہر تارکی سے منہ پھیر کر بند آنکھوں تلے اپنے اندر کے اُجالوں سے باتیں کرنے لگا۔ جانے کتنے گھنٹے یوں گزر گئے۔ پھر دوبارہ دیوار کی درز سے آواز اُبھری۔ ”عبداللہ تم جاگ رہے ہو.....؟“ مجھے اُس کا سوال ہنس آگئی۔ ”تو تمہارا کیا خیال ہے میں اس آرام دہ کمرے کی سہری پر ٹیک لگائے اپنے غلاموں کا انتظار کرتے سو گیا ہوں؟“ دوسری جانب شاید خانو کے ہونٹوں پر بھی صدیوں بعد کوئی مسکراہٹ اُبھری ہوگی۔ ہی وہ بولا ”زندہ دل لگتے ہو۔ یہاں کیسے آچھنے؟“ میں نے مختصر اُپنا جرم بتا دیا۔ خانو دوسری جانب سے خند لہجے میں بولا ”تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ وہ اس سے کہیں زیادہ گرا ہوا، خطرناک اور کمینہ صفت انسان ہے۔“

اب سبھی بھی اُس کے چنگل سے نہیں نکل پائے گی اور اسی قلعے میں سسک سسک کر دم توڑ دے گی۔ اس سے پہلے بھی نہ جانے کتنی معصوم لڑکیاں اس ورنڈے کی ہوس کا شکار ہو چکی ہیں۔ آج زندگی میں پہلی بار تمہارے سامنے یہ اقرار کرتے ہوئے میں خود کو بھی انتہائی گرا ہوا انسان محسوس کر رہا ہوں کہ کل تک میں خود بھی اس کے کسی پالتو کی طرح اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا آیا ہوں۔ جانے کتنے بے گناہوں کے خون سے جانے انجانے میں صرف اس کی خوشنودی پانے کی خاطر ہاتھ رنگ چکا ہوں میں۔ اور آج شاید انہی مظلوموں میں سے کسی کی آنے مجھے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔“ خانو نہ جانے ماضی کی کن بھول بھلیوں میں کھو گیا تھا۔ اچانک میرے بہن میں ایک کوندالپا اور میں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز بلند ہونے سے روکی۔ ”سنو خانو! کیا تم سیکنہ نامی کسی لڑکی کو جانتے ہو۔ اُسے بھی اسے قلعے کی طرف ہی لایا گیا تھا.....؟“ میری بات سنتے ہی دوسری جانب کچھ دیر کے لیے سنا سنا چھا گیا اور پھر خانو کی بیچانی سی آواز سنائی دی۔ ”تم سیکنہ کو کیسے جانتے ہو..... خدا کے لیے بتاؤ۔ پچھلے پانچ مہینوں سے مجھے اُس لڑکی نے سونے نہیں دیا۔ جب بھی ذرا دیر کے لیے آنکھ لگتی ہے وہ برے خواب میں چلی آتی ہے۔ مجھے اُس کی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ تمہارا اُس لڑکی سے کیا تعلق ہے۔ میں اپنے گناہوں کا تمہارے سامنے اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس درد اور خوف کے عذاب سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ میری مدد کرو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔“ خانو کا ہجکان اس قدر بڑھنے لگا تھا کہ خطرہ محسوس ہوا کہ اس کی بلند ہوئی آواز آس پاس کے پہرے داروں کی ہوشیار نہ کر دے۔ بڑی شکل سے میں نے اُسے یہ احساس دلایا کہ ہم دونوں کہاں ہیں۔ کچھ دیر بعد خانو کا جنون کچھ کم ہوا تو اُس نے میرے دھیرے سیکنہ کی کہانی میرے گوش گزار کرنی شروع کی، جسے سن کر خود میرے اپنے ہاتھ پاؤں بے باں سے ہوتے گئے۔

خانو نے بتایا کہ آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے رات کی گاڑی کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر معمول سے کچھ زیادہ دیر کے لیے ٹھہری تھی۔ شاید انجن ٹل ہو گیا تھا۔ گرمی اور جس سے گھبرا کر لوگ پلٹ فارم پر اُتر آئے۔ نامی میں وہ نوجوان جوڑا بھی تھا، جسے رحمان گڑھ جانا تھا۔ لڑکی شرماتی اور گھبرائی ہوئی سی تھی۔ صاف ظاہر رہا تھا کہ ان کی شادی کو ابھی پورا ہفتہ بھی نہیں گزرا ہوگا۔ کیوں کہ لڑکی کے ہاتھوں کی مہندی تک تازہ تھی۔ رہا گ کا سرخ جوڑا ابھی تن پر موجود تھا۔ جبروت کا خاص کارندہ، اکرم اپنے دو مزید ساتھیوں کے ساتھ اس تپت پلٹ فارم پر موجود تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ وہ رات کی گاڑی دیکھنے کے لیے اسٹیشن ضرور آتا تھا۔ کبھی لہجہ کوئی اچھا ”شکار“ ہاتھ لگ جاتا تھا اور آقا کو خوش کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ جاتا تھا۔ اُس دن خانو بھی اُن کے ساتھ آیا تھا۔ اسی اثناء میں پلٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے اُن کی نظر اس جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کو شاید پیاس ستا تھی گی اور لڑکا پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہا تھا لیکن اس صحرائی اسٹیشن پر بھلا پانی کہاں میسر تھا۔ لڑکے کے مسافروں کے پاس جو تھوڑا بہت پانی تھا، وہ صحرا کے سفر اور پھر اس ویران پلٹ فارم پر گاڑی کے

ملی تو سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ وہ گھبرا کر جھٹکے سے کھڑا ہوا تو بستر سے گرتے گرتے بچا۔ ایک دوسرا جھٹکا اُس  
 نظر تھا۔ وہ اُسی خادمہ کے کمرے میں موجود تھا۔ جورات اُسے کھانا دینے آئی تھی۔ رحیم نے چلا کر اُس سے  
 ہٹا کر وہ یہاں تک کیسے پہنچا اور کیسے کہاں ہے.....؟“ خادمہ کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی باہر کا دروازہ  
 زور سے پیٹا جانے لگا۔ رحیم بخش نے دروازہ کھولا تو تین چار مرد غصے میں تن تناتے ہوئے اندر داخل  
 ہوئے اور آتے ہی رحیم بخش پر چڑھ دوڑے کہ وہ قلعے کی خادمہ کے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔ رحیم چلاتا ہی رہ  
 اکر وہ تو خود اپنی سیکین کو تلاش کر رہا ہے لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور بات اتنی بڑھی کہ قلعہ دار کی عدالت کا  
 ازہ کھٹکنا یا گیا۔ وہاں اکرم اور خانو کو جبروت کے دائیں بائیں کھڑے دیکھ کر رحیم کو سارا ماجرا سمجھ آ گیا کہ  
 اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن اُس کے ہزار چیخنے چلانے کے باوجود اُس پر خادمہ کے کمرے میں  
 دتی نئے کے عالم میں داخل ہونے کا الزام لگا کر صحر پاد کرنے کی سزا سنائی گئی۔ البتہ اُس وقت جبروت کا  
 رعام نہیں تھا۔ قلعے کے اندر صرف اُس کے چند خاص کارندے ہی موجود تھے۔ سیکین کو اُس رات بستی کی  
 نی ست ایک کچے مکان میں قید رکھا گیا تھا اور جبروت کے حکم ہی پر اگلی رات اُسے خانو اور اکرم اٹھالائے  
 آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ رحیم کبھی وہ صحر پاد نہیں کر سکا۔ سیکین اُس رات جبروت کی خواب گاہ پہنچا دی  
 ، لیکن تب بھی وہ ایک زندہ لاش ہی تھی اور جب صبح اُسے باہر نکالا گیا، تب وہ اس سانس لینے کے تکلف  
 بھی آزاد ہو چکی تھی۔ کچھ نے کہا کہ وہ خود ہی پھندا لے کر اس ذلت بھری زندگی سے منہ موڑ گئی اور کچھ نے  
 بھی جبروت کے قاتل پنچوں کے دباؤ کا شکار قرار دیا۔ بہر حال سیکین مر گئی..... خانو پُچ ہو کر ہانپنے لگ  
 اور میرے زمین و آسمان ایک ہونے لگے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے صرف سیکین ہی نہیں مری، کال گڑھ  
 ہر گھر میں موت نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ تب ہی اس بستی میں مجھے ہر پل ماتم کی سی کیفیت محسوس  
 آتی۔ کہتے ہیں، کچھ خون ایسے ہوتے ہیں جنہیں زمین کا دامن بھی خود میں سمیٹنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ خانو  
 زور سے رورہا تھا۔ ”جس دن سے سیکین مری ہے، میں ایک لمحہ بھی چین سے جی نہیں پایا۔ مجھے یوں لگتا ہے  
 رہا میرے سس پاس پھرتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے کہ مجھے کیوں مار دیا۔ ابھی تو میں نے جینا بھی نہیں  
 مانتا۔ ابھی تو شادی کا پرندہ بھی میرے بالوں سے نہیں کھلا تھا۔ ابھی تو مجھے تیلیاں پکڑنی تھیں۔ جگنوؤں  
 پیچھے بھاگنا تھا۔ ابھی تو مجھے اپنے رحیم بخش کے ساتھ رنگوں کی پہچان کرنی تھی۔ ابھی تو میری کئی خواہشیں  
 محسوس۔ پھر تم نے ان کا گلا کیوں گھونٹ دیا۔“ خانو نہ جانے کیا کیا بولتا رہا اور میرا چہرہ نمکین پانی سے جلنے  
 جانے وہ میری کون تھی۔ مجھے ہی اُس کی شبیہ اُس کی موت کے بعد کیوں دکھائی دی؟ کیا واقعی آواز کی  
 سا کی طرح ہماری تصویریں بھی خلا کی کسی تہ میں ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتی ہیں۔ جس طرح لوگ اپنی  
 تہ کے بعد بھی خوابوں میں زندہ نظر آتے ہیں، کیا میں بھی کسی ایسے ہی خواب کا شکار ہوا تھا؟ کیا یہ صحر مجھے  
 لولی کا خواب دکھا رہا تھا۔ میرا سر درد کے مارے پھٹنے لگا۔ میں روتے ہوئے خانو کو دو بول تسلی کے بھی نہ

تین گھنٹے کے اس غیر متوقع شاپ نے ختم کر دیا تھا۔ اور اُس وقت سب ہی مسافر پانی کی تلاش میں سرگرم  
 تھے۔ رہی سہی کسر اس غضب کی گرمی اور جس نے پوری کر دی تھی۔ ایسے میں اکرم کی لڑکی پر نظر پڑی اور پل  
 کر ہی رہ گئی۔ اُس نے خانو اور دوسرے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ تینوں اُس لڑکی کی جانب بڑھ گئے۔ ٹرین  
 عملے نے اعلان کر دیا کہ انجن فیل ہونے کی وجہ سے قریب ترین جکشن سے دوسرا انجن منگوا لیا گیا ہے لیکن کال  
 پہنچتے پہنچتے وہ انجن بھی پانچ گھنٹے لگا۔ یعنی صبح تک انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اتنے میں لڑکی کا شہ  
 ناکام و نامراد بنانا پانی کے واپس آ پہنچا۔ یہی وہ موقع تھا جس کا انتظار وہاں کھڑا اکرم کر رہا تھا۔ اُس نے فوراً  
 اور موڈ بانہ لہجے میں لڑکے سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو اُن کے ساتھ بستی تک چل کر پانی  
 کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آئے۔ لڑکا جس کا نام رحیم بخش معلوم ہوا، کچھ تذبذب کا شکار تھا کہ وہ  
 نوبیا ہتا بیوی کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہے۔ اکرم نے فوراً پانسہ پھینکا کہ رحیم بخش چاہے تو اپنی بیوی  
 ساتھ لے لے۔ اس کے دونوں ساتھی یہیں اسٹیشن پر ٹھہر کر ان کے سامان کی حفاظت کریں گے اور رحیم  
 اپنی بیوی سمیت جیپ میں اکرم کے ساتھ جا کر ٹرین کے سب ہی مسافروں کے لیے پانی اور کچھ پھل  
 لے کر واپس آجائے گا۔ آخر کچھ پس و پیش کے بعد رحیم بخش اس بات کے لیے راضی ہو ہی گیا اور اپنی  
 کو لے کر اکرم کے ساتھ چل پڑا۔ لڑکی کو وہ سیکین کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، جو کافی پریشان سی دکھائی دیتی تھی۔  
 نے آنکھوں آنکھوں میں رحیم بخش کو منع کرنے کی کوشش کی لیکن اکرم اس دوران رحیم بخش سے اس قدر  
 تکلف ہو چکا تھا کہ رحیم بخش جیسے سیدھے سادے انسان کو وہ اس وقت دنیا کا سب سے بھلا آدمی دکھائی  
 دیے بھی اکرم جیسے گھاگ شخص کے لیے اس ذہنیاتی لڑکے کو اپنے جال میں پھانسا قطعی مشکل ثابت نہیں  
 خانو اور دوسرا ساتھی دکھاوے کے لیے اسٹیشن ہی پر رُک گئے اور پھر اکرم اور جوڑے کے پلیٹ فارم سے  
 ہی دوسرے راستے سے کال گڑھ کے لیے نکل پڑے۔ اکرم جیپ میں رحیم بخش اور سیکین کو لیے سیدھا کال  
 کے قلعے پہنچ گیا اور انہیں بیرونی احاطے کے ایک مہمان خانے میں چھوڑ کر جبروت کو اپنے ”کارنائے“  
 اطلاع دینے چلا گیا۔ سیکین اور رحیم بخش کے لیے کچھ ہی دیر میں ایک خادمہ کھانا لے پہنچ گئی۔ رحیم کو کچھ  
 تھی۔ اُس نے خادمہ سے کہا کہ انہیں واپس پلیٹ فارم پہنچنا ہے لہذا یہ کھانے وغیرہ کا تکلف نہ کیا جائے  
 خادمہ نے اُسے بتایا کہ اکرم ٹرین کے باقی مسافروں کے لیے پانی اور کھانے وغیرہ کا انتظام کر کے جب  
 آئے گا، تب تک اُسے یہی حکم ہے کہ جوڑے کو کھانا کھلا دیا جائے۔ خادمہ نے کھانے کے دوران کچھ  
 پھولوں والی اور دھنی کی بہت تعریف کی۔ سیکین نے اُسے بتایا کہ یہ چادر اُس کی بوڑھی نانی نے اس بڑھا چا  
 بھی خاص اپنے ہاتھوں سے سیکین کی شادی کے لیے کاڑھی ہے۔ خادمہ نے درخواست کی کہ سیکین جب  
 یہاں سے دوبارہ گزرے اُس کے لیے بھی ایسی چادر ضرور بنوائی لائے۔ سیکین نے بھی وعدہ کر لیا۔ اُن غی  
 گیوں میں رحیم بخش اور سیکین نے کھانا کھایا اور خادمہ برتن لے کر واپس چلی گئی۔ اس کے بعد رحیم بخش کی

اُن کی لاڈلی سیکینہ بھی اب مٹی کا حصہ بن چکی ہے۔ میں نے خانو سے آخری سوال پوچھا ”کیا تمہیں سیکینہ کی قبر کا کچھ اتنا پتا معلوم ہے۔ اُس کے درياء کو اور کچھ نہیں تو اُس کی لحد کا نظارہ ہی نصیب ہو جائے تو شاید اُن بد نصیبوں کو کچھ قرار مل سکے۔“ خانو کچھ سوچ میں پڑ گیا ”یہاں کم ہی خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جنہیں باقاعدہ کوئی قبر نصیب ہوتی ہے۔ ٹھہرو مجھے سوچنے دو۔ سیکینہ کو تو شاید اسی احاطے میں دفنایا گیا تھا۔“ ”کیا.....؟“ لفظ تھے کہ انکارے..... میری سانسیں رُکنے لگیں۔ ”اسی احاطے میں دفنایا تھا۔ ٹھیک سے یاد کرو، کہاں۔ یہ بہت ضروری ہے خانو.....“ خانو نے اپنا سر پیٹا ”ارے ہاں..... یہی تو جگہ تھی۔ اسی برآمدے میں دائیں جانب سے ساتویں کوٹھڑی تھی۔ ہاں ہاں، ساتویں کوٹھڑی ہی میں اُسے دفنایا تھا ہم نے۔“ خانو کی بات سنتے ہی میں چکر اکر اپنی جگہ ڈھے سا گیا۔ زمین کی گردش رُک گئی۔ آسمان پلٹ گیا اور زمین اونڈھی ہو گئی۔ مجھے جس کوٹھڑی میں قید کیا گیا تھا، اس کا نمبر داہنی طرف سے ساتواں ہی تھا۔ سیکینہ اسی زمین کے نیچے دفن تھی، جہاں میں اس وقت اپنا شکستہ وجود لیے بیٹھا تھا۔

کہہ سکا۔ پھر اچانک جیسے وہ خود ہی ہوش میں آ گیا۔ ”سنو عبداللہ..... مجھے تم سے کچھ بہت ضروری بات ہیں۔ میں نے ساری زندگی کوئی نیک کام نہیں کیا اور شاید میرا آخری وقت بھی اب کچھ زیادہ دُور نہ جاتے جاتے میں ایک اچھا کام کرنا چاہتا ہوں۔ کل صبح جس صحرا سے تمہارا مقابلہ ہوگا وہ اس سے پہلے کتنے معصوموں کا لہو ہی چکا ہے، لیکن اگر تم میری چند باتیں دھیان سے ذہن نشین کر لو تو تم اس صحرا اور کے درندہ نما کتوں کو شکست دے سکتے ہو۔ تمہیں صحرا میں جس سمت دوڑنے کو کہا جائے گا، بظاہر اس تاثر ملے گا کہ اگر تم سیدھ میں دوڑتے رہے تو ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے اور تمہاری جاں بخشی گی۔ یہ درست نہیں۔ اول تو یہ خوں خوار صحرا ایک گھٹنے کی مسافت پر واقع اسٹیشن تک پہنچنا ہی نا کا ہے۔ لیکن بالفرض کوئی خوش قسمت اسٹیشن تک پہنچ بھی جائے تو وہاں اُسے اکرم اپنا انتظار کرنا ہوا۔ پندرہ منٹ تک لگا تار بھاگنے کے بعد ساتویں بڑے ٹیلے سے دائیں جانب کو مُڑ جانا۔ کتے تمہاری جانب پلٹیں گے، لیکن تب مقابلہ برابر کا ہوگا، کیوں کہ اُن کے لیے بھی تمہاری طرح یہ علاقہ بالکا گا۔ وہاں سے ٹھیک سات میل کے فاصلے پر سرحد کی جانب سے آتی ایک نیم پختہ سڑک گزرتی ہے۔ سڑک تک پہنچ گئے تو سمجھو کہ آدھی جنگ تم جیت گئے۔ کیوں کہ سڑک پر مشرق کی طرف دوڑتے رہنے تمہیں فوج کی کوئی چوکی مل جائے گی یا پھر کیکڑا.....“ میں نے حیرت سے دہرایا ”کیکڑا.....؟“ ”ہاں مال برداری اور مسافروں کے لیے سرحد کی طرف سے جو کھلے ٹرک نما عجیب ہیئت کی گاڑی چلتی ہے، یہاں کیکڑا کہتے ہیں۔ یہ سواری تمہیں کسی بھی سرحدی بستی تک پہنچا دے گی، جہاں سے تم اپنی مرضی پناہ تک پہنچ سکتے ہو۔ لیکن یاد رکھنا..... تمہیں مستقل بھاگتے رہنا ہوگا۔ پیچھے دنوں یہاں بارش ہوئی قسمت نے تمہارا ساتھ دیا تو شاید راستے میں تمہیں کوئی برساتی جو ہرل جائے لیکن ہوشیار رہنا دو گھن زیادہ پانی پینے کی کوشش کی تو وہیں گر جاؤ گے۔ صرف ہونٹ ترکر کے آگے بڑھ جانا۔ اس شدید پیاسر بھی تمہارے لیے زہر ثابت ہوگا۔ اور تمہارا دل بند کر دے گا۔ ایک اور ضروری بات، کوشش کرنا کہ دوڑتے وقت سانس منہ کی بجائے ناک سے لو اور سورج کو براہ راست دیکھنے سے مکمل گریز کرنا۔ جو کر نیٹے میں اُڑس لینا، پھینکنا نہیں۔ پاؤں شروع میں گرم ریت میں جھلسیں گے لیکن تلوؤں کی جلد پو جل جانے کے بعد احساس ختم ہو جائے گا۔ پانی میسر آتے ہی کوئی رد مال وغیرہ اچھی طرح بھگو کر لیتا۔ اور میں پھر کہہ رہا ہوں کہ بھاگتے رہنا۔ یہ تین ساڑھے تین گھنٹے تمہیں اپنی زندگی کی دوڑ دوڑ۔ ہی جیتی ہے۔ اگر گناہ گاروں کی دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں تو میں آج زندگی میں پہلی اور آخری دعا کہ خدا تمہیں اس امتحان میں کامیاب کرے.....“ خانو کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی۔

صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ مجھے رہ رہ کر سیکینہ کے بوڑھے نانائانی کا دھیان ستارہ تھا۔ اُج کہ میں دوبارہ اُن کا سامنا کرنے سے پہلے ہی صحرا کی ریت میں خاک ہو جاؤں ورنہ میں انہیں کیسے

## اک نئی جنگ

مانے جانے ان نسلوں سے غلام چلے آتے لوگوں کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ وہ ایک آزاد ملک کے شہری ہیں نہیں۔ غلامی زنجیروں میں بندھے رہنے ہی کا نام نہیں ہوتا۔ غلامی تو ایک خاص رویے کا نام ہے، جو ذہنوں کو سخر کر لینے سے وابستہ ہے اور جبروت کو پتا تھا کہ ذہنوں کو مسخر کیسے کیا جاتا ہے۔ رُوحوں کا تو پتا نہیں، پر سموں کو خیر کرنے کے لیے وہ خوف کے ہتھیار کا استعمال کرتا تھا۔ اُسے لوگوں کو حیران اور خوف زدہ کر کے مزا تا تھا۔ یہ سارا تماشا اُس نے اپنے جنوں کی سیرابی کے لیے ہی لگا رکھا تھا۔ دو تین سال پہلے میں اور میرا دست، کاشف لندن گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے گئے تھے تو ہمیں پکا ڈلی کے علاقے میں ایک عجیب لب کے بارے میں پتا چلا تھا۔ وہاں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو خود کو سانپوں سے ڈسواتے ہوئے دیکھا۔ وہاں لوگ اسے ایڈرنا لین رَش (Adrenaline Rush) کا کھیل کہتے تھے۔ ہمارے جسم میں موجود بے مادے (ہارمون) کے بہنے کا تعلق شدید خوف سے ہوتا ہے۔ مغرب میں جہاں لوگ ہر قسم کے تفریح رُجرے سے گزر چکے ہوتے ہیں، اُن کے لیے زندگی ایک بے کیف سامعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے میں بچہ من چلے اپنے جسم میں خون کی روانی بحال رکھنے کے لیے عجیب و غریب قسم کے مشاغل اختیار کر لیتے ہیں۔ دلی بہت بلندی سے چھلانگ لگا لیتا ہے، کچھ سانس بند کرنے کی کوشش میں جان سے جاتے ہیں، کچھ ریوالتور لے ایک جیبر میں گولی رکھ کر ٹریگر دبانے کا کھیل کھیلتے ہیں اور کچھ وائٹ گولڈ (ہیروئن کی ایک نئی قسم) کے وف کو اپنے ہتھوں کے ذریعے اس طرح دماغ کے خلیوں تک پہنچاتے ہیں کہ پھر وہ سدا کے لیے کسی اور ال کے باسی بن جاتے ہیں۔ لیکن اس ایڈرنا لین رَش (Adrenaline Rush) کا یہ جان لیوا نشہ باقی منشوں کا سر تاج بن جاتا ہے۔ وہ خود کو موت کے منہ میں ڈھکیل کر اس قضا کو بل پل اپنی رگوں میں اُترتا ہوا سوس کرنے میں ایسی سدا بہار لذت پاتے ہیں، جو انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتی ہے۔ جبروت نالایع ہی کسی نشے کا شکار اور رسیا تھا۔ یہ بات مجھے اُسی دن محسوس کر لینی چاہیے تھی، جب میں نے اُسے مجھ سے اپنے کتے لڑاتے اور خون کے چھینٹے اڑتے دیکھ کر یہجانی انداز میں خوشی مناتے ہوئے دیکھا۔ ٹھیک ایسی ہی خوشی وہ اُس وقت بھی محسوس کرتا ہوگا، جب اُس کے پالتو شکاری صحرا میں اپنے شکار کی بوٹی کر کے اُس کے خون آلود کپڑے اپنے جڑوں میں دبائے واپس اپنے آقا کے پاس دوڑے چلے آتے۔ مغرب ایسے جنونیوں کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے، جو صرف یہجان کی خاطر قاتل بنے اور پھر کبھی جیک رابر (Jack The Ripper)۔ کبھی فرینکلنسن (Frankinstine) اور کبھی فریڈی کے نام سے مشہور سنے ٹھیک اُسی طرح اس وقت میرے سامنے جیپ سے اُتر کر اپنے کتوں کو والہانہ پیار کرنے والا یہ جنونی ل بھی کسی ایسی ہی نفسیاتی بیماری کا شکار تھا۔ جسے خود کو جابر سے جبروت بنانے میں جانے کتنے سال لگے۔ سگے کہتے ہیں، نام بھی ہماری شخصیت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کا ایک مظاہرہ تو میں اپنے سامنے ہی برہا تھا۔ جبروت اپنے کتوں کو پیار کر کے میری طرف بڑھا۔ ”ہاں تو تم تیار ہو، مقابلے کے لیے۔ اب بھی

سورج نکلنے تک میں وہیں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے پاؤں آخری حد تک سکیڑ کر گھٹنے اپنے سینے کے ساتھ اُس وقت تک جوڑے رکھے، جب تک مجھے لینے والے وہاں پہنچ گئے۔ میں اُس مظلوم لڑکی کے لیے اور تو کچھ نہ کر پایا لیکن اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ اُس کے مدفن پر اپنے پا پھیلا کر نہ بیٹھوں۔ باہر آئیں بلند ہوئیں تو میں نے خانو کو الوداع کہا۔ ”میں جارہا ہوں دوست۔ اگر تم سے زندہ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو اتنا ضرور یاد رکھنا کہ کفارے کی آس تو آخری سانس تک رہتی ہے۔“ تم بات پوری ہونے سے قبل ہی پہرے دار آ پہنچے۔ خانو کی آخری آواز، جو میرے کانوں تک پہنچی وہ ”رب را تھی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے جیپ میں بٹھا کر بستی کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ پوری بستی کے مرد وہاں م تھے۔ جبروت کے کارندے اور محافظ بھی اسلحہ سنبھالے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ سلطان بابا وہاں لے آئے۔ اب شاید صرف جبروت اور اُس کے کتوں کا انتظار باقی تھا۔ سلطان بابا میری جانب بڑ پہرے داروں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انہوں نے تین ختم کی اور مجھ پر پھونک دیا۔ ”جب تک ہماری ایک سانس باقی ہے، موت زندگی کی خود سب سے بڑی محافظ ہوتی ہے۔ یہ دنیا صرف ابتدا ہے۔ انتہا کا سفر اس سے پرے شروع ہوتا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے۔“ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، ورنہ میں انہیں آگے با گلے لگا لیتا۔ مجھے اپنے اس آخری سفر سے پہلے اس زاوراہ کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے شاید میری آف کی تحریر پڑھ لی اور خود ہی بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا، ”جیتے رہو۔“ اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلنے والی اس اہمیت آج مجھ سے زیادہ بھلا اور کسے محسوس ہوئی ہوگی۔ کچھ ہی دیر میں جبروت اپنی مخصوص جیپ میں لاڈ لے کتوں سمیت دُور صحرا سے نمودار ہوتا نظر آیا۔ ریت سے اُٹھتی گرم لہروں کے پس منظر میں اُس کی شفاف پانی میں تیرتی نظر آرہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ جبروت ایک بہ شعبہ باز ہے۔ وہ ایسے کھیل صرف اپنی تفریح طبع کے لیے کھیلتا ہے۔ پھر چاہے وہ رحیم اور سیکینہ کا معا نوری اور عبداللہ کا قصہ۔ دونوں جگہ وہ پوری طرح مختار تھا کہ بنا کسی حجت کے بھی۔ مجھے اور رحیم کو دوپ میں ختم کروا سکتا تھا۔ بغیر کسی عدالت اور فیصلے کے ڈھونگ کے بھی وہ ہماری جان لے سکتا تھا۔ یہاں اُ۔ پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ اگر آس پاس کے علاقے کی پولیس اور قانون خاموش تھا تو ضرور اس کے پیچھے کا اثر و رسوخ شامل ہوگا۔ کال گڑھ تو ایک جنگل تھا اور اس جنگل میں صرف جبروت نامی بادشاہ کا قانون



وقت ہے اگر تم اپنے جرم کا اقرار کر لو اور مجھ سے معافی مانگ لو تو تمہاری سزا میں کمی کی جاسکتی ہے، جی.....“ جبروت کی آنکھوں میں صرف اور صرف تھیک تھی۔ میں نے چند لمحے اُس کی جانب غور سے دیکھا۔ ”اگر میں نے تم سے معافی مانگ لی تو تمہارا یہ کھیل اور وارہ جائے گا۔ پھر شاید میں نہیں تو کوئی اور اس جڑ بھینٹ چڑھ جائے کیوں کہ تمہیں تو بہر حال یہ خونی تماشا کرنا ہی ہے کیوں کہ صرف اسی صورت تمہارے بھڑکتی یہ لہو کی پیاس شاید کچھ دنوں کے لیے بجھ جائے گی۔ ہو سکے تو آج یہاں سے فراغت پانے کے کسی بڑے ماہر نفسیات سے مل لینا۔ شاید وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے۔“ وہ کچھ دیر میری جانب عجیب سے دیکھتا رہا، پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا ”یا تو تم واقعی بہادر ہو یا پھر موت کو اتنے قریب پا کر ہر خواہ تمہارے ذہن سے مٹ گیا ہے۔ مجھے بھی روئے گز گزاتے اور بیروں میں پڑتے دشمن اچھے نہیں لگتے میں انہیں بھی مارتا تو ضرور ہوں لیکن عزت کی موت نہیں۔ تم نے البتہ آج اپنے لیے ایک باوقار مور ہے۔ اطمینان رکھو، تمہاری موت کے بعد بھی کال گڑھ میں تمہارا نام غیرت مند دشمنوں کی فہرست میں جائے گا۔“ جبروت اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ہجوم اور سلطان بابا پر الوداعی نظر ڈالی اور میں دوڑ شروع کرنے کے نشان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مجھے غزاتے، گھورتے اور اپنے خوں خوار جڑواں رال نکاتے قد آور کتوں کے بے حد قریب سے گزرا گیا تاکہ وہ میرے جسم کی بو کو اپنے دماغ کے خلیوں اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ جس وقت میں ان چھ کتوں کے قریب سے، اپنا جسم اُن کے جڑواں کرتے ہوئے گزر رہا تھا، میری رگوں میں ایک عجیب سی جھنجھٹا ہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ شاید میرے اندر ایڈرنالین نامی ہارمون کا بہاؤ شروع ہو چکا تھا، جس کی لذت پانے کے لیے جبروت چلتی دھوپ میں آتماشا دیکھ رہا تھا۔ میری اور اُس کی کیفیت میں فرق صرف اتنا تھا کہ میری کیفیت میرے متوقع خون بہنے سے تھی جب کہ جبروت کا ایڈرنالین دوسروں کا خون بہتے دیکھ کر اُس کے اندر دوڑتا تھا۔ اُس نے اپنی کا بندھی گھڑی کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہا ”اب سے ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ان کتوں کے پٹے کھول جائیں گے۔ تم یہاں سے ٹھیک اپنی سیدھ میں دوڑو گے تو ایک گھنٹے بعد ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے شرط صرف اتنی ہی ہے کہ میرے یہ پالتو شیر اس سے پہلے تم تک نہ پہنچ جائیں اور ہاں بے فکر رہو یہ سدا ہوئے ہیں لہذا یہ اسٹیشن کی عمارت دیکھتے ہی دُور سے پلٹ جائیں گے۔ تو کہو، تم تیار ہو؟“ میں نے ”ہاں“ کہا اور جبروت کا اشارہ پاتے ہی صحرا میں دوڑ لگا دی۔ پہلے دو تین منٹ تو مجھے کچھ احساس ہی نہ تھا لیکن جیسے ہی میں نے پہلا ٹیلا پار کر کے خانو کی ہدایت کے مطابق اپنے جوتے اتارے، ایک لمحے کے یوں محسوس ہوا، جیسے ہزاروں نغصے نئے انکارے میرے کتوں سے ہوتے ہوئے، خون کے اندر سرایت آچکے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے دن ہی میں تارے نظر آ گئے اور میں نے بے اختیار اپنی ہتھیلیوں سے اپنے کتوں کے بعد دیکر اس آگ کی تپش سے بچانے کی کوشش کی، لیکن میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ

سب کچھ کر پاتا۔ میرے ذہن میں بار بار خانو کا ایک جملہ گونج رہا تھا ”یاد رکھنا، تمہیں ہر حال میں بس دوڑتے ہی رہنا ہے۔“ میں نے شدید تکلیف سے کراہتے ہوئے مجبوراً اس آگ کے سمندر میں دوبارہ پاؤں ڈال دیئے۔ صحرا کے پہلے پانچ منٹ ہی نے میرا وہ حال کر دیا تھا، جو کسی ایسے خستہ حال شخص کا ہو سکتا تھا، جو اس تپتے ریگ زار میں برسوں سے بھٹک رہا ہو۔ میرے ہونٹ خشک ہو کر چپختے لگے۔ سانس دھونکی کی طرح چلنے، چلنے میں ہزاروں کانٹے چبھنے لگے۔ بے اختیار میں نے منہ سے سانس لینے کی کوشش کی تاکہ حلق میں لگی آگ کو کچھ ٹھنڈک ملے لیکن پہلے ہی سانس میں اُڑتی ریت کے گبولے سے ہزاروں دڑے کسی خاردار تاریکی طرح میرے گلے سے ہوتے ہوئے سانس کی نالی میں انک گئے اور مجھے زوردار کھانسی کا پھندا لگا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ خانو کی آواز پھر ذہن کے کسی گوشے سے نکرائی ”منہ سے سانس لینے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔“ میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ پانچواں ٹیلا پار کرتے ہی میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پاؤں کے کتوں میں پہلے منٹ میں جوتے اتارے ہی جو چھالے بنے تھے، وہ ایک ایک کر کے پھٹنے لگے اور مجھے ہر چھال پھٹنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے پیروں پر ہزاروں نشتر لگا کر مجھے ان کھلے زخموں کے ساتھ نمک کے سمندر پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا گیا ہو اور وہ نمک میرے کھلے منہ والوں زخموں سے، خون میں مل کر اسے جلا رہا ہو، کھولا رہا ہو۔ اس خُش نمک کی کڑواہٹ مجھے اپنے حلق میں، سارے جسم میں دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ دسویں منٹ کے ختم ہوتے ہی وہ تپتے جہنم جیسا صحرا میرے ساتھ کھیل کھیلنے لگا۔ مجھے اپنے سامنے نکلنے والی فاصلے پر ٹھانٹیں مارتا ایک وسیع سمندر دکھائی دیا۔ ارے اتنا بہت سا پانی۔ میں اپنی سمت بھول کر اس جانب لپکا۔ میرے اندر بیٹھا خانو چلایا ”براہ راست سورج کو نہ دیکھنا.....“ لیکن کچھ لمحے پہلے ہی میری نظریں قبر برساتے گولے پر غیر اختیاری طور پر پڑ چکی تھی۔ یہ سامنے بہتا سمندر اور شفاف لہریں اسی سورج کی جلتی کرنوں سے ملی میری نظر کا شاخسانہ تھیں۔ مجھے زور کا ایک چکر آیا اور میں اپنی ہی جھونک میں لڑھکتے دئے نیلے سے نیچے جا کر۔ میری آنکھوں میں ریت پڑ گئی اور کچھ دیر کے لیے میں اندھا سا ہو گیا۔ اچانک درمیان سے دھول بجنے کی آواز سنائی دی۔ میری ساری جھپٹیں جیسے ایک ساتھ ہی بیدار ہو گئیں۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ جبروت نے اپنے کتے میرے تعاقب میں کھول دیئے ہیں۔ اگر مجھے یہاں یہ آواز سنائی دے گی تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میں اتنی دیر تک دوڑنے کے باوجود ابھی آغاز کے مقام سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ سامنے ہی میری جلتی آنکھوں نے ساتویں نیلے کے آثار دیکھے اور میرے شدید تھکے، ٹوٹے اور شکستہ جسم نے ایک اور کوشش کی۔ اچانک میرے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ خانو نے کیا کہا تھا۔ ساتویں نیلے سے ٹیلا یا بائیں.....؟ شاید دائیں.....؟ نہیں نہیں بائیں جانب، لیکن..... شاید دائیں.....؟ میں سر پٹ دوڑتا تھا لیکن میرا ذہن جیسے سن سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ساتواں ٹیلا ریت کی ایک ڈھیری سے بڑا ہوتے ہوئے ایک مٹی پہاڑی میں تبدیل ہوتا گیا اور پھر جیسے ہی میں دوڑتے ہوئے اس کے اُوپر چڑھا تو میرے ذہن نے

میکائی انداز میں فیصلہ دے دیا۔ دائیں جانب..... اور میں مشینی انداز میں داہنی طرف مڑ گیا۔ شدید سے میرا حال ہو رہا تھا۔ بس ایک بوند پانی اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ پھر مجھے موت ہی کیوں نہ آجائے۔ اچانک میری نظر دوسرا صحرا میں چمکتے ایک سنگے پر پڑی جو دھوپ کی کرنوں جگمگا رہا تھا لیکن یہ طلائی سنگہ یہاں.....؟ اور پھر وہ جگمگا تا سنگہ بڑا ہوتا گیا۔ ارے..... یہ تو لوہے کی ایک سی پرات تھی۔ نہیں۔ اودہ میرے خدا، یہ تو چھوٹا سا جو ہڑ تھا۔ بارش کے پانی سے بنا ایک چھوٹا سا جو ہڑ، بڑے ٹیلے کی آڑ میں عمودی رخ پر اس طرح بنا تھا کہ دھوپ براہ راست وہاں نہیں پہنچ پاری تھی۔ کیا وہ اتنی جلدی بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ کیا اس صحرا سے عرش بریں کچھ زیادہ ہی قریب تھا یا پھر میرا آخری وقت تو آ رہا تھا کہ فرشتوں نے میرے حساب کتاب کے بستے سمیٹتے سمیٹتے میری آخری دعائیں بھی سینٹا شروع تھیں۔ میں کسی دیوانے کی طرح دوڑتے ہوئے جو ہڑ کے قریب پہنچا اور میرا شدید جی چاہا کہ اپنا مگد لے پانی میں ڈال کر وہیں پڑ جاؤں۔ اس وقت وہ چھوٹا سا جو ہڑ کیا، میں پورا دیا بھی ایک ہی گھونٹ پی جانا چاہتا تھا۔ ”خبردار..... گھونٹ بھر پینے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ دل بند ہو جائے گا۔“ میں نے نہ ”نہیں، اب اور کوئی نصیحت نہیں۔ اس شدید پیاس کے عالم میں مرنے سے تو بہتر ہے کہ میں دو گھونٹ پی کر جاؤں۔“ اُس وقت مجھے اور اک ہوا کہ لوگ مرنے سے پہلے پانی کیوں مانگتے ہیں۔ میری نسون مڑ خون گاڑھا ہو کر میرے اندر موجود پانی کا آخری قطرہ تک چوس چکا تھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے کپٹی پر پڑی کسی نس اس زور سے پھٹے گی کہ سارے صحرا کو لال کر جائے گی۔ میں نے جلدی سے ہتھیلیوں میں پانی بھرا اور پھر چھم سے کود کر میرے سامنے کسی کے بندھے ہاتھوں کی صورت آن کھڑا ہوا۔ ”نہیں عبداللہ، نہیں۔ یہ نہیں موت ہے۔“ دفعتاً میری ہتھیلی میں کوئی موٹی سوئی زور سے گڑ گئی۔ تکلیف سے میری چیخ نکلتے نکلتے اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا، جن کے کونوں ابھی تک جو ہڑ سے نکالا گیا پانی ٹپک ٹپک کر گر رہا تھا۔ ایک لمبی اور موٹی سی کالی جو تک میری ہتھیلی کی جلد ماس تک اپنے نوکیلے دانت گاڑ چکی تھی اور ایک دوسری جو تک چلتی ہوئی میری کلائی کے قریب خون چوسنے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے گھبرا کر پانی پھینک دیا۔ کلائی والی جو تک پانی بہاؤ کے ساتھ ہی گر گئی لیکن ہتھیلی والی سرمئی جو تک، میرے سیاہ مقدر کی طرح میرے گوشت سے چپکی رہی اور درد، جلن اور جھپن کی ایک کیشلی لہر میری انگلیوں کی پوروں سے ہوتی ہوئی، پورے بازو میں پھیل گئی۔ میرا ٹیلا پڑنے لگا اور میں نے بے اختیار شدید تکلیف کے عالم میں اپنا ہاتھ گرم چلتی ریت میں گھونپ دیا۔ جو تک نازک اور لچیلی سی چمکیلی جلد سے شدید تپتی ریت کمرائی تو ہلکی سی ایسی آواز بلند ہوئی، جیسے جلتے ہوئے انگہ پر کوئی پانی کا پھیٹا مار دے۔ جو تک تڑپ کھڑا چھل اور اس کا نوکیلا ڈنک میری ہتھیلی سے نکل گیا۔ میں کانپتے ہاتھوں سے اپنی جیب سے زومال نکال کر پانی میں بھگوایا اور اسے اپنے خشک چھتے ہونٹوں سے لگا

رے ہونٹوں کی جلی ہوئی جلد کو ذرا سی نمی میسر آئی تو ان کی حالت مزید خراب ہو گئی اور خون کی پتلی سی چند برس زومال کی سطح پر ابھر آئیں۔ دوسری مرتبہ بیچکا زومال میں نے چہرے پر پھیرا اور تیسری مرتبہ اسے بھگو اپنے سر پر باندھ ہی رہا تھا کہ مجھے میری قضا کی آوازیں سنائی دینی لگیں۔ ہاں..... یہ وہی بھونکتے کتوں دوڑنے اور غزانے کی آواز تھی۔ مطلب وہ قریب تر ہو رہے تھے۔ میں اٹھ کر بھاگا۔ فی الحال وہ مجھے نظر نہ آ رہے تھے اور مجھے ایک گمان یہ بھی تھا کہ ساتویں ٹیلے کے بعد اگر وہ اپنی جھونک میں مزید کچھ آگے بڑھ جاتا تو انہیں پلٹنے میں دو چار منٹ مزید لگیں گے کیوں کہ اس وقت صحرا میں چلتی گرم کو کا رخ بھی اسی سمت تھا، اس طرف میں دوڑ رہا تھا۔ لہذا ان تک میرے جسم کی بو پہنچنے پہنچنے بھی کچھ وقت ضرور لگے گا۔ لیکن اب خود ہی اپنی زوج دھیرے دھیرے میرے اندر سے سر کننا شروع ہو چکی تھی۔ اگر میں پچھلے چھ مہینوں سے سلطان کے ساتھ اتنا پیدل نہ چلا ہوتا اور میں نے جبل پور کے بسیرے کے دوران پہاڑی والی درگاہ کے دشوار راستے انہ کی بار طے نہ کیے ہوتے تو میں یقیناً بہت پہلے ہی گر چکا ہوتا۔ کیوں کہ کالج اور یونیورسٹی میں اسپورٹس بعد صرف ایک گھنٹہ روزانہ اسکاٹس کا کھیل ہی میری واحد ورزش رہ گیا تھا اور آج اس صحرا نے مجھے ”دوڑ“ مل مطلب سمجھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میں نے ریت کے گبولوں کے عقب سے اُس پہلے عفریت کو نمودار تے دیکھا۔ میرا خشک صحیح تھا۔ ساتویں ٹیلے کے بعد وہ گلولوں میں بٹ گئے تھے اور یہ پہلا تھا، جس نے لٹا پالی تھی۔ میرے قدم تیز ہو گئے لیکن اس کی غزا انہیں بتدریج قریب آنے لگیں۔ میرے پاس پیچھے مڑ کر نہ کا وقت نہیں تھا۔ میری ابھی سانسیں خود ایک غزاہٹ میں تبدیل ہونے لگیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے بھی تو ایک زندہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ اُن آخری لمحات میں میرے اندر کا زندہ بھی بیدار ہو گیا۔ اب میں اللہ یا سارا نہیں..... صرف ایک انسان باقی رہ گیا تھا، جسے اپنی جان بچانے کے لیے ایک خونی عفریت کا نا تھا۔ پھر کے دور کے انسان کی تمام جہتیں ایک دم ہی میرے اندر انگڑائی لے کر جاگ چکی تھیں اور اب تے ہوئے میری نظر چاروں جانب کچھ ایسا تلاش کر رہی تھیں، جسے میں اپنے دفاع کے لیے ہتھیار کے طور قتال کر سکتا۔ غزا انہیں اب بالکل میرے قریب پہنچ گئی تھیں۔ ساتھ ہی ریت پر دوڑنے کی دھمک اور دھوپ کی آوازیں میرے حواس مغلط کیے دے رہی تھیں۔ میرا دشمن بہترین سدھائے ہوئے شکاری کی ہمتا جو کئے اور حتی الامکان آواز نکالے بغیر میرے تعاقب میں تھا۔ اچانک ریت میں دہلی ایک خشک ٹہنی زلی پر میری نظر پڑی اور میں اُسے اٹھانے کے لیے جھکا اور یہی میری غلطی تھی۔ لکڑی اندر تک ریت میں ما ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ جھلنے کے باوجود وہ پوری طرح باہر نہیں نکلی لیکن اس اثنا میں پہلا دشمن میرے سر اچکا تھا۔ میری نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے دوڑتے ہوئے بناڑ کے مجھ پر قد بھری اور ٹھیک لے لے لکڑی ریت سے نکل آئی، جسے میں وحشا نہ انداز میں طاقت لگا کر باہر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں برا اختیار کی طور پر وہ خشک لکڑی پوری قوت سے فضا میں لہرائی اور پتا نہیں کتنے کو وہ چھڑی کتنی زور سے لگی

ہی پھلے ٹیلے کی جانب سے اس کے گردہ کے دو اور ساتھی نمودار ہوئے اور مجھے دیکھ کر انہوں نے خوشی سے جھپٹے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ لکڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جاگ رہی تھی لہذا اب مجھے اپنے غلہ بازوں ہی پر بھروسہ کرنا تھا۔ لیکن وہ بھاری بھرکم وجود اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میرے سینے پر گرا تو میرے ہاتھ جیسے ٹوٹ ہی تو گئے۔ اُس کے خوشی پنچے میرے شانوں میں یوں پیوست ہوئے کہ کئی خراشوں میں سر جھرمک گئیں۔ اس کی غزاٹیں اور گرم سانس میرے گالوں کو چھو رہی تھیں اور تھوٹھنی سے بہتی رال کا دھارام میری ہائیں آنکھ کے اُپر لٹک رہا تھا۔ اُس کے کھلے جبروں کے چاروں کونوں سے جھانکتے وہ چار لمبے نوکے دانت عین میری شہرگ میں گڑ جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اُس کی نظریں جھنجھلایا ہوا تھا، اُسے میری مزاحمت بُری لگ رہی تھی۔ اُس کی نظر نے میری نظر سے کہا ”زیادہ مت ترپو۔ اپنی جان مجھے سوپ دو، میرا مالک انتظار کرتا ہوگا۔“ میرے اندر کا درندہ غزایا۔ ”نہیں، اتنی آسانی سے نہیں۔“ اچانک ہی مجھے اس بے بس رچھ کے چنترے یاد آ گئے۔ وہ رچھ اس طرح کے کئی عفریتوں۔ ایک موٹی زنجیر سے بندھے ہونے کے باوجود آخری وقت تک لڑتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ پوری لڑائی دوران مستقل اپنا سر ہلا ہلا کر اپنے زرخے کو ان کتوں کے جبروں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مطلب اسے سدھائے ہوئے کتوں کا پہلا نشانہ مقابل کی شہرگ ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اس وقت میرے سینے پر میری رگ جان میں اپنے دانت گاڑنے کی دیوانہ وار کوشش میں مصروف تھا۔ میرے حواس یکے بعد دیگرے پھر سے جامد ہونے لگے تھے۔ اصل میں مجھے اس وقت، اس کتے کے وجود سے اتنی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی بلکہ اس کی مستقل غزاٹ اور سانس کی خراہٹ میرے حواس معطل کیے جا رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ اگر کتے کی آواز سے یہ وحشیانہ مفت نکال دی جائے تو شاید اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔ ہمارے ہاتھوں پیروں میں سے آدھی جان نکالنے کے لیے وہ سب سے پہلے اسی ہتھیار کا استعمال کرتا ہے۔ شاید اثر سائب کی پھینکاؤر کسی بھی درندے کی دھاڑ میں بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اب تک کے چہرے کو اس کا گلا دبا کر اپنے چہرے سے دُور رکھنے میں کامیاب تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کام عارضی ہے کیوں کہ میرے بازو دخل ہو رہے تھے اور اس کے پنچے میرے سارے جسم پر جلتی خراشیں چھوڑ جا رہے تھے۔ اچانک میری مٹھی میں کچھ ریت بھر گئی اور بے اختیار میں نے ساری کی ساری ریت اُس قاتل آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ زور سے چیخا اور ایک لمحے کے لیے اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں پوری قوت لگا کر اُسے اپنے اُپر سے اُچھال کر دُور پھینک دیا۔ میرا گرتا چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نے فوراً اُسے تنہم سے علیحدہ کیا اور اپنے کچھ کپڑے کو بھاگتے ہوئے اپنے گلے کے گرد اچھی طرح کس باندھ لیا۔ اس کا شکار میری شہرگ تھی تو مجھے سب سے پہلے اُسے ہی بچانے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ جب تک دشمن اپنا جسم جھٹک کر اپنی آنکھوں سے ریت جھاڑ چکا تھا اور پھر سے میرے پیچھے لپکنے کی تیاری میں تھا۔ اسی

میں پھلے ٹیلے کی جانب سے اس کے گردہ کے دو اور ساتھی نمودار ہوئے اور مجھے دیکھ کر انہوں نے خوشی سے جھپٹے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ لکڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جاگ رہی تھی لہذا اب مجھے اپنے غلہ بازوں ہی پر بھروسہ کرنا تھا۔ لیکن وہ بھاری بھرکم وجود اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میرے سینے پر گرا تو میرے ہاتھ جیسے ٹوٹ ہی تو گئے۔ اُس کے خوشی پنچے میرے شانوں میں یوں پیوست ہوئے کہ کئی خراشوں میں سر جھرمک گئیں۔ اس کی غزاٹیں اور گرم سانس میرے گالوں کو چھو رہی تھیں اور تھوٹھنی سے بہتی رال کا دھارام میری ہائیں آنکھ کے اُپر لٹک رہا تھا۔ اُس کے کھلے جبروں کے چاروں کونوں سے جھانکتے وہ چار لمبے نوکے دانت عین میری شہرگ میں گڑ جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اُس کی نظریں جھنجھلایا ہوا تھا، اُسے میری مزاحمت بُری لگ رہی تھی۔ اُس کی نظر نے میری نظر سے کہا ”زیادہ مت ترپو۔ اپنی جان مجھے سوپ دو، میرا مالک انتظار کرتا ہوگا۔“ میرے اندر کا درندہ غزایا۔ ”نہیں، اتنی آسانی سے نہیں۔“ اچانک ہی مجھے اس بے بس رچھ کے چنترے یاد آ گئے۔ وہ رچھ اس طرح کے کئی عفریتوں۔ ایک موٹی زنجیر سے بندھے ہونے کے باوجود آخری وقت تک لڑتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ پوری لڑائی دوران مستقل اپنا سر ہلا ہلا کر اپنے زرخے کو ان کتوں کے جبروں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مطلب اسے سدھائے ہوئے کتوں کا پہلا نشانہ مقابل کی شہرگ ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اس وقت میرے سینے پر میری رگ جان میں اپنے دانت گاڑنے کی دیوانہ وار کوشش میں مصروف تھا۔ میرے حواس یکے بعد دیگرے پھر سے جامد ہونے لگے تھے۔ اصل میں مجھے اس وقت، اس کتے کے وجود سے اتنی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی بلکہ اس کی مستقل غزاٹ اور سانس کی خراہٹ میرے حواس معطل کیے جا رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ اگر کتے کی آواز سے یہ وحشیانہ مفت نکال دی جائے تو شاید اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔ ہمارے ہاتھوں پیروں میں سے آدھی جان نکالنے کے لیے وہ سب سے پہلے اسی ہتھیار کا استعمال کرتا ہے۔ شاید اثر سائب کی پھینکاؤر کسی بھی درندے کی دھاڑ میں بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اب تک کے چہرے کو اس کا گلا دبا کر اپنے چہرے سے دُور رکھنے میں کامیاب تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کام عارضی ہے کیوں کہ میرے بازو دخل ہو رہے تھے اور اس کے پنچے میرے سارے جسم پر جلتی خراشیں چھوڑ جا رہے تھے۔ اچانک میری مٹھی میں کچھ ریت بھر گئی اور بے اختیار میں نے ساری کی ساری ریت اُس قاتل آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ زور سے چیخا اور ایک لمحے کے لیے اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں پوری قوت لگا کر اُسے اپنے اُپر سے اُچھال کر دُور پھینک دیا۔ میرا گرتا چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نے فوراً اُسے تنہم سے علیحدہ کیا اور اپنے کچھ کپڑے کو بھاگتے ہوئے اپنے گلے کے گرد اچھی طرح کس باندھ لیا۔ اس کا شکار میری شہرگ تھی تو مجھے سب سے پہلے اُسے ہی بچانے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ جب تک دشمن اپنا جسم جھٹک کر اپنی آنکھوں سے ریت جھاڑ چکا تھا اور پھر سے میرے پیچھے لپکنے کی تیاری میں تھا۔ اسی

## معصوم سے معصومیت تک

اس جنگ میں اپنے ساتھ مزید تین ساتھیوں کو پا کر میرے اندر زندگی کی نئی رتق جا گئی۔ باقی تین دشمن بھی کچھ فاصلے پر تھے لیکن صحرا میں ان کے وحشیانہ انداز میں بھونکنے کی آوازیں بتدریج قریب آرہی تھیں۔ ماننے والے تین دشمنوں نے پسترا بدل کر جھ پرچھنے کی کوشش کی لیکن کالا اور اس کے گروہ کے باقی دو جانباز ب میرے اور ان دشمنوں کے درمیان حائل تھے۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی دشمن تین سے چھ ہوئے، تب شاید ہرے یہ تین وفادار بھی کچھ نہ کر پائیں کیوں کہ ان میں سے صرف کالا ہی باقاعدہ سدھایا ہوا تھا اور وہی اس رنی لڑائی کے گر جانتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ ان تین دشمنوں کو اپنے پیچھے لگا کر میدان جنگ تبدیل کیا جاتا رہے۔ پھر مجھے تو ہر حال میں آگے ہی بڑھتے رہنا تھا۔ سو، میں ایک بار پھر ہمت مجتمع کر کے اٹھا اور دشمنوں سے پہلو ہاتے ہوئے صحرا میں سڑک کی سمت دوڑنے لگا اور پھر میرے منہ سے ایک طویل کراہ نماجی نکل گئی۔ میرے نکلے ہیر میں ہاتھ کی انگلی جتنا ایک کاٹا اس طرح گھسا کہ تلوے کو چیرتا ہوا اوپر سے نکل گیا۔ میں اسی قدم لڑکھڑا لڑکھڑا اور پاؤں جیسے شل ہو گئے۔ میں نے زور سے آنکھیں بند کیں اور کانے کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر پاؤں سے ٹکدہ کر دیا۔ اچانک میرا دھیان نیپے میں اٹکے اپنے جوتوں کی جانب گیا، جو میں نے شروع ہی میں خانو لہدایت کے مطابق اپنے جسم کے ساتھ کس کر باندھ لیے تھے۔ میں نے جلدی سے جوتے پہنے۔ زمین سخت روئی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اب سڑک کہیں قریب ہی تھی۔ کتوں کی آوازیں بھی جھپٹے ٹیلے تک آ پہنچی تھیں۔ پھر پہلے تین کا دشمن گروہ میرے سر پر آن پہنچا۔ اس بار سرغنہ نے پیچھے سے میری گردن میں جبرے سے اڑا کیا لیکن میرے گلے میں بندھی قمیض کے چیتھڑوں کی وجہ سے اس کے دانت ماس میں ٹھیک طرح سے کھب ٹٹ پائے۔ لیکن میں اس کے دھکے سے اپنی جھونک میں سامنے جا گرا۔ تب تک میرے ساتھی بھی پہنچ چکے تھے۔ کالے کا ایک ساتھی جو میری پہرے داری کے لیے میرے سر کی جانب کھڑا ہو گیا تھا، اُسے سرغنہ نے ایک زوردار پنچہ مارا اور خون کے چھینٹے میرے چہرے کو بھگو گئے۔ کالا بھی نہایت بے جگری سے لڑ رہا تھا لیکن ب دشمنوں کی تعداد چھ ہو چکی تھی۔ میں جب دوڑتے ہوئے آخری ٹیلے پر پہنچا تو بہت دُور کالی تارکول کی رُک کی باریک دھاگے کی طرح نظر آرہی تھی۔ میں نے ٹیلے کے دوسری جانب اترتے ہوئے آخری مرتبہ بچے نظر ڈالی تو کالے سے میری نظر ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہوں ”ہم نے اپنا نمک حلال کر دیا دوست! اب آگے تم جانو اور تمہاری قسمت.....“ اچانک میرے پیروں کو نیچے کسی نرم اور لمبی سطح کا احساس

آنکھیں پھر سے چندھیا گئیں۔ غزائیں اب باقاعدہ جینوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ میں نے بمشکل پلڑا کروٹ لی اور حتی الامکان سر اٹھا کر اپنے اس محسن جسم کو دیکھنے کی کوشش کی، جس نے ہوائی سے میری جانہ اُڑ کر آتی تھا کو اُچک لیا تھا اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا، دشمن کو ہوائی میں دبوچ لینے والا ”کالا“ تو وہ اور اس کے گروہ کے باقی دو ساتھی سینہ تانے میرے اور میرے تین دشمنوں کے درمیان صحرا میں کھڑے تھے۔ اس وقت دونوں گروہ ایک دوسرے کو نظروں نظروں میں تول رہے تھے، غزارے تھے، دھمکارے تھے۔ میں کراہ کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے لگا اس وقت میں کالے اور دشمنوں کے گروہ کے درمیان ہوتی گفتگو سمجھ سکتا ہوں۔ دشمنوں کا سرغنہ بولا ”تم ہمارے پرانے ساتھی رہے ہو۔ اس لیے ہم تمہارا لحاظ کر رہے ہیں۔ ہٹ جا ہمارے راستے سے..... ہمیں اس کی شہ رگ چیر کر اپنے آقا کے پاس لے جانی ہے۔ وہی آقا، جو کل تک تم بھی مالک تھا۔“ کالا جواباً بولا ”نہیں..... وہ کبھی میرا مالک تھا لیکن اب یہ بھی میرا دوست ہے۔ میں تم کو کی جان نہیں لینے دوں گا۔ تم لوگ واپس پلٹ جاؤ.....“ سرغنہ بھونکا ”بس..... بہت ہو چکا.....“ ہی دیر میں میرے تین مزید ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس پرانے انسان کے چکر میں اپنا پرانا ساتھی اپنی جان سے جائے۔ ہم نے بہت سے مقابلے ساتھ جیتے ہیں۔ نہ جانے کتنی جنگیں ایک ماں لڑی ہیں۔ اپنی یہ آخری جنگ ہمارے خلاف نہ لڑو۔ یہ انسان بڑے کم ظرف اور احسان فراموش ہوتے ہیں ان کے لیے اپنے ساتھ اپنے ان دو بے وقوف ساتھیوں کی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ یہ تو ہماری طر سدھائے ہوئے ہیں، نہ ہی لڑنا جانتے ہیں..... ہٹ جاؤ.....“ کالے نے جسم تولا..... ”اگر یہ آخری جنگ ہے تو میں اپنی یہ آخری لڑائی ایک غدار اور احسان فراموش بن کر نہیں..... بلکہ ایک دوست بن کر لڑوں گا۔“ اتنے میں دُور سے باقی تین کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دیے لگیں۔ سرغنہ نے فاتحانہ انداز میں کالے کی جانب دیکھا ”اچھا تو پھر ٹھیک ہے..... مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ.....“



موتی۔ دشمن کی اپنی شرک سے خون کا ایک نوارہ چھوٹا اور مجھ سمیت سڑک کے اٹلتے تار کول کو رنگ گیا۔ زمین پر خون گرنے سے ایسی آواز ابھری جیسے شدید گرم اور تپتے ہوئے توے پر کوئی ٹھنڈا پانی چھڑک دے۔ فضا میں ایک نعرہ گونجا ”اللہ اکبر“ اور دوسرے فارسی کی آواز آئی۔ مجھ پر جھلاٹ لگنے والا پہلا دشمن، بالکل میرے مقابل گرا ہوا تھا اور دشمن کی بغض بھی ڈوب رہی تھی اور آنکھیں میری طرف پلکوں کے بوجھ سے بوجھ ہو کر بند ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نظرات آپس میں ٹکرائی۔ مجھے لگا جیسے اُس نے مجھ سے کہا ہو ”الوداع“ دشمن! تم نے بھی خوب دشمنی نبھائی۔“ لیکن ہم دونوں ہی اپنے اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور تھے اور پھر دشمن کی آنکھیں بھی میری آنکھوں کے ساتھ ہی بند ہو گئیں۔ آخری چند لمحوں میں مجھے اس کی آنکھوں میں وہی مصیبت دکھائی دی، جو کسی بچے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ واقعی خدا ہمیں اس دنیا میں شفاف اور معصوم ہی بھیجتا ہے مگر ہم رفتہ رفتہ خود کو میلا اور داغ دار کرتے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ تو پھر بھی جسم کے گناہ روزانہ وضو کر کے اور زور کے گناہ رات کو سوتے وقت توبہ کر کے دھونے کی کامیاب یا ناکام سعی کر ہی لیتے ہیں لیکن ان میں سے وہ، جو میری طرح ان تمام داغوں سمیت ہی دنیا سے رخصت ہونے کو ہوں، انہیں ان آخری لمحوں میں کیسا نسوس ہوتا ہوگا؟ کیا ہمیں دنیا میں صرف یہی داغ میٹھنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ مجھے اس سڑک پر پڑے ان نثری لمحوں میں ایک عجیب سا اور اک ہوا کہ ہم میں سے زمین پر بسنے والے ہر ذی روح کا سفر بس ”معصوم“ سے ”معصومیت“ تک واپسی کی ایک کہانی ہی ہے۔ میں یونیورسٹی میں اپنی انگریزی کی پروفیسر مار تھا سے ایک سطر ہمیشہ سنتا تھا ”Back to the Innocence“، لیکن ”معصومیت کی طرف واپسی“ کی اس سطر کا مطلب مجھے اس روز سمجھ میں آیا۔ ہم کامل معصوم پیدا ہوتے ہیں، لیکن گناہ ہمیں غیر معصوم اور عاصی ادیتے ہیں۔ دراصل مذہب ہم پر وارد ہی اس لیے ہوا ہے کہ وہ ہمیں پھر سے معصوم بنادے اور تمام عمر مذہب نامی کوشش رہتی ہے کہ وہ ہماری اس ”معصومیت سے معصومیت تک“ کی واپسی کی راہ کو ہموار کر دے۔ اور ایہ ٹھیک موت کی گھڑی میں چند لمحوں کے لیے ہم سب پھر سے معصوم ہو جاتے ہیں۔ تب ہی ہماری کول روح نکلیں ہونے کا موقع ملتا ہے، ورنہ گناہوں سے تسخیر اس کثیف جسم کے پنجرے اس نورانی بیوے کے لالچنا کن ہو جاتا۔ کیا میری روح بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ میرا جسم تو ابھی گناہوں کے بوجھ سے آزاد نہیں ہوا۔ آنکھیں کھلنے میں اتنی دیر لگی۔ میرے سر پر سبز آسمان تھا، کیا وہاں فلک کا رنگ بدل جاتا ہے؟ اچانک رے کانوں میں آواز گونجی ”اٹھ گیا بھئی جوانا! شاباشے۔“ میں نے چونک کر دہائی طرف آواز کی جانب بھاڑ بھڑکا کر ایک سپاہی اپنی بندوق صاف کر رہا تھا۔ اوہ..... تو میں زندہ تھا اور جسے میں سبز آسمان سمجھ رہا تھا بھلا شوٹ کے کپڑے سے بنے ہرے خیمے کی چھت تھی۔ میرے ذہن میں خانو کا آخری جملہ گونجا ”اگر یہ کچھ نہیں سرحد پر بنی کسی فوجی چوکی تک پہنچا دے تو سمجھ لینا کہ یہی تمہاری جیت ہے.....“ میں ایک جھٹکے سے ٹکر بیٹھ گیا۔ میرے سارے جسم میں شدید درد کی ایک ٹیس اٹھی۔ سپاہی جلدی سے اٹھ کر میرے قریب

ہوا اور میرے جوتے چپکنے سے لگے۔ ارے یہ تو وہی سڑک تھی، جسے میں اب بھی بہت دُور دیکھ رہا تھا سڑک صحرا کے اندر سے ہوتی گزر رہی تھی اور اس کے جس کٹوے کی طرف میں بھاگ رہا تھا، وہ اُسی سڑک تسلسل تھی لیکن یہ کلواریت کے طوفان کی وجہ سے شاید نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ خانو کی آواز پھر سے میرے کانوں میں گونجی۔ ”اگر تم اس سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو کہ تم نے آدمی جنگ جیت لی۔“ نے پیچھے مڑ کر دیکھا، دونوں دشمن کف بہاتے، رال پکاتے اور اپنے مضبوط پنجوں سے بھاگتے اُسی رفتار میرے تعاقب میں آرہے تھے بلکہ یہ فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میرے پیچھے پھروں کی بچی کبھی سانسیر تیزی سے ختم ہو رہی تھیں۔ ویسے بھی اس ایک زندگی کے لیے ان پیچھے پھروں کے تمام خلیوں کو جس قدر مشا سر انجام دینی تھی، پچھلے دو گھنٹوں میں وہ اس سے زیادہ محنت کر چکے تھے۔ اچانک بے خیالی میں میری نظر آ کی جانب اٹھ گئی۔ شاید وہ میری آخری دعا کا وقت تھا۔ پتا نہیں ہم ہمیشہ دعا کرتے وقت ہر بار اپنی نظر آ کی جانب کیوں اٹھاتے ہیں، اپنے دل کی جانب کیوں نہیں دیکھتے۔ کیا یہ بھی ہمارے کمزور ایمان کی نشانی ہے۔ کیا وہ صرف آسمان پر ہی بسیرا کرتا ہے۔ میری اس آخری اٹھی نظر نے بھی اُسی لمحے مجھے میری ایمانی کی سزا دے دی۔ میرا سر سورج کی تیز روشنی دیکھ کر زور سے چلکرایا اور میں کسی مدھوش سے نوش کی ط لڑکھڑایا اور اگلے ہی لمحے نرم، کچی سڑک پر چاروں شانے چٹ پڑا تھا۔ میری کہنیاں اور گھٹنے جھل کر سیاہ ہو گئے۔ میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ جسم کا ایک ایک ریشہ اس قدر شدید تھکن سے چور تھا کہ اب دوڑتی، غزاتی، رال پکاتی اور اپنی طرف بڑھتی ہوئی وہ موت بھی ایک لمبے اور آرام دہ سکون کا ایک وقفہ ہی رہی تھی۔ ہم زندگی بھر اس بے وفائی زندگی کے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، دھوکے دے ہیں، ایذا دیتے ہیں لیکن ہمارا آخری حاصل یہی موت ہوتی ہے۔ صحرا میں آج اس دو گھنٹے کی دوڑ اور اس میری طرف بڑھتی موت نے زندگی کا سارا فلسفہ خوب اچھی طرح مجھے سکھا دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اپنی طرح ان سب انسانوں کو جو اس زندگی کی دوڑ میں خود اپنے آپ کو، اپنے رشتوں کو اور جیواور جیبے دو کے اصولوں بھول چکے ہیں، ایک بار صحرا کی اس دوڑ میں لاکھڑا کروں اور جب وہ بھی میری طرح نڈھال ہو کر گر پڑا موت اپنے خونی جڑے اُن کی شرک میں پیوست کرنے لگے تو اُن سے بس ایک ہی سوال پوچھوں ”کیا بے وفائی زندگی واقعی اس قابل تھی، جس قدر تم نے اسے پیار دیا؟“ میرے دشمن بس اب چند گز ہی دُور تھے میں نے ڈوبتی آنکھوں اور بند ہوتی پلکوں سے اُن میں سے اگلے والے کو مجھے یوں زمین پر بے بس گرا دیکھا خوشی سے ہو کتے ہوئے سنا۔ انہیں بھی تو عرصے بعد کوئی ایسا دشمن میسر آیا تھا، جس نے آج اُن کے سامنے سے بھی پسینہ چھلکا دیا تھا۔ آخری لمحے میں، میں نے اُس کے خونی جڑے کو ایک خاص زاویے پر رکھتے اور کے چار لمبے نوکیلے دانٹوں کو خاص میکانزم کے تحت آگے نکلنے ہوئے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ اس قاتل جلت خاص نشانہ میری شرک ہی تھی۔ میرے دل نے کہا ”خوش آمدید“ اور ٹھیک اُسی لمحے فضا میں فارسی کی ایک آ

ہے بات کر کے خیمے سے باہر نکلا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ باہر کچھ فاصلے پر میرے دونوں دشمنوں کی لاشوں کو دو سپاہی ایک گہرا گڑھا کھود کر دفنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حوالدار نے اپنے انچارج پکستان صاحب سے شفقت ختم ہونے کے بعد مجھے اپنی جیب میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچانے کی اجازت لے لی تھی۔ جیب روانہ ہونے سے پہلے دو سپاہی کو در کچھلی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ شیر محمد خود را نیوٹنگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم اسی تارکول کی سڑک سے ہوتے ہوئے واپس صحرا کی جانب روانہ ہو گئے۔ کچھ گھنٹے قبل یہی قاتل صحرا میری سانس گھونٹنے کے لیے کسی اور انداز میں مجھ پر کھلا تھا اور ابھی اس وقت اس جیب میں گزرتے ہوئے سب کچھ گھٹنا مختلف اور کتنا مہربان دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے دوڑتے دوڑتے کتنا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ جیب ریت کے ٹیلوں سے اتنی چڑھتی کال گڑھ کی جانب بڑھ رہی تھی اور پھر ایک ٹیلا اترتے ہی میری زبان سے بے اختیار نکلا ”روکو..... جیب روکو.....“ حوالدار نے چونک کر جلدی سے ایک پر پاؤں رکھ دیا۔ میں تیزی سے کود کر ٹیلے کی پچھلی جانب دوڑا، اور پھر میرے قدم ریت ہی میں دھنس کر رہ گئے۔ شیر محمد اور سپاہی بھی میرے پیچھے ہی بھاگے چلے آئے اور پھر اُن کی نگاہوں نے بھی میری نظروں کے غائب میں وہ نظارہ دیکھ لیا۔ سامنے ہی کالا اپنے دو ساتھیوں سمیت بے جان پڑا تھا اور چند قدموں کے فاصلے پر ادھر اُدھر تین دشمنوں کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ میں دوڑتا ہوا کالے کے پاس پہنچا۔ میرے دوست نے لنگی کی بازی ہارنے سے پہلے شدید جدوجہد کی تھی۔ میں وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھے بیٹھے رو پڑا۔ حوالدار زہرت سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”کیا یہ تین تمہارے محافظ تھے۔“

”ہی آواز بے شکل لنگی“ نہیں۔ یہ تین میرے دوست تھے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کے لیے اپنی جان دی ہے۔“ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر دوں۔ حوالدار میری حالت سمجھ چکا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو نثارہ کیا اور خود بھی جیب کے پیچھے سے ترپال کے نیچے رکھے بیلچوں میں سے ایک اٹھالایا اور کچھ ہی دیر میں وہ بگہرا گڑھا کھود چکے تھے۔ میں نے کالے کو الوداعی سلامی پیش کی اور انہوں نے میرے تینوں دوستوں کو دل ریت تلے دبا دیا۔ میں نے شیر محمد کی جانب دیکھا اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ”میں جانتا ہوں جوان! تم اپنے دشمنوں کو بھی یوں پڑا رہے نہیں دو گے۔ یہی بڑے دشمن کی نشانی ہوتی ہے۔“ کچھ ہی دیر میں اتنے ہی لہرے گڑھے میں میرے تینوں دشمن بھی ریت نشین ہو چکے تھے۔ وہ میرے دشمن تھے، لیکن وفادار تھے۔ جب کال گڑھ کی سرحد سے کچھ فاصلے پر تھے تو میں نے ایک جیب کے ہولے کو تیزی سے واپس پلٹتے بھاگا۔ لیکن شام کے جھپٹے اور فاصلے کی وجہ سے میں ٹھیک طرح سے گاڑی پہچان نہیں سکا۔ حوالدار کا خدشہ صحیح نکلوں کے واپس نہ پہنچنے پر جبروت کے ہرکارے صحرا میں اُن کی تلاش میں نکل آئے تھے۔ جب ہم کال گڑھ کی بیرونی حد تک پہنچے تب تک اندھیرا چھا چکا تھا اور دُور سے پولیس کی جھپوں اور ایک بڑے ٹرک کی جلتی تکیاں قریب آتی نظر آرہی تھیں۔ چند لمحوں بعد پولیس کے جوانوں کا ایک جم غیر ایک ایس پی اور ڈی

آگیا۔ ”اوئے آرام سے جوان آرام سے۔ پورے چھ گھنٹے بعد تم ہوش میں آئے ہو۔ میرا نام حوالدار ہے۔ ہم چھ سپاہی ہیں اس چوکی کی دن کی ڈیوٹی پر..... میں ہی شفٹ انچارج ہوں اور اس وقت میں تو سے باہر کھڑا علاقے کا جائزہ لے رہا تھا، جب میں نے دُور سے پہلے تمہیں اور پھر تمہارے پیچھے ان کو دوڑتے دیکھا۔ واہ بھی..... عجب دوڑ تھی وہ بھی..... اور جب تک میں بھاگ کر اندر خیمے سے اپنی بندوڑ کر آیا، تم زمین پر گر چکے تھے۔ ٹھیک لمحے پر اپنی بندوڑ اور اپنا نشانہ آزمانے کو ملا۔ خدا نے سرخرو کیا، اور بندوڑ پر لگے دُور بینی نشانے پر کبھی بھروسہ نہیں رہا۔ مجھے تمہارے اور اس کتے کے تیزی سے قریب سروں میں سے کتے کے سر کو علیحدہ رکھ کر گولی چلائی تھی اور یقین کرو کہ ایک لمحے کے لیے بھی اگر میری کانپ جاتی تو مجھے وزیرے کی ماں سے بہت صلواتیں سننا پڑتیں۔“ حوالدار زور سے ہنسا ”وزیرا، وزیرا“ پانچ سال کا بیٹا ہے.....“ میں نے بستر سے اترنے کی کوشش کی۔ ”مجھے کہیں بہت جلدی پہنچنا ہے.....“ تمہاری دیوانہ وار دوڑ سے ہی پتا چل رہا تھا۔ ویسے تو میں نے قریبی یونٹ سے ڈاکٹر کو بلوایا تھا۔ وہ وہ پہلے آ کر تمہیں ضروری انجیکشن وغیرہ لگا چکا ہے اور تمہارے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر گیا ہے لیکن اس نے جاتے یہ بھی کہا ہے کہ تم ایک ہفتے تک بستر سے اٹھنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ ویسے یہ ماجرا کیا تھا.....؟“ میر جلدی جلدی شیر محمد کو ضروری تفصیل بتائی کہ میرے لیے ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہے۔ شیر محمد حیرت سے کھولے میری بات سنتا رہا اور اچانک میرے ذہن میں آئی جی نصیر صاحب کا خیال آیا۔ کمال آباد اگرچہ سے تین دن ٹرین کے فاصلے پر تھا لیکن ان کے حکم پر کسی قریبی ضلع کی پولیس میری مدد کو کال گڑھ آ سکتی

میں نے جلدی سے شیر محمد سے پوچھا ”کیا میں یہاں سے کمال آباد ایک فون کر سکتا ہوں۔“ ہاں جی! نہیں، ایک کیا دس فون کرو۔“ اُس نے خیمے میں رکھے ایک پرانی وضع کے لوہے کے ڈبے کو اٹھا کر دو تین اس کی چرخی گھمائی۔ دوسری جانب سے شاید کسی آپریٹر نے اٹھایا۔ شیر محمد نے مجھ سے کمال آباد کا نمبر پوچھا میں نے اُسے بتایا کہ مجھے نمبر تو زبانی یاد نہیں ہے لیکن کمال آباد میں آئی جی نصیر کا کوئی بھی نمبر ملا دیں۔ آدھ پانچویں کوشش پر دوسری جانب سے گھر کے نمبر پر پہلے کسی آپریٹر نے فون اٹھایا۔ میں نے اُسے بتایا کہ سلطان بابا کے حوالے سے عبداللہ بات کر رہا ہوں اور مجھے نصیر صاحب سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ دیر بعد دوسری جانب سے نصیر صاحب کی جھکی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ شاید آرام کر رہے تھے۔ وہ تقاضا کروانے سے پہلے ہی مجھے پہچان چکے تھے اور جب میں نے انہیں ساری صورت حال بتائی تو اُن کے لہجے فکر مند کے ساتھ ساتھ رواپتی پولیس والوں کی تیزی بھی در آئی۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ اگلے آدھے گھنٹے کے اندر قریب ترین ضلع کے ایس پی اپنی تمام تر مہیا کمک کے ساتھ کال گڑھ کے لیے نکل چکے ہوں گے جب تک میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچوں گا تب تک وہ بھی مجھے وہیں میرا انتظار کرتے ملیں گے۔ انہوں سختی سے مجھے منع کیا کہ میں تنہا دوبارہ کال گڑھ میں داخل ہونے کی کوشش نہ کروں۔ جب میں نصیر صاحب

نوری بھی اپنے باپ سمیت محن ہی میں کھڑی رو رہی تھی۔ میں واپس دوڑتا ہوا ایس پی کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ سلطان بابا کا کہیں کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ایس پی وائرلیس پر اپنی فورس کو ہدایات دینے میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں قیدیوں کے ہجوم سے ایک قیدی باہر نکلا اور اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ”میں جانتا تھا..... تم کا میاں واپس لوٹو گے.....“ آواز سنتے ہی میں نے چوک کر اُسے دیکھا، وہ خانو تھا۔ میں بھی روہانسا ماہو گیا۔ ”یہ سب تمہاری مدد کی وجہ سے ممکن ہوا ہے خانو..... لیکن میرے سلطان بابا نہ جانے کہاں ہیں۔ سارا فائدہ چھان مارا ہے لیکن.....“ خانو چلا یا ”ٹھہرو! وہ ضرور بابا کو قلعے کی اُس خفیہ سرنگ کے ذریعے لے جانے کی کوشش میں ہوں گے، جو سیدھی صحرا کو جانتی ہے.....“ ایس پی نے خانو کی بات سنتے ہی مزید ایک لمحہ نالغ کیے بنا کچھ سپاہیوں کو خانو کے ساتھ اُس سرنگ کا پتا لگانے کے لیے دوڑا دیا۔ میں نے بڑھنے کی کوشش کی تو مجھے روک دیا گیا۔ ”آپ رک جائیں..... وہاں خطرہ ہو سکتا ہے.....“ میرے بس میں ہوتا تو سب سے آگے بھاگ جاتا۔ کچھ ہی دیر میں ایک سپاہی ہانپتا ہوا دوڑ کر واپس آیا اور اُس کی تنہا کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ زور سے چیخا ”سرنگ مل گئی ہے صاحب۔ وہاں ایک بڑھاوندھے منہ پڑا ہے.....“

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

ایس پی کی قیادت میں وہاں آپہنچا۔ افسروں نے اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ وہ آئی جی صاحب کی ہدایت پر یہاں پہنچے ہیں۔ شیر محمد نے مجھ سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے زور سے گلے لگا لیا اور اور ”مجھے یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے جوان، ورنہ میں بھی تمہارے استاد سے ملنے ضرور تمہارے ساتھ۔“ میں نے اُسے رخصت کرتے ہوئے دھیرے سے اُس سے کہا ”جب تم وزیرے کی بات سے فون پر بات کرو تو اُسے بتانا کہ تمہارا نشانہ واقعی بہت اچھا ہے.....“ جیب میں بیٹھتا ہوا شیر محمد زور سے فون پر بات کر ڈال کر بڑھ گیا۔ ایس پی نے وہیں ریت پر لکڑی کی ایک چھڑی کی مدد سے میرے معلومات مطابق کال گڑھ کا ایک چھوٹا سا نقشہ بنا لیا اور قلعے کا جغرافیہ اور آنے جانے کے تمام ممکنہ راستے اپنی فوج اچھی طرح ذہن نشین کر دئیے۔ آدھے سپاہی ڈی ایس پی کی قیادت میں دوسری جانب سے صحرا کی طرز نکلنے راستوں پر پہرے کی چوکیاں بناتے ہوئے کال گڑھ کا محاصرہ کرتے ہوئے بڑھتے گئے جب کہ ایس پی صاحب میرے ساتھ آدھے سپاہی کے لیے کال گڑھ داخل ہو گئے۔ کبھی کبھی نصیب ہماری ساری گنتی اٹنی کر ہے۔ ہر توقع برعکس ثابت ہو جاتی ہے۔ شاید آج یہی جبروت کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ اس قید خانے میں خانو مجھے صحرا کے دور رخ سے نکلنے کے راستے اور گر تبا دے گا اور میں اُس کے جانبازوں کو کالے اور اُس کے دوست قیدیوں کی مدد سے پچھاڑ کر صحرا پار کر جاؤں گا اور ایک سرحدی چوکی پر بھی پہنچ جاؤں گا۔ چوکی والے بھی اپنے فرائض کی حد بندی کی وجہ سے اتنی جلدی میری مدد نہ کر پاتے کیوں یہ پولیس کا کیس تھا۔ ایسے میں جبروت نے یہ بھی کہاں سوچا ہو گا کہ مزار پر رہنے والے یہ دو فقیر اتنی پہنچ رکھتے ہوں گے کہ ایک ٹیلی فون پر ضلع کے ایس پی کو تمام لوازمات کے ساتھ کال گڑھ آنے پر رضامند کر کے گئے، کیوں کہ عام حالات میں اس سارے انتظام کے لیے کم از کم مہینہ درکار ہوتا لیکن اس کی تمام توقعات برعکس میں اس وقت ایس پی سمیت قلعے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دربان کو دروازہ کھولتے ہی گرفتار کر لیا گیا اندر سے کچھ مزاحمت ہوئی اور چند کارندوں نے پولیس پر فائر کھولنے کی کوشش کی لیکن آدھے گھنٹے کے اندر قلعے کے اندر موجود دس بارہ محافظ گرفتار ہو چکے تھے۔ میں تیزی سے راہ داریوں میں دوڑتا ہوا قید خانوں طرف بڑھ گیا۔ نوری اور اُس کے باپ سمیت گیارہ مزید قیدی اس زندان سے برآمد ہوئے لیکن میری نظر سلطان بابا کی تلاش میں جھک رہی تھیں۔ میں نے ایک ایک کال کھڑی میں خود جھانک کر دیکھا لیکن ان کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ قیدی آزاد ہونے کے بعد قلعے کے صحن میں جمع تھے اور خوشی سے نعرے لگا رہے تھے قلعے سے باہر کال گڑھ کی ساری بستی، رات ہونے کے باوجود جمع ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے پھڑوں کے لیے رہے تھے، چلا رہے تھے۔ جبروت کے ظلم کا سورج آج ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا لیکن خود جبروت جانے کہاں غائب تھا۔ اکرم اور اُس کے دو مزید خاص ہر کاروں کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میری سانسیں نہ لگیں۔ کہیں اُس نے سلطان بابا کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔

## پہلا کفارہ

ایسا کہ سارے علاقے کا محاصرہ کر لیا گیا ہے، لیکن فی الحال اُس کی حراست کی اطلاع نہیں آئی۔ میں نے بھیڑ  
ن سیکنے کے نانا تانی کو دیکھا تو میرا جی چاہا کہ دوڑ کر کہیں چھپ جاؤں، لیکن وہ تو خود مجھے ہی تلاش کر رہے  
تھے۔ ظاہر ہے اُن کے پاس وہی ایک تھا۔ جس کے بارے میں سوچ کر ہی میری سانسیں گھٹنے لگتی تھیں۔  
پایک ہجوم میں خانو مجھے ایک جانب کھڑا نظر آیا۔ میں نے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلایا۔ وہ جلدی سے  
ری جانب بڑھا ”تم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے نا.....؟“ ہاں۔ اور اسی لیے میں نے خود  
لیس کو اپنے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ ایس پی صاحب نے مجھے جبروت کے خلاف ”سلطانی گواہ“ بنانے کا  
مدہ بھی کیا ہے۔ مجھے جبروت کے گہرنا کا اقرار بیان کی صورت میں بھری عدالت میں کرنا ہوگا اور میں اس  
لے لیے تیار ہوں۔ بلکہ پولیس اگر مجھے سلطانی گواہ نہ بھی بنائے تب بھی عدالت میں بیان ضرور دوں گا۔“ میں  
نے فور سے خانو کی طرف دیکھا۔ ”نہیں تم ضرور سلطانی گواہ ہی بنو گے، لیکن یہ تمہارا کفارہ نہیں ہوگا۔ تمہارا  
ن کفارہ تمہاری رہائی کے بعد شروع ہوگا۔ بلو، منظور ہے؟“ خانو نے میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا  
پے۔ ”تمہارے لیے خانو کی جان بھی حاضر ہے۔ تم صرف کفارے کی بات کرتے؟“ میں نے اُسے دُور  
فرے بوڑھے جوڑے کی طرف اشارہ کر کے بتایا ”یہ بوڑھا اور بوڑھیا اُسی سیکنے کے نانا اور تانی ہیں، جو اسی  
نے کی کھولی نہرسات میں دفن ہے۔ تمہارا پہلا کفارہ یہی ہے کہ تم انہیں لے جا کر سیکنے کی قبر دکھاؤ اور اس بوڑھیا  
لے ٹانوں پر پڑی وہ آدمی بٹھی ہوئی پھولوں والی چادر اُس بد نصیب کی قبر پر ڈال دو۔“ خانو کے چہرے کا  
لٹ پٹا بڑھ گیا اور وہ یوں ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا، جیسے اُس کے قدموں تلے کوئی کچھونکل آیا ہو۔ ”نہیں نہیں!  
مے نہیں ہوگا۔ تم چاہو تو میرا سر کاٹ کر اُن کے قدموں میں ڈال دو، لیکن.....“ ”لیکن کیا؟ ابھی تو تم دعویٰ  
رہے تھے کہ کفارے کے لیے ہر حد سے گزر جاؤ گے۔ پھر اس پہلی حد کو پار کرنے سے پہلے ہی تمہارے  
ن کیوں جلنے لگے.....؟“ وہ بے بسی سے تپملایا ”نہیں یہ بات نہیں ہے۔ لیکن میں اُن کا سامنا کیسے کروں  
؟“ میں نے اُس کا چہرہ اپنی جانب موڑا ”تمہیں صرف آج نہیں، ساری عمر اُن کا سامنا کرنا ہے۔ کیوں کہ  
ہارا اصل کفارہ اب ان لاچاروں کی کفالت ہی ہے۔ اب تم ہی کو عمر بھر ان کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ زندگی بھر  
ن گناہ دھونے کا اس سے بہترین موقع بھلا اور کیا ہوگا؟“ خانو نے شدید کش مکش کے عالم میں سیکنے کے  
رگوں کی جانب دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اُسے اُن کی جانب دھکیل دیا۔ بوڑھیا اپنے آس پاس سے  
زرنے والے ہر شخص سے یہی پوچھ رہی تھی کہ کیا قلعے کے سارے قیدی رہا ہو چکے ہیں اور کیا ان میں سے کسی  
ن اُن کی سیکنے کو کہیں دیکھا؟ خانو دھیرے دھیرے چلا ہوا اُن کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بوڑھی آنکھوں نے اُس  
ے بھی یہی سوال پوچھا۔ خانو نے بنا کچھ کہے اُن دونوں کا ہاتھ پکڑا اور اندرونی راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔  
ن کے قدموں میں واضح لرزش مجھے اتنی دُور سے بھی نظر آرہی تھی، لیکن یہ لڑکھڑاہٹ اُن قدموں کی تھی، جو  
نا زندگی میں پہلی مرتبہ کفارے کی راہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔ جانے ہمارے قدم تب اس طرح کیوں نہیں

اُس سپاہی کی بات سن کر مجھے یوں لگا، جیسے ابھی آسمان پھٹ کر ہمارے سروں پر آگرے گا۔ میں تو  
کر آگے بڑھا تو کسی دوسرے سپاہی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن میں اُسے دھکیل کر قلعے کی  
غلام گردش کی طرف بھاگا، جہاں خانو سُرنگ دکھانے کے لیے باقی سپاہیوں کو لے گیا تھا۔ وہاں تھوڑے  
فاصلے پر مجھے اندر جاتی بیڑھیاں نظر آ گئیں، جو بظاہر کسی نہ خانے کا راستہ دکھائی دے رہی تھیں۔ جانے جبر  
جیسے ہر قلعے دار کو اپنے قلعے میں ایسی خفیہ سرنگیں بنانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ میں نے تاریخ میں  
ایسے بہت سے بادشاہوں کا تذکرہ پڑھا تھا جو اپنے محل سے فرار کا ایسا کوئی پوشیدہ راستہ ضرور بنا کر رکھتے  
کیا جبر اور اقتدار ہمیشہ ہی سے چور راستوں کا محتاج رہا ہے۔ سرنگ کے اندر سپاہیوں کا ہنگامہ سا تھا۔ ام  
تھک ہونے کے باوجود نہ جانے اس سرنگ میں ہوا کہاں سے آرہی تھی۔ میں نارنج کی روشنی میں بنے دائر  
سے ہوتا ہوا وہاں تک پہنچا، جس جگہ کی سپاہی نے نشان دہی کی تھی۔ ہاں، وہ سلطان بابا ہی تھے۔ ہوش و جا  
سے بیگانہ، نہایت زرد رنگت اور اکھڑی سانسوں کے ساتھ بے سدھ پڑے ہوئے۔ کچھ سپاہی اُن کے  
پاؤں مسل کر انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں سلطان بابا کو  
کر باہر کھلی فضا میں پہنچا دیا گیا۔ بظاہر انہیں کوئی چوٹ لگی نظر نہیں آرہی تھی۔ ایس پی صاحب نے جب  
سپاہی کو اپنی گاڑی سے میڈیکل بکس لانے کا حکم دیا تو عقدہ کھلا کہ وہ ڈاکٹر پہلے ہیں اور سی ایس ایس آفیسر  
میں۔ انہوں نے سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کیا اور ایک انجیکشن بھی لگا دیا۔ انہیں بھی بظاہر ٹھنکن اور تھکن  
علاوہ کوئی خاص علامت دکھائی نہیں دی، لیکن انہوں نے مجھے تلقین ضرور کر دی کہ پہلی فرصت میں انہیں  
بڑے اسپتال میں مکمل طبی معائنے کے لیے ضرور لے جاؤں۔ قلعے میں ابھی تک افراتفری پھیلی ہوئی تھی  
سپاہیوں کے ساتھ زنانہ پولیس بھی تھی، جس نے قلعے کی تمام خواتین کو اندرونی احاطے میں جمع کر کے انہیں  
دی کہ فی الوقت اُن میں سے کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں آرام کر  
البتہ واضح رہے کہ اُن میں سے کسی کو بھی قلعہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ رات تیزی سے ڈھل رہی تھی  
میں وہیں سلطان بابا کے سرہانے پریشان بیٹھا بار بار اُن کا ہاتھ اُٹھو کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ حد تک  
ہوئی تو میں جلدی سے ایس پی صاحب کو بلا لایا۔ انہوں نے تصدیق کر دی۔ ”ہاں..... کچھ بخار سا تو ہے۔  
اتنی تھکن کے بعد یہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔“ میں نے اُن سے جبروت کے بارے میں پوچھا تو انہوں



دو چار دھکے سینے پر اس زور سے لگے کہ وہ بھاگنے والوں کے تیز قدموں کے لیے زحمت بن گئے۔ جبروت آگے نکل چکا تھا، پیچھے والوں میں سے کسی نے اُن کے سر پر وار کیا اور وہ لوگ انہیں بے سدھ پڑا چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے۔ شاید اُن کے ذہن میں کہیں یہ اطمینان بھی ضرور ہوگا کہ اس خفیہ سُرنگ میں یہ ضعیف شخص اڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی جان دے دے گا، کیوں کہ عام حالات میں اُس تہ خانے کی دیواروں میں چھپے، اس سُرنگ کے دروازے کو ڈھونڈنے میں ہمیں شاید ہفتوں لگ جاتے ہیں، لیکن ایک بار پھر یہاں خانو کا کفارہ جبروت کی تمام چالوں اور گناہوں پر بازی لے گیا اور چند لمحوں بعد ہی ہم نے انہیں کھوج لیا۔ میں نے انہیں مختصر ایکسینہ کے بارے میں بتایا تب تک اندر سے سیکنہ کے نڈھال نانا نانی کو کچھ لوگ سہارا دیئے ہوئے باہر نکال لائے۔ خانو بھی اُن کے ساتھ ہی تھا۔ ایس پی صاحب کو سلطان بابا کے ہوش میں آنے کی خبر ملی، تو انہوں نے فوراً آئی جی صاحب کو کنٹرول لائن کے ذریعے اطلاع کروادی۔ رات ڈھلنے والی تھی۔ میرے شدید اصرار کے باوجود سلطان بابا نے مزید آرام کرنے سے منع کر دیا اور مؤذن کو وہیں قلعے کی فصیل پر چڑھ کر اذان دینے کی ہدایت کی۔ وہ بہت نڈھال سے لگ رہے تھے، لیکن انہوں نے وہیں قلعے کے کپکنے کو دھلو کر چادریں بچھوائیں اور امام صاحب سے درخواست کی کہ وہ آج ہمیں قلعے میں فجر کی جماعت کروائیں۔ قلعے کی دیواروں نے صدیوں بعد یہ نظارہ بھی دیکھا۔ امام کی قرأت کی آواز اس چار دیواری میں گونجی، تو بستی کے سب ہی لیکن غم دیدہ ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ ظہر کی نماز کے بعد سیکنہ کی آخری رسومات ہمیں قلعے میں ادا کی جائیں گی۔ بوڑھا جوڑا بھی اسی حق میں تھا کہ اب اسی کوٹھڑی کو سیکنہ کی قبر کے طور پر رہنے دیا جائے۔ البتہ وہاں باقاعدہ مٹی کی ڈھیری اور قرآن و دعا وغیرہ کا انتظام کروادیا گیا۔ میرا ذہن پھر سے جسم اور رُوح کے اُن دیکھے تعلق کے الجھے دھاگوں کو سلجھانے کی کوشش میں خود اپنے بیٹے ادھیڑ نے لگا۔ رُوح کا عکس کیسا ہوتا ہوگا؟ کیا ہمارے ظاہری جسم کی شہادت کا بھی اس عکس پر کچھ اثر پڑتا ہوگا یا پھر وہ ہوا کے کسی جھونکے کی طرح بے رنگ، بے فعل ہوتی ہوگی اور مجھے سیکنہ کا جو عکس صحرا میں نظر آتا تھا، وہ تو اُس کی موت کے بعد دکھائی دیا تھا۔ گویا وہ عکس رُوح کے بغیر کی تصویر تھی۔ ہم خواب میں جو چلتی پھرتی تصویریں دیکھتے ہیں، وہ بھی تو بے جان ہی ہوتی ہیں۔ جس شخص کو میں اپنے خواب میں چلتا پھرتا، دوڑتا بھاگتا دیکھتا ہوں، وہ اُس وقت اپنی رُوح سمیت کہیں اور جیتا جاگتا موجود ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ذہن کے پردے پر بنا رُوح جو فلم چل رہی ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ کبھی ہمارا اس شخص کے جسم اور رُوح سے کوئی خونی رشتہ بھی رہا ہو۔ ہم بالکل انجان اور نئے چہرے بھی اپنے خواب میں دیکھتے ہیں۔ ہمارا ذہن ان کا خاکہ کیسے تراش لیتا ہے؟ اُن میں سے کئی چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں ہم باقی ساری زندگی کبھی دوبارہ نہیں دیکھ پاتے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی خواب کا شناسا چہرہ مل بھی جاتا ہے۔ تو کیا ہم عالم ارواح میں پہلے اُس چہرے کی رُوح سے مل چکے ہوتے ہیں؟ سلطان بابا کی حالت اُس وقت ایسی نہیں تھی کہ میں انہیں مزید سوال پوچھ پوچھ کر پریشان کرتا، لیکن خود میں الجھتا ہی چلا

لڑکھڑاتے اور ڈر لگاتے جب ہم گناہ کے راستے پر بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے قدرت ہم کز درو انسانوں کو اس قدر ثابت قدم اور مضبوط کیوں سمجھتی ہے؟ سچ ہے کہ انسان کا مقدر یہ عمر بھر کی پھسلن ہی ہی ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں، جو اس ازلی ڈھلان سے پھسلے بنا ہی سیدھے نیچے اتر جاتے ہیں۔ نہ کوٹھڑیوں کی جانب گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک بڑھیا کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ بوڑھے کے رونے کی آواز بھی سنائی دی، تو ساری بستی والے اُس جانب دوڑے۔ میں وہیں گم گم سر بابا کے سر ہانے بیٹھا رہا کہ میں جانتا تھا کہ ان بد نصیبیوں پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ میں نے سیکنہ کے نانا نانی کی آس سدا کے لیے توڑ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ کیا بُرا تھا اگر میں انہیں اُن کی آخری چند سالوں میں اسی بھرم ہی میں جینے دیتا کہ اُن کی لاڈلی نواسی گم شدہ، لیکن زندہ ہے۔ ہم میں بہت سے انسان اپنی ساری زندگی ایسے ہی کسی جھوٹے بھرم میں گزار دیتے ہیں کہ ”وہ مجھے چھوڑ گئی، وفا نہ تھی۔ وہ واپس لوٹا ہے تو پھر میرا ہی ہوگا۔“ ”یہ دنیا ہماری نہیں تو کیا، آخرت تو ہماری ہی ہے۔“ یا زندگی کس نے دیکھی ہے، جتنا بھی جینا ہے، یہی جی لیں۔“ تو اگر ایک بھرم اور بڑھ جاتا تو ایسا کیا گناہ لیکن میں اس عمر بھر کی اذیت سے بھی واقف تھا، جو کسی کے نہ ختم ہونے والے انتظار کی صورت میں ہے۔ انتظار تو خود پل پل وار ہوتی موت کا نام ہے اور میں اُن دونوں کی بوڑھی آنکھوں کو انتظار کی اصلیب پر مزید نہیں لٹکانا چاہتا تھا، ورنہ شاید اُن کی چلیں موت کے بعد بھی کھلی رہ جاتیں۔

کچھ دیر میں سلطان بابا نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں جلدی سے اُن پر جھکا ”اب آپ..... آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ ہوا کیا تھا؟“ میں نے ایک ہی سانس میں کئی ڈالے۔ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے۔ ”ابھی تک بہت جلد باز ہو۔“ پھر انہوں نے آہستہ آہستہ کہ جبروت کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں صرف بارہ گھنٹے کے قلیل وقفے میں ضلع بھر کی پولہ لے کر قلعے کے دروازے پر آپہنچوں گا۔ جیسے ہی اُسے پولیس کی آمد کی اطلاع ملی اور صحرا سے آئی جبروت نے اُسے بتایا کہ صحرا میں صرف اور صرف پولیس ہی کی گاڑیاں نظر آرہی ہیں، تو اُس نے سب حکومت میں موجود اپنے اُن اعلیٰ عہدے داروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، جو اُس کے در پردہ ہم لیکن حسب معمول اس موقع پر سب ہی نے کسی نہ کسی بہانے سے معذرت کر لی۔ ایک آدھ نے پولہ دربار کی گھنٹی ہلانے کی کوشش کی بھی، تو وہاں نصیر صاحب کی ہدایات کا قفل پڑا پایا۔ جبروت کے پا تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور فورس کال گزھ میں داخل ہو چکی تھی۔ تب ہی اُس نے سلطان بابا کو طلب کیا کہ اُن سے پوچھا کہ آخر وہ ہیں کون؟ لیکن اس سے پہلے کہ سلطان بابا کوئی جواب دے پاتے، گاڑیوں کی آوازیں قریب آتے لگیں اور مجبوراً جبروت کو افراتفری میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ جاتے جا اپنے ہر کاروں کو سلطان بابا کو بھی ساتھ لے جانے کا حکم بھی دے دیا، لیکن اس بھاگ دوڑ میں سلط

سے وارلیس سیٹ چیخ پڑے، ہر جانب ایک شور مچ گیا۔ جبروت نے خود کو کنپٹی پر گولی مار کر اپنا خاتمہ کر لیا تھا۔ بستی کی ساری آبادی، جو پولیس کے عارضی صحرائیں قائم کردہ کنٹرول روم کے گرد جمع تھی، گنگ سی رہ گئی۔ چاروں طرف ایک سناٹا چھا گیا۔ ظلم کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ابھی چوبیس گھنٹے پہلے تک، جوان سب لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرتا تھا، آج ایک بے جان لاش کی صورت ریت پر بے بس پڑا تھا۔ سرخ رنگ اور خون کی دھار تو اُس کا پسندیدہ کھیل تھا اور آج جاتے جاتے بھی وہ یہ کھیل کھیل ہی گیا۔ سلطان بابا کو خبر پہنچی تو ان کی زبان سے ایک ہی جملہ نکلا ”انا للہ و انا الیہ راجعون.....“ وہ ابھی نوری کے گھر ہی میں آرام کر رہے تھے اور پھر اگلی صبح سورج نکلنے ہی پہلے سانول اور پھر اُس کا باپ کے یکے بعد دیگرے نمودار ہوئے۔ سانول مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر میرے گلے لگ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس کا باپ بھی شرمندہ سا بیچھے کھڑا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے چپ کر دیا۔ سانول کے باپ نے ساری بستی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے کہ وہ جبروت کے ڈر کی وجہ سے کھل کر بستی والوں کا ساتھ نہیں دے سکا۔ نہ ہی اُس نے اپنے بیٹے کو جبروت کے نوری کے لیے بھیجے گئے رشتے اور اس سارے معاملے کی خبر ہونے دی، کیوں کہ اُسے خدشہ تھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیئے۔ وہ خوف زدہ تھا اور زمانے میں خوف سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ کال گڑھ والوں کے سر سے جبروت کے خوف کے بادل چھپے، تو ان کی زرد رنگت میں بھی دھیرے دھیرے سرخی شامل ہونے لگی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ صرف سانس لینے کی مجبوری سے نکل کر جینے کے سنے دیکھنے لگے تھے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ میں اگلے دن بستی والوں سے زخمت لے کر سلطان بابا کو شہر کے کسی بڑے اسپتال میں داخل کروادوں تا کہ اُن کے تمام ٹیسٹ ہو سکیں۔ ویسے بھی کال گڑھ میں ہمارا کام ختم ہو چکا تھا، لیکن جیسے ہی میں نے اپنی اس خواہش کا بستی والوں کے سامنے اظہار کیا، سب ہی بگڑ گئے۔ سانول تو باقاعدہ لڑنے کے لیے آپہنچا کہ اگر سلطان بابا کا طبی معائنہ ہی کرنا ہے تو وہ خود میرے ساتھ شہر جا کر دو چار دن میں سارے کام مکمل ہونے کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آجائے گا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھا تا کہ ہمارے پاؤں میں چکر تھا، جانے قدرت نے ہمارا اگلا پڑاؤ کہاں لکھا تھا اور اب مزید کون سا امتحان درپیش ہوگا۔ اسی شام سانول کے باپ کی درخواست پر نوری کو باقاعدہ نشانی پہنانے کی رسم بھی رکھی گئی تھی۔ شام ہی سے بستی کے سب ہی گھر کی دیواروں کی منڈیر پر دیئے جلا دیئے گئے۔ یہ اس صحرا کا پہلا چراغاں تھا، جو قلعے کی دیواروں کے باہر خود بستی والوں کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ مردوں نے برسوں سے صندوقوں میں پڑی اپنی سفید لٹھے کی گھیر دار شلواریں نکلو کر انہیں مانع لگا کر تیاری کی۔ بوسکی کی دو گھنٹوں کے نشان والی قمیضیں اور سر پر نیا صافہ یا سرخ پگڑی، عورتوں نے بھی اپنے بازو کہنیوں سے اوپر تک چڑیوں سے بھر لیے۔ سرخ، نیلے، پیلے، اودے اور سفید بڑے گھیر والے پلو اور ناک میں چمکیلے کوکے۔ جانے انکارسوں کا مہندی سے ایک خاص تعلق کیوں جڑا ہوتا ہے۔ شاید رنگ اور خوشی کا آپس میں کوئی گہرا ناتہ ہوگا۔

گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آج بھی ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں، جو مستقبل کی جھلکیاں اپنے خواب میں دیکھ لیتے ہیں۔ اُن میں سے بعض تو جاگتی آنکھوں چند لمحوں میں آنے والے کسی واقعے کی کچھ تفصیل، کبھی کچھ اشاروں میں اور کبھی باقاعدہ چہرے، نام اور جگہ کی تفصیل کے ساتھ دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن انہیں وہ اجنبی چہرے اور انجان جگہیں کس طرح خواب میں دکھائی دی جاتی ہیں۔ ضرور میرا اور سیکینہ کی تصویر کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ میرے لیے بظاہر انجان ہونے کے باوجود انجان نہیں تھی۔ میرا سارا دن اسی سوچ بچار میں گزر گیا۔ میری پوری کوشش تھی کہ سلطان بابا جس قدر ہو سکے، آرام کریں، لیکن بستی والوں نے ہمیں مزار واپس لوٹنے ہی نہیں دیا اور نوری کا باپ ضد کر کے ہمیں اپنے گھر لے آیا۔ میں نے بستی کے ڈاکے کے ذریعے شیر محمد کو بھی ایک رقعہ بھجوایا تھا کہ اگر ہو سکے تو اپنی یونٹ کا ڈاکٹر لے کر کچھ دیر کے لیے کال گڑھ آجائے۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کروا کے اپنا پورا اطمینان کر لوں اور پھر وہ ”شاباشے جوانا شاباشے“ کرتا ہوا عصر کے بعد اپنی جیب میں ڈاکٹر کو لے کر پہنچ بھی گیا۔ ڈاکٹر نے نہایت تفصیل سے سلطان بابا کا معائنہ کیا۔ وہ اُن کی سر کی چوٹ کے بارے میں کچھ فکر مند نظر آ رہا تھا۔ اُس نے چند تفصیلی ٹیسٹ لکھ کر دے دیئے کہ دو دن آرام کے بعد جب سلطان بابا سفر کے قابل ہو جائیں، تو فوراً شہر کی کسی بڑی لیبارٹری سے یہ ٹیسٹ کر دالیے جائیں۔ تب تک اُس نے سلطان بابا کو بستی سے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ مغرب کے بعد شیر محمد اور ڈاکٹر کو زخمت ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مکمل اندھیرا چھاتے ہی سرحد کی جانب سے شدید فائرنگ کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ پولیس کی نفری بھی ابھی تک کال گڑھ ہی میں موجود تھی اور پھر کچھ دیر بعد ہی ایس پی صاحب نے آکر ہمیں وہ خبر سنائی، جو ایک خدشے کی طرح میرے دل و دماغ کے کسی کونے میں صبح سے کلک رہی تھی۔ جبروت اور اُس کے چار ساتھی سرحد پار کرنے کی کوشش میں سرحدی ریجنرز سے بھڑ گئے اور میری توقع کے عین مطابق جبروت نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے ایک بار سلطان بابا نے بتایا تھا کہ معافی اور توبہ کی توفیق بھی مقدر والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے، ورنہ آنکھوں پر لوہے کے پردے اور کانوں میں سیسہ پگھلا دیا جاتا ہے۔ انسان کے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے۔ شاید یہی سب کچھ جبروت کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اُس کی انا اُسے کفارے کے راستے پر بڑھنے سے روک رہی تھی۔ موت دونوں جانب ہی اُس کا مقدر تھی۔ وہ گرفتاری دے دیتا، تب بھی صرف سیکینہ کا قتل نہ اُسے پھانسی پر چڑھانے کے لیے کافی تھا اور شاید خود کو اپنی مرضی سے دار کے حوالے کر دینے سے قدرت اُس کے چند گناہ دھوبھی ڈالتی، لیکن اُس نے گناہوں کی کالک ماتھے پر لیے ہی اس جہاں سے جانے کی ٹھان لیا تھا۔ پولیس کنٹرول کے ذریعے ہمیں بل بل کی خبر مل رہی تھی کہ اب جبروت کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا ہے۔ اب اُس کے ساتھی بھاگ رہے ہیں اور پھر اُس کا پہلا محافظ گرا پھر دوسرا اور اب جبروت کو آخری تہیہ کا جاری ہے کہ ہتھیار ڈال کر سامنے آجائے اور پھر مکمل خاموشی..... ایک آخری فائر کی آواز گونجی اور پھر پولیس

نہیں پائی، لیکن ان کے الپ اور گیت سدا کے لیے امر ہو کر ان صحراؤں، بستیوں اور گاؤں گلیوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

سانول کی منگنی کی تقریب کا ہنگامہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ لڑکے والیاں ترکی بہ ترکی لڑکی والیوں کے موالوں کا جواب دے رہی تھیں۔ مرد قہقہہ لگا رہے تھے۔ صحرا کے بنے ہوئے خاص سونف اور شکر کے مشروب سے ساری تقریب کی خاطر مدارات کی جا رہی تھی۔ بچے ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ ہر طرف نور، رنگ، شور اور قہقہے تھے۔ سانول کو عورتوں کے جھرمٹ میں باہر لایا گیا، توبہ ہی اُس جانب دوڑے۔ کچھ ایسا ہی نظر نوری کے صحن کا بھی تھا۔ اس وقت نوری کے چہرے پر شام کی لالی اور صبح کے نور جیسے دو موسم بیک وقت بھلا رہے تھے۔ یہ لڑکیاں ایسے موقعوں پر اتنے بہت سے رنگ بیک وقت کیسے سمیٹ لیتی ہیں۔ اب عورتوں کے تیروں کا رخ میری جانب ہو گیا تھا۔ ایک نے لگائی ”جانے لوگ کس کے غم میں جوگی بن بیٹھے ہیں۔ کاش آسمان پر اڑتی یہ نیلی پتنگ مزار کے مجاور تک میرا پیغام بھی پہنچا دے.....“ سب زور سے ہنسے۔ دوسری دلی نے تان چھیڑی۔ ”مزار کے مجاور کی آنکھوں کا سرمہ جانے کس کان سے آتا ہے..... اگر وہ چاہے تو ہم سب اپنی اپنی سرے دانیوں مزار کی چوکھٹ پر چھوڑ آئیں.....“ سانول میرے قریب ہی بیٹھا ہنس ہنس کر اس عورتی بولی کا ترجمہ مجھے سنا رہا تھا۔ لفظ چاہے کسی بھی زبان کے ہوں..... ان گیتوں کا مطلب سدا ایک سا ہی ہوتا ہے۔

ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ صحن کا دروازہ کھلا اور ایک طالب علم، جسے میں مزار چھوڑ آیا تھا، گھبراہٹ سے اندر داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری طرف بڑھا۔ اس کی کچی پکی اُردو سے میں صرف اتنا ہی سمجھ پایا کہ سلطان بابا کو خون کی تہ ہوئی ہے اور اُن کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے جسم میں سے جیسے کسی نے پل مبر ہی میں ساری جان نکال دی۔ میں نے سانول سے کہا کہ وہ یہیں رہے، لیکن مجھے ابھی مزار لوٹنا ہوگا۔ لیکن سانول بھی میرے پیچھے ہی لپکا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دیگر بہت سے لوگوں سمیت مزار کی جانب دوڑے چلے جا رہے تھے۔

اسی لیے تو جہاں خوشی بکھرتی ہے، وہیں بہت سے رنگ بھی ڈرتے ہیں۔ میں خود تو ابھی تک اس ”خوشی“ نامی جذبے یا احساس کی گتھی ہی نہیں سلجھا پایا تھا۔ خوشی کیا ہوتی ہے۔ مجھے تو ہمیشہ سے ہی زیادہ خوشی مزید افسردہ کر دیتی ہے۔ شاید میرے اندر خوشی جھیلنے کا ظرف ہی نہیں تھا اور کسی ایسے احساس کا جشن کیا منانا، جو چند گھنٹوں سے لے کر بس چند گھنٹوں تک ہی آپ کا ساتھی ہو۔ شاید خوشی کا واسطہ ہی اس کی اس کم یابی کی صفت سے بڑا ہے۔ بڑی سے بڑی خوشی ہمیں بس کچھ دیر کے لیے ہی تو مکمل سرور رکھ پاتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے بے سرور ایک اطمینان میں ڈھلنے لگتا ہے اور چند گھنٹوں بعد ہی کسی احساس کی تکمیل کی طمانیت میں تبدیل ہو کر ذہن کے کسی گوشے میں کروٹ لے کر سو جاتا ہے۔ پھر جب تک ہم خود اس لطیف احساس کو نہ ٹولیں، یہ اپنے آپ نہیں جاگتا۔ لیکن اس کے برعکس ”غم“ ہر لمحہ بوند بوند ہو کر ہمارے دل کی زمین پر ٹپکتا رہتا ہے۔ ہمیں خوشی کو کچھ دن کے بعد یاد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جب کہ غم ہمیں کبھی بھولتا نہیں۔ کسی وفادار دوست کی طرز پر پل ہمارے وجود کے اندر رہتا ہے۔ خوشی اپنے ساتھ ہمیشہ رخصت ہونے کا تصور لاتی ہے، جب کہ غم کا کاڑا ایک دائمی چھن، کاٹ اور جلن لیے دل کے اندر ہی پیوست ہو جاتا ہے۔ تو پھر نہ جانے ہم ہمیشہ خوشی کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اس بے وفا کو ہر لمحہ خوش آمدید کہنے کے لیے کیوں تیار رہتے ہیں، جو ہمیشہ اپنے ماتھے پر ”الوداع“ لکھوا کر آتی ہے۔ اُسے کیوں اٹھا کر سدا کے لیے اپنے سینے سے نہیں لگا لیتے، جو عمر بھر ہمارا چوکھٹ پر پڑا ہمارا انتظار کرتا رہتا ہے۔

سانول بھی آج اس بے وفا خوشی کے وار کا شکار تھا۔ جب میں مزار کی دہلیز پر بڑے غم کی چوکھٹ پار کر کے بستی کے لیے نکلا، تو شام ڈھل چکی تھی۔ غم مجھے جاتے دیکھ کر بولا ”جاؤ مل آؤ، اس دو گھنٹی کی ساتھی سے میں یہیں پڑا رہ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ پر دیکھو، کہیں دیر نہ کر دینا کہ میرا تمہارا تو سدا کا ساتھ ہے۔“ سلطان بابا کی دیکھ بھال کے لیے پیش امام صاحب نے مسجد سے دو طلبا کو مزار بھیج دیا تھا، کیوں کہ سلطان بابا اس شراپے سے گھبرا کر آج شام ہی واپس مزار لوٹ آئے تھے۔ میں جب سانول کے گھر سے قریب پہنچا تو دورو سے مجھے عورتوں کی گنگناہٹ سنائی دی۔ صحرائی گیت کے بول سانول کو مبارک باد دے رہے تھے ”کہ آج سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا۔ تمہاری محبوب سولہ سنگھار کیے اور اپنے ماتھے پر تمہارے نام کی بندیا لگائے کہ سے تمہارا انتظار کر رہی ہے..... لیکن خدا مارے ان چوڑیوں والیوں کو..... یہ ہمیشہ دیر کر دیتی ہیں..... شاید تمہاری محبوب سے جلتی ہیں۔“ عورتیں زور سے ہنسیں اور کسی دوسری جانب سے کوئی اور ٹولی گنگنائی، یہ چوڑا والیوں کا جواب تھا ”ہاں ہاں..... ہم کیوں جلدی کریں؟ ہمارے تو دل جل رہے ہیں..... بستی میں ایک ہی چھیل چھیلا تھا، جس کی بانسری سننے کے لیے ہم ساری صحرائیں جمع ہوتی تھیں..... خدا کرے آج اس زور آندھی چلے کہ صحرا کا شہزادہ اپنا راستہ بھول کر چوڑی والیوں کی بستی میں آجائے.....“ سب عورتیں ہنس پڑیں جانے یہ صحرائی گیت اور بچے کون لکھتا ہوگا۔ جانے ایسے کتنے تم نام شاعر ہوں گے، جنہیں دنیا کبھی جان

## دھانی

شہر کے سب سے بڑے اسپتال کا پتا میں پہلے ہی اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ چکا تھا۔ دوسرا فون میں نے آئی جی نصیر کو کیا کیوں کہ انہوں نے ایس پی کے ذریعے سلطان بابا کی پل پل کی خبر دینے کی ہدایت کی تھی۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں رحیم پور میں ہوں تو فوراً اپنے ایک ریٹائرڈ سینئر کا نام، پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھوا کر تاکید کی کہ اسپتال پہنچ کر انہیں بھی ضرور مطلع کر دوں۔ یہ صاحب پولیس کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد اب رحیم پور ہی میں اپنا فارم ہاؤس اور مالٹے، کیونو کے باغات کا کام سنبھالتے تھے۔ میں نے بے دھیانی میں ساری تفصیل کاغذ کی ایک چٹ پر لکھ کر جیب میں ڈال لی۔ اُس وقت میری ساری توجہ اس جانب تھی کہ کسی طرح جلد از جلد سلطان بابا کو اسپتال پہنچا دوں اسٹیشن کے باہر ٹیکسی اسٹینڈ سے گاڑی لے کر میں لاشتم پشتم اس بڑے نجی اسپتال تک پہنچاؤں اور یہاں ایک بار پھر میرا حلیہ میرے آڑے آگیا۔ باہر کھڑے دربان کو اس بات کا یقین ہی نہیں تھا کہ میں اتنے بڑے اسپتال کی فیس بھر سکوں گا۔ تب قریب سے گزرتے ایک معمر ڈاکٹر کو روک کر میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں اندر جانے کی اجازت دلوئے۔ پتا تم پہلے ہی اسپتال کے اکاؤنٹ میں منتقل کروا چکے تھے۔ وہ کوئی بھلا انسان تھا۔ اُس نے ہمدردی سے میری بات سنی اور گاڑی کو ڈانٹا کہ ”کتنی بار منع کیا، یوں مریضوں کو گیٹ پر روک کر بحث نہ کیا کرو۔“

میں سلطان بابا کو انہی ڈاکٹر صاحب کی معیت میں انتہائی نگہداشت کے شعبے کی طرف بھجوا کر خود استقبالیہ کی طرف دوڑا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی کو میں نے پاپا کا اور اپنا نام بتایا کہ وہ چیک کرے کہ کیا اس مد میں کوئی رقم اسپتال کے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی ہے۔ اُس نے مستعدی سے جانچ پڑتال کے بعد مسکراتے ہوئے اطلاع دی کہ رقم جمع ہو چکی ہے۔ پاپا نے اتنے پیسے بھیج دیئے تھے کہ اگر ہمیں مہینہ بھر سے زیادہ بھی یہاں رہنا پڑتا تو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ تب میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ کہ ”اب تو مسیحا بھی گراں ہو گئے۔“ اگر انسان کی جیب میں مناسب رقم نہ ہو تو یہ مسیحا بھی اس کا مقدر نہیں۔ سلطان بابا کے سر کے بہت سے ایکسپریز اور سی ٹی اسکین وغیرہ کے بعد انہیں ایک کشادہ کمرے میں داخل کر لیا گیا۔ اس وقت وہ اپنے حوش و حواس میں تھے۔ اور انہیں مستقل یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں خواہ خواہ انہیں اتنے مہنگے اسپتال میں کیوں لے آیا ہوں۔ بقول اُن کے وہ بھلے چنگے تھے اور اب ہمیں وہاں سے چل پڑنا چاہیے تھا۔ لیکن ڈاکٹروں کی رائے اس کے بالکل برعکس تھی۔ انہوں نے سر کی اندرونی چوٹ کا خدشہ ظاہر کیا تھا اور اُن کے کلیے کے مطابق اب تک سلطان بابا کا چلنا پھرتا بھی کسی مجھ سے کم نہیں تھا۔ بہر حال طے یہ ہوا کہ صبح بڑے ڈاکٹروں کا ایک پینل بابا کی تمام رپورٹس کی جانچ کرے گا اور پھر کوئی حتمی بات کی جائے گی۔

اس سارے ہنگامے میں شام ہو چکی تھی اور جب مجھے سلطان بابا کی نگرانی پر مامور نرس نے یہ اطلاع دی کہ یہاں رات بھر نپھرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تو مجھے ایک دوسری تشویش نے آگھیرا۔ میں سلطان بابا کو اکیلا چھوڑ کر کہیں جاتا تھا لیکن اسپتال کے اصول بھی اٹل تھے۔ ابھی میں اسی کش مکش میں مبتلا تھا کہ

سلطان بابا کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ چند لمحوں ہی میں وہ برسوں کے بیمار نظر آنے لگے رات کی گاڑی چھوٹنے میں ابھی سوا گھنٹہ باقی تھا لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سواری کا تھا۔ گھنٹہ یہاں سے ریلوے اسٹیشن کی مسافت تھی۔ لیکن کسی مریض کو بنا کسی سواری، یہ صحرا پار کرانے میں ہو جاتی ہے۔ لہذا طے یہ ہوا کہ ہم دودو کی ٹولیوں میں اُونٹوں پر سفر کریں گے۔ بستی میں سواری کے اُونٹ موجود تھے۔ عام حالات میں ان کے پیچھے دو پہیوں والی ٹھیلہ گاڑی بھی لگادی جاتی تھی۔ لیکن اس وہ پیسے ریت میں دھنس کر چلنے کی وجہ سے تاخیر کا باعث بن سکتے ہیں لہذا ہمیں اُونٹوں کے مضبوط قدموں انھار کرنا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دس آدمی پانچ اُونٹوں پر سوار، صحرا میں دوڑے جارہے تھے۔ سلطان میرے ساتھ تھے۔ سانول اور اُس کا باپ ایک اُونٹ پر اور نوری کا باپ اور پیش امام صاحب ایک سانے تھے۔ خانو، اکرام صاحب اور بزرگ بقیہ اُونٹوں پر توڑے ہمارے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر پہا ہم بستی کی سرحد سے گزر رہے تھے تو سب ہی مرد اور عورتیں مجھے اور سلطان بابا کو الوداع کہنے کے لیے آئے۔ میں نے صحرا میں پلٹ کر دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے ہوا دھیرے سے میرے کان میں سیکنے کے پیغام کی سرگوشی کر کے ہو لے سے گنگنائی ہو..... ”الوداع.....“

ہم تیزی سے صحرا عبور کر کے اسٹیشن تک پہنچ تو آئے۔ مگر جس وقت میں نے دُور صحرا میں ریلوے کی اجاڑ عمارت اور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر جلتی نیالی سی گیس جتی دیکھی، تب تک ہمیں گھنٹہ بھر زیادہ وقت ہو چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر پہنچنے کا غائبہ لے والے نے خوش خبری سنائی کہ آج گاڑی دو گھنٹہ ہے، اس لیے ابھی کال گرھ نہیں پہنچی۔ میں نے سلطان بابا کو وہیں پلیٹ فارم پر بیچھے، لکڑی کے تختے نما دیا۔ نہ جانے کن فکروں میں وقت گزر گیا اور گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ سب ہی کی آنکھیں نم، افسردہ تھیں۔ سانول میرے ساتھ شہر جانے پر مُصر تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے واپس جانے پر آمادہ کیا۔ سینڈ کلاس کے ڈبے میں بھڑکے باوجود مجھے سلطان بابا کو لٹانے کی جگہ مل ہی گئی۔ یہاں سے قریب بزر رحیم پور بھی کم از کم بارہ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اور میں سارا راستہ یہی دعا کرتا رہا کہ ہمارے وہاں قریب مزید کوئی اُن ہوئی نہ ہو جائے۔ بارہ گھنٹے بعد ساڑھے نو بجے کے قریب جب ٹرین نے رحیم پور کے سے پلیٹ فارم کو چھوا تو میں نے سب سے پہلے گھر فون کر کے ماما پاپا سے بات کی اور انہیں کچھ پیسے بھیجے



ایک بزرگ جو نفیس سے سفاری سوٹ میں ملبوس تھے، ہونٹوں میں پائپ دبائے بوکھلائے ہوئے سے وہ دے کر اندر داخل ہوئے۔ سلام کے بعد دھیرے سے نرس سے پوچھنے لگے۔ ”کیا عبداللہ صاحب کا بیٹی ہے۔ میرا نام شیخ امتیاز ہے۔“ اچانک میرے ذہن میں بھی نام گونجا۔ اوہ! یہ تو وہی حضرت تھے، جن کا نام نصیر صاحب نے بطور خاص لکھوایا تھا۔ میں جلدی سے درمیانی حصے کا پردہ ہٹا کر کمرے کے دوسرے حصے آگیا اور انہیں سلام کیا۔ ”جی..... میرا نام عبداللہ ہے۔“ وہ مجھے دیکھ کر کچھ ہلکے اور پھر جلدی سے آگے بڑھ کر جوشی سے ملنے لگے۔ ”اوہ! معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل میرے ذہن میں کسی بزرگ کا خاکہ تھا۔ نصیر نے کچھ دیر پہلے ہی فون کر کے ساری تفصیل بتائی ہے۔ وہ بزرگ کیسے ہیں، جن کی طبیعت نا تھی۔“ میں انہیں اندر سلطان بابا کے پاس لے گیا۔ وہاں انہوں نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا کہ وہ اور صاحب ملازمت میں ایک دوسرے سے سنیا رٹنی میں کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود بہت قریب تھے اور تعلق شیخ صاحب کی ملازمت سے فراغت کے بعد بھی بڑھتا ہی گیا۔ انہوں نے بڑی عازری سے سلطان سے درخواست کی کہ اُن کے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو ضرور حکم کریں۔ سلطان بابا نے اُن کا شکریہ ادا کیا یہاں تک آگئے، یہی اُن کے لیے باعث تسلی ہے۔ شیخ صاحب نے جھجکتے ہوئے اسپتال کی فیس کا پوچھا تو نے انہیں بتایا کہ مہینے بھر کی پیشگی ادائیگی ہو چکی ہے۔ وہ ذرا سے حیران ہوئے لیکن چہرے کے تاثرات گئے۔ ہمارے ظاہری حلیوں کو دیکھتے ہوئے اُن کی حیرت بجاتی کہ کاغذ کے ان مخصوص ٹکڑوں کی اہمیت جگہ مسلم ہے۔ اتنے میں نرس نے ایک بار پھر یاد دلایا کہ مریض کے پاس رہنے کے اوقات ختم ہو چکے ہیں سلطان بابا کو اب بھی میری ہی فکر کھائے جارہی تھی کہ میں رات کہاں بسر کروں گا۔ میں نے نہیں تسلی دے میں قریب ہی کوئی جگہ تلاش کر لوں گا۔ وہ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا رہیں۔ شیخ صاحب جو دروازے کے قریب ہی کھڑے ساری بحث سن رہے تھے، جلدی سے بولے ”آپ نوجوان کی فکر نہ کریں۔ میرا اتنا بڑا گھر کس دن کام آئے گا۔ عبداللہ میاں کو میں اپنے ساتھ ہی لے جاؤں! صبح ٹھیک وقت پر دوبارہ یہاں پہنچا بھی دوں گا۔“ سلطان بابا میرے چہرے پر پس و پیش کے آثار دیکھ گئے کہ میں ان تکلفات میں پڑنے سے کتر رہا ہوں۔ انسان جب تک اکیلا اور اپنے بس میں ہو تو آزاد ہے۔ کسی اور کے کمر پر ہو تو جکڑ جاتا ہے۔ میں جب تک اپنے گھر میں بھی تھا تب بھی مجھے گھر کی پابندیال مہا پاپا کی نصیحتیں کبھی مخصوص اوقات کا پابند نہیں کر سکتی تھیں۔ بیرونی گیٹ کی ایک چابی ہمیشہ میری گاڑی چابی کے چھلے میں موجود رہتی تھی تاکہ جب کبھی میں آدھی رات کو اپنی مزرعت کے بعد گھر پہنچوں تو مجھے با بجا کر دروازہ نہ کھلوانا پڑے۔ مجھے بند دروازوں، لگے بندھے نظام الاوقات اور ایسی ہر پابندی سے خدا کا بیر تھا، جو میرے اندر کی آزاد دنیا کو قید کرنے کی کوشش کرتی۔ اور شاید وہ آوارہ گرد سا حراب بھی مجھ سے چھپا بیٹھا تھا۔ سلطان بابا میرے ساتھ ہوتے تو بات اور ہوتی، کیوں کہ اُن کی موجودگی میں کہیں بھی آز

۱۰۷

دیں کرتا تھا، لیکن یوں تنہا شیخ صاحب کے ساتھ جانے میں مجھے بہت ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ امتیاز صاحب بھی بے ہچکچاہٹ جان گئے مسکرا کر بولے ”بھئی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ نصیر آج کے بعد مجھ سے کبھی بات نہ کرے رد کہیں اور ٹھہر جانا۔ کیوں کہ وہ پکا پولیس والا ہے، ایک بار زور دھ جائے تو منانا مشکل ہے۔ جب اُسے پتہ چلا کہ میرے شہر میں اُس کے مہمان کہیں اور قیام کر رہے ہیں تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ وہ کیا سوچے گا.....؟“

ان بابا نے بھی میرا ہاتھ دبا کر مصلحت سمجھانے کی کوشش کی۔

ہم اسپتال کی پارکنگ میں آئے تو اُن کی بی بی ایم ڈبلیو کے ڈرائیور نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ لا اور کچھ دیر میں ہم اُن کے گھر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ راستے میں انہوں نے اپنے خاندان کا اہل تعارف بھی کر دیا۔ اُن کی اہلیہ چار سال پہلے داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ گھر میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑا لڑکا کاروبار کے سلسلے میں گزشتہ ایک ہفتے سے بیرون ملک تھا۔ اُس کی آمد دو ہفتے میں متوقع تھی۔ چھوٹی دو بیٹیاں اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھیں۔ اور سب سے چھوٹا بیٹا ابھی بی بی اے کا طالب علم تھا۔ میں چاہ اُن کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ کافی زندہ دل انسان معلوم ہوتے تھے۔ جو اپنی اولاد کی ہر چھوٹی بڑی دلچسپی پوری طرح شامل ہو اور اپنے گھر ہی کو اپنی کل کائنات سمجھتا ہو۔ میں نے اپنے بارے میں مکمل تفصیلات نے سے اجتناب کیا اور اتنا ہی بتایا کہ ماں باپ کے بعد اب سلطان بابا ہی میرے اپنے اور بزرگ ہیں۔ اسی میں اُن کا گھر بھی آگیا۔ کافی بڑا بنگلہ تھا۔ جدید طرز تعمیر کا ایک شاہکار۔ اتنے دن صحرائیں گزرنے کے تنازعہ زیادہ بڑھ اور ہرے بھرے درخت دیکھ کر جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اچانک ہی دنیا بلیک اینڈ سے تبدیل ہو کر رنگین ہو گئی ہو۔ جلتی ہوئی لوکی جگہ گاڑی سے اترتے ہی ہلکی ہوئی نرم ہوا کے جھونکے میرا چہرہ چوم لیا۔ دو نوکر اندر سے دوڑے چلے آئے۔ آگے بڑھ کر ہاتھ سے میرے کپڑوں کا تھپتھاہا لیا۔ صاحب نے انہیں ہدایت کی کہ مجھے انیکسی میں لے جائیں۔ اب میرا قیام وہیں ہوگا۔ انہوں نے رات کھانے کے لیے میرے پسند پوچھی تو میں ٹال گیا کہ جو بھی بنا ہو وہی میری پسند ہوگا۔ میں نوکروں کے پیچھے ناک کی طرف بڑھنے لگا تو انہیں کچھ یاد آیا ”ارے ہاں، عبداللہ میاں! انیکسی کے دوسرے کمرے میں اپنے یار میاں بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک ماہ پہلے ہی دارالحکومت سے تشریف لائے ہیں۔ میرے بہت سے دوست کے صاحب زادے ہیں۔ تمہارے ہی ہم عمر ہیں۔ اُمید ہے کہ تم دونوں کا وقت اچھا گزرے تمہارا دھوکہ فریش ہو جاؤ..... ہم کھانا انیکسی ہی میں کھائیں گے۔“ میں انیکسی پہنچا تو بنگلہ کا ایک پورا حصہ ان خانے کے طور پر پچھلے حصے میں موجود تھا۔ جس کا اپنا پورچ اور باغچہ بھی اسی حصے میں واقع تھے۔ انیکسی چار کمرے تھے، ڈرائنگ روم اور کھانے کا کمرہ اس کے علاوہ تھا۔ میرے لیے جو کمرہ کھولا گیا، اس کے دوا لے کمرے میں پہلے سے روشنی تھی اور تیز موسیقی کی آواز بند دروازے سے باہر آرہی تھی۔ گھر کافی اہل اور اور ہر طرح کے آسائشی لوازمات سے مزین تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہاں ایک عجیب سی محسوس کا

ہاں اس فون کی دوسرے لائن کہاں تھی۔ اس طرح مصروف کر دینے سے کوئی ضروری فون بھی تو چوک سکتا۔ میں نے دوبارہ ریسپورڈ اٹھایا۔ دوسرے جانب وہی آواز تھی ”جی..... شہر یار.....؟“ ”اوہ تو یہ شہر یار کے لیے تھا۔ میں نے جواب دیا“ ”نہیں..... شہر یار صاحب تو اپنے کمرے میں ہیں۔ میں یہاں مہمان ہوں۔“

رے جانب پھر وہی جلتزنگ بجا۔ ”اوہ..... معاف کیجئے گا۔ آپ کو اتنی رات گئے زحمت دی۔ آپ فون دیں اور اس بار گھنٹی بجے تو آپ نہ اٹھائیے گا۔“ شہر یار خود اٹھائیں گے۔ دراصل اس نمبری کی دواکس مینٹز

”میں نے ریسپورڈ واپس رکھ دیا۔ دس منٹ کے بعد گھنٹی بجی تو تین گھنٹیوں کے بعد خاموشی چھا گئی۔ شاید

ری جانب سے شہر یار نے فون اٹھالیا تھا۔ کمرے میں کچھ دیر گزارنے کے بعد ہی مجھے پھر سے وہی گھنٹن

لگی، حالانکہ اے سی کی وجہ سے کمرے میں خوش گوار خنکی چھانی ہوئی تھی۔ میں ابھی باہر نکلنے کا سوچ رہا تھا

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور شہر یار نے اندر جھانکا ”ویسے تو آدھی رات کے وقت یہ سوال کرنا خود

زہی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن اجازت ہو تو اندر آ جاؤں۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی اور تمہاری نیند شاید

اس فون کی بجتی گھنٹی نے اڑا دی ہے۔“ میں خوش دلی سے مسکرایا ”نہیں! میری نیند ازل سے اُڑی ہوئی

شاید میرے اندر ہی کوئی گھنٹی لگی ہوئی ہے۔ اندر آ جاؤ۔“ شہر یار نے میری کرسی کے سامنے والا صوفہ

مال لیا ”واہ، خوب کہی۔ ویسے تمہاری تعلیم کتنی ہے؟ سچ کہوں تو مجھے تو تم بھی کوئی رٹنر ہی دیکھتے ہو۔“ میں

کر مال گیا اٹنا شہر یار سے سوال کر دیا ”تم کہانی کی تلاش میں یہاں آئے ہو، تو پھر کچھ کامیابی ہوئی کہ

”شہر یار نے ایک لمبی سی سانس لی ”اب کیا بتاؤں۔ پچھلے چند دنوں سے میں خود ایک کہانی بنا ہوا

”کیوں..... خیریت.....؟“ ”ہاں فی الحال تو خیریت ہی ہے۔ دراصل ڈیڈی نے مجھے یہاں کسی اور

مکے لیے بھیجا ہے۔ کہانی تو بس ایک بہانہ ہی ہے۔ مجھے شیخ انکلی کی دو بیٹیوں میں سے کسی ایک کا بطور ہم

تخاب کرنا ہے۔ یہ ڈیڈی کی خواہش ہے۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے مجھے یہ اختیار دیا

کہ چونکہ ابھی تک کوئی مہ جیس میری نظروں میں سائی نہیں، لہذا اس چٹاؤ کے لیے اپنی پہلی تلاش اسی گھر

شروع کروں۔ اور یہیں سے میری الجھن کا آغاز ہوتا ہے۔“ میں نے حیرت سے اُس کی جانب

”اس میں الجھن کیسی۔ شیخ صاحب کی دونوں صاحب زادیوں سے مل کر دیکھ لو۔ اور پھر دونوں میں سے

مادل کو بھائے اُس کے لیے ہاں کہہ دو اور پھر تمہیں تو نہ کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے۔ دل نہ مانے تو

ڈیڈی کو اطلاع کر دیتا۔“ شہر یار نے پھر ایک آہ بھری ”یہی تو مشکل ہے۔ مجھے ان میں سے بڑی والی

ما ہے۔ کیا کہوں کہ وہ میری غزل ہے یا خیال کی زبانی، درد کا کوئی قطعہ ہے یا غالب کے خطوط کی نثر

”میں مسکرا دیا۔ ”تو پھر الجھن کیا ہے۔ پہلی فرصت میں گھر والوں کو اطلاع کر دو کہ وہ آ کر تمہارے

اُس کا ہاتھ مانگ لیں۔“ شہر یار جلدی سے بولا۔ ”وہ ہے ایسی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے فون پر اُسی کی

کہی تھی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اُس کا مطالعہ کتنا وسیع ہے، لٹریچر تو جیسے وہ سارے کا سارا گھول کر پی چکی

احساس ستانے لگا۔ شاید اتنے بہت دنوں تک تنگ و تاریک اور ویران جگہوں پر رہتے رہتے، مگر ماحول کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہم اپنی آسائش اور آرام کے پیمانے خود بنا رہے ہیں۔ کبھی یہ آرام دہ بستر میرے آرام کا پیمانہ تھا اور اب ایک رات پہلے تک صحرائی جلتی ریت سکون سے سو جاتا تھا۔ بات تو بس ذرا اس پگھے من کو بہلانے کی ہوتی ہے۔ اور ہم سے جو کوئی بہلاوے کا ٹکڑا جان لے، دراصل وہی کامیاب کہلاتا ہے۔

کچھ دیر بعد شیخ صاحب بھی کپڑے تبدیل کر کے انگیسی پہنچ گئے۔ مجھے نوکر نے بتایا کہ وہ صاحب کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو ایک کلین شیونو جوان نے اُٹھ کر میرا کیا۔ ”ہیلو! مجھے شہر یار کہتے ہیں۔“ میں نے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما۔ ”میں عبداللہ ہوں۔ مسکرایا.....“ عبداللہ تو ہم سب ہی ہیں۔ یعنی اللہ کے بندے۔“ شیخ صاحب زور سے ہنسے ”ارے؟ بات کا بُرا نہ ماننا، دراصل لفظوں سے کھلیا ہی شہر یار میاں کا پیشہ ہے۔ قلم کار جو ظہر ہے۔ آج کل اپنے کسی منصوبے کے لیے کہانی کی تلاش میں آئے ہوئے ہیں۔“ میں بھی دھیرے سے مسکرایا ”پھر ڈرنا چاہیے، کہیں ہماری ہی کہانی نہ بنا ڈالیں۔“ اُن دونوں ہی کو شاید مجھ سے ایسے کسی جواب کی توقع ایک لمحے کے لیے دونوں چونکے اور پھر دونوں ہی زور سے ہنس پڑے۔ کھانے کے دوران پتا چلا ایک لکھاری ہے۔ ماں باپ کا کلوتا بیٹا، سونے کا چچ منہ میں لے کر پیدا ہوا لیکن عملی زندگی میں باپ میں ہاتھ بٹانے کی خواہش کو رد کر کے قلم سے رشتہ جوڑ لیا۔ موضوعات کی یکسانیت سے گھبرا کر وہ ایک لکھنے کی بجائے کہانی کی تلاش میں گھوم گھوم کر لکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ شہر یار کو مختصر سلطان بابا کے بار دیا۔ کھانے کے بعد کافی کا ایک دور چلا اور پھر شیخ صاحب ہم دونوں سے رخصت ہو کر آرام کے گئے۔ میں اور شہر یار بھی شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ میں عشاء کی نماز ادا کر بعد بھی بہت دیر تک شیشے کی اس دیوار نما بڑی سی کھڑکی کے قریب ہی بیٹھا رہا، جہاں سے انگیسی کو موجود بائینچ کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ باغ میں ہر تین چار گز کے فاصلے پر بجلی کے سفید دودھیا قہقے لڑتے۔ لہذا اس وقت بھی وہاں دن جیسا ہی سماں تھا۔ میری توجہ ابھی اسی لان کی انتہائی نفاست سے باڑھ اور ریلوں کی جانب ہی تھی کہ اچانک سامنے بڑی چھوٹی سی شیشے کی تپائی پر پڑا فون بج اٹھا۔ میرا چونکا، رات کے ساڑھے بارہ بجتے کو تھے۔ اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے؟ اچانک میرا ذہن اسپتال گیا اور کسی اُن جانے و سوسے کی پھینکار سے ڈر کر میں نے جلدی سے ریسیور اٹھالیا۔ ”جی.....“ دوسرے خاموشی تھی۔ میں نے قدرے زور سے کہا ”جی فرمائیے“ دوسرے جانب سے ایک نازک سے نہ ابھری۔ ”جی آپ کون؟“ ”میں عبداللہ ہوں۔“ دوسرے جانب سے کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ شاید کوئی تھا۔ میں گہرے سانس لے کر اُٹھنے ہی کو تھا کہ گھٹی دوبارہ بجی۔ جی میں آیا کہ ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دو

جس نے تمہارے راتوں کی نیند اڑا دی ہے۔“ شہر یار نے سر کھجایا۔ معاً تو صل کرتا ہی پڑے گا۔ انکل کی عادت ہے کہ وہ شام کی چائے سب کے ساتھ ہی کبھی لان میں تو کبھی سن روم میں پیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کل تمہارا سامنا بھی ان دونوں سے ہو جائے، پھر تم ہی بتانا کہ فون پر اتنا اچھا بولنے والی، سامنے آتے ہی اس قدر خاموش کیوں ہو جاتی ہے۔ شہر یار بہت دیر تک میرے کمرے میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ لہذا اگلی صبح مجھ سے فجر قضا ہوئی۔ آنکھ کھلی تو سر بھی بہت بھاری ہو رہا تھا۔ نوکر نے مجھے کمرے سے نکلنے دیکھ کر جلدی سے ناشتا میز پر لگا دیا۔

کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے اسپتال چھوڑ آیا۔ شیخ صاحب دوسری گاڑی میں صبح سویرے ہی کسی ضروری کام سے نکل چکے تھے۔ البتہ ڈرائیور کو ہدایت کر گئے تھے کہ مجھے شام چار بجے کے قریب گھر واپس لیتا آئے۔ میرے ذہن میں شہر یار کی رات والی بات گونجی۔ سلطان بابا کی حالت آج کچھ بہتر لگ رہی تھی۔ دوپہر بارہ بجے تک اُن کے تمام ضروری معائنے بھی ہو گئے۔ جن کی رپورٹ کل ملنا تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گھر واپس بھیجنے کی بات کی تو انہوں نے منع کر دیا کہ اگر شیخ صاحب نے کہا ہے تو پھر میں شام کو گھر سے ہو آؤں، پھر چاہے تو رات گئے تک اسپتال میں اُن کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں۔ میں ساڑھے چار بجے ڈرائیور سمیت گھر واپس پہنچا تو دربان نے بتایا کہ شیخ صاحب لان میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ شام کی چائے پر شہر یار اُن کا چھوٹا بیٹا وقار بھی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں چائے لگا دی گئی۔ اتنے میں اندر سے جدید وضع نفل کے لباس میں ایک شوخ سی لڑکی نکلی۔ شیخ صاحب نے تعارف کروایا۔ ”عبداللہ میاں! یہ ہماری بڑی صاحبزادی ہیں، شاہانہ۔ ہماری شانی۔“ میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ شانی کے پیچھے پیچھے ایک اور سیدھی سادھی، ٹامیں مانگ نکالے سانولی سلونی لڑکی بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہماری جانب آگئی۔ وہ شاہانہ کی بالکل لٹ دکھائی دیتی تھی۔ سادہ سا کرتا پا جامہ پہنے لمبی سی چٹیا بنائے۔ وہ اس ماحول سے یکسر مختلف نظر آئی۔ شیخ صاحب نے پھر تعارف کروایا۔ ”اور بھئی۔“ یہ ہیں ہماری چھوٹی صاحبزادی۔۔۔۔۔۔ دھانی۔۔۔۔۔۔“

ہے، دنیا کا کون سا موضوع ہے جس پر وہ بات نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔۔ لیکن صرف فون پر۔۔۔۔۔۔ جیسے ہی وہ سامنے ہے، سمجھو زبان کھو جاتی ہے اُس کی۔“ تو کیا اُسے پہلے پتا تھا کہ تمہارے اُن کے ہاں ٹھہرنے کی اجازت ہے۔۔۔۔۔۔؟ شہر یار مسکرا دیا ”ہاں میرا خیال ہے کہ ڈیڈی نے انکل کو کچھ اشارہ ضرور دیا ہوگا اور خود انکل اولاد سے بالکل دوستوں جیسا برتاؤ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ضرور اپنی دونوں بیٹیوں کو میری آمد کا مہمان ہوگا۔ ان کے آپس میں شرارت آمیز اشارے تو یہی بتاتے ہیں۔ لیکن میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں اُن تنہائی میں ایک بارل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک آدھ بار ایسا موقع ملا بھی تو میرے کان وہ سب کچھ لیے ترستے ہی رہے جو میں فون پر اُس کی میٹھی زبان سے سنتا رہا ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فون پر دونو بیک وقت موجود ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو دونوں ہی زور سے ہنس بھی دیتی ہیں۔ مطلب انہوں نے چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھ سے بات کرتے وقت وہ دونوں ہی دوسری جانب لائن پر موجود ہوتی مجھے شہر یار کی حالت دیکھ کر ہنسی آگئی۔ اُس نے شکوہ کیا ”ہاں تم! بھی ہنس لو۔ اپنی صورت حال ہی کچھ ہے کہ آتے جاتے سب ہی ہماری کھٹلی اڑاتے ہیں۔“ میں نے اُسے چھیڑا ”تم خواہ خواہ کہانی کی تلاش یہاں وہاں بھٹکتے پھرتے ہو۔ ایک سنسنی خیز تجسس سے بھرپور کہانی تو خود تمہارے آس پاس چل رہی ہے۔ یار نے قریب پڑا کٹن اپنے سر کے پیچھے رکھا۔“ ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تو خواتین کے کسی رسالے کے لیے ایک ناول کا پلاٹ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے یہاں آئے مہینے بھر سے کچھ زیادہ ہونے کو آگیا۔ مجھے اس سے ایک تو تفصیلی ملاقات میں بہت سے سوالوں کا جواب لینا ہے اور میرے پاس اس کے وقت بھی نہیں ہے۔ میں نے غور سے شہر یار کی جانب دیکھا ”ویسے کیا تم نہیں سمجھتے کہ تم نے مجھے اپنی“ کی کہانی میں شامل کرنے میں کچھ جلدی کی ہے۔ میں ابھی تک تمہارے لیے ایک اجنبی ہی تو ہوں۔“ مسکرایا ”ہم بھی لکھاری ہیں۔ میاں چلتے پھرتے بہت کرداروں کے اندر تک جھانک لیتے ہیں۔ مانا ملے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں، لیکن تم میرے لیے پہلے لمحے کے بعد ہی اجنبی نہیں رہے تھے۔ تم وہ فون جس کا ہمیں تم نے بھر رکھا ہے۔“ میں نے چونک کر اُسے دیکھا ”اچھا۔۔۔۔۔۔؟ اتنی جلدی یہ نتیجہ کیسے اخذ نے۔“ شہر یار میرے جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ کھانے کی میز پر زیادہ تر انا لائن اور چائینز ڈشز موجود تھیں۔ تم نے چھری کاٹنے کا استعمال حتی الامکان کم سے کم کیا لیکن تمہیں ان لوازمات کا استعمال کرتے دیکھا بھی باسانی بتا سکتا تھا ہے کہ تم وہ نہیں جو دکھائی دیتے ہو۔“ میں نے حیرت سے شہر یار کی طرف دیکھا کمال کا مشاہدہ تھا اُس کا۔ اتنی چھوٹی سی بات کا بھی اُس نے کس قدر غور سے جائزہ لیا۔ میں نے اُدی۔“ واہ بھئی۔۔۔۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ آج کل کے نئے لکھاری بھی اس قدر گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ تم۔ متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“ شہر یار زور سے ہنسا۔ ”تو پھر ہو جاؤ نا متاثر۔ کوئی تو ہمارا بھی“ میں بھی ہنس پڑا۔ ”چلو تو پھر آج سے میں تمہارا پہلا پرستار ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اب اس معے کا کیا کر

## لفظ گر

لیکن یاد رہے..... جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سوسو ہوتا ہے۔“ میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ ہر بار کی طرح ان کا یہ مخصوص جملہ ایک بار پھر میرے اندر سب کچھ ٹپٹ کر گیا۔ اب تو مجھے اس جملے سے باقاعدہ خوف سا محسوس ہونے لگا تھا، کیوں کہ سلطان بابا نے جب بھی اسے ادا کیا کوئی نہ کوئی انہونی ضرور پیش آئی۔ میرے لبوں سے آخر بہت دیر سے اٹکا سوال پھسل ہی پڑا۔ ”آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ دعا سے تقدیر بدل سکتی ہے، پھر آپ اپنے لیے شفا یابی کی دعا کیوں نہیں کرتے۔ کال گڑھ میں آپ کو جو شدید چوٹ لگی، آپ نے اس سے بچاؤ کی دعا پہلے سے کیوں نہ کی؟“ وہ میرا سوال سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے، جیسے میں نے قبل از وقت کوئی بات پوچھ لی ہو۔ کچھ دیر بعد خاموشی توڑی اور کہا۔ ”میں ہمیشہ اپنے لیے، تمہارے لیے بلکہ سب کے لیے یکساں دعا مانگتا ہوں۔ سب کے لیے اللہ سے اُس کا فضل، کرم طلب کرتا ہوں۔ اور ہر اس خواہش کا اظہار کرتا ہوں جس کی تکمیل میں ہم سب کی بہتری ہو..... لیکن یاد رہے، بہتری کس بات میں پوشیدہ ہے، اس کی خبر تو بس اُسی کو ہے۔ جانے اس سر کی چوٹ اور پھر یہاں اسپتال تک پہنچنے میں اُس کی کون سی صحت پوشیدہ ہے۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر، بہت قریبی نتائج پر نظر رکھنے والے پیدا کیے گئے ہیں لہذا نتائج کی پرواہ ہمیشہ اُسی پر رکھ چھوڑنی چاہیے..... رہی بات خود اپنے جسم کو گھائل ہونے سے بچانے کے لیے دعا کرنے کی تو یاد رکھو، اس جسم کی اپنی کچھ حدیں ہیں اور موت ان جسمانی حدود کو پار کر جانے کا نام ہے۔ یہ جسم دنیا کی سب سے فانی شے ہے۔ اس دور میں اس بدن کے عروج اور پھر زوال کا دورانیہ اوسطاً ساٹھ سے ستر سال کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کلیے سے میرا جسم اپنی عمومی مدت پوری کر چکا ہے۔ میں ستر کے عدد کو چھوٹنے والا ہوں اور اس دوران میرے جسم میں موجود خون کے خلیے، میری رگیں، شے اور جسم کے بنیادی اعضا اپنی عمومی مشقت پوری کر چکے ہیں۔ اب ان اعضا کے ساتھ جسم کا جو بھی برتاؤ ہے، وہ خصوصی ہوگا۔ یہاں ایک بات اور دھیان میں رکھنے کی بہت ضرورت ہے کہ موت کا تعلق کبھی براہ راست جسم کے زوال سے نہیں ہوتا۔ موت جسم میں موجود رُوح کے نکلنے کا نام ہے جو نکلنے نکلنے سو سال سے بھی زیادہ کا عرصہ لے سکتی ہے۔ اور بہت سے ایسے انسان ہمارے آس پاس موجود ہیں، جو اپنے جسم کے اس خصوصی رویے کی وجہ سے بآسانی اتنی عمر کا سنز بھی طے کر لیتے ہیں، جب کہ بعض حادثاتی صورتوں میں بیس بائیس سال کے جوان جسم سے بھی رُوح بلیا کر میں نکل جاتی ہے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ جسم کی اپنی بھی ایک خاص میعاد اور مدت ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں..... ایکس پائیری ڈیٹ، جو کسی حادثے کی صورت میں فوراً اور طبعی مدت پوری کرنے کی صورت میں ساٹھ سے ستر سال کے اندر ہمارے جسم کو اس حال تک پہنچا دیتی ہے کہ جہاں ہماری رُوح کا اس بدن میں مزید قیام مشکل ہو جاتا ہے۔“ میں غور سے سلطان بابا کی بات سن رہا تھا۔ مجھے لگا کہ ایک بہت بڑا اسرار میرے ذہن کے درپچوں سے اندر آتے آتے واپس پلٹ گیا۔ جیسے کچھ سمجھ میں آنے سے پہلے ہی سب کچھ اُنکھ میں اُلجھ گیا ہو۔ سلطان بابا نے کچھ وقفے کے بعد بات جاری رکھی۔ ”اسی لیے ہمارے معاشرے میں

اگر ان دونوں کا تعارف خود شیخ صاحب نہ کرواتے تو شاید میں کبھی انہیں سگی نہیں نہیں مانتا۔ ان کے برتاؤ، چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ میں مشرق و مغرب جتنا فاصلہ اور دن اور رات جیسا فرق تھا۔ خود اعتمادی دونوں میں یکساں اور بلا کی تھی۔ چائے کے دوران دونوں بہنوں نے مجھ سے سلطان بابا کی کا پوچھا اور اپنی اور شیخ صاحب کی جانب سے خواہش ظاہر کی کہ جب وہ بہتر ہو جائیں تو کچھ دن ان سہ ساتھ ہمیں ان کے گھر پر قیام کریں۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ میں ان کی فرمائش ضرور سلطان بابا تک دوں گا۔ شہر یار کی ساری توجہ شاہانہ پر تھی۔ مگر نہ جانے کیوں وہ چائے پینے کے دوران بھی کھویا کھویا سا اُٹھا۔ میں چائے ختم کر کے شیخ صاحب کی اجازت سے دوبارہ اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ باقی سب بھی اُٹھ تھے۔ شہر یار نے مجھ سے کہا کہ وہ رات کے کھانے پر میرا انتظار کرے گا۔ میں اسپتال پہنچا تو سلطان کمرے میں تین چار سینئر ڈاکٹروں کا جھگڑا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ نرس نے مجھ سے درخواست کی کہ جب ڈاکٹر کمرے سے نکل نہ جائیں میں بیرونی کمرے میں انتظار کروں۔ دس منٹ کا وہ مختصر عرصہ مجھ صدیوں جیسا بھاری گزرا۔ پھر جیسے ہی پہلے ڈاکٹر نے باہر قدم رکھا میں تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ ٹھیک تو ہے نا ڈاکٹر صاحب۔“ ڈاکٹر مسکرایا۔ ”اوہ ہاں..... ڈونٹ وری۔ بس معمول کا چیک اپ تھا۔ اب لوگوں سے اسپتال والوں نے اتنی فیس لی ہے تو ہمیں بھی کچھ سرگرمی تو دکھانا پڑے گی نا۔“ اُن کی بات میں بھی مسکرا دیا۔ طبیب کے پاس مریض کے لیے دوا اور اُس کے تیمار داروں کے لیے مسکراہٹ سے اور بھلا کیا سوغات ہوگی۔ خوش دلی اور اخلاص سے بھری ایک مکان کی خود اپنی ایک مسیحا گری ہوتی۔ بہت سے گھائل تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا فقط علاج ہی بس ایک مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اور اس لمحے یہ احساس ہوا کہ طب کے شعبے میں شاید دوا سے بھی زیادہ اور پہلی ضرورت خوش اخلاقی ہے۔

سلطان بابا اپنے بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے بولے۔ ”میں نے کہ اسپتال میں بندہ داخل تو اپنی مرضی سے ہوتا ہے، لیکن پھر اس کی رہائی ان ڈاکٹروں کی مرضی ہو پاتی ہے۔ اب یہ روز بروز نئی محبتیں تراشیں گے مجھے یہاں روکنے کے لیے.....“ مجھے اُن کی ”رہاؤ اصطلاح پر ہنسی آگئی۔“ ہاں..... ابھی باہر جو ڈاکٹر صاحب ملے تھے، وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ پیسے! انہیں حلال بھی تو کرتا ہے۔“ میری بات سن کر بابا بھی مسکرا دیئے۔ ”ٹھیک ہے میاں! کر لو اپنی ضد پور!



عام طور پر لوگ اپنے جسم کے اس عمومی رویے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی دینی اور نیادی معمولات کا بھی ترتیب دیتے ہیں۔ ایک عام رویے کا انسان چالیس پینتالیس سال کی عمر کے بعد مذہب کو زیادہ دینے لگتا ہے، کیوں کہ اس کے لاشعور میں کہیں یہ بات دہی ہوتی ہے کہ عمر کی آخری دہائیاں شروع ہو چکی بہتر ہے کہ اب اوپر والے کو بھی راضی کر لیا جائے۔ واضح رہے کہ بچپن، لڑکپن، جوانی اور پھر بڑھاپا۔ یہ کیفیات بھی صرف ہمارے جسم ہی پر وارد ہوتی ہیں۔ ان کا ہماری رُوح سے کوئی تعلق نہیں، البتہ رُوح کا ہماری ان جسمانی تبدیلیوں پر منحصر ہے۔ تقدیر وہ وقت طے کرتی ہے، جب ہماری رُوح کو ہمارا یہ جسم چھوڑ دے اور پھر کوئی نہ کوئی بہانہ، بیماری، چوٹ، حادثہ یا سادہ طبعی موت اس رُوح اور جسم کی دائمی جدائی کا باعث جاتا ہے۔ یہی ہمارا ایمان ہے کہ ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور پھر موت کے بعد اُسے روزِ حشر سے دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اور تب ہماری زندگی کا دوسرا اور اصل دور شروع ہوگا۔ اسی لیے ہمیں دنیا کے لیے اُسی قدر محنت کی تاکید کی گئی ہے، جتنا ہمیں یہاں رہنا ہے۔ ”سلطان بابا اپنی بات ختم کر چکے لیکن میرا ذہن حسب معمول کچھ نئے سوالوں میں الجھتا چلا گیا۔ تو کیا ہماری معصوم رُوح صرف ہمارے گئے گناہوں کی سزا بھگتی ہے؟ کیا گناہ اور ثواب کا اختیار صرف ہمارے ایک بنیادی عضو ”ذہن“ کا رستائیوں کا شاخسانہ ہے؟.....“

رات آٹھ بجے نرس نے دوبارہ آکر مجھے کل والی بات کی یاد دہانی کروائی کہ تیار داروں کو رات گزار کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب خود بھی آپہنچے اور چندرہ منٹ سلطان بابا کے ساتھ بیٹھے۔ بعد ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم نے اسپتال کے اصولوں کے مطابق روانگی اختیار کر لی۔ شیخ صاحب نے راہ میں بتایا کہ آج نصیر صاحب نے انہیں فون کر کے سلطان بابا کی تفصیلی خیریت معلوم کی تھی اور مجھے نہ جانا کیوں اُن کی باتوں سے کچھ ایسا محسوس ہوا، جیسے آئی جی صاحب نے انہیں کچھ میرے بارے میں بھی بتایا۔ اور شاید وہ یہ بات بھی جان چکے ہیں کہ اسپتال کی ادائیگی بھی میرے گھر والوں کی طرف سے کی گئی ہے۔ بہر حال انہوں نے مصلحتاً اس موضوع کو چھپانے سے گریز ہی کیا اور مجھے ایک بڑی مشکل سے بچالیا کیوں اب میں کسی بھی طور اپنے روایتی حسب نسب اور ماضی کے کسی بھی حوالے کو اپنی ذات کا تعارف نہیں چاہتا تھا۔ ہم گھر میں داخل ہوئے تو اُن کا چھوٹا بیٹا دھار کا ر پورج سے ذرا پرے اپنی ڈی ٹی ایس بیوی باپ کی ریس چیک کرنے کے لیے اس کے پچھلے پیسے کو اسٹینڈ کے ذریعے اُونچا کر کے ہائیڈرو لک جیک لگا رہا تھا۔ سارے گھر میں موٹر سائیکل کی تیز آواز نے ہنگامہ سا برپا کر رکھا تھا۔ میں ایک لمحے ہی میں ماضی کی بھول بھلائی میں کھو کر خود اپنے گھر کے احاطے میں پہنچ گیا اور چند لمحوں میں وقار کی جگہ پرانے ساحر نے لے لی۔ ہرال کو میں اور کاشف میرے ہی گھر میں، اپنی اپنی بانیکس کھول کر اسی طرح ان کی صفائی کیا کرتے تھے اور گھر سر پر اٹھائے رکھتے۔ وہ دن گھر کے تمام نوکروں کی شامت کا دن ہوتا کیوں کہ ہمیں ہر دوسرے لمحوں کی

کسی چیز کی ضرورت ہوتی۔ اور نہ ملنے پر یادیر سے لانے پر کوئی نہ کوئی نوکر ہمارے عتاب کا شکار بن کر رہی رہتا۔ پھر شام کو جب پایا گھر واپس آتے تو اُن کی عدالت میں ہماری شکایتیں لگتیں اور کبھی مجھے اور کبھی کاشف کو جبران بھرتا پڑتا۔ یہ وقت بھی کیسی کیسی کروٹیں بدل جاتا ہے۔ کاش ہمارا حافظہ بھی گزرتے وقت کی کروٹ کے ساتھ ساتھ کسی سلیٹ کی طرح صاف ہوتا رہتا، تو کتنا اچھا ہوتا۔ مجھے اپنی جگہ زکا دیکھ کر شیخ صاحب آگے جاتے جاتے واپس پلٹ آئے۔ ”کیوں عبداللہ سب ٹھیک تو ہے نا.....“ میں جلدی سے سر جھٹک کر اپنی دنیا میں واپس آیا اور آگے بڑھ گیا۔ شیخ صاحب نے نوکروں سے کہا کہ وہ تازہ دم ہو کر انیکسی ہی میں ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قدم وقار کی جانب بڑھنے سے نہیں روک پایا۔ اُس نے ہائیڈرو لک تیل کی لمبی گلاس نما پکی اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور پچھلے پیسے کی ڈسکس میں بنے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں تیل ڈالنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی جانب آتا دیکھ کر اس نے اسٹیمپلٹر چھوڑ دیا لیکن پہلے اب بھی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں نے تیل کی پکی اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ ”جب تک پہلے مکمل طور پر زک نہ جائے اور بایک کا انجن ٹھنڈا نہ ہو جائے، تیل نہ دینا۔ ورنہ یہ آئل صرف پیسے کی ڈسک تک محدود نہیں رہے گا، پورے انجن میں پھیل جائے گا۔ پھر کئی دن تک بایک بار بار چوک ہوتی رہے گی.....“ وقار کھلے منہ کے ساتھ حیرت سے میرے بات سن رہا تھا۔ پھر اُس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اوہ! تو یہی وجہ تھی کہ بایک پوری ریس نہیں اٹھا رہی تھی اور میں پچھلے تین دنوں سے سر کھپا رہا ہوں اور ڈسک کو جام کچھ کر تیل دیئے جا رہا ہوں۔“ میں نے مسکرا کر آئل کی بوتل اُسے واپس کر دی۔ وقار بھی جلدی سے ہاتھ پونچھ کر میرے ساتھ ہی انیکسی کی طرف پلٹ لگا اور اپنی بایک کے بارے میں بتانے لگا کہ ابھی دو ماہ پہلے ہی اُس کے ڈیڈ نے اُسے یہ بایک لے کر دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہدایتی کتابچہ (Manual Guide) نہیں ملا۔ کیوں کہ بایک سمندر کے ذریعے کھلے بحری جہاز پر پہلے پورٹ اور پھر یہاں تک پہنچی تھی، لہذا بہت سے ضروری لوازمات بھی غائب تھے۔ انہی باتوں کے دوران شیخ صاحب بھی پہنچ گئے۔ لیکن آج شہر یار نہ جانے کہاں غائب تھا۔ نوکر نے بتایا کہ وہ شام کو کسی دوست کے ہمراہ کہیں باہر نکل گیا تھا لیکن کھانے لگنے تک شہر یار بھی پہنچ گیا۔ وقار بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ اب تک وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ پھر کھانا کھاتے کھاتے اچانک ہی وہ پوچھ بیٹا..... ”عبداللہ بھائی کیا آپ مولوی ہیں؟“ شیخ صاحب نے اُسے گھور کر دیکھا اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ”ہاں۔ لیکن جیسے نیم حکیم ہوتے ہیں، ویسے ہی میں فی الحال آدھا مولوی ہوں۔“ وقار اور شہر یار بھی مسکرا دیئے۔ وقار کی کچھ ہمت بندھی۔ ”آپ کے گھر والے کہاں رہتے ہیں۔ آپ کو اُن کی یاد نہیں آتی؟“ شیخ صاحب نے اُسے ڈانٹا۔ ”وقار! یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ میں نے شیخ صاحب کو روک دیا۔ ”کوئی بات نہیں اسے پوچھنے دیں۔ ہاں تو بھی میرے گھر والے تو یہاں سے بہت دور رہتے ہیں اور مجھے اُن کی یاد بھی بہت آتی ہے۔“ تو پھر آپ کیا کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جب اُن کی بہت یاد آتی ہے کیوں کہ میں تو اپنے گھر سے

ایک رات بھی دور نہیں رہ سکتا۔“ ”رہ تو میں بھی نہیں سکتا، پر کیا کروں میرا کام ہی ایسا ہے نا۔ البتہ جب کہ والے بہت یاد آتے ہیں تو تھوڑا سا رو لیتا ہوں۔ اس طرح دل کچھ بہل جاتا ہے۔“ وقار زور سے ہنس پڑا۔ ”ارے، آپ روتے بھی ہیں۔ لیکن آپ تو مجھ سے بھی بڑے ہیں۔“ ”تو کیا ہوا۔ بڑے روتے نہیں کیا؟“ ”میر تو سمجھتا ہوں بڑوں کو چاہئے چھپ کر ہی سہی، چھوٹوں سے زیادہ رونا چاہیے۔ اس طرح اُن کا دل کبھی خیر نہیں ہوگا۔ میری مانو تو تم بھی ابھی سے پریکٹس شروع کر دو۔ ہر غم کا ڈر دل سے نکل جائے گا۔“ ”اب ڈر صاحب اور شہر یار بھی ہماری اس ”معصوم“ بحث سے لطف اندوز ہونے لگے۔ وقار نے جھجکتے ہوئے اپنے دل کی ایک اور شک زبان سے اُگل دیا۔ ”آپ تو ہم جیسے ہی ہیں، لیکن شام کو شاہانہ باجی کہہ رہی تھیں کہ جو لوگ یار اپنا گھریا چھوڑ کر اسے پر نکل آتے ہیں، وہ رفتہ رفتہ انتہا پسند بن جاتے ہیں۔“ ”شیخ صاحب کے ہاتھ کاٹنا چھوٹ گیا۔ شہر یار نے بھی چونک کر اُپر دیکھا۔ شیخ صاحب غصے سے بولے۔ ”وقار یوہر مائنڈ یوہر اوارڈ برنس۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر شیخ صاحب کو روکا۔ ”تم انتہا پسندی کے کہتے ہو۔“ ”وقار کچھ ہچکچایا۔ ”وہی؟“ ”لوگ زبردستی اپنی منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ میں نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا۔ ”دیکھو! پانی کا گلاس تقریباً بھرا ہوا ہے۔ اس کے سانچے میں جتنی گنجائش تھی، اتنا پانی اس میں موجود ہے۔ اگر میں اس گلاس میں مزید پانی ڈالوں گا تو وہ چھلک کر میز پر گر جائے گا اور اس سے تمہیں، تمہارے ابو اور شہر یار کو پریشان ہوگی۔ بالکل اسی طرح، جیسے تمہارے ڈی ٹی ایس بائیک کی رفتار کی حد ایک سو اسی کی ہے؟ لیکن اگر شہر کی عام سڑکوں پر تم اسے ساٹھ، ستر کی رفتار سے زیادہ چلاؤ گے تو لوگ ڈر کر ادھر ادھر بھاگیں گے۔ ہو سکتا ہے تم کسی زخمی بھی کر بیٹھو۔ بس یہی انتہا پسندی ہے۔ ہر وہ حد جس سے گزر کر تم دوسرے انسانوں کے لیے کسی بھی طرح کی پریشانی کا باعث بن جاؤ، وہ انتہا پسندی ہے۔ ہم نے آج کل اس صفت کو نہ جانے کیوں صرف مذہب کی وابستہ کر دیا ہے۔ انتہا پسندی ایک رویے کا نام ہے۔ تم اپنی حد سے بڑھ کر بائیک دوڑا کر بھی انتہا پسند بن سکتے ہو۔ شہر یار تیز ہارن بجا کر بھی اس فہرست میں شامل ہو سکتا ہے۔ شیخ صاحب دن میں آٹھ گھنٹے کے بجائے تیس گھنٹے اپنے کاروبار پر صرف کر کے بھی انتہا پسند کہلا سکتے ہیں۔ لیکن میرا راستہ تو میری اپنی کھوج کا ہے۔ میں کچھ سیکھنے کے لیے گھر سے نکلا ہوں۔ میرا مقصد اپنے نظریات کسی پر مسلط کر کے اُسے پریشان کرنا نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں ابھی تک صرف مختلف نظریات کو جانچنے اور پرکھنے کی حد تک ہی محدود ہوں۔ جانے ان مختصر زندگی میں، مذہب کی بنیادی باتوں سے کچھ آگے بھی بڑھ پاؤں گا یا نہیں۔ کسی انتہا تک جانا تو بہت ڈر کا بات ہے۔ ویسے بھی مذہب ہمیں ہر چیز میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ خودعبادت میں بھی ایسی اعتدال کو مد نظر رکھنے کا حکم ہے۔ تو پھر بھلا مذہب ہمیں کسی بھی انتہا پسندی کی طرف کیسے لے جا سکتا ہے۔“

میری بات ختم ہونے کے بعد بھی کمرے میں کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر میں نے خود ہی دعا

ہے پوچھا کہ کوئی اور سوال تو اُس کے ذہن کو پریشان نہیں کر رہا؟ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ ”نہیں عبداللہ بھائی۔ میں آپ کی باتیں سننے سے پہلے واقعی ایسے لوگوں سے بہت کترا تا تھا، لیکن آج آپ نے مجھے احساس دلایا کہ شاید ہم خود ہی مذہب کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ مذہب ہمیں کبھی اس طرف نہیں دھکیلتا۔ ہمیں خود اپنے رویوں پر قابو پانا ہوگا۔“ شیخ صاحب کے تھے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں نے خوش ہو کر بیٹے کی پیٹھ تھکی۔ شہر یار بھی مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کھانے کے بعد بھی بہت دیر تک ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے شہر یار سے عشاء کی نماز کے لیے مہلت طلب کی۔ ”ٹھیک ہے جناب، لیکن نماز پڑھتے ہی میرے کمرے میں چلے آنا۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ میں نے ہنس کر اسے دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں تمہارے ضروری باتوں کا دائرہ کہاں تک محدود ہوگا۔ تم چلو میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔“ نماز کے بعد میں شہر یار کے کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ نیلگوں دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے اُدھ جلتے سگریٹ راکھ دان میں اب بھی سلگ رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے لیے تو میرا دم ہی گھٹ سا گیا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے لگا تار سگریٹ نوش ہو گے۔“ شہر یار نے جلدی سے اُٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ ”نہیں۔ ہر وقت اتنی سگریٹ نہیں پھونکتا۔ بس کبھی کبھی ذہن کسی پلاٹ یا نکتے پر الجھ جائے تو پھر یہ ٹکٹنیں ہی میرے سوچوں کی رُک ہوئی گاڑی کو آگے دھکیلتی ہے۔“ ”مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ یہ کڑوا دھواں تم جیسے لکھاریوں کے اندر جا کر ایسا کیا جا دو کرتا ہے کہ لفظ اور خیال آنسوؤں کی طرح باہر ٹپکنے لگتے ہیں؟“ ”شہر یار زور سے ہنسا۔ ”پتا نہیں، وہ ہو سکتا ہے اندر جا کر یہ دھواں اُن کا بھی دم گھونٹا ہو تو خیال باہر ٹپکنے لگے ہوں۔ کیا تم بالکل بھی سگریٹ نہیں پیٹے۔۔۔۔۔؟“ ”مجھے اپنے ماضی کی شامیں، کلب اور ان میں بھرا دھواں یاد آ گیا۔“ ”کبھی پیتا تھا، دن میں ایک آدھ پیکٹ بھی پھونک جاتا تھا۔ اب نہیں پیتا۔ تم یہ بتاؤ کہ ایسا کون سا خیال انک گیا ہے، تمہارے اندر جسے اس دھواں سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ ”شہر یار نے گہری سی سانس لی، لیکن جواب دینے کے لیے اُس کے لب کھلنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ شہر یار نے جلدی سے فون اُٹھالیا۔ دوسرے جانب سے شاید کسی نے سلام کیا۔ شہر یار نے جواب کے بعد کہا ”زہے نصیب۔۔۔۔۔ کیسے آج کون سا امتحان لیں گی ہمارا۔۔۔۔۔؟“ میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا لیکن شہر یار نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوبارہ بٹھالیا۔ مجھے اُن کی گفتگو کے دوران وہاں بیٹھنا کچھ معیوب سا لگ رہا تھا، لیکن شہر یار نے میرا دوسرا اشارہ بھی نظر انداز کر دیا اور دوسری جانب کی بات سن کر کہا۔ ”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم کچھ دیر بعد بات کریں۔ دراصل میرے کمرے میں ایک مہمان دوست ہے۔“ دوسری جانب کی بات سن کر شہر یار نے فون رکھنے سے پہلے کہا۔ ”چلیں ٹھیک ہے، کل بات کریں گے اور ہاں آپ کے سوال کا جواب ادھار رہا تھا۔“ فون رکھ کر وہ میری جانب پلٹا۔ ”کافی چلے گی۔۔۔۔۔؟“ ”نہیں! میری کفین سے کچھ زیادہ غبی نہیں۔“ ”تم نے خواہ مخواہ فون بند کر دیا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں تو ویسے بھی جانے ہی والا تھا۔“ ”شہر یار کسی

اور حرکتی ہوئی۔ سارا گھر اُسی کی وجہ سے حرکت میں رہتا تھا۔ نہ وہ خود چین سے بیٹھتی تھی نہ ہی کسی کو زیادہ دیر بیٹھے رہنے دیتی تھی۔ دونوں بہنوں کے اس مزاجوں کے فرق ہی نے دراصل شیخ صاحب کے گھر کے توازن کو ایک خوبصورت انداز میں برقرار رکھا ہوا تھا۔ بیٹے بھی باپ کے فرمان برار تھے البتہ۔ گھر کا سارا انتظام بہنوں نے سنبھال رکھا تھا۔ شہریار آیا تو کسی کہانی کی تلاش میں تھا، لیکن شیخ صاحب کے ہاں مہمان ہوتے ہی وہ خود ایک کہانی کا حصہ بنتا گیا۔ اُس کا استقبال کرنے والی دھانی تھی، جس نے اپنے گھر کے گیٹ پر اُسے خوش آمدید کہا۔ لیکن..... جس نے شہریار کے دل کے گیٹ پر پہلی دستک دی، وہ شانی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ایک دم ہی نہیں ہو گیا۔ پہلے تعارف میں تو کوئی بھی شاہانہ کے ملکوتی حسن سے متاثر ہو سکتا تھا، لیکن شہریار کو شانی کی رنگ نمنے میں دو ہفتے سے بھی زیادہ لگ گئے۔ انکسی میں وہ اُس کی دوسری رات تھی، جب فون کی کھٹی پہلی بار بجی۔ دوسری طرف جو بھی تھی، اُس نے اپنا نام نہیں بتایا بلکہ یہ کوئی بھی اُس نے شہریار ہی پر چھوڑ دی کہ وہی سے پہچانے کہ وہ کون ہے، کیوں کہ یہ دعویٰ بھی تو شہریار ہی کا تھا کہ لکھاری لوگوں کی آنکھوں سے اُن کے دل کا حال جاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور شہریار کو اگلے روز ہی شانی کی آنکھوں میں چھپاؤ گلابی پیغام دکھائی دے گیا، جو شاید پہلے ہی دن سے اُس کی گھنیری پلکوں کے چھپے چھپا ہوا تھا۔ لیکن شہریار نے مزید کئی دن لیے ات والی اُس آواز کو اُس کی پہچان بتانے میں۔ شاہانہ کو خوشی ہوئی کہ اُس کی نظروں کا پیغام شہریار کے دل تک پہنچے گا۔ کامیاب ہو گیا۔ پھر راتوں کے فون کی یہ شہزادی کچھ ایسی ہی شروع ہوئی کہ لفظوں کی دنیا میں رہنے والا شہریار جیسا لفظ گر بھی ان ملائم لفظوں اور کوئل جذبوں کا شکار ہوتا چلا گیا، جو دیر رات گئے تک وہ فون پر اُس کی باتوں میں اندھیلی تھی۔ وہ دونوں دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ شہریار اُسے اپنے افسانوں کے موضوعات پر بحث کی دعوت دیتا اور اُس سے ایک قاری کے طور پر پہلی رائے بھی لیتا۔ لیکن مسئلہ وہاں سے جڑ اُڑنے لگا، جب ایک آدھ مرتبہ شہریار کو شانی سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا۔ وہ فون پر شاہانہ کی منفرد اور گفتگو میں الفاظ کے نئے زاویوں کی عکاسی سن کر خود بھی ایسے کسی موقع کا بے تابی سے انتظار کر رہا۔ پہلی مرتبہ اُس وقت یہ ملاقات ہوئی، جب سارے گھر والے کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور شام کی سائے پرباغ میں وہ اور شاہانہ تنہا تھے اور دوسری مرتبہ جب شیخ صاحب کو کسی ضروری کام کے سلسلے میں ایک ڈرائیور سمیت شہر سے باہر جانا پڑا اور شہریار گھر کی دوسرے گاڑی میں شاہانہ کو اس مقام سے گھر واپس لے کر آیا، جہاں سے مقررہ وقت پر ڈرائیور نے اُسے لانا تھا۔ لیکن شہریار کے نقشہ کان شانی کے لبوں سے کچھ نئی آرزوئی کرتے رہے اور وہ بس چھوٹے چھوٹے جملوں میں ”ہوں ہاں“ کر کے شہریار کی باتوں کا اب دیتی رہی۔ اسی بات نے شہریار کو الجھا رکھا تھا۔ حالانکہ وہ درپردہ اپنے خاندان کو شاہانہ کے لیے اپنے مامندی سے بھی آگاہ کر چکا تھا، لیکن وہ ایک مرتبہ شانی سے کھل کر بات کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش مانتا۔ کیوں کہ اگلے ماہ اُس کے گھر والے باقاعدہ اس پری زخ کو شہریار کے لیے مانگنے آرہے تھے اور شاید

گہری الجھن کا شکار نظر آرہا تھا۔ ”پتا نہیں کیوں تم سے ہر الجھن بانٹنے کو جی چاہتا ہے۔ ہم رائزر ویلے بہت کھلے دل کے مالک ہوتے ہیں۔ جو بھا جائے، وہی اپنا بن جاتا ہے۔“ میں نے غور سے اُس کی طر دیکھا۔ ”تم کچھ الجھے ہوئے سے لگتے ہو؟“ ”ہاں..... ایک عجیب سی بات ہے شاید میرا وہم ہی ہو لیکن نے محسوس کیا ہے کہ شانی جس طرح کھل کر ہر موضوع پر مجھ سے فون پر بات کرتی ہے۔ سامنے آنے پر وہ کے بالکل برعکس چپ سی نظر آتی ہے۔ پہلے پہل تو میں اسے روایتی شرم و حیا کے زمرے میں تو لٹا رہا، لیکن آدھ مرتبہ ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع بھی ملا تو وہ بس ہوں ہاں ہی کرتی رہی۔“

میں غور سے اُس کی بات سنتا رہا۔ ”تم ایک لکھاری ہو۔ لفظ تمہارے آس پاس عقیدت سے دوڑا ہوئے بیٹھے رہتے ہیں لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر کوئی تمہاری طرح گفتگو کے فن میں ملاق ہو۔ ہو سکتا ہے اُ۔ خاموشی کی زبان زیادہ بہتر لگتی ہو۔ ویسے بھی یہ لڑکیاں چپ رہ کر زیادہ بولتی ہیں۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے ”تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے۔ تو ہو سکتا ہے۔ اُسے بھی یہ لفظ غیر ضروری اور اضافی محسوس ہو۔ ہوں۔“ شہریار اب بھی بے چین تھا۔ ”ہاں! ایسا بھی ہو سکتا ہے، لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ لفظ ہی تھے، جو ہمیں اتنا قریب لانے کا باعث بنے۔ اُسے یہ بھی پتا ہے کہ اچھے لفظ اور اُن سے بنے اُ چھوئے خیالات ہی میری بکزوری ہیں۔ پھر بھی وہ بولنے میں اس قدر احتیاط، بلکہ کنجوسی کا مظاہرہ کیوں کر ہے.....؟“ یہ سوال تم نے شانی سے کیوں نہیں پوچھا؟“ ”پوچھا تھا۔ اُسی نے بھی کم و بیش وہی تمہارا جواب دہر دیا کہ تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے۔“

اس رات شہریار نے مجھے تفصیل سے شیخ صاحب کے خاندان کے بارے میں بتایا کہ اُن کا بڑا بیٹا نام اور چھوٹی بیٹی دھانی نقش و نگار کے معاملے میں اپنے باپ پر گئے ہیں، جب کہ بڑی بیٹی شاہانہ اور چھوٹا بیٹا دا اپنی مرحومہ ماں کے حسن اور رنگ و روپ سے جڑے ہوئے تھے۔ اسی لیے شانی اور دھانی کے نقش اس قدر مختلف تھے۔ لیکن اس چہرے اور دھوپ چھاؤں جیسے رنگ کے فرق سے قطع نظر شیخ صاحب کی تمام اولاد بڑے بے حد ایکا اور محبت تھی۔ خاص طور پر دونوں بہنیں تو جیسے ایک جان دو قالب تھیں۔ البتہ شانی کے مقابلے میں دھانی اپنے باپ سے زیادہ جڑی ہوئی تھی۔ اُس کا نام بھی شیخ صاحب نے دھان کی فصل کی کٹائی کے وقت اُس کی پیدائش پر رکھا تھا۔ سنا ہے اُس سال شیخ صاحب کی گاؤں والی زمینوں پر چاول کی فصل نے برسوں کے ریکارڈ توڑ دیے تھے، اور پھر دھانی جیسے جیسے بڑی ہوئی گئی دھانی رنگ بھی اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن گیا۔ اسکول میں دھانی رنگ کے واٹر کالر، پنسلیں، پھر کالج بیک اور پھر یونیورسٹی میں لباس میں دوپٹے، ہاتھک چوڑیاں، ہیر بنڈیا پھر پرس..... کوئی ایک چیز دھانی ضرور ہوتی تھی۔ یہی حال گھر بھر کی کٹلری، پردوں اور صوفوں کی کراکیم حتیٰ کہ اس کے اپنے کمرے کے رنگ اور اس کی اپنی شخصیت پر بھی حاوی تھا۔ وہ خود بھی اس رنگ جیسی پرسکون، ٹھہری ہوئی اور سادگت تھی۔ البتہ شانی اس کے برعکس تیز گلابی رنگ جیسی تھی۔ شوخ، چلبلی

شہر یار کے والد اس سلسلے میں شیخ صاحب کو بھی شہر یار کی مرضی سے آگاہ کر چکے تھے۔ شہر یار نے غالباً پانچویں پیکٹ کے آخری سگریٹ کو رکھ میں تبدیل کیا ہی تھا کہ باہر سے صبح کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔

## میرا ہر لفظ تمہارا ہے

کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ”جی.....؟“ وہ کچھ دیر بعد ہلکے سے کھٹک کر دوبارہ بولی ”میں شیخ صاحب کی چھوٹی بیٹی دھانی بول رہی ہوں۔“ میں سنبھل چکا تھا ”جی فرمائیے.....“ وہ کچھ ابھی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ ”وہ دراصل مجھے کچھ وضاحت کرنا تھی۔ بعض باتیں سفر کرتے ہوئے اپنا اصل زاویہ کھو بیٹھتی ہیں اور مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔“ مجھے حیرت ہوئی ”جی، میں سمجھ سکتا ہوں، لیکن مجھے اس تمہید کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔“ وہ کچھ ہچکچائی ”تمہید تو میں نے باندھ دی ہے۔ اب باقی بات آپ کو شانی بتائے گی۔ یہ لیں، اُن سے بات کریں۔“ چند لمحوں بعد کم و بیش بالکل ویسی ہی آواز فون پر ابھری ”آداب! دراصل کل وقار نے رات کے کھانے پر مجھ سے منسوب کر کے آپ سے کچھ ایسی بات کہی، جو میں نے اس مفہوم میں ہرگز نہیں کہی تھی۔ نہ ہی میرا مقصد آپ کو ہدف تنقید بنانا تھا۔ میں نے لوگوں کے عمومی رویوں کی بات کی تھی۔ ڈیڈی بھی ہم سے بہت خفا ہوئے۔ آپ کو جو ذہنی تکلیف ہوئی، میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”یقین کریں وہ بات تو بس فونی ہنسی مذاق میں بحث کا حصہ بن گئی اور میں تو بھول بھی چکا تھا۔ آپ ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھیں۔“ ”شکر ہے۔ آپ کے بزرگ اب کیسے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں اور دھانی بھی ڈیڈی کے ساتھ جا کر اُن کو دیکھ آئیں۔“ ”جی ضرور۔ کیوں نہیں۔ انہیں بہت خوشی ہوگی۔“ پیچھے سے کسی سرگوشی کی آواز آئی۔ ”شان! جھجکے ہوئے بولی ”دھانی کہہ رہی ہے کہ آپ ڈیڈی کا دل ضرور صاف کر دیجیے گا، ہماری جانب سے۔ ہم اُن کی ذرہ برابر شکلی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔“ مجھے ہنسی آگئی۔ تو گویا یہ ساری گفتگو شیخ صاحب کی ناراضگی دور کرنے کے لیے تھی۔ میں نے انہیں مطمئن کیا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔ انہیں آپ سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔“ میں نے بات ختم کر کے فون واپس رکھ دیا اور یہی سوچتا رہا کہ نہ جانے یہ لڑکیاں ایسے کانچ کے من کے ساتھ اس پتھر ملی دنیا میں کیسے گزارہ کر پاتی ہیں۔

اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کچھ مضحل سے لگ رہے تھے۔ لگتا تھا رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائے۔ میں سب جین ہو کر جلدی سے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور بابا کی اس حالت کی وجہ پوچھی۔ اُس نے مسکرا کر تسلی دی۔ ”ایسا ہو جاتا ہے۔ انہیں ہائی ڈوز اینٹی بائیوٹکس دی جا رہی ہیں۔ ایسے میں طبیعت کا بوجھل ہو جانا قدرتی عمل ہے اور پھر اُن کی خوراک بہت کم ہے۔“ میری پریشانی دور ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی۔ ”لیکن انہیں ہوا کیا ہے۔ اب تو اُن کے تمام معائنے بھی ہو چکے ہیں۔“ ڈاکٹر نے اُن کی فائل کھولی اور آسان لفظوں

میں شہر یار کو تسلی دے کر جب اپنے کمرے میں آیا تو میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال دیر دیرے گھر کرنے لگا تھا۔ شہر یار کی نظر شاہانہ ہی پر کیوں نکلی؟ دھانی بھی تو اُسی گھر میں ہی رہتی تھی۔ ہمارا نظر ہمیشہ روشن اور اُبلے چہروں ہی میں کیوں اُلجھتی ہے۔ یہ خوبصورتی کیا بلا ہے؟ اگر یہ دیکھنے والی نظریہ منحصر ہوتی ہے تو پھر ہماری نظر عام چہروں پر کیوں نہیں رکتی؟ ہمارا دل کسی سادہ چہرے کے لیے بھی پہلا جھٹک میں اس طرح کیوں نہیں دھڑکتا، جیسے وہ کسی ماہ ویش کی پوری پلکیں مگرنے سے پہلے ہی اُس کے لیے زانو ہو چکا ہوتا ہے۔ تو پھر کہیں یہ قدرت کی بے انصافی تو نہیں کہ اس نے کچھ آئینے تو اتنے شفاف اور ہلکے دھندلے بنا ڈالے۔ اور اگر چہروں اور رنگ و روپ میں یہ تفریق پیدا کرنی اتنی ہی ضروری تھی تو ہمارا نظر اور ہمارے دلوں میں یہ فرق نہ ڈالا ہوتا۔ کیوں ہمارے سدا کے سودائی اور پاگل دل کو ان شفاف آئینوں میں جھانکنے کی لت ڈال دی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ باہر سورج نکل چکا تھا۔ میں۔ یہ سوچ کر فون بجنے دیا کہ شہر یار خود اُٹھالے گا۔ گھنٹی لگا تا رہتی رہی، پھر بہت دیر بعد بند ہوگئی۔ شاید شہر یار اُٹھالیا تھا پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور شہر یار آنکھوں میں نیند کا خمار لیے پتھوں بیچ جمائیاں لیتا کھڑا آیا۔ ”عبداللہ فون اُٹھاؤ..... تمہارے لیے کال ہے۔“ میں چونک گیا۔ ”میرا فون..... اس وقت.....“ شہر یار پلٹ گیا میں نے دھڑکتے دل سے فون اُٹھایا ”جی کون ہے.....؟“ ”دوسری جانب کچھ خاموشی کے آواز ابھری۔“ ”جی..... میں دھانی بول رہی ہوں.....“



میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہمیں دو محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑ رہا ہے۔ اُن کے داہنی جانب آخری پسیوں کو اندر کی جانب کسی زوردار دھکے کی وجہ سے شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، جس کا اثر اندر جھک کر بیروں تک ہوا ہے۔ ہمیں ان خراشوں کو بھرتا ہے اور دوسری اہم بات ان کی سر کی چوٹ ہے۔ ہمارے دباؤ شریانوں میں خون کی روانی میں ایک لمحے کی زکاوٹ بھی شدید نقصان کا باعث بن سکتی ہے اور خون کا دباؤ عارضی یا مستقل فالج کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ خون کے بہاؤ میں یہ زکاوٹ خون سے بنے ریت کے ذرے سے بھی باریک لوٹھڑے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ لوٹھڑا اگر شریانوں سے چپک جائے تو اسے قہراً اور اگر خون کے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہے تو اسے طب کی زبان میں ایمبولس کہتے ہیں۔ بس یوں سمجھو فی الحال تو کسی ایسے چپکے یا بننے والے لوٹھڑے سے بچے ہوئے ہیں لیکن کبھی کبھی وقت گزرنے کے ساتھ ایسی پیچیدگیاں ظاہر بھی ہونے لگتی ہیں۔ تو بس فی الحال ہماری اتنی ہی جنگ ہے، ان کی بیماری کے اور یہی کوشش ہے کہ مزید کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ آپ اطمینان رکھیں۔ وہ ماہر ہاتھوں میں ہیں۔“ ڈاکٹر۔ مستند تجربے کا رکی طرح مجھے تسلی دی۔ لیکن اُس کی باتیں سننے کے بعد میرا ہاسپٹالین بھی جاتا رہا۔ واپس کمرے میں پلٹا تو سلطان بابا نے میرے چہرے کی سختی پر بکھری سیانی کو غور سے پڑھا ”تم بھی آگے ڈاکٹروں کی باتوں میں۔ مطمئن رہو، جب تک سانس باقی ہیں، یہ بیماری میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اور سانس پوری ہوئی تو ان ڈاکٹروں کی ساری دنیا کی مکمل سائنس مل کر بھی مجھے ایک زائد سانس نہیں دے گی۔ پھر اس جھیلے میں کیوں پڑتے ہو؟“ میں نے انہیں غور سے دیکھا ”میرا بھی ٹھیک یہی یقین ہے، لیکن کے باوجود ہم آخری لمحے تک ہر ممکن دوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دوا کرنا بھی تو ایک طرہ دعا ہے۔ یہ بھی تو اُمید اور آخری لمحے تک اس کا کرم یا فضل ہو جانے کا ایک استعارہ ہوتی ہے۔ لہذا آپ دوا کی دعا کرنے سے رو نہ لیں۔ میرے ہونٹوں سے ادا ہوتی دعا آسمان کی وسعتوں تک جاتی ہے تو میرا یہ دعا آپ کی نسون میں بہتے خون کے غلیوں میں گھل کر اپنی فریاد اس زندگی کے مالک کو پیش کرتی۔ تیرا ایک بندہ تیرے آسرے پر اس دوا کی کرامات پر یقین کیے بیٹھا ہے۔ اس کو مایوس نہ کرنا۔“ میں نہم کتنی دیر تک ہولتا رہا۔ سلطان بابا خاموشی سے میری بات سننے رہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا تو اُن کی بھیگی ہوئی تھیں۔ میں گھبرا کر جلدی سے اُن کی جانب بڑھا ”ارے..... یہ کیا، میری کوئی بات ناگوار نہ کی؟“ انہوں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ”نہیں۔ یہ آنسو بھی اُس کی شکرگزاری کے ہیں۔ آج پہلا عبد اللہ نے سلطان کو سبق دیا ہے۔ آج شاگرد اس مقام پر ہے، جہاں استاد تھک کر بیٹھ گیا ہے۔ جیتے خوش رہو۔“ میں نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ”یہ میں نہیں، میرے اندر خود آپ بول رہے۔ میرے پاس تو خود اپنا کچھ بھی نہیں۔ یہ نام بھی آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔“ میں بہت دیر اُن کے سر ہانے بیٹھا

ظہر کے وقت میں نے دھیرے سے اُن کا کاندھا ہلا کر نماز کے لیے جگا دیا۔ شام چار بجے کمرے کے کچھ آئینے اُبھریں اور پھر شیخ صاحب اپنی دونوں بیٹیوں اور شہریار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔ غلام بابا اُن سب سے مل کر کافی ہشاش بشاش ہو گئے۔ انسان سے انسان کا یہ رشتہ بھی کس قدر انوکھا ہے، بی بی زہرا تو کبھی تریاق۔ جبروت کے زہر نے بابا کو اسپتال کے اس بستر تک پہنچا دیا تھا اور شیخ صاحب اور اُن خاندان کے ذرا سے تریاق نے پل بھر میں اُن کے زرد چہرے پر کتنے رنگ کھلا دیئے تھے۔ جب شیخ صاحب نے شہریار کا اُن سے یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ وہ بہت جلد اُن کی فرزندگی میں آنے والا ہے تو سلطان بابا مسکرا کر اُس کی جانب دیکھا ”کیوں میاں، نماز وغیرہ بھی پڑھتے ہو یا صرف صفحے ہی سیاہ کرتے رہتے“ شہریار جو نہ جانے کس خیال میں کھویا کھڑا تھا اس اچانک حملے سے بالکل ہی گھبرا گیا ”جی..... وہ..... مطلب ہے.....“ ہم سب شہریار کی یہ حالت دیکھ کر ہنس پڑے۔ سلطان بابا نے اُسے دعا دی ”جیتے رہو ہاں، نماز پڑھا کرو۔ لکھنے والا تو ویسے بھی خدا کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ تب ہی اس کا زیادہ واسطہ الہام ہوتا ہے۔ اپنی تحریر میں جذب کی کیفیت پیدا کرنا چاہو تو پانچ وقت اُس کے دربار میں حاضری دینے کا پابند ہو خود کو“ شہریار نے جلدی سے یوں سعادت مندی سے سر ہلایا، جیسے آج ہی سے اُن کی نصیحت پر عمل کر دے گا۔ سلطان بابا نے خاص طور پر دھانی اور شانی سے بھی اُن کی مصروفیات کا پوچھا اور انہیں بھی دی۔ وہ سب بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ سلطان بابا کا کمرہ اُن کے لائے ہوئے سامان سے بھر چکا تھا، ڈاکٹر نے پریز کی باندی بتا کر اُن سب کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آٹھ بجے سے کچھ پہلے شیخ صاحب گھر کا دوسرا ڈرائیو جو روز مجھے لینے آتا تھا، وہ بھی آ پہنچا۔ میرا دل آج سلطان بابا کو چھوڑ کر جانے کو بالکل بھی مایوس نہ تھا، لیکن رات کی ڈیوٹی والی نرس بھی پہنچ گئی تھی۔ لہذا مجبوراً مجھے سب کے ساتھ اٹھنا پڑا۔ شہریار بے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور شیخ صاحب ہماری گاڑی کے ڈرائیور کو اپنی گاڑی کے پیچھے آنے کا کہہ کر فی اور شاہانہ کے ساتھ بڑی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اسپتال سے نکلیں تو خلاف دل شیخ صاحب والی گاڑی نے گھر کی مخالف سمت موڑ کاٹ لیا۔ شاید وہ گھر جانے سے پہلے کہیں اور جانا چاہتے تھے۔ میں نے اپنی سوچوں میں گم شہریار کو جھپٹا۔ ”عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر چاہنے والوں کے چہرے کھلے رہتے ہیں، لیکن تمہاری حالت اس کے برعکس کیوں ہے؟“ شہریار نے لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری لہجے میں کہا، ”دل بھی جل گیا ہوگا۔ کریدتے ہو راکھ، آخر یہ جو کیا ہے..... کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے غالب میرے دل کا ہر معاملہ پہلے ہی ساری دنیا پر کھول گیا ہے۔ اب راکھ کریدنے سے تمہیں بھی کچھ مل نہ ہوگا اسے دوست۔“ میں مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کی گاڑی نے شہر کے ایک مشہور پانچ ستارا ہوٹل کی ذیلی راہ کی جانب موڑ کاٹا اور کچھ دیر بعد ہم سب ریسٹورنٹ میں کھانے کے میز کے گرد جمع تھے۔ شیخ صاحب نے ”مجھے لڑکیوں کی ضد تھی کہ آج رات کا کھانا ہم کہیں باہر کھائیں، لہذا اب آپ سب بلا تکلف اپنی پسند

ایک عجب سے بات محسوس کی کہ ہمارے دن اور رات کے رویوں میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ رات بہت حد تک بدل دیتی ہے۔ ہماری اندر چھپے بہت سے خوابیدہ جذبوں کا براہ راست تعلق رات سے ہوتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے ایسا خواب ناک ماحول میسر ہو تو یہ جذبے اپنے پوری قوت سے ہماری شخصیت پر ی ہو جاتے ہیں۔ ہمارے باتیں نشلی ہو جاتی ہیں اور ہمارے لہجے ملائم..... بعض اوقات ہمیں خود سے ہی ہونے لگتا ہے اور ہم اپنے اندر چھپے کسی معصوم بچے کی ہر ضد مانتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی روایتی وضع داری بولا تار کر بے باک ہو جاتے ہیں اور ہمارے اندر کی زودان پسند شخصیت چھم سے باہر نکل آتی ہے۔ کہتے انے میں بھی یہی تمام خصوصیات ہوتی ہیں۔ گویا ایسے ماحول میں یہ رات بھی ایک نشے کی طرح ہی ہمارے ن میں تحلیل ہو کر ہمیں دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر سکتی ہے۔ شاید رات خود ایک بہت بڑا نشہ ہے۔ پیانٹ ہمارے چھڑے ”صرف لفظ..... اور بس یہی لفظ ہی تو ہیں میرے پاس..... تمہیں دینے کے لیے.....“ اچانک دھانی نے کھوئے کھوئے سے شہر یار سے پوچھا۔ ”آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی تو بتائیے آئے والی تحریر کے بارے میں۔“ شہر یار کچھ چونک سا گیا۔ ”آج کل میں ایک ایسے قلم کار کی کہانی لکھ رہا ہوں جس کی تحریر اور لفظوں نے ساری دنیا میں دھوم مچا رکھی ہے۔ اس کی ہر نئی آنے والی کتاب مقبولیت کے ریکارڈ قائم کر رہی ہے۔ لوگ بے چینی سے اس کے قلم سے کھڑے لفظوں کی مالا چھنے کے لیے اس کی تحریر کا مار کرتے ہیں، لیکن عجب بات یہ ہے کہ خود اس لکھاری کے پاس اپنے گھر میں بولنے کے لیے صرف نوٹ ہے۔ اس لکھاری کی شریک حیات کے حصے میں قلم کار کا کوئی لفظ نہیں آتا۔ وہ دونوں بس خاموشی میں لی کرتے ہیں۔“ شاہانہ کی ساری توجہ اب شہر یار کی جانب تھی۔ دھانی نے دلچسپی سے پوچھا ”لیکن ایسا دل..... کیا لکھاری کی شریک حیات کو لفظوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یا پھر قلم کار اپنی کسی گزشتہ محبت کے اثر کو محسوس کرتا ہے؟“ شہر یار نے غور سے شانی کو دیکھا۔ ”نہیں۔ لکھاری کی زندگی کی سہمی تو اُس کے لفظوں سے بے تاب رہتی ہے اور خود لکھاری کی پہلی اور آخری محبت بھی اُس کی شریک حیات ہی ہے۔ لیکن اُسے لکھنا ایسا لگتا ہے، کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے، وہ سب اُس کی محبت کے لیے ہی تو ہوتا ہے۔ تو پھر اپنی زبان سے بھی نا لفظ ادا کرنا، جو اس کے لہف کردار ایک دوسرے کے لیے ہمہ وقت اُس کی کہانیوں میں بولتے نظر آتے ہیں، اسے یہ ادا نیگی کچھ معیاب سی نظر آتی ہے اور کہیں اُس کے دل میں یہ خدشہ بھی موجود ہے کہ ان ہی لفظوں کے ذریعوں کی بے ساختہ زبانی ادا نیگی کو دکھانا نہ سمجھ لیا جائے، لہذا اپنی شریک حیات اور محبت کے سامنے وہ عموماً خاموش رہتا ہے اور یہیں سے لکھاری کی شریک حیات کی اُلجھن شروع ہوتی ہے۔ کیوں کہ بظاہر اُس پاس س اور اُس لڑکی کی سہیلیاں اُس پر رشک کرتی ہیں کہ لکھاری کی شریک حیات کس قدر خوش قسمت ہے کہ ان خوب صورت لفظوں کا ہمہ وقت ساتھ میسر ہے، جنہیں کتاب کی صورت میں پڑھنے کے لیے لکھاری کے ہاتھ میں بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں اور لمبی قطاروں میں کھڑے ہو کر اُس کی کتابیں خریدتے ہیں۔ اسی کش مکش

بتادیں۔“ کچھ ہی دیر میں مستعد بیروں نے میز پر کھانا سجا دیا۔ ہم سے ذرا فاصلے پر لابی میں ایک کلاسیک موسیقار پیانو پر مختلف فرمائشی ڈھنیں چھیڑ رہا تھا۔ اُس پاس بیٹھے لوگ کاغذ کی چٹ پر اپنی پسند کی ڈھنیں ادا کر رہے تھے۔ ہیرے کی ٹرے میں ڈال دیتے جو فوراً اُسے پیانٹ کے سامنے لے جا کر رکھ دیتا۔ ہیرے مسکرا کر اپنا سر ہلاتا اور پھر باری آنے پر جب وہ ڈھن بجاتے ہوئے اُس کی انگلیاں پیانو کی لمبی سفید تھرک رہی ہوتیں تو اُس کی نظریں بار بار فرمائش کرنے والے جوڑے کی جانب اٹھتی رہتیں۔ سچ ہے کہ ہر ہنرمند داد کا خواست گار ہوتا ہے۔ مجھے بچپن میں پیانو سیکھنے کا جنون تھا۔ ہمارے گھر کے بڑے ہال سیلون کی لکڑی سے بنا ایک بھورے رنگ کا بہت بڑا پیانو رکھا ہوا تھا، جسے باپا کبھی کبھار کسی محفل کے دوران کبھی تہائی میں بجاتے تھے۔ اور میں گھنٹوں محویت سے بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا۔ جانے کیوں تب ہی سے پیانٹ بہت ہنرمند اور سلجھے ہوئے لوگ لگتے تھے۔ ہمارے دائیں جانب شیشے کی دیوار پر پانی کا جہز اس طرح سے بھر رہا تھا، جیسے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ کھانے کی میزوں کے ارد گرد روشنی کا انتظام اس انداز میں کیا گیا تھا کہ ہر شخص ایک مدہم روشنی کے دائرے میں خود کو اس طرح محسوس کرتا جیسے وہ سب درمیان ہوتے ہوئے بھی تجلیے میں ہے، اور شاید تجلیے و تہائی کا احساس ہی اس ماحول کو آرام دہ اور دلہا بنائے ہوئے تھا۔ صاحب حیثیت لوگ ایسی جگہوں پر شاید اسی احساس کی قیمت ادا کرتے ہیں، ورنہ کم یہی ذائقہ ہر مہتر خوان پران کے گھروں میں بھی موجود ہوتا ہے۔ وہ یقیناً یہاں پیش کیے جانے والے کی نہیں، یہاں گزارے جانے والے وقت کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ دھانی اور شاہانہ نے بھی مختلف ڈھن فرمائش شروع کر دی۔ پیانٹ شاید شیخ صاحب کی ذاتی حیثیت سے واقف تھا، لہذا اب اُس کی پورا ہماری میز کی جانب تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں پیپا اسٹیوڈنٹر کے اسی نشے کی ڈھن بہت شہرے بجاتے تھے ”ہیلو..... کیا میں وہی ہوں، جس کا تمہیں انتظار ہے؟ کیوں کہ میں تمہاری محسوس آنکھوں اور گھائل مسکراہٹ میں دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ تمہیں کیسے جیتوں اے دلربا..... کہ میں انجان ہوں..... میں ابھی ان ہی لفظوں کے ظلم سے شروع کروں..... کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“ پیانٹ نے ڈھن سے سارے ہال نے اُسے داد دی۔ اب دھانی کی باری تھی، اُس نے چٹ بھیجی، ”لا پرواہ سرگوشیاں (whispers)..... میری بہترین دوست ہیں..... لیکن اب میں کبھی رقص نہیں کر پاؤں گا، کیوں کہ بوجہ قدم بتا تال کے ہیں.....“ بہت دیر تک شانی اور دھانی میں جارح مائیکل، ویم اور ماڈرن بالک پرانے نغموں اور پھر شیر (Cherr) بیک سٹریٹ بوائز اور برٹنی سپیریز کے نئے نغموں کی ڈھنوں پر چار آزمائے کا سلسلہ جاری رہا۔ شیخ صاحب بھی کچھ اس طرح مطمئن بیٹھے مسکراتے رہے، جیسے اُن کا کیا اُٹھنے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ دیرے دیرے ڈھلتی رات کا ٹسوں اب پوری طرح چھا چکا تھا۔ کھانے ہال میں اب بھی بہت سی میزیں بھری ہوئی تھیں اور دیر رات کو نکلنے والے آوارہ گرد بھی جمع ہو رہے تھے۔

اور دینی الجھنوں کی یلغار میں ایک دن لکھاری کی محبت اس کا گھر چھوڑ جاتی ہے کہ اب وہ مزید اس خاموشی  
متمثل نہیں ہو سکتی۔“ شانی اور دھانی بہت غور سے شہریار کی بات سن رہی تھیں۔ شیخ صاحب بھی پوری  
متوجہ تھے۔ اُن سے شہریار کی خاموشی کا لبا و تقہ برداشت نہیں ہو سکا اور وہ جلدی سے پوچھ بیٹھے ”تمہارا  
کہانی کا عنوان کیا ہے؟“ شہریار نے ہم سب کی جانب نگاہ دوڑائی..... ”میرا ہر لفظ تمہارا ہے، لیکن میری  
کا انجام ابھی باقی ہے۔ آپ سب بھی اپنی رائے دیجئے کہ انجام کیسا ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر کے لیے خاموشی  
خاموشی طاری رہی۔ پھر دھانی ہی نے سکوت توڑا۔ ”انجام تو بہت واضح ہے، لکھاری کو اپنی محبت کی جگہ  
بعد یہ احساس ہو جانا چاہیے کہ رشتے لفظ مانگتے ہیں۔ جذبے اظہار چاہتے ہیں اور محبت ادائیگی کے لیے  
شدہ ہے۔ لہذا اُسے بھی دل سے یہ دہرائی ہوئی بات کا خوف نکال کر اپنے لفظ اپنی محبت کے نام کرنا  
گئے۔ کیوں کہ محبت کبھی پرانی اور باسی نہیں ہوتی۔ لفظ کبھی میلے نہیں ہوتے اور اپنی محبت کے لیے ان کی  
سدا بہار رہتی ہے۔ لہذا لکھاری کو اپنی محبت کا اظہار کھل کر کر دینا چاہیے اور اپنی شریک حیات کو اپنی زندگی  
واپس لے آنا چاہیے۔“ شہریار نے مجھ پر نظر ڈالی ”اور تم کیا کہتے ہو عبداللہ۔“ میں شہریار سے ایسے ہی  
کی توقع بالکل نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اب سب کی توجہ میری جانب مبذول ہو چکی تھی اور خلاصی ناممکن تھی۔  
لگتا ہے دھانی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کیوں کہ ہماری زندگی میں بعض رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی طبیعت  
کے ساتھ دنیا میں وارد ہوتے ہیں۔ اور ہمیں اسی مدت کے اندر ہی ان رشتوں کو برتنا پڑتا ہے۔ ورنہ  
ہو جانے کے بعد وہ جذبے بھی سرد پڑ جاتے ہیں، جو ان رشتوں کی بنیاد اور ان کی روح کا باعث  
ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ خون کے رشتوں کے علاوہ سب ہی رشتوں پر اس ایکس  
ڈیٹ کی مہر پہلے ہی سے لگی ہوتی ہے۔“

کہانی کا انجام طے ہو چکا تھا۔ ہم سب گھر واپس پہنچے تو شب نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ رات  
بھی شہریار خاموش رہا۔ ہم دونوں انیسکی میں اپنے کمروں کی جانب بڑھنے لگے وہ اچانک ہی کسی خیال  
سے باہر آیا۔ ”آج تم نے ایک عجیب بات محسوس کی، یا پھر یہ میرا ہی واہمہ ہے.....؟“ میں سمجھ گیا کہ  
اشارہ کس جانب ہے۔ ”نہیں..... میں پہلے ہی یہ بات محسوس کر چکا ہوں۔ جس وقت تم اپنی کہانی کا پایہ  
چکے تھے، تب ہی میں نے تمہاری آنکھوں میں سوال پڑھ لیا تھا۔ شانی سوچتی ہے اور دھانی اس کی  
لفظوں کا روپ دیتی ہے۔ شاہانہ کے پاس لفظ نہیں ہیں اور دھانی ہی اُس کی لغت ہے۔“ شہریار نے  
نظروں سے میری جانب دیکھا ”اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم کچھ اور ہو۔ اتنی باریک بات جسے جاننے  
مہینہ بھر سے زیادہ لگ گیا، تم نے دو ملاقاتوں ہی میں کیسے پرکھ لی؟“ ”نہیں..... اس میں ایسی کوئی خاموشی  
نہیں۔ تمہاری جگہ اگر میں محبت کے اس سنہری جال میں جکڑا ہوتا تو شاید مجھے اس سے بھی زیادہ وقت  
بات محسوس کرنے میں۔ دراصل کچھ جذبے ہمارے حواس پر آہنی پردے ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر یہ کوئی

بھی تو نہیں..... ہم میں سے بہت سے لوگ کسی ایک میدان ہی میں یکتا ہوتے ہیں۔ کچھ لفظوں کو کاغذ پر  
لکھنے کا ہنر جانتے ہیں تو کچھ اُن کی ادائیگی میں کمال رکھتے ہیں۔ اور لکھاریوں کے ساتھ تو یہ مسئلہ بہت عام  
ہے کہ بعض بہت بڑے لفظ گرہونے کے باوجود گفتگو کے معاملے میں خاص ماہر نہیں ہوتے۔ اسی طرح کچھ جو  
جانتے ہیں، وہ بول نہیں سکتے۔ شاید شانی کا بھی یہی مسئلہ ہے۔“ شہریار کہیں اور کھویا ہوا تھا ”تو پھر وہ مجھ سے  
ان دنوں پھر گھنٹوں کیسے بات کر لیتی ہے۔ کیا یہ مسئلہ صرف تھپیلے اور جلوت کا ہے؟“ میں نے غور سے شہریار کو  
دیکھا۔ اُس کی زبان پر وہی بات آکر زک گئی تھی، جو خود کہیں دُور میرے ذہن کے کسی گوشے میں اُنکی ہوئی  
تھی۔ میں نے اپنا سوال دہرانے سے پہلے لفظ اپنے ذہن میں ترتیب دیے۔ ”ٹھیک سے یاد کر کے بتاؤ، تم  
مطلوبہ گفتگو کی نشستوں کا ذکر کر رہے ہو، وہ تمہاری یہاں آمد کے بعد سے لے کر تب تک اسی طرح جاری  
رہا ہے تم انہیں محسوس کرنا چاہتے تھے۔“ اور کیا ان میں کبھی کوئی بدلاؤ بھی آیا تھا؟“ شہریار کو جیسے ایک جھکا سا  
۔ غالباً وہ میرے سوال کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ ”اُس کی گفتگو اُس وقت تک مکمل تھی، جب تک میں نے شانی  
کا آواز کی شناخت کا اعلان نہیں کیا۔ اور اس بات میں قریباً دو ہفتے کا عرصہ حائل تھا۔“ میں اور شہریار ایک ہی  
تہ پر پہنچ رہے تھے۔ شہریار کی شیخ صاحب کی کوشی میں آمد کا مقصد سب کے لیے ایک کھلا راز تھا اور دوسری  
تہائی سے شہریار کو وہ ٹیلی فون آنا شروع ہوا تھا۔ پھر شہریار اس آواز کے زیر و بم میں کھوتا چلا گیا۔ اس ملائم  
راز کے جادو، لفظوں کے خوب صورت چٹاؤ اور خیالات کے حسین زاویوں نے اُسے کچھ ایسا مدھوش کیا کہ وہ  
آپ ہی بھول گیا۔ روز شام کو جب چائے پر شیخ صاحب کے گھرانے سے اُس کی ملاقات ہوتی تو وہ شانی  
دھانی دونوں کے چہروں پر رات والی آواز کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ شہریار کی الجھن بھی اپنی جگہ بجا تھی  
بل کہ دونوں بہنوں کی آواز بالکل ایک جیسی تھی۔ خود میں نے بھی جب شاہانہ اور دھانی سے اُس روز فون پر  
تک کی تھی، دونوں آوازوں میں فرق تلاش نہیں کر پایا تھا۔ اور پھر شہریار کو شانی کی آنکھوں میں وہ گلابی معطر  
ام کھائی دے ہی گیا، لہذا یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ شہریار کو فون کرنے والی شاہانہ ہی تھی۔ شہریار نے اُسی  
تہ کو سنی حل کر دی، جو پچھلے دو ہفتوں سے اُس کے دل میں اٹھل پھٹھل چھا رہی تھی اور اُس نے فون کرنے  
کا آواز کو شاہانہ کی آواز کے طور پر شناخت کر لیا۔ شانی نے بھی اپنی ہار تسلیم کر لی اور اس کے بعد شہریار کا شوق  
وقت بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک آدھ ملاقات کا موقع میسر بھی آیا، لیکن ساتیس تشہ ہی رہیں۔ ایک لفظ گر ایک  
کے لفظ تراش سے کچھ لفظوں کی بھیک نہ پاسکا۔ پھر دھیرے دھیرے شہریار کو یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ اب  
تک زیادہ تر دی بولتا ہے اور دوسری جانب سے شاہانہ صرف اس کے لفظ جوڑتی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح  
مل کر شہریار سے نہ تو بحث کرتی تھی اور نہ ہی شہریار کے نئے افسانوں کے پلاٹ پر کوئی تبصرہ۔ لیکن شہریار  
خود اس میں اس تبدیلی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تاوقتیکہ اُس کی شاہانہ سے تنہائی میں دو ملاقاتیں نہیں  
ملیں۔ پھر شیخ صاحب کے مہمان کے طور پر انیسکی میں شہریار کا ہم سایہ بن گیا اور اس کا زیادہ تر رات کا

## لفظ روتھ جاتے ہیں

وقت میرے ساتھ اپنی کہانیاں سناتے گزرنے لگا اور آج وہ لمحہ بھی آ ہی گیا، جب شہر یار نے وہ بات عرض کی، جو شاید عام حالات میں اُسے بہت پہلے سمجھ آ جاتی۔ ہم دونوں کافی دیر خاموش کھڑے رہے۔ اچانک فون کی گھنٹی نے ہم دونوں کے خیالات کی روتھ روتھ دی۔ شہر یار نے انجکچا کر میری جانب دیکھا۔ میں نے اُر دی ”سچ ہمیشہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور ہم سے بہت نزدیک ہوتا ہے۔ یہ ہماری سوچ اور ہمارے اقتدار گئے راستے کا تصور ہوتا ہے کہ ہم اس سچ تک پہنچنے میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں۔ شاید ہم جان بوجھ کر اُکڑتے ہیں اور وہ راستہ اختیار کرتے ہیں، جو ہمیں سچ تک پہنچانے میں بہت دیر لگاتا ہے۔ لیکن میں یہ اُمید رکھتا ہوں کہ تم اس سچ کا سامنا بہادری سے کرو گے۔ جاؤ جا کر فون اُٹھاؤ۔ اب تم سے صبح ہوگی۔“ میں شہر یار کا شانہ سمجھتا ہوں کہ آگے بڑھ گیا۔ صبح ہونے میں کم ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔ نہ بعد میں کچھ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر صبح کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

پھر میری آنکھ فون کی گھنٹی سے ہی کھلی۔ دوسری جانب کونسی کا خانساں تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ مرتبہ پہلے بھی میز پر ناشا لگا چکا ہے، لیکن جب خلاف معمول میں اپنے وقت پر باہر نہیں نکلا تو اُسے اُٹھائی۔ لہذا اُس نے میری طبیعت کا پوچھنے اور ناشا لگانے کی اجازت طلب کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ باہر نکلا تو شہر یار پہلے ہی سنے باہر کھلتی کھڑکیوں کے قریب کھڑا نہ جانے غلام کیا گھور رہا تھا۔ میرے اُڑنے کی آہٹ سن کر وہ میری جانب پلٹا۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا عبد اللہ۔ سچ ہمیشہ ہمارے آس پاس موجود ہے۔ ہم خود ہی نہ جانے کہاں بھٹکتے رہتے ہیں۔ میرا سچ بھی میرے سامنے آ گیا ہے۔ مجھ سے شروع نہ کرنے والی شانی نہیں تھی۔ میں جن سنہرے خوابوں اور کول جذبوں کے دھارے میں بہہ رہا تھا۔ اُنہم کی صورت دینے والی خواب گر کوئی اور نہیں، دھانی ہی تھی۔“

ہماری زندگی میں پیش آنے والے بعض حقائق ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا مکمل ادراک ہونے کے باوجود ہم ان کے پیش آنے پر کچھ اس جھٹکے سے چوکتے ہیں، جیسے وہ حقیقت نہیں، کوئی انہونی ہو۔ ٹھیک اس وقت میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ حالانکہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات گزشتہ شام ہی سے گردش کر رہی تھی کہ شانی کی اس پہلو تہی اور خاموشی کے پیچھے کوئی ایسی ہی کہانی ہوگی، لیکن شہر یار کی زبانی یہ بات سن کر چند لمحے کے لیے میں گنگ سا رہ گیا۔ شہر یار کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات سو نہیں پایا۔ میں تیزی سے اُس کی جانب بڑھا ”تو کیا تم نے براہ راست شانی سے سوال کر ڈالا؟“ ”نہیں۔“ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کل رات میری کہانی کا پلاٹ سن کر شاید شانی کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ میں روپوں کے رفرق کو پہچان گیا ہوں۔ وہ بہت شرمندہ تھی کہ یہ بات بتانے میں سے اتنی دیر لگی۔ حالانکہ اس کی اپنی نیت ہی یہی تھی کہ وہ کسی مناسب موقع پر یہ راز کھول دے گی کہ شہر یار کو شروع میں فون کرنے والی شانی نہیں دھانی تھی۔ اور پھر جب شہر یار کی پسندانہ دونوں بہنوں پر کھلی تو شانی نے از خود فون پر دھانی کی جگہ لے لی۔ کیونکہ دھانی کے بقول اُس کے شہر یار کے لیے صرف بطور ایک اچھے لکھاری، پسندیدگی کے جذبات تھے۔ جب کہ ان کی پہلی نظری میں شہر یار کی شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی۔ لیکن وہ دونوں ہی شاید یہ جان نہیں پائیں کہ شہر یار غلوں کا امیر ہے۔ اُس کی رگوں میں لفظ زندگی بن کر دوڑتے ہیں اور اس کی نوسوں میں خون نہیں، لفظ رواں ما۔ اُس کے دل کو فتح کرنے والی وہ پہلی آواز، جس نے حسین لفظوں سے خیال کی سنہری وادیوں تک کا سفر ریار کی انگلی پکڑ کر طے کیا تھا، وہ صرف چند بیٹھے بول نہیں تھے، وہ ایک فریکوئنسی تھی، جس نے اُن دونوں کو زکریا کیسے نکلتے پر پہنچا دیا، جہاں سے ان کا وہ سفر شروع ہوتا تھا، جس کے راستے اور منزلیں سب ایک ہی تھیں۔ لیکن دھانی کے جانے کے بعد شانی وہ فریکوئنسی بول رہی نہیں رکھ سکی۔ وہ دوا انسان، جن کے درمیان محبت بٹا جرتے ہیں، ان کے جذبوں کی لہریں ہوا کے دوش پر ضرور کسی ایک اور خاص مقام پر ملتی ہوں گی، جیسے یو کی شارٹ ویو، میڈیم لہر کی فریکوئنسی نہیں پکڑ سکتی اور اسی طرح لاگ ویو، شارٹ ویو کی لہروں پر چڑے نہ پکڑ نہیں پاتی، حالانکہ یہ تینوں لہریں اسی فضا میں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں لیکن ان کے دائرہ کار مختلف۔ محبت کے جگنو بھی ہر لمحہ ہوا میں تیرتے اور جگمگاتے رہتے ہیں، لیکن کس جگنو کی چمک کس اندھیرے دل کا رین کر اُس انسان کی زندگی میں اُجالے بھر دے گی، اس کا فیصلہ وہ فریکوئنسی کرتی ہے، جس کے طے بنا دینا



کا ہر ملن ادھورا رہ جاتا ہے۔ ہاں البتہ شاید محبت کے یہ جگنو فضا میں تیرتے ہوئے اپنی جگہیں بعض مرتبہ بھی دیتے ہیں۔ ایک لہر کی تہ سے نکل کر سفر کرتے ہوئے، دوسری لہر میں بھی جا ملتے ہیں۔ تب ہی ہمیں یہ اوقات ایسے انسانوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے، جو بظاہر پہلے ہمارے لیے بہت عام ہوتے ہیں اور ہمارے آس پاس ہی برسوں سے موجود ہوتے ہیں، جی رہے ہوتے ہیں۔ مجھے ایک اور عجیب سی حقیقت کا ادراک ہوا۔ ہمارا معاشرہ جہاں شادی کا بندھن ہی ملن کا باعث ہوتا ہے۔ جہاں اب بھی نوے فیصد رشتے بزرگوں، مرضی اور دو خاندانوں کے جوڑ کا سبب ہوتے ہیں۔ ایسی طے شدہ شادیوں میں جہاں دو ہم سفر زندگی میں مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی کسی بندھن میں بندھ جانے کے بعد ہیں، وہاں محبت کے جگنوؤں کا سفر تیز جاتا ہے۔ شاید دعاؤں کا ایندھن اس رفتار کو ہمیز دیتا ہے، لیکن شہر یار کا ستا ہوا چہرہ اور اُس کی سرخ آنکھیں رہی تھیں کہ اُس کے جذبوں کے جگنو اب بھی وہیں، اُسی لہر میں نمود تھے، جہاں کبھی پہلی رات دھانی کے تار جڑے تھے۔ میں نے غور سے شہر یار کی آنکھوں میں بجھتے ہوئے چراغوں کو دیکھا ”پھر تم نے شانی کیا کہا؟“ ”میں پھٹ پڑا کہ ان دو بہنوں نے میری زندگی کے ساتھ اتنا بذا مذاق کیوں کیا۔ آخر میں نے کیا کیا بگاڑا تھا۔ وہ رو پڑی اور مجھ سے معافی ہی مانگتی رہی کہ اس کا مقصد مجھے دھوکا دینا کبھی نہیں تھا۔ اُسے بھی گزشتہ رات ہوٹل میں کھانے کے دوران یہ احساس ہوا کہ میں دھانی کے خیالات اور باتوں سے پہلے ہوا تھا اور شانی کے حسن سے بعد میں۔ جب کہ وہ اب تک یہی سمجھتی آرہی تھی کہ میں پہلے ہی دن سے اُسے متاثر ہوں۔“ مجھے شہر یار کی بات سن کر نہ جانے کیوں بہت دکھ ہوا۔ ”تمہیں اُسے ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔ اگر اندر بہت نازک ہے۔ تمہارے دیئے ہوئے لفظوں کے گھاؤ بھرتے بھرتے بھی گئے تو اُن کے داغ جگمگاتے رہیں گے۔“ شہر یار الجھا ہوا تھا۔ ”میں بہت دباؤ میں تھا۔ خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور بہت کچھ کہہ گیا۔“ ”دباؤ ہی میں تو خود پر قابو رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جانتے ہوا صل فاتح کون ہوتا ہے۔ وہ جوش دباؤ میں بھی متانت کا دامن تھامے رکھے۔ انسان کی پہچان اُس کے غصے کے دوران ہی ہوتی ہے۔ حالات میں تو سبھی میٹھے ہوتے ہیں، ہمارے اندر کے زہر کو پرکھنے کا پیمانہ یہ دباؤ اور طیش ہی تو ہے۔ اور“ چند لمحوں میں کچھ بت ایسے ٹوٹے ہیں کہ پھر کبھی جڑ نہیں پاتے۔ اپنا بت سنبھالو شہر یار۔“ وہ چڑسا گیا ”تو تم چاہتے ہو، میں ابھی جا کر اس سے معافی مانگ لوں۔“ ”نہیں۔ یہ دوسری غلطی ہوگی تمہاری۔ تم پہلے ہی اشتعال میں آ کر پہلی غلطی کر چکے ہو۔ زندگی میں بعض غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں، جو مناسب وقت کا تقاضا ہیں، حالانکہ اس لمحے آپ کے دل و دماغ پر اپنی بھڑاس نکالنے کا جنون طاری ہوتا ہے اور بظاہر آپ کو ایسا رہا ہوتا ہے کہ گنتی برابر کرنے کا یہ موقع اگر آپ کے ہاتھ سے نکل گیا تو شاید ہمیشہ کے لیے دیر ہو جائے گی۔ ہمارا جوابی حملہ خطا ہو جانے کے بعد انہی اُن کہے لفظوں کی صورت میں کاٹنا بن کر خود ہمارے دل ہی میں رہے گا۔ لہذا ہم اپنے دل کے بولی اپنی زبان سے زہر میں بجھے تیر بنا کر دوسرے کے دل میں پیوست کر دے

ہیں۔ اور ایسا کرنے سے وقتی طور پر ہمیں کچھ سکون بھی ضرور مل جاتا ہے۔ لیکن کبھی تم نے سوچا ہے کہ ہم اس سارے عمل میں حاصل کیا کرتے ہیں؟ صرف ایک خلش، کبھی نہ مٹنے والی کک اور بد قسمتی سے غلط ثابت ہو جانے کی صورت میں عمر بھر کے پچھتاوے، کیوں کہ دل کے ششے میں آیا بال پھر کبھی نہیں نکلتا۔ اسے نکالنے کے لیے وہ شیش پچکنا چور کرنا پڑتا ہے یا پھر عمر بھر اسی بال کے ساتھ گزارا کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ کبھی واپس نہیں ملتے۔ اور ہم کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کھودیتے ہیں، جو پھر کبھی نہیں ملتا۔ اس لیے رویوں میں حد و رجا احتیاط ہی زندگی کے ہر بندھن کی کامیابی کی ضمانت ہے۔“ شہر یار خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے پاس کسی اجنبی کے ساتھ بھی کوئی دوسرا رشتہ نہ ہونے کے باوجود بردباری، احترام اور اس کی اور اپنی عزت کا رشتہ تو ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ اور دو قوتی محبت یا خون کے کسی رشتے کی صورت میں تو یہ ذمہ داری دینی ہو جاتی ہے۔ میں رات کو اپنے ذمہ داری نبھانے پایا۔ میں اب تک اپنی ہر کہانی اور افسانے کو ایک خوب صورت موڑ پر ختم کرنے کا عادی رہا ہوں لیکن خود میری اپنی کہانی کا اتنا بد صورت انجام ہوگا، یہ میں نے کبھی سوچا کہ نہ تھا۔“ ”تو پھر اب تم نے کیا سوچا ہے۔ کہانی ختم کرنے کا ایک اصول یہ بھی ہوتا ہے کہ کھاری کو ہر کردار کے ساتھ انصاف کرنے کے بعد اُسے انجام تک پہنچانا ہوتا ہے۔“ شہر یار نے لمبی سی آہ بھری۔ ”لیکن میری کہانی کا انجام کچھ مختلف ہے۔ میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس افسانے کے ہر کردار کو اپنا انجام خود طے کرنا ہوگا۔“ ہماری باتوں کے دوران ناشتا بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ مستعد نوکر تھوڑی دیر بعد چائے گرم کر کے میز پر سجاتے رہے تھے۔ میں دو گھنٹہ بھر کے اسپتال کے لیے نکل پڑا۔

سلطان بابا کی حالت آج خلاف معمول کچھ بہتر نظر آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولے ”آج اپنی کٹڈی کہاں لٹکا آئے ہو میاں۔ کبھی اس ذہن کو دو گھڑی آرام بھی کر لینے دیا کرو۔“ میں مسکرا کر بات ٹال گیا۔ جانے وہ اتنی آسانی سے چہرے کی سیلٹ کیسے پڑھ لیتے تھے یا پھر میری جبین کی ٹکٹیں ہی کچھ ایسی تھیں کہ میرے اندر برقی ہر بارش لفظوں کی صورت قطروں کی طرح ٹپکتی اور پھسلتی رہتی تھی۔ چہرہ آئینہ ہوتا ہے اور آئینے بوندوں کا بلوچ زیادہ دیر سہا نہیں پاتے۔ انہیں بہنے کے لیے راستہ دینا ہی پڑتا ہے کہ بہاؤ کا واسطہ ہمیشہ سے شفافیت سے ہے۔ سلطان بابا کو اب اسپتال سے خارج ہونے کی فکر ستا رہی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ یہاں سے بہت دور ملک کے مغربی ساحل پر کوئی درگاہ ہے، جہاں ہمارا پہنچنا ضروری ہے۔ میں چونک سا گیا۔ ساحل اور درگاہ کا نام سن کر مجھے اچانک ہی اپنا شہر اور زہرا سے ساحل پر ہوئی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ میرا شہر مشرقی ساحل پر تھا اور سلطان بابا مغربی ساحل کی جانب بے ہوئے شہر کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہی لہروں کے دوسری پار وہ بھی تو رہتی تھی۔ اس سمندر کے دو کناروں کی لہریں بھی تو آخر کبھی نہ کبھی ایک دوسرے سے مل جاتی ہوں گی۔ جانے ہمارے مقدر کی لہریں کب آپس میں جڑ پائیں گی۔ میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے سلطان بابا کی آنکھ لگنے کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے

لینے آیا تو میں چاہتے ہوئے بھی اُسے واپس نہیں بھیج پایا۔ یہ سلاخیں اور قید خانے ہمیں کیا قید کر پائے گئے، اصل قید تو مروت اور وضع داری کی ہوتی ہے۔ میں گھر پہنچا تو ملکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی اور موسم کے انہی تیوروں کے باعث آج بڑے والے شیشے کے کمرے میں چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سمیت شیخ صاحب کا سارا خاندان موجود تھا۔ برستے موسم کی مناسبت سے ہلکے پھلکے پکوان میز پر جارہے تھے۔ ہمارے اندر موجود ڈانٹوں کا تعلق باہر کے موسموں سے کیسے جڑ جاتا ہے، یہ میں کبھی کہہ نہیں سکتا۔

پایا۔ دونوں بہنوں اور شہریار کے رویے میں تناؤ اُن کے بے حد چھپانے کے باوجود محسوس کیا جاسکتا تھا صاحب نے بھی غور سے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ”کیوں بھئی، کوئی سرد جنگ چل رہی ہے کیا۔ تم تینوں آج بے حد خاموش ہو۔“ وہ تینوں ہی کچھ گڑبڑا سے گئے۔ شہریار جلدی سے بولا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں کبھی کبھی موسم کچھ بولنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ لفظ خود بوندیں بن کر بہہ جاتے ہیں۔“ شیخ صاحب زبان سے بے ساختہ واٹکل۔ ”بھئی واہ، کیا بات کہی ہے۔ خاموشی کا حق ادا کر دیا۔ کبھی ہم بھی ان برستی بوندوں کے لیے کچھ ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔ عبداللہ میاں! تم ہی کچھ کہو، ان تینوں نے تو بارش سے شرط باندھ لیا ہے۔“ دھانی نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ شیخ صاحب تناؤ محسوس کرنے کے باوجود بڑی خوب صورتی سے نال گئے تھے۔ میں نے بات جوڑی ”مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ موسم ایسے ہوتے ہیں جو ہم سے تمام گلے گلے بھلا کر بس اس موسم میں ڈوب جانے کا تقاضا کرتے ہیں کہ موسم بھی تو ایک نعمت کی طرح ہوتا ہے۔ کمرے کی نعمت ہو تو موسم ہم سے رُڈھ جاتے ہیں اور پھر بہت دنوں تک وہ ہمارے کمرے کی کھڑکی پر دستک نہیں دے سکتا۔ بس دبے پاؤں خاموشی سے باہر ہی سے گزر جاتے ہیں۔“ اب چونکنے کی باری شاہانہ کی تھی، جب کہ مخاطب شہریار تھا، جس نے ہلکے سے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر چائے کی پیالی سے اٹھتی بھاپ عجب میں گم ہو گیا۔ باہر گرتی بوندوں نے اب باقاعدہ جل تھل کی شکل اختیار کر لی تھی۔ باہر باغیچے میں ایک جگہ پر پانی کا جو ہڑ سناٹا دیکھ کر میرا بہت شدت سے جی چاہا کہ میں کاغذ کی ایک چھوٹی سی کشتی بنا کر اس میں چھوڑ آؤں اور پھر اپنے بچپن کی طرح ہاتھ کی چھتری بنا بنا کر، گھنٹوں خود بھیگ کر اس کشتی کو بھیجنے سے رہوں، حتیٰ کہ شام ڈھل جائے اور سرمئی بادلوں کی چھتری اندھیرے میں ممانکین سے مجھے ڈھونڈتے ہو وہاں نکل آئیں اور میں اُن کی انگلی تھامے ہوئے گھر کی جانب جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کر اپنا سفینہ ڈونڈ کر، آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکاتا رہوں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ ”کاغذی سفینوں“ کو تو ڈوب ہی جانا ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ سفینہ کسی نازک رشتے ہی کا کیوں نہ جیسے اس وقت شانی اور شہریار کے رشتے کی کشتی ڈوب رہی تھی۔ ہم کسی کے کتنے بھی قریب کیوں نہ جائیں، کسی کو کتنا ہی اپنا کیوں نہ مان لیں، اگر وہ رشتہ کاغذی ہو تو سفینہ ڈوب ہی جاتے ہیں۔ لفظ رُڈھ جا ہے۔ ایک لمحہ پہلے وہی انسان جس پر ہمارا کامل یقین، مان اور بھرم ہوتا ہے کہ بس وہی تو ہے جو ہمیں اس

پائیں سب سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے، اگلے لمحے ہی ہمارے لیے دنیا کا سب سے انجان شخص بن جاتا ہے۔ میں آج تک یہ معمہ حل نہیں کر پایا تھا کہ بے انتہا اپنائیت کا وہ بھرم جھوٹا ہوتا ہے یا پھر اچانک ہی بیچ میں رانداز ہو جانے والی اس بیگانگی اور اجنبیت کا یہ احساس سچا۔ ہم پل بھر ہی میں اتنے اپنے اور پھر ایک دم پانک اتنے بیگانے کیسے ہو جاتے ہیں؟

چائے ختم کر کے میں اسپتال واپس جانے کے لیے اٹھا تو شیخ صاحب بھی سلطان بابا کو دیکھنے میرے انجی ہی چل پڑے۔ سلطان بابا ہمیں ساتھ آتا دیکھ کر مسکرائے۔ ”لگتا ہے میرے جوگی کا دل آپ کے ہاں گیا ہے؟“ شیخ صاحب بھی ہنس پڑے۔ ”پتا نہیں، لیکن عبداللہ میاں کو دیکھ کر تو خود ہمارا بھی جوگ لینے کو جی ہوتا ہے۔“ وہ دونوں زمانے بھر کی باتیں کرتے رہے اور میں کمرے کی کھڑکی کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کر رستی بوندوں کا کھیل دیکھتا رہا۔ بارش میں سب ہی منظر یکساں ہو جاتے ہیں۔ رجم جھم گرتی وہ پھوار باہر، ماتھ ساتھ ہمارے اندر سے بھی بہت کچھ دھو ڈالتی ہے۔ گھر واپس پہنچنے پر مجھے شہریار انگلیسی میں دکھائی دیا۔ نوکر نے بتایا کہ ہمارے جانے کے کچھ دیر بعد وہ بھی دوسری گاڑی لے کر کہیں نکل گیا تھا۔ بارش نے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ نوکر نے کھانے کا پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ عشاء کے بعد بھی میں بہت دیر شہریار کا انتظار کرتا رہا، پردہ نہ جانے کہاں رہ گیا تھا؟ انہی سوچوں میں گم میں باہر لان میں جلتی سفید گول لپٹوں کی یلغار جیسی بارش کی بوندیں گرتی دیکھ رہا تھا کہ اچانک فون کی تھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

”ہیون شہریار کے لیے ہوگا، لیکن وہ تو ابھی واپس ہی نہیں پلٹا۔ تھنٹی بہت دیر تک بج کر چند لمحے کے لیے ہوئی اور پھر کچھ دیر بعد ہی پھر سے لگا تار بجنے لگی۔ میں نے شش و پنج کے عالم میں فون اٹھا ہی لیا۔ دوسری بان دونوں سے کوئی ایک بولی۔ ”ہیلو..... جی میں عبداللہ بول رہا ہوں۔ شہریار ابھی گھر واپس نہیں لوٹا۔“

رہا جانب کچھ لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر وہ بولی۔ ”میں دھانی بول رہی ہوں۔ مجھے دراصل آپ ہی سے کرنی ہے۔“ میں نے اپنی حیرت کو ظاہر ہونے سے روکا۔ ”جی فرمائیے.....“ وہ کچھ دیر تک اپنے لفظ لپٹ رہی۔ ”عاب شہریار نے آپ کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ مجھے اسی سلسلے میں آپ کی کچھ مدد ہے.....“ میں حاضر ہوں۔ اگر کسی بھی مدد کے قابل ہوں۔“ ”شکریہ..... شانی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کچھ فون میں شہریار کے بہت اچھے دوست بن گئے ہیں۔ آپ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں کہ وہ ہماری شروع میں لپٹا دانی کو بس ایک شرارت سمجھ کر معاف کر دیں۔ ہم دونوں میں سے کسی کا بھی مقصد انہیں دھوکا دینا نہیں شانی کل رات سے بے حد پریشان ہے اور یقیناً جاے اس سارے معاملے میں اگر کوئی تصور وار ہے بھی، میں ہوں، لیکن سزا شاہانہ کو مل رہی ہے۔ مجھ سے مزید اُس کے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ آپ شہریار سے ساگر سزا دینا اتنا ہی ضروری ہے تو میں حاضر ہوں۔ وہ چاہیں تو ساری عمر مجھ سے کوئی رابطہ بھی نہیں رکھیں، شانی کو معاف کر دیں۔ وہ بہت معصوم ہے۔“ مجھے لگا کہ دھانی بولتے بولتے کچھ بھرا سی گئی ہے۔ میں نے

اُسے تسلی دی۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں ضرور اُسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ حالانکہ بات کچھ نازک جذبہ کی ہے۔ آپ نے شہریار سے خود بات کی ہے؟“ جی کل رات جب وہ شانی کو ڈانٹ رہے تھے۔ میں بھی اُن سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور آج شام بھی چائے کے بعد میں نے انہیں فون کیا، لیکن شہریار میری کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ وہ میری اس خطا کو شرارت مانتے پر تیار ہی نہیں۔“ میں بے ساختہ کہہ ”کیا وہ صرف ایک شرارت ہی تھی؟“ دوسری جانب گہری خاموشی چھا گئی۔ مجھے تاسف ہوا لیکن تیرکان چھوٹ چکا تھا اور اندھے تیرکی سب سے بڑی خطا یہی ہوتی ہے کہ اس کا نشانہ نامعلوم رہتا ہے۔ پھر مجھ نے تلاقی کی کوشش کی ”معاف کیجیے گا بعض مفہوم بات سے پہلے اور بہت سے نامناسب انداز میں مخاطب پہنچ جاتے ہیں۔“ دوسری طرف سے اضطرابی کیفیت اور ابھی سانسوں پر قابو پانے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ دھانی نے خود کو سنبھالا۔ ”خدا کرے آپ جس نتیجے پر پہنچے ہیں، شہریار وہاں کبھی نہ پہنچیں۔ سچ یہی ہے بات شرارت ہی سے شروع ہوئی تھی۔ میری بہن مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وہ شہریار کی ہڈی ہے۔ اس حقیقت کے بعد باقی تمام باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے پاس دلیل کی طاقت ہے، جو شہریار کی تمام اُلجھنیں مٹا سکتی ہے۔ مجھے آپ کی جانب سے کسی پیش رفت کا انتظار ہے؟ بات ختم کر کے دھانی نے فون رکھ دیا۔ گویا میرے ذہن کے کسی گوشے میں پلنے والا خیال صرف میرا وہاں نہیں تھا۔ شاہانہ سے بہت پہلے دھانی شہریار کو اپنے من مندر میں بیٹھا چکی تھی، شاید اسی وقت جب شہریار اُس نے گیٹ پر خوش آمدید کہا ہوگا۔ لیکن شہریار نے جب اُس کی آواز کو شانی کی آواز کے طور پر شناخت کر دھانی اپنے اندر جھٹکے سے ٹوٹ کر کرجی کرجی ہونے والے جذبے کی آخری چیخ کو بھی کچھ اس خوبصورت سے چھپا گئی کہ اس کی ہم نفس اس کی واحد راز دار بہن، جو خود دھانی کا آئینہ تھی، اُسے بھی اس طوفان کے آواز اور پھر خاموشی سے گزر جانے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ ایک بار پھر روپ کا ڈاکا پڑ گیا۔ یہ من موہنی صورتوں والا ہی تو سب سے بڑے ڈاکو ہوتے ہیں، لیکن حیرت ہے دنیا کی کسی بھی تعزیرات میں اس ڈاکے کی کوئی سزا نہیں۔ زیادہ نہ سہی پر کم از کم ان روپ والوں اور بے روپوں کے لیے علیحدہ علیحدہ جزیرے ہی مقرر کر چاہیے تھے۔ تاکہ کبھی کسی بے روپ کا رستہ نہ کٹتا۔ انہی سوچوں میں ساری رات کٹ گئی۔ شہریار واپس لوٹا۔ صبح ناشتے کی میز پر میں نے نوکر سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ پہلے ہی گیا تھا کہ اگر رات کو اُسے زیادہ گئی تو وہ اُسی دوست کے یہاں ٹھہر جائے گا، جہاں وہ جا رہا تھا۔ میں شہریار کی آمد سے مایوس ہو کر اسپتال لیے نکلنے کا سوچ کر بھی انکسی کا باغیچہ پار کر رہی رہا تھا کہ سامنے سے آتی دھانی کو دیکھ کر میرے قدم جم گئے۔ وہ اس وقت برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ قریب آنے پر میں نے اُسے سلام کیا اور جواب دینے کے وہ اچانک ہی اس اُلجھن کا شکار ہو گئی، جو کسی بھی فیصلے کے آخری لمحات میں کچھ پل کے لیے ہمارے قدم سے دیتی ہے۔ آخر میں نے بات شروع کی۔ ”شہریار رات کو واپس نہیں لوٹا، لیکن آپ مطمئن رہیں۔ میں

میں ضرور اُس سے بات کروں گا۔“ جی میں جانتی ہوں۔ دراصل میں کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی۔ دراصل..... ”اُسے لفظوں سے زیادہ وہ خود ابھی ہوئی لگ رہی تھی۔ اُس کی پلکیں جھک گئیں۔ ”کیا شہریار نے آپ سے کوئی بات کی تھی؟ میرا مطلب ہے کیا وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہیں؟“ میں ناراضی سے زیادہ اسے ایک بے نام اُلجھن کہوں گا۔ شہریار اُن لوگوں میں سے ہے، جن کے دل کی کنجی لفظ ہوتے ہیں۔ ان کے من کے دروازے الفاظ کی چاہتوں سے کھلتے ہیں۔ آپ نے وہ سارے دروازے کھول ڈالے لیکن کسی اور کو اس کے من میں دھکیل کر خود دل کے دروازے سے ہی واپس پلٹ گئیں۔ شہریار اس وقت دستک دینے والے اور اندر آنے والے مہمان کے فرق کی اُلجھن کا شکار ہے۔ اُسے کچھ وقت دیں۔ وہ اس کش کش سے ضرور باہر نکل آئے گا۔“ دھانی کی جھکی پلکیں میری بات سن کر بہت دیر تک اُنٹھ نہیں پائیں۔ پھر جربہ وہ بولی تو مجھے یوں لگا کہ ساری کائنات اس کے اندر کے درد میں ڈوب ہی تو جائے گی۔ ”کوئی بھی مہمان دروازے پر دستک دے کر خود واپس پلٹنا نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ دستک تو زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار ہی دی جاتی ہے۔ لیکن اگر اندر سے میزبان کون؟“ ”پوچھنے کے بجائے کسی اور مہمان کا نام لے کر با آواز بلند صرف اُسی کو خوش آمدید کہے تو کسی بھی وضع دار مہمان کو پلٹ ہی جانا چاہیے۔“ میں نے چونک کر اپنے سامنے سر جھکا کر اُس دھان پان سی سانوی سلونی کو دیکھا۔ سچ ہے، ظرف کسی روپ کا حقان نہیں ہوتا۔ میں نے اُسے مزید کھوجا۔ ”اندر بلانے والے میزبان کو اپنی پہچان بھی تو کروائی جاسکتی تھی۔ کبھی کبھی اچانک نئے آجانے والے مہمان بھی تو اُسی حیر اور خوشی کے ساتھ لبیک کہہ جاتے ہیں۔“ اُس نے اپنی بیگنی نظر اٹھائی، درد، شکوہ، قسمت سے گلہ اور اپنی بے بسی کا نفوس۔ کیا کچھ نہیں تھا اُس ایک نظر میں..... ”نہیں..... کم از کم میرے معاملے میں یہ انہونی ناممکن تھی۔ میں بچپن سے ان سب چیزوں کی عادی ہو چکی ہوں۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ شہریار کے من کی کنجی لفظ ہیں۔ لیکن اُن کے دل کا راستہ بھی اُن کی نظر سے ہو کر ہی گزرتا ہے۔ تب ہی میرے لفظوں کی دستک کے باوجود انہیں باہر دھکیل دیا، جسے اُن کی نظر نے سراہا تھا۔ رنگ، روپ اور حسن کی طاقت سے کسے انکار ہے اور یقین جانیں شانی کے لیے ایسی ایک دستک تو کیا، میری ہزار زندگیاں بھی قربان ہو جائیں تو یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ کیوں کہ ایسی بہن نصیب والوں ہی کو ملتی ہے۔ وہ بہت نازک ہے، بہت معصوم ہے۔ اور چاہے انجانے میں کسی، پر اب وہی شہریار کے دل کی ٹیکس ہے اور یہی اس کی خوشی ہے۔ اور میں اپنی بہن کی خوشی کے لیے اپنی آخری سانس بھی گروی رکھ سکتی ہوں۔“ میں نے غور سے اُسے اپنے لرزتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔ ”یقیناً شاہانہ بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں گی۔ کیوں کہ میں نے آپ دونوں کو ایک جان دو قالب پایا ہے۔ پھر آپ کو نہیں لگتا کہ آپ نے اپنی پہلی دستک اُن سے چھپا کر کوئی بے ایمانی کی ہے؟“ ”نہیں میں نے ہی اُسے یہ سمجھایا تھا کہ اگر شہریار کا دل اُس کی جانب مائل ہے تو شانی کو بھی اپنے دل سے رائے لینی چاہیے۔ اُس کا دل اگر شہریار کو محرم مانتا ہے تو پھر اُسے بھی قدم بڑھانے میں دیر نہیں کرنی

## تم بھول جاؤ گے

ان دو بہنوں کے لگا تار بچتے آنسو مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو سکے۔ میں تو انہیں کوئی تسلی دینے کی بات میں بھی نہیں تھا۔ بعض دھاگے کچھ اس طرح الجھ جاتے ہیں کہ انہیں سلجھانے کی ہر کوشش انہیں مزید مانے کا باعث بنتی چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ جذبیوں اور رشتوں کے معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں ان جذبیوں، رشتوں اور گتھیوں کو اسی طرح الجھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا پڑتا ہے۔ سو، میں بھی ان دونوں یونی الجھا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ زندگی میں کبھی کچھ سیدھا نہیں ہوتا۔ یہ ہم سب کے ساتھ مکمل بھید بھاؤ ہے۔ شہر یار، دھانی اور شاہانہ کی زندگی نے بھی اپنا خراج وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ کتنی حیرت کی بات کہ وہ دونوں بہنیں شہر یار کا دل جیت کر بھی رو رہی تھیں۔ ایک اپنے لفظوں سے جیتی اور روپ سے ہاری تھی دوسری روپ سے جیت کر بھی لفظوں سے شکست کھا گئی تھی۔ وہ دونوں ہی فاتح بھی تھیں اور شکست خوردہ۔ کچھ ایسا ہی حال محبت کی اس ٹکون کے تیسرے کردار شہر یار کا بھی تھا۔ یہ محبت ہم لاچار انسانوں کے لئے کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ آج دھانی کی فریاد نے مجھے اندر تک لرزا کے رکھ دیا تھا۔ دنیا کا ہر انسان مرد و عورت کی تخصیص کے بنا خود کو اپنے من کے آئینے میں حسین تر ہی دیکھتا ہے۔ شاید ہمارے ہمیشہ سے دو چہرے تھے ہیں۔ ایک وہ جو ظاہری دنیا کو نظر آتا ہے اور دوسرا وہ جو ہم ہر لمحہ خود اپنے من کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ میں نے بعض اپنے اندر لگے ششے سے جھلکتے دوسرے چہرے کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر انہیں دنیائے آئینوں کی عادت ہی نہیں رہتی اور تب تک وہ خود کی بار چوٹک جاتے ہیں، جب کبھی ان کا واسطہ لگے گی ششے سے پڑتا ہے۔ کیوں کہ سامنے نظر آتے آئینے میں کھڑا شخص انہیں بالکل اجنبی نظر آتا ہے۔ لیکن چونکہ کہہ سکتے ہیں ”ارے میری تصویر تو بالکل اچھی نہیں آتی.....“ یا ”بھئی میں تو بالکل ہی ’فٹو جنک‘ لہوں، بعض زندہ تصویر کشی سے کترانے لگتے ہیں۔ تنہائی میں بار بار خود کو مختلف زاویوں سے ششے میں دیکھ کر اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ چاہے ہماری تصویر اچھی نہیں آتی، چاہے ہم ویڈیو میں نہ مل سکیں کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں، اصل میں تو ہم بہت دل کش ہیں۔ ہمیں ہمیشہ صرف وہی جملے یاد جاتے ہیں جو کبھی کسی نے ہمارے سر پر کی تعریف میں کہے ہوتے ہیں۔ ہم وہی رنگ پہننا شروع کر دیتے، جو کہ کسی کی رائے کے مطابق ہم پر چلتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی برتاؤ ہماری تمام شخصیت کے بناؤ سنگھار کے ساتھ ماہو جاتا ہے۔ دراصل ہمیں پہلا دھوکا دینے والا کوئی اور نہیں خود ہمارے کمرے کا آئینہ ہوتا ہے جو ہماری

چاہیے اور شاہانہ نے یہی کیا۔ کیوں کہ وہ خود کہیں اندر سے شہر یار کو اپنا مان چکی تھی۔ ”دھانی کے کانپتے دھڑکے لرزش بڑھنے لگی۔ گویا معاملہ قربانی دینے کا ہے؟“ ”اُس نے شکوہ بھری نگاہ ڈالی۔“ ”اگر یہ قربانی ہی ہے تو قربانی میں اپنے جہنم ہی سے دیتی چلی آ رہی ہوں۔ معاملہ اگر خوب صورت لفظوں ہی تک محدود ہوتا تو شہر یار پہلی نظر مجھ ہی پر پڑتی، لیکن مجھ جیسوں کو شاید خود کو مکمل کرنے کے لیے خوب صورت خیالات اور دانش پر بیساکھی کی ضرورت پڑتی ہے۔ خوب صورت لوگوں کی زبان سے نکلا ہر لفظ خود حسین اور ہر خیال حسین تر ہو جاتا ہے۔ میں کتابی دنیا میں رہنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ نہ ہی میں نے کبھی کسی خصوصی سلوک کی توقع ہی کی ہے۔ ہاں، میرے اندر میرے اپنے تخیل کی دنیا ضرور آباد ہے۔ جانے اس بار میرا دل کیسے بھٹک گیا اور شہر یار کے دل کا دروازہ کھٹکھٹا بیٹھا۔ لیکن کیا کریں، دل پر زور بھی تو نہیں..... اور اس دل کو بھٹکانے میں بھی شہر یار میرے ادیبوں اور شاعروں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی ہمارے دل کی بھی راکھ کو اپنے جادو بھرے لفظوں سے کہہ کر اس میں دبی چنگاریاں بھڑکاتے ہیں اور پھر ہمارا دل باغی ہو کر ہم سے بس ایک ہی سوال کرتا ہے کہ بد صورت لوگوں کو محبت کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ کیا کم روپ والوں کا دل کچھ کم دھڑکتا ہے یا سادہ چہرے والوں کے اندر کے جذبے بھی بے رنگ اور سادہ ہوتے ہیں۔ قدرت نے یہ کیسا نظام بنا رکھا ہے کہ روپ بانٹنے وقت تو ترازو اوپر نیچے ہو جاتا ہے لیکن جذبے، کسک اور خلش بانٹنے وقت پیمانہ یکساں رکھا جاتا ہے۔ کیوں ہمارے اندر چاہنے اور چاہے جانے کی اس لا زوال خواہش کا پیمانہ ہمارے رنگ و روپ کے مطابق کم یا زیادہ نہیں رکھا گیا۔ اگر چاند اور ستارے تو زکرائے کے دعوے صرف روپ والوں کے لیے مخصوص ہیں اور پھر ہم جیسوں کے لیے ایک اور فلک کیوں نہیں تخلیق کیا گیا، جہاں جگمگاتے تارے اور چاند نہ کبھی چنداں نہ جلیں انکارے کچھ مدہم جگنو ہی ٹانگ دیے ہوتے، کیوں ہمارے فلک کے مقدر میں بھی ہمارے نصیب کی طرح صرف سیاہی لکھ دی گئی.....؟“

دھانی بولتے بولتے ہانپنے لگ گئی۔ شاید عمر بھر کا لاوا تھا، جو آج میرے سامنے بہہ نکلا۔ ایک آنسو دھانی کی آنکھ سے ٹپکا اور اُس کی قدم بوی کر گیا۔ پیچھے سے آہٹ بلند ہوئی شانی کسی ستون کی آڑ میں جانے کہ سے کھڑی ہماری ساری باتیں سن رہی تھی۔ دھانی کا رنگ اُسے دیکھ کر مزید پیلا پڑ گیا۔ شانی اپنی بہن کی جانب لپکی اور پھر اگلے ہی لمحے دونوں بہنیں ایک دوسرے کو گلے لگا کر ہلکے ہلکے کر رہی تھیں۔ میری پلکیں بھی نم ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے آج پوری خدائی رو رہی ہے۔



اور سب ہمارے کسی کی اوزمنی کا آچکل تھے۔ اگر ملزمان کی فہرست بنائی جاتی تو سب سے بڑا مجرم تو میں خود تھا۔

شہر یار بہت دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر معائنے سے فارغ ہوئے تو سلطان بابا نے فوراً اُن کے سامنے دوبارہ اپنی ”رہائی“ کی درخواست پیش کر دی۔ ڈاکٹروں میں سے ایک ہنس کر بولا۔ ”کیوں بابا! کیا آپ کا یہاں ہمارے ساتھ دل نہیں لگتا؟“ سلطان بابا مسکرائے۔ ”جس نے یہاں دل لگایا، سمجھو وہ یہیں کا ہو گیا یہاں..... آپ مجھے یہاں سے جانے دیں تو یہ وعدہ رہا کہ ہر ہفتے ہم خود یہاں حاضری دینے آ جایا کریں“۔

”ح“ بھی ڈاکٹر ہنسنے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ شہر یار، سلطان بابا کے پاس جا بیٹھا۔ میری نظر سامنے دیوار پر لگے کینڈر پر پڑی۔ ہمیں کال گڑھ سے نکلے آج ٹھیک چند ہواں دن تھا۔ اچانک نہ جانے کیوں پل بھری میں مجھے ایسا لگا کہ کینڈر میں بھرے رنگ غائب ہو گئے ہوں۔ تصویر رنگین سے صرف کالی اور سفید ہو کر رہ گئی۔ پھر میں نے ذرا غور کیا۔ نہیں کالائیں یہ تو نیلا اور شاید کچھ پیلا رنگ بھی تصویر میں باقی تھا۔ مطلب یہ کہ صرف سرخ اور بزرگ تصویر سے اڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر زور سے پلکیں جھپکیں جیسے کوئی پرانے مکرئی دی کے چلتے چلتے رنگ اڑ جانے پر اُسے زور سے آس پاس سے تھپک کر، ہلا کر جھٹکے سے اُس کے رنگ واپس لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک لمحائی اثر تھا اور دوسرے ہی لمحے میری بصارت کے رنگ واپس لوٹ چکے تھے۔ لیکن ایک لمبک اُسی لمحے مجھے اپنی نسلوں میں تیز مرچوں جیسی جلن اور چھین دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ بے چینی اور ملن کا احساس اس قدر شدید اور اچانک تھا کہ میری آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ میں نے جلدی سے قریب سے پانی کے جگ سے تین چار گلاس پانی بنا کسی وقفے کے حلق سے نیچے اُٹھ لیلے۔ شہر یار دوسرے کمرے میں سلطان بابا سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں میری اس بگڑتی حالت سے ناواقف تھے۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو۔ لیکن نے کیوں مجھے ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے لبوں کے کنارے پر ہلکا سا کف جمع ہو کر قلیل ہو گیا ہو۔ پتا نہیں یہ سب کیا تھا۔ لیکن چند لمحوں ہی میں اس احساس نے میری رُوح پھوڑ کر رکھ دی تھی۔ شکر ہے کہ جس وقت سلطان بابا نے مجھے آواز دی، تب تک میرا ہانپنا ختم ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ خواہ خواہ پریشان ہو سکتے۔ پھر بھی جب میں درمیانی راستے کا پردہ اٹھا کر اُن کے بستر والے حصے تک پہنچا، تب تک وہ میرے سر پر کچھ پڑھ چکے تھے۔ ”کیا ہوا میاں! یہ ہلدی کہاں سے مل لائے ہو چہرے پر۔ رنگ کیوں زرد پڑ رہا ہے؟“ میں نے بات ٹالی۔ ”کچھ نہیں۔ شاید نیند نہ آنے کی وجہ سے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ اب ٹھیک ہوں“۔

”وہ کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتے رہے۔“ کبھی دو گھڑی آرام بھی کر لیا کرو۔ جنوں حد سے گزر نہ تو دھشت بن جاتا ہے۔“ میں چپ رہا۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور آ گیا۔ میں نے شہر یار سے کہا کہ کمرہ چلا جائے۔ شیخ صاحب جانے کیا سوچتے ہوں گے۔ لیکن اُس نے ضد پکڑ لی کہ میں بھی کچھ دیر کے لیے اُن کے ساتھ ہی چلوں۔ میں نے پردہ اٹھا کر دیکھا سلطان بابا کی آنکھ لگی چکی تھی۔ ہم خاموشی سے دبے پاؤں کمرے سے نکل آئے۔

دائیں جانب نکلی مانگ کو سر کے بائیں جانب دکھاتا ہے۔ اور پھر کبھی کبھی دائیں بائیں کا یہ معمولی سا سفر ہمارے سر کی مانگ کی طرح ہمارے اندر لگے اور باہر کرے کے آئینے کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک اور ڈال دیتی ہے۔ مجھے اُس دن نہ جانے اپنے بچپن میں سنی اس معمولی شکل و صورت والی شہزادی کی کہانی پر یاد آ رہی تھی جس نے اپنی سلطنت کے کبھی آئینے توڑ ڈالنے کا حکم دے دیا تھا۔ کاش ہماری دنیا کے کبھی میرا آئینے بھی ٹوٹ جاتے اور ہم میں سے ہر ایک کے من کا آئینہ باہر کرے میں لگ جاتا تو یہ دنیا کتنی خوبصورت ہو جاتی۔ کون جانے ہمارے بچ کتنے ایسے دل جلے بھی ہوں جو آئینے توڑنے کی بجائے آنکھیں پھوڑنے آس دل میں رکھتے ہوں گے۔ اگر انسانی خوبصورتی کو مانپنے کا پیمانہ صرف یہ بے وفا نگاہیں ہی ہیں تو کاش بے بصارت ہی ہوتے۔ میرا ذہن نہ جانے کن بھول بھلیوں میں انکا ہوا تھا۔ اندر ڈاکٹر سلطان بابا کے چندا معائنے کر رہے تھے۔ اچانک میں شہر یار کو سوجی ہوئی آنکھیں لیے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیرت زدہ سا رہا کیوں کہ میرے لیے اس کی یہاں اسپتال میں آمد بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میں جلد سے اُس کی جانب بڑھا۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے، سب ٹھیک تو ہے نا.....؟“ ”ہاں بس ایک دوست کی طرا زک گیا تھا رات کو۔ اب بھی وہیں سے آرہا ہوں۔ پتا نہیں کیوں گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ سوچا کچھ تمہارے پاس ہی بیٹھ جاؤں۔ سلطان بابا اب کیسے ہیں؟“ ”وہ بہتر ہیں۔ لیکن تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ دونوں تمہارے اس رویے کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ کس کو سزا دے رہے ہو۔ خود کو یا ان دونوں کو.....؟“ شہر یار نے ایک لمبی سانس لے کر اپنا سر کسی کی ٹیک سے نکا دیا۔ ”بہت اُلجھ گیا ہوں میں..... سمجھ نہیں آرہا۔“ ”کیا سمجھ میں نہیں آرہا۔ دل دروازے پر دستک دینے والی کو تم پہلے ہی واپس لوٹا چکے ہو۔ جودل کے اندر براجمان ہے، اُس کی توقد ر کرو۔“ شہر یار نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میرا جی چاہا کہ میں وہ کے ساتھ ہوئی ساری بات اُسے بتا دوں لیکن کسی کا بھرم نہ کھنا مقصود تھا۔ لہذا اختصار کے ساتھ ان دونوں کی پریشانی بیان کر دی۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ شہر یار کی اُلجھن کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ جائے اور پھر میں اس سے کس رویے کی امید کر رہا تھا۔ خود میں بھی تو کسی مدد رُخ کی ایک اچھنی نظر کا شکار ہو کر سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ کہیں میں بھی صرف زہرا کے روپ ہی کا تو گھائل نہیں تھا؟ اگر زہرا بھی عام ظر صورت کی کوئی سیدھی سادی سی لڑکی ہوتی تو کیا تب بھی میں اسی طرح اپنا چین و قرار لٹا بیٹھتا، خود میں کسی کی گہری، کالی جھیل جیسی آنکھوں، گلابی عارض اور گالوں میں پڑنے والے لڑھو کے قریب جا کر کانا خود میری منزل بھی تو کسی کے پنکھڑی لبوں کے قریب کا تل تھا اور خود میرا دستہ بھی تو کسی کی صراحی دار گرا کے خم سے ہو کر ہی گزرتا تھا۔ خود میرے خوابوں کی نیند بھی تو کسی کی آنکھوں پر گرتی زلف نے اُڑا رکھی تھی۔ میں بھی تو کسی کی گھیری پکوں کے تپتے سائے تلے ہر دم جل رہا تھا۔ پھر مجھے شہر یار سے کسی بھی گلے شکوہ کا حق تھا۔ شاید ہر گھائل، روپ کا گھائل ہوتا ہے۔ ہر جنوں کسی حسن کا اسیر ہے۔ ہر چاند کسی کی گلابی کا

گھر میں داخل ہوتے ہی حسب توقع شیخ صاحب نے شہریار پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ وہ ٹھیک ہے۔ کہیں اُن کی خدمت میں کوئی کی تو نہیں آگئی جو شہریار یوں اُکستا کر دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ شہریار بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ اُسے تو بس اپنی کہانی کے ایک اہم موڑ کے لیے ماحول کی کچھ تبدیلی چاہی تھی اور بس..... چائے کے دوران شانی اور دھانی نے بھی ہر ممکن کوشش کی کہ ماحول خوشگوار ہے۔ آج مگر روز جیسی پھوٹا تو نہیں پڑ رہی تھی لیکن آسمان پر آج سفید بادلوں کے بہت سے آوارہ کلوڑے ”کوکلہ چھا“ کھیل رہے تھے۔ آج دن بھی جمعرات کا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب چھوٹی ماں (میری خالہ) بادلوں کی کہانی سنایا کرتی تھی کہ یہ سارے بادل اللہ میاں کی بھیڑیں اور دے رہے ہیں جنہیں اللہ میاں کے وقت نیلے آسمان پر کھینے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں تو میرے ذہن میں اللہ میاں کا بہت ہی خوبصورت تصور ابھرتا تھا۔ شہریار آج بھی چپ سا تھا۔ دھانی نے غالباً شیخ صاحب کا دھیان ہٹانے کے لیے ادھر اُ کی باتوں کا سلسلہ جوڑ رکھا تھا۔ شانی بھی سچ میں ایک آدھ لقمہ دے رہی تھی۔ اچانک ہی دھانی مجھ سے پوچھی۔ ”عبداللہ! آپ بتائیں کہ آپ ایسے موسم کو کیسے انجوائے کرتے ہیں؟“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ ان دو لڑکیوں کو شیخ صاحب کی کتنی فکر تھی۔ کیا کبھی بیٹیاں اپنے باپ کے لیے اسی طرح کھلتی ہوں؟ ”میرے ذہن میں تو ایسے موسم کے لیے بہت خصوصی اہتمام کے کئی طریقے آتے ہیں..... مثلاً ایسا شیشا بہت بڑا کرہ ہو جس کی شفاف دیواروں سے پرے ہم بوندوں کا کھیل دیکھیں۔ برستے آسمان سے بھیکتی زائیک کا ہر نظارہ ایک ہی فریم میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔ شیشے کے ہال میں ایک بہت بڑا سیانوا اور.....“ شانی اچانک بولی اٹھی۔ ”اور اس سیانوا پر زیبا ٹیگم ٹھیں لگتا رہی ہوں کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی سجاد دی.....“ شانی کی مثال اس قدر بے ساختہ اور عمدہ تھی کہ ہم سبھی زور سے ہنس پڑے۔ شیخ صاحب بہت دیر تک اس بات کا لطف لیتے رہے۔ ماحول ہل بھر میں ہی خوشگوار ہو گیا اور شانی اور دھانی کی کوششیں رائیگاں نہیں گئی۔ وہ رشتے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جن کی پروا کرنے کے لیے لوگ موجود ہوتے ہیں شاید رشتوں کا واسطہ ہی دل جوئی اور دل داری سے ہوتا ہے، ورنہ سارا جہاں اجنبی ٹھہرا۔ چائے کے بعد صاحب سے اجازت لے کر واپس اسپتال جانے کے لیے پوریج تک پہنچا ہی تھا کہ شانی تیز تیز قدم اٹھ میرے پیچھے چلی آئی۔ ”عبداللہ.....! میں اور دھانی دونوں ہی اپنے صبح کے برتاؤ پر بے حد شرمندہ ہیں دراصل ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے معاملے میں بہت جذباتی ہیں۔ اور میں اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں ذرا سی نمی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ حالانکہ آپ کو یہ سن کر ہلکی آئے گی کہ جب تک امی ہمارے درمیان ہوں، ہم ایک دوسرے سے دن میں تین چار بار ضرور لڑا کرتی تھیں لیکن ہمیشہ ان جھگڑوں کا خاتمہ بھی ایک کے آنسوؤں پر ہی ہوتا تھا۔“ ”جی میں سمجھ سکتا ہوں۔ آپ دل پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ جانے ان آنسوؤں صفت کو عورتوں کے ساتھ ہی کیوں مخصوص کر دیا گیا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور

پڑنے پر یہ خزانہ بہا دینا چاہیے کیوں کہ روتا ہوا انسان اُس لمحے بہت معصوم ہو جاتا ہے۔“ شانی کے چہرے پر چھایا کدھر صاف ہو گیا۔ ”آپ ہر بات کا ایک نیا زاویہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ویسے آپ کے کھینے کے مطابق تو میں اور دھانی اس دنیا کے سب سے زیادہ معصوم فرد ہوں گے، کیوں کہ ہم دونوں تو بہت روتے ہیں۔ کبھی امی کو بار کر کے، کبھی پرانی باتوں پر، کبھی ڈیڈی کی کسی پریشانی پر اور کچھ نہ ملے تو اپنی چوڑیوں کے ٹوٹ جانے یا چھلوں کے ٹوٹ جانے پر بھی..... کبھی اپنی پسند کے ایک جیسے دو جوڑوں میں سے کسی ایک کے کپڑے کا رنگ اُتر جانے پر تو کبھی دل پسند سینڈل کی ہیل ٹوٹ جانے پر.....! دھانی اور میرے پاس رونے کے بہانے کبھی بھی کم نہیں رہے۔“ میں نے ہنس کر غور سے اُس زندہ دل لڑکی کو دیکھا۔ کہاں! الجھا بیٹی تھی محبت کی رنگین لیکن تیز دھار ڈور میں خود کو۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ محبت کی یہ ڈور ہمارے جذباتوں کی پتنگ کو اُونچا اور زیادہ اُونچالے جانے کی خواہش چکا کر ہمیں اس قدر غافل کر دیتی ہے کہ پھر ہمیں اس بات کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ کب اور کس طرح یہ قاتل ڈور ہمارے شہرِ رگ پر بھر جاتی ہے۔ ہم جب تک سمجھتے ہیں، خون کا تیز فوارہ ہمیں پورے وجود تک بھگو کا ہوتا ہے۔ شانی دراصل مجھ سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ کیا میں نے شہریار تک اُن کی معذرت پہنچا دی تھی اور یہ کدوؤں نے شیخ صاحب کو پوری بات بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ دونوں چاہتی تھیں کہ میں شیخ صاحب سے بات کروں۔ میں کچھ اُلجھ گیا۔ ”میں.....؟ میرا مطلب ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن کیا آپ نہیں سمجھتی کہ یہ بہت ذاتی بات ہے، کہیں شیخ صاحب میری زبانی یہ سن کر.....“ ”میں آپ کی بات سمجھ سکتی ہوں لیکن یقین کریں کہ ڈیڈی آپ کے خیالات کی بے حد قدر کرتے ہیں۔ مجھے اور دھانی کو یقین ہے کہ وہ آپ کی بات کو غلط نہیں لیں گے۔ ہم اپنی غلطی پر تادم ہیں۔ لیکن ڈیڈی سے چھپا کر ہم مزید ایک اور غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ آپ کو یہ کس امتحان میں ڈال دیا ہم نے۔“ شاہانہ کی سنہری جبین پر اپنا عایان کرتے کرتے پسینے کے چند ننھے قطرے اُبھر آئے تھے۔ کیا کبھی لڑکیاں ایک سی ہی ہوتی ہیں؟ میں نے اُسے تسلی دی۔ ”آپ اطمینان رکھیے۔ میں اسے امتحان سے زیادہ سعادت سمجھتا ہوں۔ لیکن کیا آپ لوں کو نہیں لگتا کہ شیخ صاحب سے بات کرنے سے پہلے آپ دونوں کو شہریار سے ایک بار کھل کر بات کر لینی چاہیے؟ دل کی گرہیں، بات مضبوطی سے بھی لگی ہوں تو اُن کا کلام دھاگا آسانی سے کھل جاتا ہے۔ بعض سبقت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ پوری آج مانگتے ہیں۔ کبھی کبھی ذرا سی جلدی اور ہلکی آج ہی سے اُتار دینے پر کچھ جاتے ہیں۔ اور یاد رہے کہ رشتوں کی یہ آج بس ایک بار ہی سلگانی جاسکتی ہے۔ دوسری مرتبہ سب جلا کر رکھ دیتی ہے۔“ شاہانہ چپ چاپ سر جھکائے میری بات سنتی رہی۔ جذباتوں اور رشتوں کی آج کی لڑکی اس لمحے میں اس کے چچمی سے کندن ہوتے لگا ہی چہرے پر بھی محسوس کر سکتا تھا۔

میں اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کا چہرہ کسی تازہ پھول کی طرح کھل رہا تھا۔ پتا چلا کہ ڈاکٹروں نے اُن سے دیکھا ہے کہ اگر اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں کوئی پیچیدگی نظر نہ آئی تو انہیں جانے کی اجازت دے دی جائے

نظار میں شہر یار کے دل کے باہر کھڑی رہی ہے۔ شیخ صاحب اُنھ کر ٹپکنے لگے۔ ”شہر یار کی اُلجھن اپنی جگہ بجا ہی..... لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری دونوں بیٹیاں ایک دوسرے کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گی۔ شہر یار اچھا لڑکا ہے اور میں اُس کی صاف گوئی سے بھی مزید متاثر ہوا ہوں۔ اُس سے بس اتنا کہنا ہے کہ اُس گھر کے دروازے اُس کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔“ گویا شیخ صاحب نے فیصلے کا اختیار شہر یار کو دے دیا تھا۔ میں اُن سے اجازت لے کر واپس انیکسی پہنچا تو شہر یار برآمدے ہی میں شیشے کی دیوار کے پیچ بڑی آرام کرسی پر بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر سنبھل گیا۔ ”آگے وکیل احب! اب کیا فیصلہ لے کر آئے ہو.....؟“ ”تمہاری عدالت نے فیصلے کا اختیار بھی تم ہی پر چھوڑ دیا ہے۔“ ”شانی یا دھانی نام کی جو بھی بیڑی تمہیں پسند ہے، تمہیں اُسی کے ساتھ عمر قید سادی جائے گی۔“ شہر یار نے ہنوں پر عجیب سی مسکراہٹ اُبھرائی۔ ”منصف کسی کو عمر قید کی سزا سنانے سے پہلے کبھی ان ہتھکڑیوں یا ریوں سے کیوں نہیں پوچھتا کہ کیا انہیں اس ملزم کا زیور بننا قبول بھی ہے یا نہیں؟“ میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”شام کو پہلے دھانی آئی تھی خود انیکسی میں، مجھے صرف یہ بتانے کی شانی کی خوشی اس کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے اور یہ درخواست کرنے کے لیے کہ میں اس ابتدائی ایک ہفتے اہر بات بھلا کر اگر شانی کو خود اُس کی شخصیت کے تناظر میں دیکھوں تو شانی سے بہتر جیون ساتھی مجھے پوری باتیں چرائے لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ وہ اپنی بہن کی خوشی مانگنے آئی تھی۔“ ”تو تم نے کیا جواب دیا؟“ ”مجھے جواب دینے کی مہلت ہی کہاں ملی۔ ابھی دھانی کو انیکسی سے نکلے دو لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ ٹی کافون آگیا اور کیسا قسم ہے کہ دوسری بہن نے بھی مجھ سے وہی مانگا جو اُس کے لیے پہلی بہن مانگ کر گئی۔“ ”کیا مطلب.....! کیا شانی نے بھی.....؟“ ”ہاں اُس نے بھی صرف یہی کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ مائے لے اپنی بہن کے آنسوؤں سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں۔ اور اب چونکہ وہ اپنی بہن کے دل میں چھپے مان کو جان چکی ہے لہذا اُس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی بہن کے پسپوں کی راہ پر اپنا عمل قائم کر لے۔ اُس نے اپنے آپ کو میرے لئے سدا نامحرم رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ بھی مجھ سے اپنی آخری خواہش کے پورے دھانی کو اپنانے کا کہہ گئی ہے۔“

اچانک فون کی ٹھنٹی بجنے لگی۔ شہر یار اسی طرح شیشے کے پار دیکھتا رہا۔ ”یہ تمہارے لیے ہو گا۔ دھانی نے سے کہا تھا کہ وہ تم سے رات کو بات کرے گی۔“ میں نے اپنے کمرے میں جا کر فون اٹھایا، دوسری جانب ٹی کی تھی۔ ”یہ آپ نے کیا کیا..... کیا آپ یہ نہیں جانتی تھیں کہ آپ کی بہن کا خیر بھی اُسی مٹی سے اٹھا ہے اسے آپ کا جنم ہوا تھا۔ پھر بھی یہ جانتے ہوئے کہ شانی کبھی شہر یار کو آپ کی شرط کے مطابق قبول نہیں کرے گی، آپ نے کیوں یہ جوگ لے لیا؟“ دھانی کی آواز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی۔ ”بعض جوگ ازل سے ہماری قسمت میں لکھے ہوتے ہیں۔ میں شہر یار کو پا بھی لیتی تو یہ اُن کے لیے

گئی۔ مجھے اس لمحے وہ بالکل ایک چھوٹے بچے کی طرح معصوم دکھائی دیئے۔ انہوں نے رات کا کھانا بھی رغبت سے کھایا۔ انسان کا من اندر سے شانت ہو تو پھر کبھی ہارمون شاید مکمل کام کرنے لگتے ہیں۔ انسان اپنے اندر بھی بیک وقت نہ جانے کتنے جادو منتر چلتے رہتے ہیں۔ رات گئے میں گھر واپس پہنچا تو ایک عجم خاموشی نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں نے انیکسی میں جا کر شہر یار کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شہر یار اُن سے بولا۔ ”کم ان!“ دروازہ کھولتے ہی میری پہلی نظر شہر یار کے سوٹ کیس پر پڑی جس میں وہ اپنا سامان رکھا تھا۔ ”تو تم نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے.....؟“ ”ہاں.....! اور کوئی فیصلہ حتیٰ نہیں ہو پا رہا تھا۔“ ”تمہارے اس فیصلے کا شیخ صاحب کو پتا ہے؟“ ”انہیں فی الحال صرف اتنا ہی پتا ہے کہ میں اپنی کہانی پوری ہو جاؤں۔ واپس گھر جا رہا ہوں۔ لیکن کون جانے کہ یہ کہانی اب کبھی پوری ہوگی یا نہیں.....؟“ میں نے چونک کر کی جانب دیکھا۔ ”کیا تمہاری ان دونوں سے کوئی بات ہوئی؟“ ”ہاں.....! دونوں ہی سے فردا فردا ہوئی، آج شام کو۔“ اتنے میں نوکر نے دستک دے کر بتایا کہ شیخ صاحب لاؤنج میں کافی پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ شہر یار کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ شانی نے اُسے بھی یہ بتا دیا ہے کہ وہ مجھے شیخ صاحب بات کرنے پر آمادہ کر چکی ہیں۔ میں نے جانے سے پہلے آخری مرتبہ شہر یار سے پوچھا۔ ”تم کسی نتیجے پہلے ہو تو مجھے بھی بتا دو کہ شاید میں تمہارا مقدمہ ٹھیک طرح سے شیخ صاحب کے سامنے پیش کر پاؤں۔“ ”تم کے لبوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ اُبھری۔“ ”نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو..... مجھے یقین ہے کہ تم ایک بہترین کی طرح میرا مقدمہ لڑو گے۔ فی الحال میں دل اور دماغ کی اس جنگ میں پس رہا ہوں۔ تم جاؤ، اگلے انتظار کر رہے ہوں گے۔“ میں نوکر کے ساتھ لاؤنج پہنچا تو کافی کنگ سجائے جا چکے تھے۔ ماحول پر طاری تھی۔ دھانی نے کافی کپس میں انڈیل کر ہمارے حوالے کی اور خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ شیخ صاحب بھی شاید خود کو ذہنی طور پر کسی اہم بات کے لیے تیار کر چکے تھے۔ میں نے آسان لفظوں میں انہیں شہر یار یہاں آنے سے لے کر دھانی کے فون اور پھر شانی کی پسند تک کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ چپ چاپ بات سننے رہے اور جب میں بات ختم کر چکا تب بھی بہت دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ اُس کی سرسراہٹیں بتا رہی تھیں کہ دونوں ہمیں پاس ہی کسی ملحقہ کمرے میں موجود ہیں۔ شیخ صاحب اپنا ہاتھ چکے تھے۔ اور ان کے ماتھے پر غنتی شکنیں بھی دھوئیں کے اُن مرغولوں جیسی تھیں جو اس وقت اُن کے ہاتھ نکل رہے تھے۔ بہت دیر بعد اُن کے لب کھلے۔ ”تو کیا شہر یار اسی لیے یہاں سے جا رہا ہے؟“ ”یہ بھی وجہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ چند دن کا یہ وقفہ ان تینوں کو کسی ٹھیک فیصلے پر پہنچنے میں مدد دے گا۔“ ”شیخ صاحب نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا۔ میں جانتا تھا وہ اس وقت کسی شدید کش مکش کا شکار تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی میں جیت اُن کی دو بیٹیوں میں کسی کی ہوتی، خود اُن کی اپنی ہار جیتی تھی۔ کیوں کہ یہ راز اب اُن پر بھی عیاں چکا تھا کہ شانی سے پہلے دھانی، شہر یار کی کنڈی ہلا چکی تھی اور انجانے ہی میں سہمی پر وہ بھی اس در کے کھلے

نہ جوش دکھا توں بھل دیسیں  
تیرے باجوں میں نئی جی سکی  
نہ ظلم کما..... توں بھل دیسیں  
دلدار مٹھا..... توں بھل دیسیں

ادھوری خوشی ہوتی، کیوں کہ اُن کی آدھی خوشی شانی کی شخصیت میں پوشیدہ ہے اور کبھی کبھی ادھوری خوشی سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ محبت اگر دو نقطوں کی صورت میں ہو تو کبھی نہ کبھی دائرہ بن کر مکمل ہو ہے۔ لیکن اگر یہی محبت تینوں کی صورت اختیار کر لے تو اس کے تین زاویے کبھی جڑ نہیں پاتے۔ شاید ہم شانی کو مٹا ہی لوں۔ آپ نے ہمارے لیے جتنا کچھ کیا، میں شکریہ ادا کر کے اس کی اہمیت کم نہیں کر رہا۔ آپ کو اگر وقت ملے تو شانی سے بات کیجئے گا، اُسے آپ کی باتیں جلد سمجھ آتی ہیں۔“ فون بکھ دینے پر بھی میں بہت دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ جانے اس محبت کے اور کتنے روپ دیکھنا باقی تھے۔

اگلی صبح میں کمرے سے باہر نکلا تو شہر یار کے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ شہر یار بہت بکھرا ہوا رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ دو انمول انسان اُسے ٹوٹ کر چاہتے تھے لیکن پھر بھی وہ خالی ہاتھ اس گم واپس جا رہا تھا۔ شیخ صاحب جیسا بڑے دل کا اور وضع دار انسان بھی میں نے کم ہی دیکھا تھا۔ اُن کے ایک شمن بھی نہیں تھی کہ جس سے کوئی اُن کی آرزوہ دلی کا اندازہ لگا سکے۔ انہوں نے حسب معمول بیٹنے شہر یار کا سامان اپنی گاڑی میں رکھوایا۔ شانی اور دھانی بھی بظاہر بڑھ چڑھ کر ہر کام میں حصہ لے رہی تھیں۔ اُن دونوں کی آنکھوں میں کبھی تحریر صاف بتا رہی تھی کہ ایک اور محبت کی کہانی بنا کسی انجام کے ختم ہو رہی۔ اس کہانی کے آخر میں بنا سوالیہ نشان ہمیشہ کے لیے اس کہانی کے ساتھ جڑا رہے گا۔ شہر یار گاڑی میں بیٹھے پہلے آخری مرتبہ ہماری جانب مڑا۔ وقار نے اُس سے پوچھا۔ ”شہر یار بھائی.....! آپ پھر کب آئیں گے ہم سب آپ کو بہت مس کر رہیں گے۔“ وہ مسکرایا۔ ”میں جلد آؤں گا۔“ شانی کی آنکھیں بھینکنے لگیں۔ مگر دھانی کو خود کو سینٹے ہوئے دیکھ کر لقمہ دیا۔ ”اُسے جلد آنا ہی پڑے گا، ورنہ پیانو پر بیٹھی گنگنا تی زبانی تم کو کہیں گی کہ کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی سجا دی۔“ سب ہنس پڑے۔ شہر یار نے شانی اور دھانی پر نظر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ جانے اس لمحے مجھے سانول کی زبانی سنا ایک صحرائی گزشتہ سے کیوں یاد آیا جس میں محبوبہ اپنے چھڑے ہوئے محبوب کو دہائی دیتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ محبوب اُسے بھول جائے گا، چاہے وہ لاکھ قرآن پر ہاتھ رکھ کر اُسے یقین دلائے۔ پر وہ جانتی ہے کہ باوقتی جواز ہے اور محبوبہ کی قسمت میں تو ازل سے جدائی کی موت ہے کیوں کہ اُس کا محبوب اُسے بھول جا۔

تے کوں یاد ہوئی میں آکھیا سی  
دل دار مٹھا توں بھل دیسیں  
وَل وَل قرآن تے ہتھ نہ رکھ  
نہ قسماں چا..... توں بھل دیسیں  
کچھ سوچ سمجھ تے فیصلہ کر



والی اُداسی۔ جب ہمیں اچھی طرح پتا ہوتا ہے کہ ہمیں ایک دن ہر رشتے، ہر جگہ، اس جہاں ہی سے رخصت ہو جانا ہے تو ہم اپنے دل کے دھاگوں کی گرہیں یہاں وہاں کیوں باندھتے پھرتے ہیں۔ سلطان بابا نے تینوں بچوں کو فردا سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ سبھی کی آنکھیں نم تھیں۔ دھانی اُن سے نظر نہیں ملا پائی۔ وہ کچھ دیر اس کے پاس ٹھہر کر بولے۔ ”جن کے من کے آئینے اتنے اُبلے ہوں، اُن کے مقدر کبھی دھندلے نہیں ہوتے۔ ہم جو کھودیتے ہیں، قدرت اُس سے بہتر ہمارے لیے پہلے سے چن رکھتی ہے۔ بس اتنا یقین رکھنا۔“ دھانی رو پڑی۔ پھر شانی اور پھر شیخ صاحب بھی اپنی چمکیں پونچھتے نظر آئے۔ مجھے اسی لیے یہ الوداع سدا سے کاٹ جاتے ہیں۔ شیخ صاحب بضد تھے کہ ہم اُن کی گاڑی مع ڈرائیور اپنے سفر کے پہلے حصے کے لیے استعمال کریں لیکن سلطان بابا نے بس کے سفر کو ترجیح دی۔

بس نے ہمیں تقریباً چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد ایک دریا سے منسلک قصبہ تک پہنچا دیا، جہاں سے اگلے روز صبح ہوتے ہی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ہمیں پہلے سمندر کی ایک بڑی شاخ اور پھر کھلے سمندر میں پہنچا دیا۔ میرا شہر اسی سمندر کے مغربی ساحل پر واقع تھا۔ میں اسٹیشن کے عرشے سے ٹکرانے والی لہروں کو دیکھ کر سوچتا رہا کہ جانے ان میں وہ کون سی لہر ہوگی جو اس ساحل کو چھو کر آئی ہوگی جس سے ذرا پرے میرے دل کے ساحلوں کی حق دار رہتی ہے۔ پھر اچانک میرے من میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ان میں کوئی ایسی لہر بھی جو اس لہر کے نازک پاؤں چھو کر آئی ہو۔ زہرا کو بھی تو ساحل کی گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلنا بہت پسند تھا۔ ضرور یہاں گہاگ اُڑاتی، مسکراتی اور شریری ہنسی ہنستی ہوئی بے باک لہر اس میں لالہ رخ کی قدم بوسی کر کے ہی مجھ تک پہنچی ہوں گی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دل کے دریا، سمندر سے بھی گہرے ہوتے ہیں۔ ”دل دریا، سمندروں کو گئے۔“ لیکن زہرا کی یاد نے پل بھر میں میری آنکھوں میں نمکین پانی بھر دیا تھا۔ وہ مجھے اس بات کا احساس دلایا تھا کہ میرے دل کا دریا کب سے سمندر میں تبدیل ہو چکا ہے ورنہ اتنا نمکین پانی میری آنکھوں کو ہر لمحہ جلائے کے لیے کہاں سے آتا۔ میری چٹلیوں کا یہ وضو شاید ازل سے جاری و ساری تھا۔ تقریباً ڈیڑھ دن کے سفر کے بعد اسٹیشن پر ہمیں ایک کٹے پھٹے ساحل پر اُتار دیا جہاں کھڑی مخصوص اُونٹ گاڑیوں پر ہمارے سفر کا آخری حصہ طے ہونا تھا۔ شام ڈھلے جب ڈوبتے سورج کی کرنوں کا سونا پورے سمندر کو ایک سنہری قالین میں تبدیل کر رہا تھا۔ میں اور سلطان بابا اپنی منزل پر پہنچ ہی گئے۔ ایک چھوٹی سی مسجد جو سمندر کی لہروں سے ٹکراتی پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی تھی۔ پیش امام کا نام مرتضیٰ تھا، جو ہمارے استقبال کے لیے مسجد کے دروازے کے باہر بیٹھ کر بیٹھے تھے۔ اُن کا گھر پہاڑی کے عقب میں واقع چھوٹی سی بستی میں تھا اور اُن کا چھوٹا بیٹا جس کی عمر تقریباً نو برس ہوگی، ہمیں پہاڑی ٹیلے کی جانب بڑھتا دیکھ کر پہلے ہی دوڑتا ہوا اپنے بابا کے پاس جا کر ہمارے آنے کی سنائی کر چکا تھا۔ جب مرتضیٰ صاحب ہم سے مل رہے تھے تو وہ اُن کے عقب میں کھڑا اپنی حیران آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ سلطان بابا نے اُسے پکارا تو وہ جلدی سے اپنے بابا کی اوٹ میں چھپ گیا۔

## شالیمار

کبھی کبھی پیار کھودینے کے بعد ہمارے لیے کسی انمول ہیرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کھوئی ہوئی ہیرا ”کوہ نور“ بن جاتی ہے۔ کھویا ہوا پیار ”شالی مار“ بن جاتا ہے۔ دھانی اور شاہانہ کی چاہت بھی شالی مار بن گئی تھی۔ شہر یار کے جانے کے بعد اگلے روز سلطان بابا بھی اسپتال سے فارغ ہو کر شیخ صاحب کے ہاں آئے۔ اُن کا ارادہ جلد کوچ کرنے کا تھا لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت اور شیخ صاحب کے اصرار پر نہ نہ ہوئے بھی ایک ہفتہ مزید بیت ہی گیا۔ اُب بظاہر اُن کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی لیکن میرے اندر کی چینی اب رفتہ رفتہ کسی لاوے کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ اور اب تو رنگوں کا میری بصارت سے کچھ ٹھنڈے لیے لڑھٹھنا، ہر چوبیس گھنٹے میں ایک معمول کی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ لیکن سبھی رنگ نہیں روٹھتے تھے، بلکہ تھے جو کسی پرانی تصویر کی طرح درمیان سے غائب ہو جاتے تھے۔ اور یہ چند لمحے مجھ پر کس عذاب کی صورت بنیتے تھے، یہ بس میرا دل ہی جانتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے لگتا تھا جیسے میری نسوں میں خون نہیں، گرم گرم سیال مادہ دوڑ رہا ہو۔ میری سانسیں کسی گرم بھٹی کی دھوئیں بن جاتی تھیں اور میں یوں ہاپنے لگتا تھا جیسے میرے دُور سے دوڑتے ہوئے آیا ہوں۔ لیکن میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ میری یہ حالت کسی پر ظاہر نہ ہو۔ کمرے میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے سلطان بابا کو مزید دیر ہو۔ وہ پہلے ہی مشرقی ساحل پر بنی کسی مسجد کی تک پہنچنے کے لیے کئی مرتبہ بے چینی کا اظہار کر چکے تھے۔ اب اگر ایسے میں، میں اپنی بگڑتی طبیعت کا رونا کر بیٹھ جاتا تو وہ ضرور علاج کے محضے میں پڑ جاتے اور ہمیں نہ جانے مزید کتنے دن یہاں رکنا پڑتا اور پھر کیا تھا، میرے اندر تو جانے ایسے کتنے لاوے میری رُوح کو جھلسانے کے لیے ہر دم جتے رہتے تھے۔ اور خود ہی تھک کر سرد بھی ہو جاتے تھے۔ سوچا یہ تپش بھی دل کے سرد خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر خود ہی بلی جاتے گی۔

جس دن ہمیں شیخ صاحب کی کوشی سے رخصت ہونا تھا، اُس روز بہت سے کالے بادل ہمیں اپنے کہنے کے لیے آسمان پر جمع ہو چکے تھے۔ میں نے سلطان بابا سے سن رکھا تھا کہ ہم جس مشرقی ساحل کی جانب جا رہے تھے، وہاں بارشیں بہت برسی ہیں۔ شاید یہ گھنیرے بادل بھی اُسی دیس سے آئے ہوں۔ مہمان راستوں سے نا آشنا ہوں تو میزبانوں کو انہیں لینے اُن کی بستی جانا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں رخصت کرنے کے دھانی، شانی، وقار اور شیخ صاحب گیٹ تک آئے۔ پھر وہی الوداع، پھر وہی رنگوں کے سرے تک پھیلنے والے

ہاں کا ایک تارا ہوتا، بہت چمک دار نہ سہی مثیالا اور دم ہی سہی، ایک آوارہ تارا..... نصف رات بج چکی تھی۔ میں نے پہاڑی ٹیلے سے اٹھنے کا ارادہ کیا اور ٹھیک اُسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے کسی بڑی گاڑی کے انجن کی آواز سنی ہے۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ ہاں اتنی جس ٹیلے کی چوٹی پر میں بیٹھا ہوا تھا، اُس سے کچھ فاصلے پر درمیان کی ایک تنگ گھاٹی سے متصل ایک اور بلبل کی چوٹی بھی تھی اور کسی گاڑی کی بیک لائٹس روشن ہو کر دھیرے دھیرے اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔ مطلب یہ کہ گاڑی پہلے ہی سے وہاں پارک تھی اور اب واپس جا رہی تھی۔ اس دیرانے میں اتنی رات گئے یہ لون تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ ”ہوگا کوئی میری طرح رات، تنہائی، سمندر اور تاروں سے بات کرنے والا.....“

خبر کے بعد اگلی صبح میری آنکھ لگی تھی تو پھر اٹھتے اٹھتے بہت دیر ہو گئی۔ سلطان بابا نے بھی جانے کیوں سورج نکلنے سے پہلے حسب معمول مجھے نہیں جگایا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو اپنے ارد گرد سلطان بابا، مرتضیٰ صاحب، نرگس اور ایک انجان شخص کو پریشان سا بیٹھا دیکھ کر میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ میرے سر میں درد کی ایک شدید پس آٹھی۔ سلطان بابا نے جلدی سے مجھ سے پوچھا۔ ”اب کیسی طبیعت ہے میاں.....؟“ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ”مجھے کیا ہوا۔ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس ذرا سر میں درد ہے۔ شاید رات کو نیند نہ آنے کی وجہ سے۔“ ان سب لوگوں نے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ انجان شخص نے میری نبض تھام لی۔ ”ایسے دورے کب سے پڑ رہے ہیں آپ کو.....؟“ میں نے چونک کر سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے گہری سی سانس لی۔ ”خبر کی نماز پڑھ کر جب تم کمرے میں لوٹ رہے تھے تو اچانک چکرا کر کمرے کی پڑھت ہی پر گر گئے تھے، تمہاری سانس بے قابو ہونے لگی تھی اور شاید ہونٹوں کے کناروں سے کف بھی بہنے لگا۔“

فائدہ مرتضیٰ صاحب نے فوراً اپنی بستی کے حکیم ریاض السلام صاحب کو بلوا لیا اور تب سے ہم سب تمہارے گھر پر ہی بیٹھے ہیں۔ حکیم صاحب کی تمہارے حلق میں انڈی ملی گئی دوا کا اثر ہوا تو سہی، پر بہت دیر سے۔“ میں نیرت سے منہ کھولے سلطان بابا کی زبانی یہ ساری زرداد سن رہا تھا۔ مجھے بالکل بھی یاد نہیں تھا کہ میں صبح روزانے کی چوٹ پر ہی گر گیا تھا۔ یہاں کمرے میں آنے تک کی تمام جزئیات میرے ذہن کی سلیٹ پر بالکل واضح تھیں لیکن اس کے بعد سب کو راتھا۔ میں نے بادل نخواستہ حکیم صاحب کو گزشتہ چند روز سے اپنے اندر ہونے والی آتش جنگ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ دن میں دو چار مرتبہ چند لحوں کے لیے میری بصرات بے رنگ بھی ہونے لگی تھی۔ حکیم صاحب پریشانی سے میری بات سن رہے اور پھر انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”ایک بات بتائیے..... باقی قریب میں آپ کے ساتھ کسی جانور کے کاٹنے یا بچے کو شت تک بوسہ دیا ہو جانے کا واقعہ تو پیش نہیں آیا؟ خاص طور پر کسی کتے سے کوئی مڈ بھیر تو نہیں ہوئی آپ کی؟“ میں حکیم صاحب کی بات سن کر اچھل ہی تو پڑا۔ میں نے انہیں مناسب الفاظ میں بتایا کہ کچھ عرصہ قبل ایسا واقعہ

اُس کا نام اشرف المرتضیٰ تھا۔ جانے دنیا کے کبھی بچوں کی بڑھیں ایک سی کیوں ہوتی ہیں۔ صاف، شفاف، ملائم، شرمیلی اور بچلی سی..... ہم تمام عمر اپنے بچپن والی رُوح کی شفافیت کو اپنے اندر قائم کیوں نہیں پاتے؟

مرتضیٰ صاحب نے سلطان بابا کو حجرے میں چلنے کی دعوت دی اور میں نے بھی کچی اینٹوں والے گمن: ان کے پیچھے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر وہی بصرات سے رنگ نچوڑ لینے والا دورہ میری نسل: آگ بھڑ گیا۔ ایک چنگاری سی میرے لبوں میں دوڑی اور میں ایک لمحے کے لیے ڈمکا سا گیا۔ مرتضیٰ صاحب جلدی سے میری جانب بڑھے۔ ”کیوں نوجوان! سب ٹھیک تو ہے نا.....“ میں نے بڑی مشکل سے سلکتی سانسوں پر قابو پایا۔ ”جی.....! میں ٹھیک ہوں۔ بس شاید لمبے سفر کی تھکن ہے۔ کچھ دیر آرام کروں! سنبھل جاؤں گا۔“ سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا لیکن چپ رہے۔ کچھ ہی دیر میں مرتضیٰ صاحب نے خود ہی عشاء کی اذان بھی دے دی اور ساحلی بستی سے دس بارہ کمین نماز کے لیے جمع ہوتے ہی کبھی اپنے حلیے سے مجھیرے لگ رہے تھے۔ مرتضیٰ صاحب کے بے حد اصرار کے باوجود سلطان بابا جماعت پڑھوانے کی ذمہ داری مرتضیٰ صاحب ہی کو سونپ دی اور ہم نے اس ساحلی مسجد میں عشاء کی بجائے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد کبھی نمازیوں نے فردا فردا سلطان بابا اور مجھے خوش آمدید کہا۔ رات کا کھانا مرتضیٰ صاحب کے گھر سے ہی آچکا تھا اور اشرف المرتضیٰ جواب دھیرے دھیرے ہم سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ جانب شرمایا سا بیٹھا، اپنے بابا کو دسترخوان پر چاول اور خشک مچھلی کے نمکین تیلے لکڑی کی پلیٹوں میں چائے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مرتضیٰ صاحب نے ہمیں کھانے کے دوران بتایا کہ یہاں کی آب و ہوا میں شدید پسینہ نمک کے مخصوص ذرات کی موجودگی کی وجہ سے لوہے، تانبے یا سولر کا کوئی بھی برتن استعمال نہیں کیا جاتا کیوں کہ وہ ہفتوں ہی میں زنگ آلود ہو کر گل جاتا ہے۔ لہذا یہاں کی تعمیر میں بھی زیادہ تر اسی مخصوص لکڑی استعمال کیا جاتا ہے جس سے بنے برتنوں میں ہم کھانا کھا رہے تھے۔ سمندر کی تیز ہوا حجرے کی بناشت کھڑکیوں اور روشن دانوں سے پار ہوتے ہوئے ایک عجیب سا ساز بجا رہی تھی جیسے کوئی ماؤتھ آؤر گان: ہونٹوں سے لگائے ہوئے ہو۔ کچھ دیر بعد مرتضیٰ صاحب اپنے بیٹے سمیت رخصت ہو گئے۔ سلطان بابا کچھ ستانے کی غرض سے لیٹ گئے اور میں خاموشی سے حجرے سے باہر نکل آیا۔ باہر میرے کبھی دوست تیار نہ ہوئے۔ نیلے آسمان پر اپنی غفلت سچا چکے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکائے۔ میں نے اُن میں سے سب سے روشن اور چمکتے تارے سے زہرا کو پوچھا۔ ”کیسی ہے وہ.....؟“ تارے نے سمندر کی مغربی سمت جھانک کر بولا۔ ”وہ بھی تمہاری طرح اداس ہے اور اپنے گھر کی وسیع چھت پر ایک آرام کرسی ڈالے اور تمہاری باتیں کر رہی ہے۔ تمہارا پتا پوچھ رہی ہے۔“ جانے کیوں اس لمحے مجھے ان ستاروں کی قسمت پر رشک آیا۔ وہ آسمان کے چھت پر لٹکے پوری دنیا میں جب چاہیں، جسے چاہیں دیکھ سکتے تھے۔ کاش میں

میں نے تیر کر لیا کہ کہیں سے بھی نقشہ میسر ہوا تو اپنے آج تک کے سفر کا راستہ جوڑ کر ضرور دیکھوں گا۔ میری حالت شام تک وقفے وقفے سے کئی مرتبہ بگڑتی گئی اور عصر کے بعد تو گرمی اور جس سے میرا دم اس قدر گھٹنے لگا کہ میں گھبرا کر ٹیلے سے نیچے ساحل کی طرف چلا آیا۔ سامنے ہی اشرف نیلی اور زرد دھاریوں والی بڑی سی پتنگ ہوا میں بلند کیے دوڑ رہا تھا۔ پتنگ کو ڈور کی ڈھیل ملی تو وہ ہواؤں میں بلند ہوتی گئی۔ میں بہت دیر تک دوڑ، پتنگ اور آسمان کا یہ کھیل دیکھتا رہا۔ دفعتاً اشرف کے ہاتھ میں تھمی کچی ڈور کو ایک جھک لگا اور پتنگ آسمان میں ڈولنے لگی۔ ڈور ٹوٹ چکی تھی۔ اشرف بہت دیر تک ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی پتنگ کو دوبارہ پکڑنے کے لیے دوڑتا رہا لیکن کئی پتنگیں اپنے مالک کے ہاتھ بھلا کر آتی ہیں۔ انہیں تو آسمان چھونے کی خواہش مزید اور مزید اونچا اڑا لے جاتی ہے۔ اشرف کی پتنگ بھی ساحل کی ہوا کے سنگ بادلوں سے پرے جا چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اشرف منہ بسورتا ہوا میرے قریب سے گزرا تو میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کیا ہوا؟ کٹ گئی پتنگ؟“ ”ہاں آج بجلی بارش نے اتنی اونچی اڑائی تھی پر.....“ اشرف ابھی تک افسردہ تھا۔ ”کوئی بات نہیں۔ دراصل تمہاری پتنگ بادلوں کو پسند آ گئی تھی۔ سوان کا دل بھی چاہا کہ وہ اس سے کھلیں۔ لہذا تمہاری پتنگ وہاں چلی گئی۔“ اشرف کچھ حیران ہوا۔ ”اچھا۔ کیا بادل بھی پتنگ اڑاتے ہیں؟“ میں مسکرایا۔ ”ہاں، بادل ہی تو پتنگوں کے سب سے اچھے دوست ہوتے ہیں۔ تب ہی تو پتنگیں اُن سے باتیں کرنے کے لیے اتنا اونچا اڑتی ہیں۔“ اشرف کے چہرے پر چھایا تکدر دُور ہونے لگا۔ ”اچھا، پھر تو کوئی بات نہیں۔ بادل تو مجھے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرے بھی دوست ہیں۔“ میرا جی چاہا کہ میں اُس سے کہوں کہ اپنے اندر یہ بادلوں اور پتنگوں کی دوستی سدا زندہ رکھنا۔ اشرف اپنی دُھن میں بولے چلا جا رہا تھا۔ ”میں بڑی گاڑی والے صاحب سے کہوں گا وہ مجھے ایک نئی پتنگ لادیں گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔“ ”یہ بڑی گاڑی والے صاحب کون ہیں؟“ اشرف نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ایک بہت بڑی سی گاڑی والے صاحب تقریباً ہر تیسرے چوتھے دن ساحل پر شام کو کچھ دیر کے لیے آتے ہیں، کبھی کبھی اُن کے ساتھ شہر کی کوئی میم صاحب بھی ہوتی ہیں۔ دونوں کچھ دیر کے لیے دوسری جانب والے ٹیلے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ چائے، کافی پیتے ہیں اور کبھی کھانا اپنے ساتھ پتنگ اور ڈور بھی لاتے ہیں۔ یہ پتنگ بھی اُسی صاحب نے اشرف کو دی تھی۔ اچانک مرسے ذہن میں گزشتہ رات والی گاڑی کی بیک لائٹس چمکیں۔ ہو سکتا ہے یہ وہی صاحب ہوں جن کی تعریف میں اشرف اس وقت زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ کچھ دیر میں سورج ڈھلنے لگا تو مرتضیٰ صاحب مسجد والے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اشرف کو آدائیں دینے لگے۔ اشرف ابھی مجھے اپنے جگری دست جانو کی کہانی مزید سنانا چاہتا تھا کہ کس طرح وہ دونوں ہیڈ ماسٹر صاحب سے نظر بجا کر کبھی کبھی آدمی چھٹی کے وقت بھی ساحل پر بچاؤں اور گھونٹے جمع کرنے آ جاتے تھے۔ لیکن اپنے بابا کی مستقل پکار سن کر اُسے بادل خواستہ اُٹھ کر جانا ہی پڑا۔ میں بھی مغرب کی اذان سن کر اُوپر مسجد میں چلا آیا۔

ضرور پیش آیا تھا کہ میں کتوں کے جڑے کی کاٹ سے تو کسی طور بچتا ہی رہا لیکن اُن کے نیچے میری جلد میں بارہا پوسٹ ہوئے تھے۔ شاید دانت بھی اس دھینگا مشتی میں میرا سچھو گئے ہوں۔ پر میں نے انہیں یہ بھی کہ اسی روز چند گھنٹوں کے اندر اندر مجھے مطلوبہ دوا دیکھیں کی صورت میں انجیکٹ بھی کر دی تھی مگر کیوں میں فوجی چوکی کے مستند اکثر تک خوش قسمتی سے پہنچ گیا تھا۔ حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ پر جن کتوں نے حملہ کیا تھا، انہیں اگلے 72 گھنٹے یا پھر چند دن زیر معائنہ رکھا تھا۔ اُن میں سے کسی کی موت تو واقع نہیں ہوئی تھی؟“ میں ایک بار پھر الجھ گیا۔ اب میں انہیں اپنی اس عجیب غریب جنگ کے بارے میں کیا بتاتا جس میں میری اور مجھ پر حملہ آور فوج کے کبھی رکن کتے ہی تھے اور بدھ سے کبھی کتوں نے اُسی میدان میں جان دے دی تھی۔ میں نے اپنا گلہ صاف کیا اور دھیرے سے بولا ”دراصل وہ تین چار کتے تھے اور مجھ پر حملے کے دوران ہی انہیں مار دیا گیا تھا۔ لہذا معائنے کی نوبت ہی نہ آئی۔“ حکیم صاحب نے تشویش بھرا لہجہ سنا کر پوچھا۔ ”اوه..... میں سمجھا۔“ سلطان بابا نے حکیم صاحب سے پوچھا۔ ”کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے نا جناب.....؟“ حکیم صاحب کچھ ہچکچائے۔ ”کھل بات تفصیلی معائنے ہی سے پتا چل سکے گی.....“ مختصر اُتار دیتا سکتا ہوں کہ بروقت دوا مل جانے کے باوجود ہاں بلکہ خدا خواستہ کچھ زہریلے مادے ان کے خون میں گردش پا چکے ہیں۔ میں اپنی سی کوشش تو ضرور کر رہا ہوں لیکن بہتر ہوگا کہ انہیں پہلی فرض میں یہاں سے تیس میل دور پہلے بڑے ساحلی شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھادیا جائے۔ میری حکمت میں جو اثر ہے، وہ سب فی سبیل اللہ آپ لوگوں کے لیے حاضر ہے لیکن زیادہ کیجئے گا۔“ حکیم صاحب اپنی دواؤں کی ایک اور خوراک پلانے کے بعد اور ہمارے ذہنوں میں اچھلنے چلانے کے بعد اپنی دواؤں کی صندوقچی اٹھا کر چلتے بنے۔ سلطان بابا اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر بس میری میں پڑ چکے تھے۔ دوپہر تک تو وہ مجھ سے باقاعدہ کچھ خفا سے بھی تھے کہ میں نے انہیں پہلے یہ سب کیوں بتایا۔ مجبوراً ظہر کے بعد مجھے زبردستی اُن کے سامنے مسجد ہی میں صف پر چوڑی مار کر بیٹھنا پڑ گیا۔ ”میں آم سفر کھانا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس اس لیے خاموش رہا۔ آپ بے فکر رہیں میں جلد تندرست ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر آپ اسی طرح رُوٹھے رہے تو میں واقعی پورا مریض بن کر بستر پر پڑ جاؤں گا۔“ میرا حرج کار گر رہا وہ دھیرے سے مسکرا دیئے۔ ”بہت ضدی ہو۔ لیکن اب ہم یہاں سے تب ہی آگے سفر کریں گے۔ جب بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ اور پھر میرے ذہن میں بہت عرصے کا انکا سوال زبان سے پھسل ہی پڑا۔ ”ہم منزلوں کی طرف سفر کرتے ہیں، اُن کا تعین آپ کیسے کرتے ہیں.....؟ مثلاً جبل پور، پھر کال گڑھ اور مشرقی ساحل کی یہ مسجد..... سفر کا یہ نقشہ کون ترتیب دیتا ہے؟“ وہ کچھ دیر توقف کے بعد بولے۔ ”اشارے مل جاتے ہیں۔ کبھی کسی حاجت مند دوست کا بلاوا آ جاتا ہے۔ کبھی وقت ملے اور میسر ہو تو نقشہ دیکھنا امید ہے تمہیں سمجھ آ جائے گی۔“ حسب معمول میرے ذہن کی کچھ گرہیں کھلیں، پر کچھ نئی گرہیں مزید پڑیں۔

## قاتل

میں ہکا بکا سایوں ہی اپنی جگہ جمنا بیٹھا رہا اور کچھ ہی دیر میں پولیس والے میرے سر پر پہنچ گئے۔ ان میں ایک نے لپک کر میری کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ عقب سے چند اور خوالدار بھی نمودار ہو گئے اور پھر ایک رگڑا "کون ہو تم..... اور اس وقت یہاں ساحل پر کیا کر رہے ہو؟" میں عبد اللہ ہوں۔ سامنے والی چھوٹی زی واقع مسجد میں رہتا ہوں۔ "ایک سپاہی میرے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دے کر بولا "یہ جھوٹ بول رہا ہے ب۔ لاش کے قریب جو قدموں کے نشان ہیں، وہ سیدھے یہاں آکر ختم ہوتے ہیں۔ یہی اس لڑکی کا قاتل۔" میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے۔ یہ لوگ کس لڑکی کی لاش کا ذکر کر رہے تھے۔ اور میرے ہون کے نشان وہاں تک کیسے پہنچے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ساری ہستی ساحل کے گرد جمع ہو چکی۔ افسر کے حکم پر مجھے جھٹکڑی پہنا دی گئی اور پھر تقریباً گھنٹے ہوئے جائے وقوعہ تک لے جایا گیا۔ کچھ پولیس لے زمین پر چوڑے سے ایک دائرہ لگائے کھڑے تھے۔ درمیان میں سفید چادر کے نیچے ایک آڑا تر چھا جسم ہوا تھا۔ چادر کے نیچے بھی جسم کے زاویوں کے متوازی سفید چوڑے کی لکیریں جھانک رہی تھیں۔ دفعتاً زور ہوا کے جھونکے سے جسم کے چہرے سے چادر ہٹ گئی۔ تیس، چوبیس سال کی ایک معصوم سی لڑکی آنکھیں سے پڑی تھی۔ چہرے پر چند گہری خراشوں کے علاوہ اور کوئی ایسی نشانی نہیں تھی کہ جسے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ لگ سکے کہ وہ اپنی سانسیں ہار چکی ہے۔ اس وقت بھی وہ اتنے قریب سے بھی گہری نیند میں سوئی ہوئی ہی لگتی جیسے ابھی پٹ سے آنکھیں کھول دے گی۔ میں ابھی تک پوری طرح اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ چند مابعد ہی سامنے سے مرتضیٰ صاحب اور سلطان بابا پریشانی کے عالم میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے آتے دکھائی دیے۔ میرے ہاتھوں میں جھٹکڑیاں دیکھ کر سلطان بابا کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ وہ لپک کر میرے قریب آئے اور سے ہاتھ نٹول کر کہنے لگے "یہ جھٹکڑیاں کیسے عبد اللہ میاں۔ یہ سب کیا ماجرا ہے؟" اتنے میں ایک سرکاری ساحل پر نمودار ہوئی اور سارے پولیس والے ہوشیار اور مودب ہو گئے۔ انہوں نے جلدی سے لوگوں کو راہر ہٹایا۔ "اے ہٹو، ایک طرف ہو جاؤ۔ ایس۔ پی صاحب آرہے ہیں۔" ایس۔ پی کے قریب آتے ہی پولیس والوں نے کھٹاکٹ سلیوٹ کیے۔ افسر نے جواباً سر ہلایا اور میری طرف چلا آیا۔ اور غور سے میری دیکھ کر بولا "ہونہ..... تو یہ ہے وہ لڑکا؟" سلطان بابا نے کھٹاکر ایس۔ پی کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ "کیا کیا ہے عبد اللہ میاں نے..... آپ نے اسے جھٹکڑیاں کیوں لگا رکھی ہیں؟" افسر نے غور سے سلطان بابا کو

عشاء کے بعد گزشتہ روز کی طرح مرتضیٰ صاحب کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ درمیان میں صاحب بھی چکر لگا گئے تھے۔ نہ جانے ہر بار وہ میری نبض دیکھتے ہوئے میرے چہرے پر کون سی آنکھیں تحریر پڑھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے ہر بار وہ کچھ کہتے کہتے رک سے جاتے رات بہت دیر تک سلطان بابا میرے سر ہانے بیٹھے رہے۔ میرا جسم اندر سے بُری طرح جل رہا تھا۔ بہت اتنی بڑھی کہ میں بہت دیر تک ادھر ادھر سر پختار ہا پھر نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔ بس مجھے اتنا ہی یاد کہ سلطان بابا دیر سے میرے سر ہانے سے اٹھ کر حجرے میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ پھر ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا کوئی بالٹی بھر بھر کر کھارنا تک ملا پانی میرے چہرے پر پھینک رہا ہو۔ تیسرے تھیمڑے پر میں نے کسماتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو سر پر حجرے کی چھت کی کھلا آسمان دیکھ کر چند لمحوں میں شینا ہی گیا۔ اور پھر پانی کی ایک تیز لہر نے میرے پہلے سے بھٹکے ہوئے مزید بھگو دیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا، صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا اور میں اس وقت حجرے کے بجائے ساحل پر ریت میں بنا ہوا تر سا بیٹھا ہوا تھا۔ یا خدا.....! میں یہاں کیسے پہنچا.....؟ ابھی رات کو تو میں اس کمرے میں ہڈیانی حالت میں اپنے بستر میں کسمسار ہا تھا پھر یہ ساحل، یہ کھلی فضا.....؟ میں ابھی جر کے پہلے شدید جھٹکے ہی سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ اچانک ڈور سے کچھ لوگ جہوم کی صورت میں مجھے اپنی ہا بڑھتے نظر آئے۔ ان کے ہینولے دیرے دیرے دھندلی شبیہوں سے واضح خاکوں میں تبدیل ہونے لگے۔ سے آگے باوردی پولیس والوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔ پھر ایک سپاہی کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مجھے دیکھتے ہی سے چلایا۔

"وہ رہا قاتل جناب.....!" پھر کوئی زور سے گرجا۔ "لپکو..... پکڑو..... قاتل جانے پائے۔" سب پولیس والے میری جانب دوڑے۔



دیکھا ”یہ آپ کا بیٹا ہے؟“ بیٹے سے کچھ بڑھ کر ہی ہے میاں..... رشتے صرف خون کے ہی تو نہیں ہو۔  
 ایس۔ پی نے غور سے بابا کو دیکھا ”خوب..... اور آپ کون ہیں؟“ ”ہم دونوں ہی مسافر ہیں۔ ایک  
 راستے کے۔ فی الحال چند دن کے لیے پہاڑی ٹیلے کی اوپر والی مسجد میں بسیرا ہے، پھر آگے بڑھ جائیں  
 میاں۔“ افسر نے گہری سانس لی۔ لیکن فی الحال شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ اس لڑکے پر خون کا شک ہے،  
 بظاہر دکھائی دینے والے تمام شواہد بھی اس کے خلاف جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے گرفتار کر کے لے جا  
 ہیں۔ ہاں، البتہ آپ میری تسلی کے لیے صرف اتنا بتا دیں کہ آپ کے بیان کے مطابق اگر آپ لوگ  
 مسجد کے حجرے میں مقیم ہیں تو پھر یہ لڑکا اتنی صبح سویرے یہاں ساحل پر کیا کر رہا تھا؟“ سلطان بابا۔  
 سانس لیا ”میں نہیں جانتا، کیوں کہ میں رات کو عبداللہ کو حجرے ہی میں سوتا چھوڑ گیا تھا۔“ ایس پی نے پوچھا  
 سلطان بابا کو دیکھا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس مشکل مرحلے پر بھی سچ کا دامن نہیں چھوڑا۔ لیکن آپ  
 سچ عبداللہ کو ہماری نظر میں مزید مشکوک بناتا ہے۔ بہتر ہوگا آپ کسی اچھے وکیل سے رابطہ کر لیں۔“ پولیس  
 نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا اور وہ لوگوں کے درمیان سے مجھے دھکیلتے ہوئے پولیس کی جیب کی طرف  
 پڑے۔ مرتضیٰ صاحب اتنے پریشان تھے کہ ان سے ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔ میں نے چلتے ہوئے پل  
 سلطان بابا کو کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میرے سارے لفظ نہ جانے کہاں کھو چکے تھے۔ بھیڑ میں کھڑے۔  
 صاحب کی نظریں مجھ سے ملیں اور مجھے لگا کہ ان کے اندر جانے کتنے طوفان اُٹ رہے ہیں لیکن وہ پولیس  
 سے کچھ بول نہیں پارہے۔ جیب میں بیٹھے ہوئے میری نظر آخری بار اس معصوم چہرے پر پڑی، جس کے  
 داغ اپنے ماتھے پر سجائے میں پولیس کے گھیرے میں ایک ان جانے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ کیا میرا جزا  
 اپنی آخری حدیں بھی پار کرنے کو تھا۔ ہستی والے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ریت اڑاتی جیب  
 سے ساحل سے دور ہوتی گئی اور کچھ ہی دیر میں سارا منظر وحشت لگا گیا۔

تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے بعد ایک خستہ حال سی پرانی عمارت نظر آئی جس پر برسوں پہلے کیا گیا جا  
 جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا۔ عمارت کے گیٹ پر پرانے سے ٹین کا ایک رنگ آلود بورڈ جمول رہا تھا، جس پر  
 بنور دیکھنے پر بھی بمشکل نظر آتے تھے۔ میں صرف اتنا ہی پڑھ پایا ”پولیس تھانہ، تحصیل ماہی“ اور  
 جیب تھانے کے چھانک سے اندر داخل ہو گئی۔ ایس۔ پی کے وقوعہ پر پہنچنے سے پہلے، جس تھانے دار  
 سے بات کی تھی، وہ یہاں کا ایس ایچ او تھا۔ مجھے تھانے دار کے کمرے میں لے جا کر دیوار کے قریب  
 رہنے کو کہا گیا۔ پتا چلا کہ ایس۔ پی صاحب ہیڈ کوارٹر یعنی شہر والے دفتر میں بیٹھے ہیں اور یہاں صرف  
 کی اطلاع پر پہنچے ہیں، کیوں کہ مرنے والی شاید خود بہت اہم تھی یا پھر اس کا تعلق شہر کے بہت اہم لوگو  
 تھا۔ ورنہ عام حالات میں ایسے مقدمات خود تھانے دار ہی نپٹا دیا کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ تھی میں  
 واقعے کے دوران ذہنی طور پر بالکل سُن اور یوں بے فکر اور لاتعلقی سا تھا جیسے پولیس قتل کے الزام

میں..... کسی بیچے کو کچڑا کر تھانے لائی ہے اور میں کسی فلم کے پردے پر یہ سب مناظر دیکھ رہا ہوں۔ کچھ ہی  
 میں ایس پی صاحب بھی کمرے میں آگئے اور تھانے دار اور چند موبد حوالدار اُن کے آس پاس اکڑ کر  
 رہے ہو گئے ہیں۔ میں نے پہلی بار ایس پی کے سینے پر لگی چھوٹی سی نام کی تختی پڑھی۔ اُن کا نام رحمن تھا۔  
 بابا نے میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں داب کر مایوس کے لیے نظر  
 لائی۔ تھانے دار نے جلدی سے بڑھ کر سگریٹ سلگا دیا۔ انہوں نے ایک زوردار کیش لے کر دھوئیں کا مرغولہ  
 میں بکھیرا اور دھوئیں کی اس نینگوں چادر سے پرے اپنی گھورتی نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں۔ ”ہونہہ..... تو  
 اللہ نام ہے تمہارا۔ اس سے پہلے کہاں رہتے تھے؟“ میں نے مختصر آہٹیں تفصیل بتائی۔ کتا پڑھ لکھے ہو؟  
 مطلب ہے مدرسے کی کون سی سند تک پڑھا ہے تم نے اب تک؟“ ”جی مدرسے کی تو کوئی سند نہیں ہے  
 ے پاس۔ ابھی کچا طالب علم ہوں۔“ میرا جواب سن کر انہیں ذرا حیرت ہوئی کیوں کہ شاید میری صاف  
 ٹوے وہ مجھے دین کا بہت پرانا طالب علم سمجھ بیٹھے تھے۔ ”اچھا یہ بتاؤ تم رات کو ساحل پر کیا کرنے گئے  
 جس لڑکی کی لاش کے پاس تمہارے قدموں کے نشان ملے ہیں تم نے اُسے پہلی بار کب دیکھا  
 “میں نے پہلی بار اُسے آج صبح ہی دیکھا ہے، جب چند لحوں کے لیے اُس کے چہرے سے کپڑا ہٹ گیا  
 مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں رات اپنے حجرے سے ساحل تک کیسے پہنچا اور میرے قدموں کے نشان ریت پر  
 رہ گئے؟“ تھانے دار سے صبر نہیں ہو سکا اور وہ کرک کر بولا۔ ”کیوں، کیا تم کو نیند میں چلنے کی عادت  
 ۔ یہی طرح سے بتاتے ہو یا پھر؟“ ایس پی نے ہاتھ اٹھا کر تھانے دار کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود  
 ل فاضل میں بکھیرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو۔ میں نے ابھی تک روایتی پولیس والے حربوں سے خود کو روک رکھا  
 دراصل مجھے لڑکی کے پوسٹ مارٹم کا انتظار ہے۔ شام تک شہر سے رپورٹ آجائے تو میں کسی نتیجے پر پہنچ کر  
 لی فیصلہ کروں گا، لیکن جب تک تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم ہم سے تعاون کرو۔ بعد میں اگر مجھے یہ پتا  
 تم نے کوئی غلط بیانی کی ہے تو تمہارے حق میں بہت بُرا ہوگا۔“ میں نے اب تک آپ سے کوئی جھوٹ  
 بولا۔ نہ ہی مستقبل میں میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ آپ اپنی تفتیش مکمل کریں۔ اگر میں گناہ گار ہوں تو بھی  
 کے اختیار میں ہوں۔ جو سزا مقرر ہوگی، مجھے قبول ہے۔“ زمین صاحب کچھ دیر تک میری آنکھوں میں نہ  
 نہ کیا تلاش کرتے رہے۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ اصل پولیس والے کی نظر کس قدر گہری اور کتنی جھپتی  
 ہوتی ہے۔ جب ہی تو انہیں آنکھوں کے راستے زور میں جھانک لینے کا فن آتا ہے۔ اتنے میں ایک سپاہی  
 اگر بتایا کہ ہستی کے چند بزرگ اور حکیم صاحب اُن سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایس پی نے انہیں دوسرے  
 سے میں بیٹھانے کو کہا اور مجھے وہیں کھڑا رہنے کا حکم دے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ صرف ایک  
 کو میری عمرانی پر مامور رہنے دیا گیا۔ البتہ میرے ہاتھ اب بھی جھکڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ کھڑے  
 سے میرے پاؤں شل ہونے لگے۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ پھر اچانک وہی لاوا میرے خون میں پھوٹا

ہیں (Allopathy) ٹرین کی دوائی پٹریاں ہیں، جو ساری عمر ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں اور جن کی منزل ایک ہوتی ہے لیکن وہ کبھی مل نہیں پاتیں۔ سلطان بابا اس سارے عرصے میں چپ چاپ بیٹھے مجھے دیکھتے رہے۔ حالات میں اندھیرا ہونے لگا تو ایک سنتری نے بیرونی طاق میں رکھا دیا جلادیا، جو سلاخوں سے پرے طرح بنایا گیا تھا کہ اس کی روشنی تو حالات تک پہنچ رہی تھی لیکن وہ قیدی کی دست برد سے پرے رہتا تھا۔ دیر میں باقی لوگ باہر نکل گئے اور صرف میں اور سلاخوں کے پار بیٹھے سلطان بابا حالات میں باقی رہے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اُن کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی تھی۔ ”یہ کیہا مقدور لکھوا کر لائے ہاں۔ کبھی کبھی تو میں خود بھی خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ کہیں کوئی مستقل جنوں ہی تمہاری تقدیر نہ ہو۔“ میں ان کا ہاتھ تھپتھپایا ”آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ دیوانے سے کوئی پرسش نہیں، تو پھر دیوانگی تو نعمت ہوئی نا۔“ اگرزائی کے عذاب سے تو جان چھوٹے گی۔ بس، یہ دعا کریں کہ میری یہ دیوانگی، یہ جنوں کسی کے لیے نقصان نہ ہو۔“ اتنے میں سپاہی نے آکر اطلاع دی کہ قیدی کو باقاعدہ ”لاک اپ“ میں بند کرنے کا ہو گیا ہے، لہذا ملاقات ختم کی جائے۔

کچھ ہی دیر میں اس خستہ حالات کی سلاخوں پر بڑا سالو ہے کا تالا ڈال کر اور دروازے کو مقفل کر کے ”لاک اپ“ بنادیا گیا۔ سلطان بابا کو میں نے بمشکل ہستی واپس جانے پر مجبور کیا۔ ورنہ وہ وہیں تھانے کے باہر اس رات گزارنے کی دھن میں تھے۔ ایس پی صاحب کی مہربانی سے مجھے وہ کھانا کھانے کی اجازت ملی گئی، جو مرتضیٰ صاحب اپنے گھر سے بنا کر لائے تھے۔ تھانے دار نے مجھے بتایا کہ رجن صاحب واپس جا چکے ہیں اور اب وہ صبح آئیں گے اور کل صبح ہی مجھے رہا ہٹ کے لیے باقاعدہ کسی عدالت کے روبرو پیش جائے گا۔ تھانے میں اب باقاعدہ مجھے مریض سمجھا لیا گیا تھا، لہذا عملے کا رویہ صبح سے کافی بہتر تھا۔ کچھ ہی دیر صرف رات کی ڈیوٹی والے تین چار سپاہی تھانے میں باقی رہ گئے اور عمارت سنسان ہو گئی۔ بس میں، میرا ل اور یہ تاریک قفس باقی رہ گئے۔ کس سے گلہ کرتا کہ جنوں کا تو واسطہ ہی سدا سے قفس تھا۔ میں تو وہ سب، یوانہ تھا، جو تاج کو اپنے ناخن بڑھ جانے کی دہائی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کھکھک کر دیوار کے تنہ فیک لگالی اور صبح سے ہوئے اب تک کے واقعات کا از سر نو جائزہ لینے لگا۔ اب تک لڑیاں کچھ یوں جاتی تھیں کہ کال گڑھ کے بے زبان دشمنوں کا زہر میرے خون میں شامل ہو کر اسے بھی لڑچکا تھا اور اب میرے اندر اپنی بیخیز یوں کی درندگی اور وحشت خون بن کر دوڑ رہی تھی، جو مجھے دن کے نامی لمبے میں خود سے بچا نہ کر سکتی تھی۔ پہلی رات فجر کے بعد مجھ پر جنوں کا پہلا طویل دورہ پڑا۔ لیکن اس نے خوش قسمتی سے میں حجرے میں سلطان بابا کے سامنے ہی موجود تھا، لہذا فوراً حکیم صاحب کو بلوایا گیا اور ان کے سامنے حلق میں چپکائی گئی دوائے شاید میرا کچھ بھرم رکھ لیا۔ لیکن دوسری رات میرا جنوں مجھے گھسیٹ کر اسے باہر لے آیا۔ نہ جانے وہ معصوم کون تھی، جو سلاخ پر لاش کی صورت موجود تھی اور کون جانے کہ واقعی

اور میری نسوں میں چنگاریاں بھڑکیا۔ سپاہی نے پہلے حیرت سے میری پھولتی سانسوں اور بگڑتی حالت کو اور پھر مجھے ڈولتے دیکھ کر وہ باہر کی جانب بھاگا۔ مجھے یوں لگا کہ سامنے والی پہلی دیوار پر کچھ عجیب عفریت نما سائے ابھر کر میری جانب بڑھ رہے ہوں اور پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جانے کتنی مہر بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو حکیم صاحب دیرے دیرے میرے گال تھپتھپا رہے تھے۔ یہ وقت حالات کے سنگی رسل نما چہرے پر لینا ہوا تھا اور میرے آس پاس سلطان بابا کے علاوہ ایک ڈاکٹر ایس پی صاحب بھی موجود تھے۔ حالات کے چھوٹے سے روشن دان سے اندر آئی دھوپ کے زاویے اور رنگت سے پتا چل رہا تھا کہ سورج ڈھلنے کو ہے۔ گویا میری زندگی سے پھر چند گھنٹے کچھ اس طرح سے پاؤں نکل گئے تھے کہ مجھے خبر بھی نہ ہو سکی۔ سلطان بابا نے مجھے بتایا تھا کہ روز قیامت جب ہم دوبارہ جائیں گے تو ہمیں یوں لگے گا جیسے ہم صرف دو گھڑی کی زندگی بتا کر آخرت تک پہنچے ہیں۔ پچھلے چار سالوں سے میری زندگی کے کئی طویل گھنٹے بھی یونہی دو پہل کی طرح میری بے ہوشی کے دوران بیت جاتے تھے۔ جب میں دوبارہ حواس میں آتا تھا تو مجھے بالکل اسی طرح محسوس ہوتا تھا، جیسے میں نے ابھی دو پہل کے آنکھیں موندی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا ”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری اٹھ بیٹھا۔ بہتر ہوں۔ بس نرسیں شدید درد ہے۔“

”ہوں..... تمہارا بلڈ پریشر انتہائی خطرناک حد تک بلند ہو گیا تھا۔ بلڈ پریشر سمجھتے ہو۔ فشار خون، واپاؤ؟“ ”جی سمجھ گیا.....“ رجن صاحب غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ سگریٹ حسب معمول اُن کی انگلی درمیان سلگ کر راکھ ہو رہا تھا۔ ”تمہیں یہ بیماری کب سے ہے؟“ میں نے حیرت سے سلطان بابا کو دیکھا، کیوں کہ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس بیماری کا ذکر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے میری نبض تھائی (Tetanus) کا علاج تو بروقت ہوا لگتا ہے۔ ٹیکوں کے نشان تو ابھی تک واضح ہیں۔ خدا کرے کہ یہ خدشات کے مطابق (Rabies) رہیجہر کا کیس نہ ہو۔ لیکن علامات تو سبھی موجود ہیں۔“ حکیم صاحب کہنے کی کوشش کی جناب یہ جنوں کا قصہ ہے۔ میرا مطلب ہے ہماری طب کی زبان میں اسے ”مگ“ بھی کہتے ہیں۔ جب یہ دورہ پڑتا ہے تو انسان اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ کسی نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اُسے ہیولے دکھائی دیتے لگتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے اُس کی یادداشت کی سلیٹ مٹ جاتی ہے۔ یعنی کو حکیم کی یہ فاضلانہ تقریر شاید کچھ پسند نہیں آئی وہ ہاتھ جھٹک کر بولا ”ہاں ہاں..... یہی ساری علامت ہیں رہیجہر کی بھی۔ لیکن میں نے آج تک رہیجہر کو زندہ نہ دیکھا۔ جب کہ یہ نوجوان تو آواز گزر جانے کے باوجود چل پھر رہا ہے۔“ بحث طویل پکڑنے لگی تو ایس پی کو مداخلت کرنی پڑی۔ انہوں نے سخت لہجے میں دونوں کو تنبیہ کی کہ میرے خون کے نمونے شہر کی لیبارٹری کو بھجوا دیے گئے ہیں رپورٹ آنے ہی پر کوئی رائے دی جاسکتی ہے۔ فی الحال اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ شاید طب

راہل ڈوب سا گیا۔ کاش یہ جرم مجھ سے سرزد نہ ہوا ہو۔ باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ سنتری برتن اٹھا کر واپس جا اٹھا۔ میرے چہرے پر بھی سلاخوں سے چھن کر آتی دھوپ نے سلاخیں ہی بنا دی تھیں۔ چہرے کی ہی کیا بات لی، اس وقت تو خود میرے سارے وجود میں جانے ایسی کتنی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں۔“

کچھ دیر میں باہر کچھ ہلچل ہوئی۔ شاید کچھ گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں بھی ابھریں اور کچھ لوگوں کی ذہن کی آواز آنے لگی۔ صبح سویرے جس سنتری نے مجھے چائے لاکر دی تھی وہ تیز تیز چلتا ہوا میری طرف آیا۔ چلو حافظ جی..... تمہاری ملاقات آئی ہے۔“ میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اگر بستی سے سلطان بابا یا کوئی اور لے آیا ہوتا تو اُسے سیدھا حوالات کی طرف لایا جاتا۔ میں نے سنتری سے پوچھا ”مجھ سے ملنے کون آیا ہے؟“ نری نے حوالات کا تالا کھولا۔ ”ریحان صاحب آئے ہیں۔“ میرے ذہن میں ایک جھٹکا ہوا..... ریحان..... اُس لڑکی کا منگیتر.....؟“ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا تھانے دار کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہی شخص نفیس سا سوٹ پہنے منہ موڑے کمرے میں کھڑا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ کے باوجود اُس نے نہ کر میری جانب نہیں دیکھا۔ میں ہلکے سے کھٹکارا۔ ریحان نامی شخص دھیرے دھیرے پلٹا۔ ہم دونوں کی ٹریس میں اور میں اپنی جگہ جیسے جم کر رہ گیا۔

وہ میرے ہی ہاتھوں اس حال کو پہنچی ہو؟ کیوں کہ مجھے نہ تو کچھ یاد رہتا تھا اور نہ ہی ایسی حالت میں، میں اپنے قابو میں ہوتا تھا۔ لیکن وہ کون تھی، چہرے اور لباس سے تو پڑھی لکھی اور کسی بڑے گھر کی دکھائی دے تھی۔ پھر اتنی رات کو اس دیرانے میں کیا کرنے آئی تھی؟ اور اگر میں نے ہی اُس کی جان لی تھی تو کیا وہ تنہا آئی تھی۔ نہ جانے ایسے کتنے سوالوں کو سنہلے تھے، جو مجھے رات بھر ڈستے رہے۔

رات پل پل کر کے سرکتی رہی اور کھلے روشن دان سے ریت کے ذرے اُڑ اُڑ کے میرے چہرے، ہاں اور سر پر گل پاشی کرتے رہے۔ ہاں سچ ہے، دیوانوں کے لیے تو یہ خاک بھی گل جیسی ہوتی ہے اور جڑ جس قدر خاک آلود ہو، اُٹھای گل زار ہوتا ہے۔ فجر کے بعد ایک سنتری چھوٹی سی چینک میں چائے اور ایک چھوٹی سی گلاسی لیے نمودار ہوا۔ ”لے بھی مولوی، چائے پی لی۔“ بھی مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ خون پر ہاتھوں ہوا ہے، لیکن باقی سب کہتے ہیں کہ تجھے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اور اسی دورے کے دورا نے اس لڑکی کی جان لے لی۔ اب اللہ جانے سچ کیا ہے.....؟“ میں نے سنتری سے پوچھا۔ ”وہ لڑکی کو جس کے قتل کا الزام میرے سر ہے؟“ سنتری جو خود بھی میرے سامنے سلاخوں کے پار اسٹول پر چا۔ دوسری گلاسی لے کر بیٹھ چکا تھا۔ اُس نے اپنا ماتھا مسلا۔ ”کیا بھلا سا نام تھا اس بے ہوش کا..... ہاں..... لیلی..... لیکن نام تھا۔ سنا ہے کسی بہت بڑی کمپنی میں کام کرتی تھی اور اُسی کے مالک ریحان منگیتر بھی تھی۔ ویسے ریحان کا نام یہاں سبھی جانتے ہیں۔ اس پورے علاقے کا سب سے بڑا رئیس ہے وہاں شہر میں اس کی میونسپلٹیئر یاں ہیں اور وہ خود بھی شہر میں اپنے محل نما بنگلے میں رہتا ہے۔ گورنر اور وزیر کے ہاں شام کی چائے پر دعوت ملنا اپنے لیے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ تھی تو ہمارے ایس بی صاحب بھی اٹل ملتے ہی دوڑے چلے آئے تھے۔ اس لڑکی کے قتل نے جانے کتنوں کی نیندیں اُڑا دی ہیں۔“ میں نے سنتری ٹھٹھا ”لیکن وہ شہر سے اتنی دُور دیرانے میں کیا کرنے آئی تھیں۔ وہ بھی تنہا۔“ چنانچہ میں۔ سنا ہے اُس کی ریحان صاحب کی شادی میں بس تین دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ ویسے بھی بستی کے لوگوں نے پہلے ہی دونوں کو ساحل پر گھومتے دیکھا تھا۔ شاید شور شرابے اور رش سے گھبرا کر چلے آئے ہوں۔“ سنتری کی بات ہی میرے ذہن میں اشرف کی بات گونجی۔ اُس نے بھی تو کسی میم صاحبہ اور صاحب کا ذکر کیا تھا، جو وہاں آتے جاتے تھے اور جس نے ننھے اشرف کو پتنگ بھی اُڑانے کے لیے دی تھی۔ کہیں یہ وہی صاحبہ صاحبہ تو نہیں؟ سنتری نے بات جاری رکھی۔ ”ویسے تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے کل شام ہی یہ پتا چلا تھا کہ لڑکی کی موت بلندی سے نیچے گرنے سے ہوئی ہے۔ لیکن اُس کے گلے پر بھی خراشیں ہیں، جن سے چلتا ہے کہ اوپر پہاڑی پر کسی نے اس کا گھاکھونٹنے کی کوشش کی اور شاید اسی دھینگا مشتی میں وہ نیچے گر گئی اُسے دھکا دے دیا گیا۔ بہر حال، جو بھی ہوا، بہت بُرا ہوا۔ اس بے چاری نے تو شاید اپنی سہاگ کی ہندا اپنے ہاتھوں میں رچانے کے لیے گیلی کر رکھی ہو۔ تین دن بعد ہی تو اس کی رخصتی تھی۔“ سنتری کی بات

لے آپ کو میرے ساتھ جانے وارادات تک چلنا ہوگا۔“ ریحان اب تھانے دار کے کمرے میں پڑی کرسی بچہ پکا تھا۔ جس کی ادھوری جھلک میں یہاں حوالات کی سلاخوں سے دیکھ سکتا تھا۔ تھانے دار کے کمرے کا اڑھ لکڑی کی چوکت سے اُدھڑا ہوا تھا اور چوکنے پر پڑی حق بھی جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی۔ انہی بے خانوں میں سے ایک مستطیل خانہ مجھے اس وقت سامنے بیٹھے سگار پیتے ریحان کے چہرے کی نامکمل دکھا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ ہمیشہ یونہی کھویا کھویا رہتا تھا یا پھر اس حادثے نے اُس کی یہ حالت کردی تھی۔

اپنی کیا آواز گونجی ”آپ کے خیال میں لیلی اتنی رات گئے اس دیرانے میں اکیلے کیوں گئی ہوگی؟“ ”وہ ہمارا بدہ تفریحی مقام تھا۔ میں اور لیلی اکثر وہاں آتے تھے۔ لیلی کو پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا اور شہر کی لمبی اور بجوم میں یہ اُس کے لیے ممکن نہیں تھا، لہذا ہم اکثر چھٹی منانے وہاں چلے جاتے تھے۔ کمپنی نے لیلی کی گاڑی بھی دے رکھی تھی۔ ہو سکتا ہے دل گھرایا ہو تو اکیلی ہی اس جانب نکل گئی ہو۔ پہلے بھی جب کبھی مخالف سمتوں سے یہاں پہنچنا ہوتا تھا تو میں لیلی کو کہہ دیتا تھا اور وہ باسانی وہاں تک آ جاتی تھی۔ البتہ کوئی نہ آنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔“ رحمن صاحب نے ہنکارا بھرا ”لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وارادات نام سے ہمیں بیک وقت دو گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات ملے ہیں۔ پہلی گاڑی تو وہی لیکسز (Lexus) جو لیلی کے استعمال میں تھی، اور جائے وارادات ہی پر کھڑی تھی، لیکن وہاں ایک دوسرے گاڑی بھی آئی تھی، جس کے واپس جانے کے نشانات بھی پکی سڑک تک ملے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی گاڑی، کار یا جپ بھی ہے۔“ ریحان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے ”لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، لیلی کی دوست یا جاننے والے کے پاس کوئی چھوٹی گاڑی نہیں ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ چھوٹی گاڑی بھی نام وہاں آئی ہو لیکن لیلی کی گاڑی آنے سے پہلے ہی چلی گئی ہو۔ وہ ایک تفریحی مقام بھی ہے اور شہر کا ہواخوری کے لیے وہاں آتے رہتے ہیں۔ کئی بار جب میں اور لیلی وہاں آتے تھے تو ہم سے پہلے ہی خاندان، کوئی جوڑا یا مچھلے نو جوان وہاں کپکپ مٹاتے ہوئے ملتے تھے۔ ایسی صورت میں ہم آگے بڑھتے۔“

رحمن صاحب نے بھی اپنا سگریٹ سلگایا۔ ”ہاں..... ہم اس زاویے سے بھی دیکھ رہے ہیں کہ شاید وہ گاڑی لیلی کی گاڑی سے پہلے وہاں سے چلی گئی ہو۔ میرا علمہ ہستی والوں کے بیانات لے رہا ہے، لیکن سے ایک تو وہ پوائنٹ ہستی سے کچھ فاصلے پر ہے اور پھر ایسی جگہ ہے کہ وہاں عموماً لوگوں کی نظر نہیں جاتی۔ ہستی کے لوگ سرشام ہی خود کو گھروں میں بند کر لینے اور عشاء کے فوراً بعد سو جانے کے بھی عادی جب کہ لیلی کی موت کا وقت رات بارہ بجے کے بعد کا ہے۔ بہر حال، فی الحال تو تمام اشارے اُسی ناک طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو پہلے ہی ہماری حراست میں ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔“

## نفق اور جنوں

کچھ دیر تک ہم دونوں یوں ہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ میرے ہر اس وقت وہ نفق کھڑا تھا، جس کی محبت کے قتل کا الزام میرے سر تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے نفیر سجے ہوئے لوگ کم ہی دیکھے تھے۔ بہترین تراش خراش کا سوٹ، ٹائی، لفٹ، لکس، کوٹ اور چٹلون کی گھنٹہ کر نہایت سلیقے سے بنائی گئی کریز اور امپورٹڈ جھکتے ہوئے جوتے۔ کبھی میں بھی لندن کے ہیرالڈز اسٹور ہر دوسرا پیرا بن خرید کرتا تھا۔ اس وقت ریحان کے سرمئی سوٹ کی جیب پر بھی وہی مخصوص چھوٹا موٹا جگمگا رہا تھا، لیکن اُس کا چہرہ اُسی قدر تاریک تھا۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ جس شخص کی محبت ابھی چوہیں گھنٹے بھی نہ ہوئے ہوں، اُسے اتنا نفیس لباس پہننے اور شیو بنانے کا دھیان بھی کیسے رہ سکتا۔ ریحان کے ہاتھ میں ہوانا کا ایک قیمتی سگار تھا، جس کی میٹھی سی خوشبو کمرے میں چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ اس تمام تراہتمام کے باوجود اس کی حالت ابتر لگ رہی تھی۔ لیکن شیو چہرہ، جس پر نساویت کی ناز کی یاد دہکتی تھی، کس قدر ڈھلکا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے تیار ہے تھے کہ وہ گزشتہ کئی راتوں سے سو نہیں پا رہا تھا۔ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ ”تو تم ہو عبد اللہ.....“ میں چپ رہا۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم کسی بیمار کی شکار ہو؟“ ”مجھے بھی یہی بتایا گیا ہے، لیکن اگر آپ یقین کر سکتے ہیں تو کم از کم اس بات پر یقین کہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے اور مجھے آپ کی متغیر کی موت پر از حد دکھ ہوا ہے۔“ ریحان کچھ کھویا کھویا سامنے تھا جیسے مدے سے اُس کے حواس ابھی تک شل تھے۔ وہ اس طرح بولا جیسے کوئی اپنے آپ سے بڑھ کر کہتا ہے۔ ”جسے جانا تھا، وہ تو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ اب یہ کس کے جنوں کا شاخسانہ ہے، اس بحث سے حاصل۔ میری دنیا تو اُجڑ گئی۔“

اتنے میں باہر کسی سرکاری جپ کے ہوٹل کی آواز گونجی اور چند لمحوں کے بعد ایس پی رحمن صاحب سے پولیس والی ٹوپی اُتارتے ہوئے جلدی میں اندر داخل ہوئے ”معافی چاہتا ہوں ریحان صاحب راتے میں گاڑی کا انجن گرم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر زکنا پڑا۔“ ریحان کا لہجہ بدستور دھیما تھا۔ ”اٹس اوکے نے پیغام بھیجا تھا میرے لیے۔“ ”اوہ ہاں..... آپ کو زحمت دینے کے لیے معذرت۔“ میں جانتا تھا اس وقت کس کرب سے گزر رہے ہیں، لیکن سرکاری فرائض کی ادائیگی کبھی کبھی ہمیں پتھر بننے پر مجبور ہے۔ دراصل آپ کو جائے وقوع پر ملی کچھ چیزیں دکھانا تھیں۔ اُن کی شناخت اور پولیس کو مطلوب ہے۔“



لڑو بارہ زور سلاخوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اور اُس نے اپنے ہونٹ جیسے سی لیے۔ میری حالت پھر سے بڑھنے لگی۔ وہی چنگاری میرے دماغ سے نکلی اور میرے جسم کو جھلسا گئی۔ سامنے بیٹھا مجھ پر ایک بڑے کی شکل اختیار کر کے مجھ پر لپکا۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں نے اس حملے کو روکنے کے لیے زلفا میں بلند کر دی۔

مجھے ہوش آیا تو منظر بدل چکا تھا۔ میں کسی اسپتال کی چار دیواری میں تھا اور آس پاس بہت سے ڈاکٹر ف آلات لئے میرا معائنہ کر رہے تھے۔ مجھے آنکھیں کھولنا دیکھ، سب ہی نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ دی۔ ”تم ٹھیک تو ہو..... تمہیں بخار تو نہیں رہتا، ہر وقت تھکن تو محسوس نہیں ہوتی۔ سر میں دھماکے سے نہ ہیں؟“ سانس لینے میں دشواری ہوتی۔ کھانا ٹھیک سے نگلا جاتا ہے کہ نہیں.....؟ ہاتھ پاؤں شل تو نہیں ہاتھ اپنا تک؟ میں نے بشکل اپنی کیفیت بیان کی کہ میں اس دورے کے دوران اپنے حواس ہی میں کب ہوں جو اتنا کچھ یاد رکھ سکوں، پھر ایک سینئر ڈاکٹر نے نوجوان ڈاکٹروں کو ڈانٹا اور کمرے کی روشنیاں مدہم نے لکھا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے مجھ سے بات کرنے لگا، لیکن اس کی باتوں کا دائرہ بھی اچانک دکھائی دے والے ہیولوں، بے یقینی، پرتشدد رویے اور فالج کی کیفیات کے گرد ہی گھومتا رہا۔ اتنے میں باہر سے کسی کی آواز آئی تھی۔ پی رحمن پوچھ رہے ہیں کہ کیا قیدی کو آج جیل وارڈ ہی میں رات گزارنی ہوگی یا وہ وہاں جیل لے جاسکتے ہیں۔ سینئر ڈاکٹر نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک لمبی راہ داری ہو کر ان کے کمرے تک پہنچ گئے۔ جہاں پہلے سے رحمن صاحب تھانے دار سمیت ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن میں کھڑا ہی رہا۔ قید کے اپنے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور شاید صرف قید یا قیدی ہونے کی تھی ہی نہیں۔ یہ قواعد و ضوابط ہی تو ہیں جو ہمیں ہر جگہ قیدی بنائے رکھتے ہیں۔ نے کچھ ہی کہا تھا کہ ”ہم بظاہر آزاد ہوتے ہیں، لیکن تمام عمران دیکھی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔“ صاحب نے ڈاکٹر سے میری بیماری کی نوعیت کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب انگریزی میں بولے ”عجیب سی بات لگتی ہے لیکن سائنس اور ایلمنٹس کی دنیا میں ہر دن ایک نئی کھوج کا دن ہوتا ہے۔ ہم بیکٹریوں پر اپنی بیماریوں کا علاج دریافت کرتے ہیں تو ہر پل کوئی نئی بیماری ایک نیا چیلنج بن کر ہمارے ہاتھ لگتی ہوتی ہے اور بیماری بھی کیا۔ یہ تو دراصل ہمارے خون میں موجود مختلف مرکبات اور مادوں کی بگڑنے کا ایک نام ہے۔ ساری زندگی، یہ دنیا اور یہ ساری کائنات ایک ترتیب ہی کا تو مظہر ہے۔ انسانی کائنات ہر وقت ایک بے حد پیچیدہ نظام ایک خاص ترتیب میں چل رہا ہے۔ جس میں اس نظام کے تحت لے مادوں کی مدت، اوقات اور بناوٹ خود بھی ایک خاص ترتیب اور نظام کے تحت ہوتی ہے۔ ان میں کی بھی چیز کی کمی بیشی یا ملاوٹ ایسی ہی کسی حالت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے، جسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں۔ اس نوجوان کے خون میں بہنے والے مادوں میں بھی حیران کن طور پر چند ایسے زہریلے

رحمن صاحب اور رحمان کمرے سے باہر نکلے۔ رحمان کی نظر مجھ سے ملی۔ مجھے اس جوان رحمان اور ضبط پر اس لمحے بے حد رشک آیا۔ جانے اُس کے اندر اس وقت کتنے طوفان مچل رہے ہوں چہرے پر مسندر جیسا سکوت طاری تھا۔ اُن دونوں کے جانے کے بعد میں پلٹا ہی تھا کہ باہر ایک دم اور سپاہی ایک ملنگ نما مجذب شخص کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے لائے اور اُسے بھی حوالات میں دھکیل کر ملنگ غصے میں اول فول بکتار ہا اور سپاہی اپنی بولی بولتے رہے۔ پتا چلا کہ ملنگ اس سے پہلے بھی لوگوں یا پتھر مار کر زخمی کر چکا تھا لیکن اُسے جھاڑ جھپٹ کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ آج تو اس نے حد ہی کر مار مار کر سارے علاقے کے گھروں کے شیشے توڑ ڈالے۔ تھانے دار ایس پی صاحب کے ساتھ جائے کی طرف نکل چکا تھا۔ لہذا ملے پایا کہ اُس کی واپسی تک ملنگ کو حوالات ہی میں قید رکھا جائے۔ ہم جھکنا وہیں سلاخوں کے پاس چوڑی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں دیوار کے ساتھ ہ بیٹھا تھا۔ ملنگ کو ایک جھٹکا سا لگا ”تو..... تو یہاں کہا کر رہا ہے.....؟“ میں گڑ بڑا سا گیا۔ ”میں..... قیدی ہوں۔“ ملنگ نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ”قیدی..... ہونہ۔ تو صرف اپنی خواہشوں کا قیدی ہے۔ تو نے خود اپنی قسمت میں لکھوائی ہیں۔“ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ چند لمحے پولیس والوں کو گالیاں دینے والا مجذب اس وقت بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ اتنے میں چائے والا سنسٹری سلاخوں سے گزرا اور ہنس کر بولا ”اس کی باتوں میں نہ آتا عبد اللہ۔ یہ تو ہے ہی سدا کا مجنوں۔ گھڑی میں توڑ میں ماشہ“ کتنی عجیب بات تھی۔ اس وقت حوالات میں دو ہی قیدی بند تھے، ان میں سے ایک مجنوں تو دیوانہ۔ دفعتاً ملنگ اپنی جگہ سے اچھل کر بالکل میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا ”یہ تو مجھے کسی خونی کی آنکھیں لگتی ہیں۔ سچ بتا، کس کا خون کر کے آیا ہے یہاں۔ زور سے چونکا گویا اس ملنگ کو کبھی میرے فسانے کی خبر ہو چکی تھی۔ اچانک ملنگ نے زور سے میرا ہاتھ ”سچ بتا.....؟ کیوں مارا اسے..... تو اور کتنے خون کرے گا.....؟“ میں چپ رہا۔ ملنگ بالکل ہی جنو ”تو کیا سمجھتا ہے..... یوں در بدر بھگتے سے تو اسے پالے گا۔ نہیں، کبھی نہیں۔ تیرا مقدر ہی یہ سدا کا ہے۔ تو یونہی سر پٹک پٹک کر مر جائے گا، لیکن جب تک اپنے من میں نہیں جھانکے گا، تب تک تیرا یہ نہیں ہوگا۔ کبھی یہ سلاخیں تیرا مقدر بنیں گی اور کبھی جنوں۔ کبھی کتے تجھ پر لپکیں گے اور کبھی بھنبھوڑیں گے۔ ترس آتا ہے مجھے تجھ پر۔ عورت کا عشق تو بھانپ نہیں پایا۔ اُس کے عشق کی گرد بھی کیا صرف نام ہی عبد اللہ رکھ لیا ہے۔ عمل کوڑی بھر کا بھی نہیں۔“ مجذب نہ جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا اندر بیک وقت نہ جانے کتنی آندھیاں، کتنے جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ملنگ ضرور میرے بارے میں جانتا تھا۔ مجھے گم صم بیٹھا دیکھ کر وہ زور سے چلایا ”تو ایسے نہیں مانے گا..... نہ مان..... کھانا تارہ بوند ٹھو کریں۔ ایک روز یونہی سولی چڑھ جائے گا۔ نہ ہی عورت تیرے ہاتھ آئے گی اور نہ خدا۔“ ملنگ

مرکب شامل ملے ہیں جو عام طور پر کسی درندے کے خون میں ملتے ہیں۔ اسے کتے کے کانے کی کمر بھی ماضی قریب میں دی جا چکی ہے۔ انٹی ٹینیس ٹیکے بھی لگ چکے ہیں، لیکن پھر بھی نہ جانے یہ کیا جواب تک باقی ہے۔ میرے لئے یہ میڈیکل ہسپتال میں ایک نئی دریافت ہے۔۔۔۔۔ اسے ریسیور پھر بھی یہ بار بار کے دورے خطرناک علامت ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر جلد ہی ہم اس بیماری کی تہ تک نہ پہنچیں تو اس نوجوان کا اعصابی نظام مکمل طور پر مفلوج ہو جائے گا، جس کا نتیجہ فالج یا پھر مکمل دیوانگی کی صورت نکل سکتا ہے۔“ میرے ذہن میں فوراً الٹنگ کی دھمکی گونجی کہ نہ مجھے خدا ملے گا نہ وصال منم۔۔۔۔۔ میں ڈاکٹر سے پوچھ بیٹھا ”میرے پاس کتنا وقت باقی ہے ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔“ ڈاکٹر سمیت رحمن صاحب اب بھی اچھل پڑے۔ سینئر ڈاکٹر نے یہ ساری گفتگو انگریزی میں شاید اس لیے کی تھی کہ وہ مریض کے مرنے کی نوعیت بتا کر اسے مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن میرا سوال سن کر ان تینوں کو ہی یہ اندازہ ہو گیا ”ساری گفتگو سمجھ چکا ہوں۔ ڈاکٹر نے پھر انگریزی میں پوچھا ”تم انگریزی جانتے ہو“ میں نے اردو میں دیا ”جی کچھ شدہ بدھ ہے، اس زبان سے میری۔ آپ برائے مہربانی میرے سوال کا جواب دیں۔“ میں نے اور کتنا عرصہ باقی ہے میرے پاس۔۔۔۔۔؟ رحمن صاحب غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جلدی سے نفی میں سر ہلایا ”دیکھو نوجوان۔۔۔۔۔ ڈاکٹر کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ تم جوان ہو، صحت مند ہو تمہارے معائنے کے دوران آج یہ بات بھی پتا چلی ہے کہ تم بے پناہ قوت ارادی کے مالک ہو۔ مجھے! میں اور تم مل کر اس بیماری کو بھی ہرا دیں گے۔ بس اپنا یقین مت کھونے دینا۔ آدھی جنگ یقین اور جو جیتی جاتی ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ریلیکس“

ایک چھ طیب کی طرح سینئر ڈاکٹر میرا سوال ٹال گئے۔ انہوں نے ایس۔ پی صاحب کو اجازت دی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں، لیکن اب مجھے لگا تا معائنے کے لئے شہر کے اس بڑے اسپتال لانا ہوگا۔ ہم اسپتال سے باہر نکلے تو جب کے قریب کھڑے دو سپاہی جلدی سے جھکڑی لے کر میرے لپکے لیکن رحمن صاحب نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا ”نہیں۔۔۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ عبداللہ! گاڑی میں تھانے لے جا رہا ہوں۔ تم لوگ تھانے دار صاحب کے ساتھ ہماری گاڑی کے رہو۔“ خوالدار نے کھٹ سے سلیوٹ کر کے سر ہلایا ”بہتر جناب“ اور رحمن صاحب مجھے لیے اپنی سرکار کی جانب بڑھ گئے۔ اسپتال سے باہر نکل کر مجھے احساس ہوا کہ یہ ساحلی شہر بھی میرے شہر کی طرح جدید تھا۔ شاید ساحل پر بسنے والے شہروں میں بہت سی مماثلتیں ہوتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ہم جگہ چھوڑ کر مضافات میں نکل آئے۔ ہمارے دہانی جانب کچھ فاصلے پر سمندر ٹھاٹھیں مارتا سڑک کے دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ شاید یہی ساحلی سڑک سیدھی ”مختصیل مائی“ کے تھانے تک جاتی تھی۔ مجھے یاد آیا صاحب نے شہر سے ہستی کا فاصلہ تقریباً 30 کلومیٹر بتایا تھا۔ رحمن صاحب خود ہی گاڑی ڈرائیو کر رہے

ڈرائیو اور گاڑی جیب کے پچھلے کپلے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ڈرائیوگ سیٹ کے ساتھ والی طرف مرمم بیٹھا، اندھیرے میں سمندر کی سفید لہروں کو کناروں سے ٹکرا کر فنا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر اکھام ”فنا“ ہی تو ہے۔ میری کہانی بھی خاتمے کے قریب ہی تھی شاید۔ رحمن صاحب نے سگریٹ میں دیا۔ ڈرائیو نے جلدی سے لائٹر دکھا کر ان کا سگریٹ سلگایا اور دوبارہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میری دیکھتا ہوا ”اُس دن جب میں نے تم سے تمہاری تعلیم کے بارے میں پوچھا تو تم نے ٹھیک طرح بتایا کیوں نہیں؟“ ”آپ نے مدرسے کی سند کے بارے میں پوچھا تھا اور میرے پاس واقعی مدرسے کی سند نہیں ہے۔“ رحمن صاحب ہنس پڑے۔ ”اچھا تو اب بتا دو، تمہارے پاس کون سی سند ہے؟“ ”یاد اب میں ایم اے کیا ہے میں نے۔۔۔۔۔“ وہ اچھل ہی تو پڑے۔ ”واقعی۔۔۔۔۔؟ تو پھر اتنا پڑھ لکھ کر ان کی خاک کیوں چھان رہے ہو، کوئی اچھی ملازمت کیوں نہیں کی تم نے۔“ میں نے بات ٹالنے کی غرض سے ”اے بھی میری ایک ملازمت ہی سمجھیں۔ ملازمت صرف تنخواہ پانے کے لیے ہی تو نہیں کی رحمن صاحب نے چونک کر میری جانب دیکھا اور مجھے ایک بار پھر اپنے لفظوں کے بے وقت چناؤ اور اس طرح اچانک زبان سے پھسل جانے پر خود پر شدید غصہ آیا لیکن تیرا ایک بار پھر لکھان سے نکل چکا فب۔۔۔۔۔ میں تو آج تک ملازمت کو صرف تنخواہ پانے کے ذرائع میں سے ایک سمجھتا رہا۔ تم اگر مناسب اپنے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ۔ لیکن اُسے زبردستی ہرگز نہ سمجھنا۔ جی چاہے تو بتا دو۔“ ”میری گزارش یہ حکم کی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ فی الحال میں ایک مکمل مجرم کی حیثیت میں آپ کا قیدی ہوں اور نہ بہت جگہوں پر بنا ہوا ہے۔ مجھے اپنے رہنما بزرگ کی بھی فکر ستائے جا رہی ہے۔ جانے وہ کیسے ہوں ناکی طبیعت یہاں آنے سے پہلے ہی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“ رحمن صاحب نے دھواں اگلا ”وہ بزرگ بھی طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ بہر حال اسپتال آنے سے پہلے میں ہستی میں ہی تھا تفتیش کے بری ان سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور میں نے تمہارے بارے میں تسلی دی تھی انہیں۔“ میں نے تشکر ادا سے ان کی جانب دیکھا۔ ”شکریہ۔۔۔۔۔ آپ ایک مختلف پولیس والے ہیں۔ رحمن صاحب ہنس رہے تھے۔ یہ الزام۔ چلو یہ بھی قبول ہے۔ تم جانتے ہو، آج ہستی کے ایک بچے نے ایسا بیان دیا ہے کہ اب تو پورے کیس کا رخ ہی بدل جائے گا۔ تم جس مسجد میں مقیم ہو۔ وہاں کے پیش امام کے بیٹے نے بتایا ہے کہ اس نے قتل کی رات اسی پہاڑی ٹیلے پر ایک دوسری عورت کو بھی جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ رات کی چھوٹی گاڑی میں سوار تھی۔ بچہ ابھی چھوٹا ہے اُس لیے زیادہ جزئیات نہیں بتا سکا۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ اسی مسلم صاحبہ کی گاڑی ٹیلے کی طرف جاتی دیکھ کر ہستی سے نکل کر اس جانب بھاگا تو اس نے نام اس دوسری گاڑی کو بھی اس ٹیلے کی جانب جاتے دیکھا۔ لیکن اسی لمحے مسجد سے اُس کے باپ کے آواز دے کر واپس بلالیا اور ڈانٹا کہ وہ مغرب کے بعد اندھیرے میں گھر سے کیوں نکلا ہے۔

## لہو کا لباس

بچے نے باپ کے ڈر سے اس وقت اُسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی میم صاحب ٹیلے پر مٹی ہیں اور ان کے بچے نے ایک دوسرے گاڑی بھی جاتے دیکھی ہے۔ جسے کوئی اور عورت چلا رہی تھی۔ پیش امام صاحب نے آئے اور آج جب ہم بیانات لینے کے لیے گئے تو اس بات کا پتہ چلا۔ "ایس پی صاحب ضرور اثر بات کر رہے تھے۔ لیکن یہ دوسری عورت کون تھی؟ میں اور رحمن صاحب دونوں ہی اس سوچ میں تم تھے کہ جو کا گیت آپہنچا۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ میں حوالات میں بیٹھا چھوٹے سے روشن دان کی تنگ سلاخوں کی اپنے حصے کے چاند کو مستطیل ٹکڑوں میں بٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کاش ان قید خانوں میں ایسے روشن دان نہ جاتے، جہاں سے کم از کم مجھ جیسے سیاہ مقدر قیدی اپنے دوست، چاند تاروں سے تو ملاقات کر لیتے۔ کیا بد پرے جسم کے ساتھ ساتھ ہمارے نظر، سوچ اور نظریے کو بھی قید کرنے کا ایک مکمل انتظام ہوتی ہے۔ میں حوالات میں آتے ہی اپنے ہم زرد سنتری سے ملنے کے بارے میں پوچھا۔ سنتری اسماعیل ہنس کر بولا "وہ سب بچوں..... اُسے تو شام ہی کو ایس۔ پی صاحب نے رہا کرنے کا حکم دے دیا تھا۔" آج شام جب رہا ہوا صاحب تھانے آئے تو وہ بڑے ادب سے اُن سے بولا، "جناب میرا کام یہاں ختم ہو گیا۔ آپ زت دیں تو میں کوچ کر جاؤں۔" صاحب بہت ہنسے اور انہوں نے اُسے آزاد کر دیا۔ میں مایوس ہو گیا۔ نے اسماعیل سے درخواست کی "اسماعیل..... تم میرا ایک کام کرو گے؟" اسماعیل جلدی سے بولا "ہاں ضرور..... کیوں نہیں۔" "کیا تم کل صبح کہیں سے اُس ملنگ کو یہاں بلوا سکتے ہو۔ میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا تھا، لیکن تب میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ کیا تم اُسے ملوا سکتے ہو؟" حافظ جی یہ کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ وہ تو سدا کا دیوانہ ہے۔ اُس کی باتوں میں نہ آتا۔" میں سنتری کی منت کی کہ دیوانہ تو شاید میں بھی ہوں، تو کیا وہ ایک دیوانے کی ملاقات، دوسرے دیوانے سے مل کر دوائے گا۔ جانے اس وقت میرا دل اتنا بوجھل کیوں ہو رہا تھا کہ میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اسماعیل بدمعاش سا گیا "ارے ارے..... یہ کیا..... نہ عبد اللہ..... نہ..... ایسے نہیں روتے..... تم تو بہت بہادر کے ہو۔ یوں دل چھوٹا نہیں کرتے۔ میں کل صبح اُسے ضرور کہیں سے بھی تمہارے لیے ڈھونڈ کر پکڑاؤں گا۔" اب آنکھیں پونچھ لو۔" وہ مجھے کسی بزرگ کی طرح دیر تک سمجھاتا رہا۔ پتا نہیں، کبھی کبھی ہم جی کھول کر رونا اپنے ہیں، تو وہ ہی ہم سے اتنی زیادہ دور کیوں ہوتا ہے، جس کو بھگونے کے لیے ہمارے یہ آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔ اس رات مجھے زہرا کی بہت ٹوٹ کر یاد آئی۔ میں نے دل میں عہد کر لیا کہ کل صبح سلطان بابا سے مل کر زہرا کو پیغام ضرور بھیجوں گا کہ وہ کسی بھی طرح یہاں آ کر مجھ سے ایک بار مل جائے۔ میں ایک بار اپنے دل ہوش و حواس میں اُس سے ملنا چاہتا تھا۔ نہ جانے پھر کبھی مکمل فرزانگی نصیب ہوگی یا نہیں۔ ڈاکٹر کی نظر سے آج مجھے احساس ہو چلا تھا کہ میرے پاس کچھ زیادہ وقت نہیں ہے۔ میرے ذہن میں بار بار اُس

ابھی میں ایس۔ پی صاحب کے ساتھ گاڑی سے اتر کر تھانے کے برآمدے تک ہی پہنچا تھا کہ اتر تھانے کا محرر بھاگتا ہوا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ وہ جلدی سے سلیوٹ کر کے بولا "پوسٹ مارٹم کی مکمل رپورٹ آگئی ہے۔ لڑکی کے چہرے، شانے اور کمر پر جو کھر و بچیں اور خراشیں آئی ہیں اس رپورٹ کے مطابق کسی درندے کے پنجوں کے نشانات تھے۔" محرر کی بات سن کر ماحول پر ایک طاری ہو گیا۔ رحمن صاحب نے یوں مایوسی سے میری جانب دیکھا، جیسے اُن کا کچھ دیر پہلے جلا، اُمید کا ایک جھوٹے ہی سے بجھ گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کے پنجوں پر نظر ڈالی۔ مجھے یوں لگا جیسے ناخنوں سے تازہ خون ٹپک رہا ہو۔

محبوب کی یہ پیشین گوئی گونج رہی تھی کہ ”نہ تو تجھے دنیا کا عشق نصیب ہوگا اور نہ تو مالک کی محبت کا حق ٹھہرے گا۔“ پتا نہیں کیوں، لیکن وہ مجذوب میرے اندر سے جیسے زندگی کی آخری رمق، اُمید کا آخری قطرہ نچوڑ کر لے گیا تھا۔ کیا میرا یہ سفر یونہی لا حاصل ہی چلا جائے گا؟ کیا واقعی میرے حصے میں نہ تو عشق مجاز چنگاری آئے گی اور نہ ہی عشق حقیقی کی مکمل بھڑکتی آگ..... کیا میں یونہی خوا خواہ ادھر ادھر سرچک رہا تھا؟ سوچوں میں نہ جانے کب صبح ہوگئی۔ فجر کی نماز پڑھتے ہی ایک بار پھر میرا پورا جسم جلنے لگا۔ بڑی مشکل میں نے خود کو اپنا سر سلاخوں سے نکرانے سے روک رکھا، ورنہ میرے سر میں شدید درد کے جودھماکے ہوتے، اُن کا فوری حل مجھے بس یہی نظر آ رہا تھا کہ اپنا سر اس زور سے دیوار یا سلاخوں پر دے ماروں کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس میں جو بھی مادہ، اس درد کا باعث ہے، وہ بہہ جائے۔ جانے کتنی دیر میں اپنے پاؤں یونہی جکڑے بیٹھا رہا، حتیٰ کہ میری ہاتھ پیر کی انگلیاں مُڑ کر تقریباً پنج ہی گئیں۔ اسی اثناء میں اسٹاٹو چائے لیے حوالات کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور جلدی سے میری جانب دوڑا۔

عبداللہ..... کیا یہ ہو رہا ہے تمہیں..... میں نے بمشکل اپنے لب کھولے۔ ”کچھ نہیں..... تم بس جا کر اُٹھو۔“ اس سے پہلے کہ میرا ہوش جواب دے جائے۔ تم اُسے لے آؤ.....“ اسماعیل اُلٹے پاؤں بھاگا۔ میں نے تجویز کر رکھا تھا کہ آج اس جنوں کو خود پر تب تک حاوی نہیں ہونے دوں گا، جب تک مجھے کچھ سوالوں کے جواب نہیں مل جاتے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں خود اپنے ہی ماس میں اپنے دانت گاڑ دوں۔ جبرے کی انگلیوں نے مجھے اس قدر مجبور کیا کہ میں نے زمین پر ریت میں پڑا لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھا لیا۔ اسے اپنے دانتوں کے درمیان اس زور سے جکڑ لیا کہ چند لمحوں بعد ہی وہ لکڑی سے ٹوٹ کر گر گیا۔ کچھ دیر میں اسماعیل دوڑتا ہوا واپس آیا اور اُس نے بتایا کہ وہ بازار میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر تھک گیا، لیکن ملنگ دوبارہ اُسے کہیں نظر نہیں آیا، حالانکہ وہ عام طور پر اُسی بازار میں کسی نہ کسی دکان یا ہوٹل کے باہر تھوڑے چوڑے پر پڑا نظر آتا تھا۔ آج تو لوگوں نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ میری حالت تب تک قدرے سنبھلا تھی۔ لیکن میرا سارا جسم پسینے سے تر تھا اور میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ شاید مجھے پھر سے بخار ہو رہا تھا۔ اسماعیل جلدی سے تھانے دار کے کمرے سے ایک موٹی سی کھیس نما چادر اٹھا لیا، جسے میں نے اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ اسماعیل ڈھک بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا ”یہ روگ کہاں سے لگا لیا اپنی کو بابو..... ابھی تو تمہارے کھینے کھانے کے دن ہیں۔“ پھر اچانک ہی جیسے اُسے کوئی ضروری بات ”ارے ہاں، رات کو یہاں سے جانے کے بعد مجھے ایک بات یاد آئی، سوچا تھا صبح آکر تمہیں بتاؤں یہاں پہنچتے ہی تمہیں دیکھ کر سب بھول گیا۔ وہ دیوانہ جب حوالات میں تمہاری طبیعت خراب ہونے کے رہ گیا تھا، جب بار بار تمہیں خیالوں میں مخاطب کر کے بس ایک ہی بات کہے جا رہا تھا کہ ”اُس سے کبوتہ دیکھے..... مشرق کو دیکھے۔“ جانے مشرق میں کیا ہے؟ میں نے چونک کر اسماعیل کو دیکھا۔ حوالات کی

دروازہ مغرب کی جانب کھلتے تھے۔ میں جہاں قید تھا، وہاں مشرق کی جانب صرف ایک سپاٹ دیوار تھی اور باقی چھوٹا سا روشن دان تھا اور بس..... پھر بھی میں بہت دیر تک آنکھیں پھاڑے دیوار کی جانب اس اُمید سے دیکھتا رہا کہ شاید مجھے وہاں کچھ نظر آجائے، لیکن سب بے سود ہی رہا۔ کچھ ہی دیر میں سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آ گئے۔ سلطان بابا دو دن ہی میں ہسپتال کے بیمار اور غڑھال سے نظر آنے لگے تھے۔ وہ ابھی کال گڑھ والے حادثے سے ٹھیک طرح سنبھل نہیں پائے تھے کہ یہ نئی افتاد آن پڑی تھی۔ کاش ہم شیخ صاحب کے ہاں کچھ روز اور ٹھہر جاتے تو اُن کی حالت بہتر ہو جاتی لیکن یہ سب اگر ہمارے ہی بس میں ہوتا تو پھر یہ ”کاش“ لفظ ہماری لغت میں کہاں سے آتا؟ مرتضیٰ صاحب مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے لیکن سلطان بابا چپ چاپ بس میری جانب دیکھتے رہے۔ آخر کار مجھے ہی ان سے پوچھنا پڑا ”آپ کچھ کہتے کیوں نہیں..... اس طرح چپ رہیں گے تو میں اور بھی پریشان ہو جاؤں گا۔ کچھ بات کیجیے۔“ ”کیا کہوں میاں..... سوچتا ہوں تمہارا یہ امتحان کب ختم ہوگا۔ اتنی کڑی آزمائش تو شاید ہی کسی نے جھیلی ہو۔ لگتا ہے اس بار خود مجھ سے بھی کوئی سرا جھوٹ رہا ہے۔ کچھ کچھ میں نہیں آتا۔“ میں نے مختصر لفظوں میں انہیں ملنگ کی ساری بات بتا دی۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر میری سانس لے کر بولے ”وہ اب شاید کسی کو دوبارہ نظر نہ آئے۔ اگر اُس کا مقصد اشارہ دینا تھا تو وہ دے کر چلا گیا۔ اس کا کام واقعی ختم ہوا۔“ میں چاہ رہی تھی اُن سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ اگر اُس کی تنبیہ سچ ثابت ہوئی تو پھر انجام کیا ہوگا۔ میں نے دبے لفظوں میں انہیں زہرا کو پیغام بھیجے کا کہا۔ وہ بس سر ہلا کر رہ گئے۔ اتنے میں ہر اچلی سی چچی۔ پتا چلا کہ ایس بی صاحب شہر سے روانہ ہو چکے ہیں اور اب چند لمحوں میں ان کی آمد متوقع ہے۔ اس چھوٹے سے تھانے کے لیے بھی یہ ایک اُن ہوتی تھی۔ عام حالات میں ایس بی جیسا بڑا افسر شاید مال میں ایک آدھ بار ہی کسی معائنے کے لیے یہاں آیا ہوگا، لیکن ریحان صاحب کے حکومت میں انڈوسون کی وجہ سے اس تھانے کے درو دیوار گزشتہ تین دنوں سے یہ ساری گہما گہمی دیکھ رہے تھے۔ اہل کاروں کی ہینوں پرانی وردیوں کو روز کلف لگا کر چکایا جا رہا تھا۔ تھانے کے درو دیوار اور احاطے کی صبح و شام دو بار صفائی ہوتی تھی اور کچھ زیادہ صحت مند سنتری اپنی توند کو چھپانے کے لیے بیٹل کو اس کے آخری حلقے سے آگے کچھ سٹے سوراخ کر کے اور بیٹل کا فیتہ سانس گھسنے کی حد تک کس کر تھانے آنے لگے تھے۔ بکل قلعی سے جگہ گارہے تھے اور جوتے پاش سے چپکنے لگے تھے۔ ہفتوں کی بڑھی جھامت روزانہ بننے لگی تھی اور سارے رگروٹ صبح کیسے اپنی گردن پر موٹی مشین پھروا کر اور سارے بال اڑا کر آنے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایس۔ بی صاحب تیزی سے تھانے میں داخل ہوئے۔ تھانے دار نے سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب کو پہلے ہی برآمدے میں ٹھہرا دیا تھا۔ آج ایس بی کا رخ خلاف معمول سیدھا حوالات کی جانب تھا۔ وہ سلاخوں کے قریب آکر اُڑھائے ہوئے لہجے میں بولے ”آئی جی نصیر صاحب سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“ میں نے چونک کر انہیں دیکھا



خراشوں اور ناخن کے کھردھوں کے جوشانات تھے، وہ میرے خون اور گزشتہ شام لیے گئے میرے ناخنوں سے مواد سے مائل نہیں رکھتے۔ گویا فی الحال میں ایک فوری نوعیت کے شک سے پھر باہر نکل چکا تھا۔ انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اشرف نے جو کچا پکا حلیہ اُس دوسری عورت کا بتایا تھا، اُس کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش بھی جاری ہے، لیکن چونکہ ایک بچے کی یادداشت اور منظر نگاری بہر حال اتنی پختہ نہیں ہو سکتی تھی لہذا ابھی کچھ مشکلات کا سامنا تھا۔ لیکن رحمن صاحب پُر امید تھے کہ پولیس جلد درست خطوط پر کیس کی تفتیش شروع کر دے گی۔ وہ ہمیں رخصت کرنے خود تھانے کے محکم تک آئے اور سلطان بابا کے لاکھ انکار کے باوجود اپنے ذرا نیور کو ہدایت کی کہ وہ ہمیں بستی چھوڑ آئے۔ شاید اس ہدایت کے پیچھے کہیں نہ کہیں اُن کی یہ خواہش بھی کارفرما تھی کہ بستی سے مجھے جھکڑیاں لگا کر گرفتار کر کے لاتے وقت بستی والوں کی نظر میں میرے مجموعی تاثر میں جو بگاڑ پیدا ہوا تھا، اس کی کچھ تلافی تو ممکن ہو۔ ہم انسان ہوتے ہی اتنے ظاہر پرست ہیں کہ ہماری عزت اور ذلت کے پیمانے اسی قدر سطحی اور ناپائیدار بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے رحمن صاحب کا یہ کلیہ سولہ آنے درست ثابت ہوا اور ہمیں ایس۔ پی کی گاڑی سے اترتے دیکھ کر بستی والوں کے دل میں اگر کوئی رہا بہا شک باقی بھی تھا، تو جاتا رہا۔ ویسے بھی یہ سیدھے سادے پھیروں کی بستی تھی اور یہاں کے لوگ رشتوں کے معاملے میں زیادہ بھاؤ تاؤ کے قائل نہیں تھے۔

اشرف کو اسکول سے آتے ہی جب یہ پتا چلا کہ میں واپس آ گیا ہوں تو وہ دوڑتا ہوا مسجد آ پہنچا۔ میں مسجد سے ذرا فاصلے پر کھجور کے تین چار جڑے ہوئے درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھا ہوا تھا۔ اشرف مجھے کچھ بتانے کے لیے بے چین تھا، لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ہی ظہر کی نماز ختم ہوئی تھی اور دو چار نمازی مجھ سے ملنے کے لیے کچھ دیر رُک گئے تھے، لہذا اُن کے جانے تک اشرف ریت میں گھروندے بنانے کا کھیل کھیلتا رہا اور پھر جیسے ہی آخری نمازی مجھ سے رخصت ہوا وہ جلدی سے لپک کر میرے قریب آ گیا۔ ”پتا ہے..... کل وہ پتنگ والے صاحب آئے تھے شام کو وہاں۔ میرے لیے بہت سی پتنگیں بھی لائے تھے۔ پر میں نے چھپ کر دیکھا تھا۔ وہ رو رہے تھے اُس جگہ بیٹھ کر۔“ میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اُس بد نصیب کو تو اب تمام عمر روتا تھا۔ ”اور پتا ہے..... وہ زور زور سے کسی کو کہہ رہے تھے کہ تم نے اچھا نہیں کیا..... یہ تم نے اچھا نہیں کیا..... پر طالب ملی..... وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔“ میں زور سے چونکا۔ اشرف مجھے طالب اور سلطان بابا کو بڑے مولوی جی کہتا تھا۔ لیکن آخر یہ ریحان کس سے خود کلامی کر رہا تھا۔ کس نے، کیا اچھا نہیں کیا۔ میں نے اشرف کو زیادہ کریدنا تو ٹھنڈا کچھ میں آیا کہ ریحان عموماً جب کبھی وہاں آتا تھا تو خود کلامی ضرور کرتا تھا۔ دنیا کے زیادہ تر بڑے اور کامیاب انسان اندرونی طور پر شدید تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کے آس پاس عبلہ تو سینکڑوں اور ہزاروں میں ہوتا ہے لیکن ایک دوست کی کمی انہیں سدا پریشان کرتی رہتی ہے، اُن میں سے بہت سے اس خود کلامی کے مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید ریحان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ شام تک دو چار مرتبہ میری

”کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن بہت مہربان ہیں وہ میرے۔“ رحمن صاحب پشیمانی سے بولے ”عجب لڑکے ہیں بھی۔ تم نے اتنے دن سے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم..... میرا مطلب ہے تم کم از کم کوئی اشارہ ہی دے دیتے۔“ میرے منہ سے اچانک بے اختیار ایک تلخ بات نکل گئی ”کیا ایسا کوئی اشارہ دینے سے میرے جرم کی نوعیت بدل جاتی.....؟“ وہ چونکے ”نہیں..... لیکن شاید میں اتنا شرمندہ نہ ہوتا جتنا آج صبح اُن کے فون کے بعد ہوا۔“ لیکن میں نے تو اُن سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ یہ بات تو آپ خود بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔“ ہاں، ہاں ہوں، لیکن شاید تمہارے بزرگ نے اُن سے رابطہ کیا ہے۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئے۔“ تھانے دار نے جلدی سے ایس پی صاحب کو بتایا کہ اس نے ایس پی کے معائنے کی وجہ سے میرے دونوں ملاقاتیوں کو پچھلے برآمدے میں بٹھا رکھا ہے۔ رحمن صاحب نے جلدی سے انہیں اندر لانے کو کہا۔ تھانے دار خود بھاگ گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم چاروں تھانیدار کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رحمن صاحب بہت اُلجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ”یقین جانیں۔ یہ میری زندگی کا پہلا کیس ہے اور پہلا موقع ہے کہ میں ایک ہی دن میں کئی گیارہ حیرت کے اتنے شدید جھٹکوں سے دوچار ہوا ہوں۔ آپ لوگ پہلے ہی نصیر صاحب سے اپنا ناتا بتا دیتے۔“ میرے نہایت قابل احترام اُستاد ہیں۔ میں نے اکیڈمی میں اُنہی کی سرپرستی میں ٹریننگ لی تھی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، اُنہی کی وجہ سے ہوں۔ اور آج صبح سویرے جب اُن کی کال آئی تو یقین چاہیے، میں دل ہی دل میں بہت نادم ہوا۔ اس تمام عرصے میں میرے کسی بھی برتاؤ سے آپ کو جو بھی کوفت ہوئی ہو، میں اس سب کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ سلطان بابا بولے ”آپ نے کچھ بھی ایسا برتاؤ نہیں کیا جو آپ کے فرض کے دائرے سے باہر ہو اور پھر چرچ تو یہ ہے کہ اگر عبداللہ میاں کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی تو شاید نصیر صاحب تک میری عرضداشت کبھی نہ جاتی۔ اس جیسے نہ جانے اور کتنے الزام کتنے کلک لگنا ابھی باقی ہیں۔ کہاں ہر بار نصیر صاحب کو زحمت دیتے پھریں گے، ہم، لیکن اس بار معاملہ کچھ اور تھا لہذا انہیں درمیان میں لانا ہی پڑا۔ اُمید ہے آپ اس سفارش کا بُرا نہیں مانیں گے۔“ رحمن صاحب گڑبڑا کر بولے ”نہیں..... ہرگز نہیں..... یقین چاہیے، یہ سب میرے لیے بہت عجیب ہے۔ اتنا اختیار رکھنے کے باوجود اگر کوئی اتنی تکلیف جھیلے تو اُسے سچائی کی دوسری سند کی ضرورت ہی کہاں باقی رہتی ہے۔ آپ میں سے کوئی بھی ذاتی چٹکے بھر کر عبداللہ کو ضمانت پر لے جاسکتا ہے۔ ہاں، بس اتنا خیال رکھنا ہوگا کہ جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی اسے علاقے ہی میں موجود رہنا ہوگا۔ میں ذاتی چٹکے کے تکلف میں بھی نہ پڑتا کہ نصیر صاحب کی ضمانت میرے لیے دنیا کی کسی بھی ضمانت سے بڑھ کر ہے، لیکن آپ جانتے ہیں، سرکاری قواعد و ضوابط بھی میرے پاؤں کی بہت سی زنجیروں میں سے ایک ہیں۔“

مرقعنی صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے بستی کے پیش امام کی حیثیت سے ایک چٹکے بھر دیا اور اس پر اپنے دستخط اور انگوٹھے کی مہر ثبت کر دی۔ جاتے جاتے رحمن صاحب نے ایک اور خبر سنائی کہ لڑکی کے چہرے اور جسم

طبیعت بگڑی اور پھر سنبھل بھی گئی، لیکن اس دھوپ چھاؤں کے کھیل نے مجھے نڈھال کر ڈالا، لہذا مغرب کے بعد میں کچھ دیر کے لیے مسجد کے حجرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس دوران سلطان بابا لگا تار مجھے سادہ پانی پر کچھ دم کر کے پلاتے رہے اور میرے اندر کی جلن کو اس پانی سے قدرے سکون بھی ملتا رہا۔ درمیان میں حکیم صاحب بھی آئے تھے اور انہوں نے بڑی عجیب سی بات بتائی کہ کچھ گھاؤ اور کچھ زخم بظاہر بھر جانے کے باوجود اس خاص مدت میں ایک بار پھر نہیں پکڑ لیتے ہیں، جب وہ تاریں اور وہی خاص وقت پلٹتا ہے، جس میں ماضی میں ہم نے وہ زخم یا چوٹ کھائی ہوتی ہے۔ ان میں کچھ زخم سہ ماہی، ششماہی اور کچھ تو سال بھر کے بعد بھی دوبارہ ہرے نہ بھی ہوں، تب بھی اپنی پوری کمک اور بے چینی کے ساتھ پلٹتے ہیں۔ اُن کے اس کلیے کی زد سے مجھے پچھلے ماہ انہی تاریخوں میں یہ زہریلے گھاؤ لگے تھے اور کتوں کا زہر میرے جسم میں پھیلا تھا۔ بروقت ملی دوا اور ویکسین کے ٹیکوں نے وقتی طور پر میری جان تو بچالی لیکن ان دردندوں کے خون خوار جڑوں کا زہر میرے خون کے خلیوں ہی میں دوا اور ویکسین سے بچنے کے لیے اپنے ہی بنائے کسی حفاظتی خول میں جا کر چھپ گیا تھا اور اب ٹھیک اُسی وقت اور تاریخ کو تیس دن کا عرصہ گزرتے ہی وہ پھر سے میرے اعصابی نظام پر حملہ آور ہوا تھا۔ گویا اس زہر نے اپنے دائرے کو مکمل کرنے میں مبینہ بھر کا عرصہ لیا تھا اور یہ حملہ اب ہر ماہ انہی تاریخوں میں اور اسی خاص وقت پر میرے اعصابی نظام کو تباہ کرنے کے لیے ہوتے رہیں گے۔ بظاہر ایلوپیتھی اور جدید طب میں اس کی وجہ اور مثال ڈاکٹروں کو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی، پر بقول حکیم صاحب ان کی سات شلیں حکمت ہی کے پیشے سے وابستہ رہی ہیں اور وہ اپنی پرانی حکمت کی کتابوں میں موجود مستند تفصیل پڑھنے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ انہی سوچوں میں گم نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی ہماری نیند اس قدر بے چین اور جھکی ہوتی ہے کہ ہم سوتے وقت بھی خود کو جاگتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو بند آنکھوں کے پردے تلے بھی ہمیں اپنے آس پاس ہوتی حرکات کا ادراک ہوتا رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت میری بھی تھی۔ جانے وہ خواب تھا یا سراپا..... لیکن میں نے اپنی بند آنکھوں کے پہوٹوں تلے ایک عورت کی شبیہ غبی محسوس کی۔ میں بے چینی سے کسمایا، لیکن اُس عورت کی تصویر بنتی چلی گئی۔ عجیب سی سفاکی تھی اُس کے چہرے پر۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے پہلے بھی اُسے کہیں دیکھا ہے..... کہاں.....؟ وہ بیک وقت میرے لیے بے حد اجنبی اور بہت شناسا چہرہ تھا۔ اور وہ عجیب سی سفاکی لیے میزی جانب گھور ہی تھی۔ میری ریزھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی اور خوف کے مارے جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

کچھ دیر تک تو مجھ سے حرکت بھی نہ ہو سکی۔ وہی عجیب سی کچکی میرے سارے وجود پر طاری تھی۔ میں نے سنا تھا، ہم جس بات کا بوجھ اپنے ذہن پر لیے بستر پر جاتے ہیں، وہی واقعہ ٹھیک اُسی طرح ہمارے خواب میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ایس بی صاحب کی زبانی جب سے ایک دوسری عورت کا اس قصے میں ذکر سنا تھا، تب سے شاید وہی عورت میرے حواس پر بھی سوار تھی۔ تبھی میں سوتے میں بھی اُس کے ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک

مجھے دور سے کسی چھوٹی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ہوا کا رُخ بدلا اور آواز غائب ہو گئی۔ میں لپک کر حجرے سے باہر نکلا۔ دُور اُسی پہاڑی ٹیلے پر کسی گاڑی کی روشنیاں مجھے نظر آئیں۔ میرے قدموں میں جیسے بجلی سی بھر گئی اور میں اس جانب دوڑا۔ دُور سے میں نے کسی عورت کی پشت دیکھی۔ اس کی لمبی چوٹی کمر پر لہرا رہی تھی اور وہ سمندر کی جانب منہ کیے کھڑی تھی۔ گاڑی کی پارکنگ والی بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ میرے سامنے قدموں کی آواز پر وہ گھبرا کر پلٹی اور چند لمحوں کے لیے تلکجے سرخ اُجالے میں اُس کے چہرے پر میری نظر پڑی۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ یہ وہی عورت تھی، جسے کچھ دیر پہلے میں نے اپنے ذہن کے پردے پر دیکھا تھا۔

## آدھا چہرہ

جن صاحب کے ہاتھ میں تھی، جسے وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ”حیرت ہے..... اگر یہ وہی عورت تھی، جس کی تلاش میں ہم در بدر بھٹک رہے ہیں تو پھر اس کی ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی اور میں یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ میں بھی روایتی پولیس والوں کی طرح تفتیش میں الجھ کر اور ہر طرف بال بچا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ جب کہ سب سے اہم لیکن غیر متوقع جگہ پر ناکہ لگوانا بھول گیا۔ میرے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اگر کوئی اور عورت بھی اس کیس کا مرکزی کردار ہے تو وہ واپس یہاں بھی آ سکتی ہے۔ ضرور اس جگہ میں کوئی خاص بات ہے، جو بظاہر ہمیں محسوس نہیں ہوئی، لیکن اس کی کیس کے باقی کرداروں کے لیے کوئی نہ کوئی شدید جذباتی اہمیت ہے۔ اب شاید وہ دوبارہ یہاں نہ آئے، کیوں کہ وہ جان چکی ہے کہ وہ لوگوں کی نظروں میں آگئی ہے۔ لہذا اب ہمیں خود اس کے پیچھے جانا ہوگا۔“ جن صاحب نے گاڑی کا حلیہ اور عورت کی شبیہ کی تفصیلات مجھ سے کئی بار پوچھیں۔ نمبر میں نوٹ نہیں کر پایا تھا، کیوں کہ میرا فاصلہ گاڑی سے بہت زیادہ تھا۔ البتہ گہرے نیلے یا سیاہ رنگ کی ایسی مارک ٹو گاڑیاں تو شہر میں نہ جانے کتنی ہوں گی۔ بہر حال، جن صاحب کے نقطہ نظر سے یہ کیس میں بڑی پیش رفت تھی اور شام ڈھلنے تک اس مقام والوں پر مختلف پولیس والوں کا آنا جانا برقرار رہا۔

اس وقت بھی سورج ڈھلنے کے قریب میں ڈور ریت پر بیٹھا تھا نے دار کو اپنے محر کو کچھ تفصیلات لکھواتے ہوئے دیکھ رہا تھا، شاید وہ دتوے کا نقشہ پھر سے بنارہے تھے۔ تھانے دار کی آواز مجھ تک آرہی تھی۔ محر نے کچھ غلط لکھ ڈالا۔ تھانے دار چلایا ”میں نے کہا تھا مشرق کی سمت سے نشانی ملی..... مشرق کی سمت سے..... سمجھ نہیں آتا کیا.....؟“ اور ٹھیک اُسی لمحے میرے کان میں اسماعیل سنتری کی آواز گونجی۔ ہاں اس نے بھی تو یہی بتایا تھا کہ وہ مجذوب میرے لیے یہی پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں مشرق کی سمت دیکھوں، اور مجھے پہلی نشانی مشرق ہی میں ملی تھی۔ جانے یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ رات جب میں اُس عورت کو دیکھنے کے بعد واپس حجرے میں پہنچا تو سلطان بابا میری تلاش میں نکلے ہی والے تھے۔ میں نے انہیں اپنے خواب اور پھر اُس عورت کے بارے میں بتایا کہ جس ہیولے کو چند لمحے پہلے میں نے بند آنکھوں کے پردے تلے دیکھا، وہی کچھ دیر بعد میرے سامنے حقیقت بن کر کھڑا تھا۔ سلطان بابا میری بات ختم ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک میری جانب دیکھتے رہے۔ ”جانتے ہو..... یہ تمہارا پہلا الہام تھا۔ آج تک تمہیں جو کچھ نظر آتا رہا، وہ ماضی میں ہو چکا تھا اور اکیلا کہتی ہے سائنس کی ڈائی پولر تھیوری آف گر پوٹی..... اس کے مطابق وہ سب صرف بنی ہوئی اور گزری ہوئی تصویروں کے فریم ہوتے تھے، لیکن اب جو تم نے دیکھا وہ ماضی نہیں مستقبل تھا۔ لگتا ہے تمہاری ریاضت نول ہو رہی ہے عبد اللہ میاں..... جیتے رہو۔“ مجھے دعا دیتے وقت اُن کے آنکھوں میں نمی اور میرے سر پر رکھا ہاتھ لرز رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ تھانے دار اور محر نے اپنا کام ختم کر لیا اور جاتے جاتے مجھ سے کہا کہ میں آئندہ کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کروں تو فوراً ہستی کے پوسٹ آفس سے مای خفیل تھانے کے نمبر

کچھ لمحے وہ مجھے اور میں اُسے یونہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ ٹیلے پر بہت اندھیرا تھا اور پھر منظر میں ساحل پر پہلی چاند کی قدرتی روشنی اس چوٹی کو مزید تاریک بنا رہی تھی۔ اگر اس چھوٹی مارک ٹو کار کی پارکنگ والی بتیاں روشن نہ ہوتیں تو میں اتنی دُور سے شاید اُس کا چہرہ بھی نہ دیکھ پاتا۔ گاؤں کے ارد گرد روشن ایک سرخ ہالہ سا بنا ہوا تھا اور اسی ہالے میں مجھے اُس کے چہرے کی دھیمی سی لیکن بے حد سفاک جھلک نظر آنے لگی۔ نہ جانے اُس چہرے میں ایسا کیا تھا کہ میرے ریڑھ کی ہڈی پر گردن کی پشت سے ہوتی ہوئی سرد پینے کی ایک لہری دوڑ گئی، میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اُسکے جانب آتے ہوئے دوڑتے وقت اپنے قدموں کی چاپ پر قابو نہ رکھ پایا تھا اور اسی آواز اُسے ہوشیار کر دیا تھا۔ وہ پل بھر میں ایک جھٹکے سے مڑی اور بجلی کی طرح گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اشارت کر دی۔ میں زور سے چیخا ”میری بات سنئے..... رک جائیے۔“ لیکن وہ بھلا کہاں رکنے والی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی گاڑی نے لمبا سا موڑ کاٹا اور فرارے بھرتی ہوئی وہاں سے روانہ ہوئی اور جب تک میں گاڑی کے مقام تک پہنچا، وہ اندھیرے میں تحلیل ہو چکی تھی۔ بہت دیر تک تو میں اپنی بھول سانسوں پر قابو ہی نہیں پاسکا۔ گاڑی جا چکی تھی اور اب صرف اس کے پیروں کے نشانات ہی وہاں باقی رہ گئے تھے۔ یہ ٹھیک وہی جگہ تھی، جہاں سے پولیس کی تفتیش کے مطابق لپٹی نیچے گری تھی یا اُسے دھکا دیا گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر چٹانوں کے نیچے جھانکا تا کہ میں وہ قاتل گہرائی دیکھ سکوں، جس نے ایک معصوم جان لی تھی اچانک مجھے زوردار چکر آیا اور مجھے لگا کہ میں خود بھی چند لمحوں میں اسی گہرائی کا شکار ہو جاؤں گا لیکن بھلا! قریب نکلی چٹان کے ایک پتھر کا جولوہراتے وقت میرے ہاتھ میں آگیا اور میں اُسی کا سہارا لے کر زمین پر پڑ گیا۔ مجھے کبھی بھی اُونچائی کے خوف (Height Phobia) کا عارضہ لاحق نہیں رہا۔ لیکن آج میں نہ جانے اُونچائی کیوں جھیل نہیں پار رہا تھا۔ میں اکثر خواب میں خود کو کسی اُونچی جگہ پر محلق یا پھر اُونچائی سے خود کو گرتے ہوئے محسوس کرتا تھا اور ہر بار میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ آج یوں لگا جیسے وہ خواب سچ ہونے کو تھا۔ یاد آ یا کہ اسپتال والے سینئر ڈاکٹر نے رسیہ کی ایک علامت ”اُونچائی کا خوف“ بھی بتائی تھی۔ میں نے آ پاس نظر دوڑائی تو مشرق کی سمت میں کوئی چیز ریت میں پڑی چمکی نظر آئی۔ میں نے اُسے اٹھایا تو سرخ رنگ کی ایک پتلی نوک وار ہیل تھی۔ اوہ گویا وہ ہراساں عورت اپنی جوتی کی ایڑی تڑوا کر جلدی میں یہیں چھوڑا تھی۔ اگلے روز ٹھیک اسی جگہ میں جن صاحب اور اُن کی ٹیم کے ہمراہ کھڑا تھا اور وہ سرخ جوتی کی ایڑی

پرفون کر کے بتادوں۔ سورج ڈھلتے ہی سب علمہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس انتظار میں تھا کہ میں دیوار کے نقشے سے ہٹ کر اُس کی تصویر کو دیکھ اپنا حتیٰ فیصلہ سناؤں، لیکن اس نے جو اس میرے قابو ہی میں کب تھے۔ محرر کب کا چائے رکھ کر جا چکا تھا، جواب پانی ہو چکی تھی۔ میں نے نظر ڈالی۔ مصور اصل چہرے سے بہت قریب تھا۔ میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ایسا ہی ایک میرے لیے بھی بنا دے۔ مصور نے بنا کسی پس و پیش کے ہو بہو ویسا ہی دوسرا خاکہ بنا کر میرے ہر کردار اور ایک بار پھر اس آدھے چہرے کے خاکے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میری اُس عورت نے بھی کہیں نہ کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔ کاش میں اُسے بروقت پہچان پاتا۔

میرے بستی پہنچنے پہنچنے عصر کا وقت بس نکلنے کو تھا۔ نماز پڑھ کر جب میں مسجد سے باہر آیا تو دُور آسمان پر نے دھانی رنگ کی ایک پتنگ اڑتے ہوئے دیکھی۔ نیچے ساحل پر اشرف اپنے دوستوں کے ساتھ خوشی رٹا پتنگ کو ڈھیل دیئے جا رہا تھا اور اُس کی دھانی پتنگ، دُور آسمان میں اتنی بلند ہو چکی تھی، جہاں سے اُس کے اوپر کا ہلکا نیلا آسمان بھی دھانی رنگ اختیار کرنا جا رہا تھا۔ میں نے چونک کر دُور ٹیلے کی جانب دیکھا۔ کان کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ مجھے تھانے دار نے بتایا تھا کہ ٹھیک اسی رنگ اور ماڈل کی دوسری گاڑی نے اُن کی کو بھی کمپنی کی طرف سے دے رکھی تھی۔ ریحان حسب معمول سمندر کی طرف چہرے کیے گم صم سا تھا۔ آج اُس کے ساتھ اُس کا پرانا ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اُس ڈرائیور کو میں پہلے بھی ریحان کے ساتھ نے والی ملاقات کے روز دیکھ چکا تھا، جو بیٹھ سے ستر برس کے بیٹے کا ایک سنجیدہ اور کم گو شخص تھا۔ دل بات یہ تھی کہ میں اپنی زندگی میں اب تک جتنے بھی ڈرائیوروں سے ملا تھا وہ گفتگو کے معاملے میں دو ال پر تھے۔ یا تو بے انتہا باتونی یا پھر انتہائی خاموش۔۔۔۔۔۔ ریحان میرے قدموں کی آہٹ سن کر پلٹا۔ ”تم ہو۔۔۔۔۔۔ مجھے رحمن صاحب نے بتایا تھا کہ تمہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ چلو اچھا ہوا۔۔۔۔۔۔ پولیس ٹانگی دُور ہو گئی۔۔۔۔۔۔“ میں نے غور سے ریحان کی طرف دیکھا۔ ”مجھے پولیس کی کبھی اتنی پرواہ رہی بھی نہیں، بابا آپ کا دل بھی میری طرف سے صاف ہو گیا ہے۔“ ریحان اُسی طرح خلا میں گھورتا رہا۔ ”جو خود اپنی نکات سے بدگمان ہو، اُسے بھلا اوروں سے بدگمانی کا موقع ہی کب ملتا ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔“ ریحان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا، بلکہ اُسے اپنی تنہائی میں مداخلت نہ ہو پسند نہیں آتی تھی۔ اتنے میں اُس کا ڈرائیور گاڑی سے نکل کر ہمارے قریب آ گیا اور ریحان سے بولا۔ ”اُسے صاحب۔۔۔۔۔۔ سورج ڈھلنے والا ہے، ہماری واپسی کا وقت ہو گیا ہے۔“ ریحان کی آواز درشت تھی۔ ”میں چلتے ہیں۔۔۔۔۔۔“ لیکن میری حیرت بڑھ گئی، جب ڈرائیور نے دوبارہ اصرار کیا۔ ”نہیں چھوٹے۔۔۔۔۔۔ سورج ڈھل جائے گا۔۔۔۔۔۔ ہمیں ابھی روانہ ہو جانا چاہیے۔۔۔۔۔۔“ ریحان نے کڑی نظروں سے دیکھ لیا لیکن بادل خواستہ اُس نے اپنی گاڑی کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ ایک ڈرائیور کی ہدایت پر اُن کا گاڑی بنا چوں چراں کیے جل دینا مجھے عجیب سا لگا اور پھر سورج ڈھل جانے میں ایسی کیا بات تھی۔ ایسی

اگلی صبح رحمن صاحب کا پیغام آ گیا کہ میں تھانے آ کر اُس عورت کا خاکہ بنوادوں۔ میں بستی سے چلا واحد قدم ہی بس میں سوار ہو کر تھانے پہنچا تو زیادہ تر عملہ تھانے دار سمیت کسی چھاپے پر گیا ہوا تھا۔ آسمان بادلوں کے چند ٹکڑے ان شریر بچوں کی طرح ادھر ادھر ڈول رہے تھے، جو اسکول سے بھاگ کر کھیلانوں میدانوں میں مڑگشت کرتے پھرتے ہیں۔ خاکے بنانے والا فنکار اور محرر تھانے میں موجود تھے۔ محرر نے اپنی ہی کمرے میں بلا لیا۔ کمرہ کیا تھا چھوٹا سا کین تھا، جہاں ایک طرف میز پر ایک پرانا سا دائرہ لیس نظام ایک قدیم سانپا لے رنگ کا ٹیلی فون پڑا ہوا تھا، جس کے ڈائل کے اوپر ایک چھوٹا سا رنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ تالے کی حالت بتا رہی تھی کہ اس میں چابی تھانے کے مواقع کم ہی آتے ہوں گے۔ محرر نے مجھے فنکار کے ساتھ بیٹھا دیا اور خود چائے کا کہنے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اُس رات اُس عورت کے چہرے کا صرف دایاں حصہ ہی دیکھا تھا، وہ بھی سرخ لکچھ اندھیرے میں، چہرے کا بایاں حصہ نقاب اور اندھیرے میں چھپا ہوا تھا، لہذا میں احتیاط سے سوچ سوچ کر مصور کو اُس عورت کے خدوخال اپنی یادداشت کے مطابق بتا رہا تھا، جسے وہ تیزی سے کاغذ پر پنسل کے ذریعے اس کی صورت میں اُتار رہا تھا۔ اچانک نے اپنی جگہ سے ذرا حرکت کی اور پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ کمرے کی مشرقی سمت میں بیٹھا ہوا اُس کے ہتھ ہی میں نے دیکھا، اُس کے پیچھے دیوار پر میٹروں کی مدد سے چھوٹا ہوا ملک کا ایک پرانا سا نقشہ ہوا تھا۔ میں مصور کو تفصیلات بتاتے بتاتے بے خیالی میں نقشے میں اپنا شہر ڈھونڈنے لگا۔ اپنے شہر سے رحمن آباد پھر جبل پور، کمال آباد اور پھر کال گڑھ اور اب یہ چھوٹی سی تحصیل ماہی۔۔۔۔۔۔ میں نقشے پر خیالی انگلی اپنے سفر کی منزلوں کے نقطے جوڑتا رہا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک کونڈا لپکا۔ میں نے جلدی مٹر تین بار پھر نقشے پر ان نقطوں کو جوڑا، سلطان بابا نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ وقت ملے تو میں نقشہ دیکھ لو۔ مصور اپنے کام میں جتا ہوا تھا اُسے مجھ سے جتنی تفصیل مل سکتی تھی، میں اُسے بتا چکا تھا، میں نے زمین پر پڑ اُس کے کیونوس کے تھیلے میں سے جھانکتی بہت سی رنگ برنگی پینسلوں میں سے ایک پینسل نکالی اور اس کی سے اب تک کے اپنے سفر کے نقطوں کو جوڑا اور میری آنکھیں پھیلتی گئیں۔ ان نقطوں کو جوڑنے سے جوہ اس مٹیالے نقشے پر میری رنگین پینسل نے بنائی تھی وہ پہلے الف اور پھر لہ تک آ کر رُک گئی تھی یعنی اگر مکمل جوڑا جاتا تو اللہ کا الہ بنتا تھا یعنی حرف ہ کی تھی، جسے جوڑنے سے پورا ”اللہ“ کا نام بن جاتا۔ میرے داغ و ماغ میں جھکڑ سے چلتے لگے۔ سلطان بابا نے کہا تھا کہ انہیں ہمارے سفر کے راستوں اور منزلوں کے بار میں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ کیا قدرت میرے راستوں اور پڑاؤ کے مقامات کے ذریعے اپنا پورا نام لکھ چاہتی ہے۔ تو کیا اب تک کا میرا یہ سارا سفر پہلے ہی سے طے شدہ تھا؟ کیا یہ سفر اُسی وقت طے ہو چکا تھا، عبد اللہ نام کا یہ اعزاز ساحر کے نام کی جگہ میرے حصے میں لکھ دیا گیا تھا۔ مصور جانے کب سے خاکہ مکمل کر



ہدایت تو عام طور پر چھوٹے بچوں کے لیے ہوتی ہیں کہ شام ڈھلنے سے پہلے گھر لوٹ آنا، جب کہ بڑے بارے میں مجھے جتنا کچھ چاہتا تھا اس اعتبار سے تو وہ اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ ماں باپ عرصہ پہلے چکے تھے اور وہ اکلوتا تھا، لہذا اُس کا گھر میں انتظار کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک لیلیٰ تھی، جو اُس کی پہلی بہن کر آنے سے پہلے ہی پتہ جھڑکی نذر ہو چکی تھی۔ پھر گھر واپس لوٹنے کی یہ جلدی کیوں اپنے آپ ہی سے سوال کر کے خود ہی ان کے جواب تلاش کرتا رہا۔ سورج ڈھلنے کا تعلق اندھیرے سے تو کیا ریحان تاریکی سے خوف کے کسی اسرار میں مبتلا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں ریحان کے پیچھے جا کر دیکھ دوں اس وقت اپنے گھر ہی گیا ہے یا اُس کی کوئی اور مصروفیت ہے؟ عشاء کے بعد مرضی صاحب میرے سلطان بابا کے لیے گھر کا بنا ہوا کچھ میٹھا لے کر آئے تو اشرف بھی اُن کے ساتھ تھا۔ میں نے اشرف کو اور ہم دونوں پر آمدے میں بیٹھ گئے اور میں نے ادھر ادھر کی باتوں کے دوران اُس سے پوچھا کہ کیا پتنگ والے صاحب کبھی شام ڈھلنے کے بعد بھی ساحل کی طرف آئے ہیں۔ اشرف نے کچھ دیر سوچا اور میں سر ہلایا۔ ”نہیں ناں..... وہ تو صمیم صاحب کو بھی کبھی دیر تک وہاں نہیں رہنے دیتے تھے، حالانکہ کہ میرے کئی مرتبہ صمیم صاحب نے اُن کو بولا بھی تھا کہ ہم رات کو پتنگ اڑائیں گے اور اپنی پتنگ ستاروں تک جائیں گے، لیکن صاحب کبھی رات تک رکتے ہی نہیں تھے۔“ میں نے مصور کا بنا ہوا خاکہ اشرف کو دکھا اُس رات تم نے اسی عودت کو پہاڑی پر آتے دیکھا تھا۔“ اشرف نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہی تو تھی۔ بہت تیز گاڑی چلا رہی تھی۔“ کچھ گھنٹیاں ایک جانب سے اُلجھ رہی ہوتی ہیں تو دوسرے سے ان کی گرہیں کھل بھی رہی ہوتی ہیں۔

اگلی صبح میں نے پوسٹ آفس سے تھانے فون کر کے رحمن صاحب کے دفتر کا نمبر لیا اور انہیں فون گزارش کی کہ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے تھانے پہنچنے کی ہدایت کی اور خود بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ سیریز ڈاکٹر کی پیش گوئی کے مطابق میرے دوروں کی تعداد میں ان کے درمیانی وقفے میں روز بروز کمی ہو رہی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے مکمل جنوں سے پہلے قتل کی گتھی سلجھ جائے اور اس کے لیے مجھے اُن کی کچھ مدد کی ضرورت ہے۔ رحمن صاحب نے چونکہ دیکھا ”لیکن تمہارا علاج بھی تو ساتھ ساتھ چل رہا ہے..... پھر تمہیں اتنا پختہ یقین کیوں ہے کہ تم مکمل منزل کو پہنچ کر ہی رہو گے.....؟ بہر حال، میں ہر طرح کی مدد کے لیے حاضر ہوں..... اور یہی میرا ہے۔“ ”نہیں..... میرے لیے فرض سے بڑھ کر آپ کا ایک اور احسان ہوگا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ میری اور ریحان کی ایک ملاقات کا بندوبست کروادیں، لیکن ہماری ملاقات شام ڈھلنے کے چاہیے۔“ ریحان صاحب کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ”لیکن شام ڈھلنے کے بعد ہی کیوں..... شاید بات کا علم نہیں کہ ریحان شام کے بعد کسی سے بھی ملاقات نہیں کرتا۔ پولیس کو بھی اُس نے ہمارے

ذریعے خاص ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ مغرب کے بعد کسی شخص سے بھی نہیں ملتا، چاہے طوفان ہی کیوں نہ آجائے۔ ہم بھی اس سے زیادہ اصرار نہیں کر سکتے، کیوں کہ بڑا آدمی ہے اور اُس کی پہنچ بھی دُور تک ہے۔“ میں نے حیرت سے پوچھا ”لیکن کیا یہ بہت عجیب بات ہے..... ایک شخص مغرب ہوتے ہی دنیا کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے میں کوئی ایمر جیسی ہو جائے تو اُس سے کیسے رابطہ ہو سکے گا۔“ ”ایمر جیسی کے لیے“ اُس کے ایک پرانے ڈرائیور کا فون نمبر موجود ہے، جو مغرب کے بعد ریحان کی تمام فون کالز اور پیغام وصول کرتا ہے۔ اصل میں یہ ڈرائیور ریحان کے باپ سیٹھ غیاث کے دور کا ہے اور یہی دنیا کا وہ واحد فرد ہے، جیسے ریحان کا اعتماد حاصل ہے۔“ ”لیکن یہ معما کیسا ہے؟“ ”کچھ نہیں..... بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ویسے عام لوگوں میں یہی بات مشہور ہے کہ ریحان کو بچپن ہی سے اندھیرے کا کوئی خوف (Darkness Phobia) ہے۔ بڑے گھروں کے بچوں میں تنہائی کی وجہ سے ایسی نفسیاتی بیماریاں کچھ زیادہ اچنبھے کی بات نہیں ہوتیں۔ اور پھر آخر یہ اُس کی اپنی زندگی ہے۔ اُس کی مرضی کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد کسی سے ملے یا انکار کر دے۔ ہم اُس پر زبردستی بھی تو نہیں کر سکتے۔“ میں نے گہری سانس لی ”مطلب یہ کہ میرا ریحان سے مغرب کے بعد ملنا ممکن نہیں ہوگا۔“ ”میں کچھ ڈوٹق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ماضی کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یہ بہت مشکل لگتا ہے۔“ ”اچھا آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ مجھے شام ڈھلے اُس کے گھر تک پہنچا دیں مجھے اُس کا پتا دے دیں۔ میں اپنے طور پر اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔“ رحمن صاحب اب بھی کچھ تجھے میں تھے۔ ”ہاں..... یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے..... میرا عملہ تمہیں ریحان کے کوشی کے باہر پہنچا دے گا، لیکن میں اب بھی سمجھ نہیں پایا کہ تم اُس سے مغرب کے بعد کیوں ملنا چاہتے ہو۔ میں نے سنا ہے ریحان اپنی اس اندھیرے سے ڈرنے والی بیماری کے علاج کے لیے بیرون ملک کے بھی بہت سے چکر لگا چکا ہے اور وہاں کے اہل پائے کے معالجین سے بھی مشورہ کر چکا ہے، لیکن اُس کا مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی، کے مصداق پھیلتی ہی چلا گیا۔ مجھے ڈر ہے تمہاری اس مداخلت پر وہ ناراض ہو کر تمہارے لیے مزید مسائل نہ کھڑے کر دے۔ یاد رکھو، تم ابھی تک ضمانت پر ہو۔ تمہیں مکمل رہائی نہیں ملی۔“ ”میں جانتا ہوں، لیکن پھر بھی میں یہ خطرہ مول لینا چاہوں گا۔ میں آپ کی سرکاری مجبوریاں اور ریحان کا اثر و رسوخ جانتا ہوں۔ اسی لیے خود اپنے طور پر ایک کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ رحمن صاحب نے ہنکارا بھرا اور ٹھیک تین گھنٹے بعد مغرب سے کچھ پہلے مجھے ایک عظیم الشان کوشی کے بہت بڑے سے گیٹ کے قریب اتار کر پولیس کی جپ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

میں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مغرب کی اذان ختم ہوتے ہی گیٹ پر لگی گتھی پر اُننگی رکھ دی۔ کچھ دیر بعد غور سے انٹرکام پر کسی کی آواز ابھری ”کون ہے؟“ ”میں عبداللہ ہوں۔ مجھے ریحان صاحب سے ملنا ہے۔“ فوراً جواب ملا۔ ”وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔ آپ صبح آئیں۔“ انٹرکام پر کچھ دیر کے لیے گہری خاموشی طاری رہی۔ پھر کوئی تھکی تھکی سی آواز میں بولا ”ہاں بولو..... کیا بات کرنی ہے تمہیں؟“ یہ آواز میرے لیے اجنبی لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی عورت ریحان کی آواز میں بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

## رُوپ بہرُوپ

میں کچھ دیر تو اُس آواز کے اُتار چڑھاؤ ہی میں الجھا رہا۔ انٹرکام پر دوبارہ ڈراورشی سے پوچھا گیا ”نہ کچھ لیلیٰ کے بارے میں بتانے والے تھے؟“ ”جی..... لیکن آپ کون بول رہے ہیں؟ کیا میں ریحان صاحب بات کر سکتا ہوں.....؟“ دوسری جانب سے جھنجھلاتی ہوئی تیز آواز ابھری ”میں ریحان بول رہا ہوں، جلدی بولو تمہیں کیا کہنا ہے۔“ اس بار آواز واقعی ریحان ہی کی تھی۔ میں نے اپنی درخواست دہرائی ”کیا میں آپ سے مل کر بات نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے مہمانوں کو اس طرح دروازے ہی سے بات کر کے لوٹا دیتے ہیں؟“ دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ شاید انٹرکام رکھ دیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں گیٹ کے قریب قدموں کی چاپ ابھری اور دربان نے گیٹ کھول دیا۔ دروازے کے بالکل سامنے اندر جاتی پکی سڑک کے دونوں طرف دور تک خوب صورت بجلی کے کمان نما کھمبوں کی قطاری چلی گئی تھی اور جن پر لٹکے چھوٹے چھوٹے فانوس یوں جل رہے تھے کہ انہوں نے دودھیاروشنی کا ایک سیلاب سا بہا رکھا تھا۔ میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ کوشی میں چاروں طرف روشنی کا ایسا خاص انتظام کیا گیا تھا کہ ہر سو چراغاں جیسی کیفیت تھی۔ میں نے جس شخص کے قدموں کی چاپ سنی تھی وہ ریحان کا وفادار ڈرائیور تھا، جس کے چہرے پر ہر ہی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ لیکن پھر اپنے تاثرات چھپا کر بولا ”معذرت چاہتا ہوں، لیکن اس وقت چھوٹے صاحب کسی سے بھی نہیں ملتے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ ”چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ چاہے معاملہ کسی کی زندگی یا موت ہی کا کیوں نہ ہو۔“ ڈرائیور نے میری بات کے جواب میں دوبارہ سختی سے کہا ”ہاں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ لیکن ایسے موقعوں کے لیے میں ہمیشہ موجود رہتا ہوں۔ تم تو اسی ساحلی مسجد کے طالب ہونا۔ تو تمہارا نام عبداللہ ہے۔ تمہیں جو بھی اطلاع دینی ہے، تم مجھے دے سکتے ہو۔“ ڈرائیور نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ نکالے اور میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ شاید وہ یہی سمجھا تھا کہ میں ریحان کی حیثیت دیکھ کر کچھ پیسے بٹورنے کے لیے اتنی دُور آیا ہوں اور خاص اسی مقصد کے لیے ریحان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے نوٹا دوبارہ ڈرائیور کے ہاتھ پکڑائے ”تم غلط سمجھ رہے ہو، مجھے جو بات کرنی ہے اس کا براہ راست تعلق ریحان صاحب سے ہی ہے۔ لیکن اگر وہ واقعی اس قدر مجبور ہیں کہ مجھ سے ملنے کے لیے دروازے تک بھی نہیں آتے تو مجھے واپس پلٹ جانا چاہیے۔ ہاں البتہ ایک پیغام ضرور دے دینا کہ میں اُس عورت کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا، جو لیلیٰ کی موت کی رات پہاڑی ٹیلے پر آئی تھی۔“ میں اپنی بات ختم کر کے پلٹ گیا۔ لیکن

نے مُوتے مُوتے بھی ڈرائیور کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزرتے دیکھ لیا، حالانکہ میں نے صرف اشرف سے ہی اب تک اُس عورت کی قتل والی رات ٹیلے پر آمد کا سُنا تھا لیکن پھر بھی یہ صرف ایک اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نہیں تھا، میرا وجدان نہ جانے کیوں مجھے بار بار اس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اُس پر اسرار عورت کا اس قتل سے ضرور کوئی ایسا تعلق تھا، جس کے دھاگے لیلیٰ اور ریحان کے ماضی سے جڑے ہوئے تھے۔ میں شہر سے ساحل کی طرف جانے والی آخری بس لے کر جب ساحل پر اُترا تو عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ جانے سے پہلے میں سلطان بابا کو بتا گیا تھا، پھر بھی وہ مسجد کے باہر مجھے اپنا انتظار کرتے ملے۔ مجھے دیکھ کر اُن کے چہرے پر بشتاشی آگئی۔ ”جانتے ہو میاں..... کسی اُستاد کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی کیا ہوتی ہے.....؟“ میں اُن کا منہ عاصجہ کر مسکرایا۔ ”جب وہ اپنے کسی نالائق شاگرد کو اپنے راستے پر قدم بڑھاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ میری نالائق شاگرداؤں کی اصطلاح پر وہ بھی مسکرا دیے۔ کال گڑھ لے نکلنے کے بعد میری زیادہ تر کوشش یہی رہی تھی کہ میں سلطان بابا کی طبیعت کے پیش نظر انہیں کم سے کم زحمت دوں۔ ڈاکٹروں نے بھی انہیں سختی سے آرام کی تلقین کی تھی اس لیے میں حتی الامکان اُن کے ذہن پر کسی بھی طرح کا بوجھ ڈالنے سے احتراز کرتا، لیکن آج ان کی بات سن کر نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ سلطان بابا خود بھی دانستہ مجھے اس معاملے میں اپنا وجدان آزمانے کا موقع دے رہے تھے۔ شاید میری تربیت کا عملی دور شروع ہو چکا تھا اور اب زندگی کی گر میں مجھے خود کھولنا تھیں۔

اگلی صبح فجر کے بعد میں ساحل پر چہل قدمی کرنے چلا گیا۔ صبح کی اوس سے بھیگی ٹھنڈی ریت، پاؤں کے ٹکڑوں کو بہت بھلی لگی رہی تھی۔ مجھے حکیم صاحب نے کل ایک بار پھر گیلی ریت پر چلنے کا مشورہ دیا تھا۔ بقول اُن کے، یہ میرے کمزور اعصاب کے لیے بہت اچھا تھا۔ انہوں نے مجھے دھوپ اور گرمی سے بھی خود کو حتی الامکان بچانے کی ہدایت کی تھی۔ شاید جنون اور تپش کا آپس میں کچھ گہرا تعلق تھا۔ پھر سورج کا تابناک زمین پر بننے کے چند لمحے بعد ہی، جب ابتدائی کرنیں شریں بچوں کی طرح آپس میں لڑتی بھگرتی زمین کو سب سے پہلے چومنے کے لیے لپک رہی تھیں اور میں اپنی چہل قدمی ختم کر کے حجرے میں جانے کے لیے مسجد کی بڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا تو میں نے اچانک اپنے شام والے تیر کو ٹھیک نشانے پر لگتے دیکھا۔ دُور نیچے آتی کو لار کی سڑک پر سفید مرسیڈز دوڑتی ہوئی اُوپر پہاڑی کی جانب آرہی تھی۔ یہ مرسیڈز میں کل شام ہی ریحان کے پورچ میں کھڑی دیکھ چکا تھا۔ شاید شہر کے اندرونی راستوں کے لیے وہ یہی کار استعمال کرتا ہوگا۔ گاڑی چند لمحوں میں مسجد کے باہر ریت کے بڑے میدان میں پہنچ کر رُک گئی اور اس میں سے ریحان کا ڈرائیور برآمد ہوا۔ وہ تنہا آیا تھا۔ ”چھوٹے صاحب تم سے کل شام نہ ملنے پر معذرت خواہ ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہیں لینے کے لیے بھیجا ہے۔ تم چاہو تو ناشا وہیں چل کر کر لینا۔“ سلطان بابا گاڑی کی آواز سن کر صحن ہی میں نکل آئے تھے۔ میں نے اُن کی جانب دیکھا۔ انہوں نے رضا مندی کے اظہار میں دھیرے سے سر ہلایا۔ ڈرائیور کا نام

اس لیے میں شام ڈھلے آپ کے دروازے تک آیا تھا۔“ ریحان نے اپنے لہجے کی تلخی کو چھپانے کی کوشش کی۔ ”تجربہ میں ایک چھوٹی سی بات سمجھ کیوں نہیں آتی کہ میں شام ڈھلنے کے بعد کسی سے ملاقات نہیں میرے کاروباری حلقے میں بھی سب ہی کو یہ بات پتا ہے اور میں اپنے معمول کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔“ کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“ ریحان کی آواز بلند ہو گئی۔ ”نہیں..... میں اپنے ذاتی معاملات پر بہتر نہیں کرتا۔ بہتر ہو گا تم بھی اس موضوع پر دوبارہ بات نہ کرو۔“ میں نے واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔ ”بہتر ہے..... اگر ہم دونوں کے درمیان اعتماد کا اسی قدر فقدان ہے تو پھر میری یہاں موجودگی بھی فائدہ مند نہیں ہے۔“ ریحان نے مجھے آواز دی، ”سنو..... تم..... تم..... سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ اس کا تعلق میرے بچپن کے ایک خوف سے ہے۔ میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کسی طرح ہسٹریا پر قابو پا سکوں..... لیکن فی الحال میرے لیے اس موضوع پر بات کرنا بھی نہایت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔“ اُمید ہے اب تم مزید اصرار نہیں کرو گے۔“ میں نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ اس وقت روئے زمین پر زیادہ مجبور انسان شاید اور کوئی نہ ہو گا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یقیناً جانو، کل جب سے تمہارا پیغام ملا کہ تم لٹی کی آخری سانسوں کے شاہد ہو اور مجھے اُس کے بارے میں کچھ بتانا چاہتے ہو تو میں نے سوچا کہ میں تمہیں بتاؤں۔ تم نہیں جانتے کہ یہ محبت کس قدر ظالم اور جارحانہ ہوتا ہے۔ چاہے، اب وہ اس دنیا میں بھی نہیں رہے لیکن اُس سے متعلق ہر ذکر، ہر یاد میرے لیے پہلے سے کہیں قیمتی ہو گئی ہے۔ میں اپنی ساری دولتیں اُس کے لیے وقف کر دیتی ہوں۔ ہر یاد اپنے دل کی پٹاری میں بند کر لینا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمہیں روئے زمین پر کسی سے بھی کم نہیں ہے لیکن میں تمہیں دل سے نکلی دعا کا خزانہ تو دے سکتا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں نے تمہیں کسی سے محبت کی ہو تو آج میرے دل کا حال جان پاتے۔“ ریحان اپنی بات ختم کر دیا۔ ”میں نے تمہیں کسی سے محبت کی ہو تو آج میرے دل کا حال جان پاتے۔“ ریحان اپنی بات ختم کر دیا۔ ”میں نے تمہیں کسی سے محبت کی ہو تو آج میرے دل کا حال جان پاتے۔“ ریحان اپنی بات ختم کر دیا۔

یعقوب تھا اور وہ راستہ بھر بالکل خاموش رہا۔ میں نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ہم کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے تو دربان نے بتایا کہ ریحان صاحب کوٹھی کے پچھلے حصے میں بنے کالفر کورس میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ایکڑوں پر پھیلی ہوئی جدید وضع کی کوٹھی تھی، جس کے اندر ہی گھاس کے اتنے وسیع لان تھے کہ ایک بہت بڑے گھاس کے قلعے کو کالفر کے کھیل کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ہمارے گھر میں پاپا نے بھی فارم ہاؤس کے پیچھے ایک چھوٹا سا کالفر کورس بنوا رکھا تھا لیکن مجھے کبھی بھی اس دھیسے سے کھیل کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ یعقوب کے ساتھ گاڑی سے اتر کر پچھلی جانب جاتے ہوئے میں نے ٹینس کورٹ اور باسکٹ بال کے پینے میدان بھی بنے دیکھے۔ شاید ریحان اپنے تمام کھیلوں کے شوق گھر ہی میں پورے کر لیتا تھا۔ گھر کے اندر ہی ایک مصنوعی ندی بھی بنائی گئی تھی، جس پر بنا پل پار کرتے ہی دُور دُور بڑی بڑی چھتریوں کے نیچے ریحان اور دو افراد کا عملہ مجھے نظر آیا۔ جو ریحان کے کالفر والی چھتریوں کا بیگ اور گیند وغیرہ تھا مے کھڑے تھے۔ ریحان نے ریت کے ایک چھوٹے سے مصنوعی ڈھیر کے پیچھے پڑی گیند کو بہت احتیاط سے تاک کر چھڑی کی ضرب لگا کر اچھالا اور گیند کچھ دُور ایک چھوٹی سی ڈھلوان پر بنے ایک سفید گول سوراخ میں غائب ہوگئی۔ عملے نے ستائی جملوں سے اپنے صاحب کی پذیرائی کی۔ مجھے دیکھ کر ریحان نے چھڑی عملے کے حوالے کی اور اپنے ہاتھوں پر پہنے چھوٹے سفید دستانے بھی یکے بعد دیگرے اُتار دیئے۔ عملہ ادھر ادھر ہو گیا اور ڈرائیور یعقوب بھی ایک خاص مقام پر آکر رُک گیا۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا ریحان کے قریب پہنچا۔ اُس کے سفید کرچے جوتے گھاس پر عجیب سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اُس نے میز پر پڑے جوس کے گلاس کے اوپر سے پلاسٹک کا کور اُتارا۔ ”ناشتہ کرو گے.....؟“ ”نہیں..... میں ناشتے میں صرف ایک کپ چائے لیتا ہوں، ساتھ میں رات کی باسی روٹی کا کوئی بچا کھڑا۔“ ریحان نے جوس کا ایک لمبا سا گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اُتارا اور قریب پڑی رس بھری کی پلیٹ سے ایک تازہ رس بھری اٹھا کر اپنے منہ میں رکھی۔ ”حب معمول کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے مجھ سے نہیں، مجھ سے پرے کھڑے کسی شخص سے بات کر رہا ہو۔“ کیا مذہب کے لیے یہ جوگ لازمی ہوتا ہے؟ میں یعقوب کی کل کی پیسوں والی حرکت پر معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے رحمن صاحب نے بتایا تھا کہ تم کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ وہ تمہیں کچھ اور سمجھ رہا تھا۔ کل تم کچھ اہم بات بتانا چاہتے تھے۔ تم چاہو تو ہم کل بات کر سکتے ہیں۔“ ریحان نے اپنے اندر کی بے چینی کو اپنے سر روپے سے بخوبی ڈھانپ رکھا تھا۔ لیکن اس کے لہجے کی لرزش کو میں صاف محسوس کر سکتا تھا۔ شاید لیلیٰ اس کی ایسی کمزوری تھی، جس کا ذکر آتے ہی وہ خود اپنے بنائے پھرے پھلانگ کر اپنے خول سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا تھا، لیکن عمر بھر کی پرہیزی خادوار تاروں کو کاٹنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے غور سے اُس کے ہاتھوں کی خفیف لرزش کو دیکھا۔ ”آپ نے یہی بات گزشتہ شام کیوں نہیں سنی.....؟ میں لیلیٰ کے آخری لمحات کا واحد معنی شاہ ہوں۔ میری ذہنی حالت بھی کچھ ایسی بہتر نہیں کہ میں تمام بار کیوں کو ٹھیک طرح سے اپنے ذہن میں جمع رکھ

میرے ذہن میں بیک وقت بہت سے جھکالے ہوئے۔ مجھے آنکھیں پڑھنے کا دعویٰ کبھی نہ تھا لیکن یہ سب  
آنکھوں نے میرے اندر نہ جانے ایک ہی بل میں کتنی بصارتیں بھر دیں۔ شاید قدرت بیک وقت مجھ سے  
فرزا نگاہیں بھی رہی تھی اور میرے اندر دیوانگی کے ساتھ ساتھ ایک اُن جانی روشنی بھی کسی درز سے مستقل  
کر آ رہی تھی۔ میں دیر سے بولا ”لیلیٰ“ نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں نے اُسے معاف کیا۔“  
کے سر پر جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑے سے حملہ کر دیا ہو۔ وہ اپنا سر تھام کر وہیں کرسی پر گر گیا۔ دُور کو  
یعقوب کے ساکت وجود میں بے چینی سے حرکت پیدا ہوئی، لیکن شاید اُس کی حد وہیں تک تھی۔ بالکل غائب  
پھر اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ ریحان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور اُس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں  
جلدی نمودار ہوئیں، جیسے کوئی کسی کیلے پہنچ کر کودا دے۔ پھر جب وہ بولا تو اُس کی آواز لرز رہی تھی۔  
..... وہ کس کو معاف کرنے کی بات کر رہی تھی.....“ ”یہ تو میں نہیں جانتا۔ شاید اُسی اُن جان عورت کو جسے  
رات پہاڑی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔“ ریحان بالکل ہی چپ ہو گیا۔ میرے مزید وہاں کو  
رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اب ریحان کو لیلیٰ کی یادوں کی بارات کو ڈولی چڑھانے  
گھنٹوں لگ جائیں گے۔ میں نے یعقوب سے کہا کہ وہ اپنے صاحب کا خیال رکھے، میں بس نے لیلیٰ  
جاؤں گا۔ واپسی پر آتے ہوئے میں تھانہ ماہی کے اسٹاپ پر اتر گیا۔ اسماعیل سنتری کے پاس کچھ دیر بیٹھا  
واپس بستی آ گیا۔ جانے اُس دن گرمی ہی کچھ زیادہ تھی یا پھر خود میرا ہی دم، جس سے گھٹا جا رہا تھا۔ وہاں  
عجیب سی بے چینی چاروں طرف سے مجھے گھیر رہی تھی، جو مجھے ہمیشہ یہ احساس دلاتی رہی تھی کہ کونسا  
ہونے کو ہے۔ شام تک میں بالکل ہی غڈ حال ہو چکا تھا۔ مجھے سلطان بابا نے بتایا تھا کہ پیش گوئی، الہام  
وجدان کا خود بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ منوں اور نٹوں جیسا وزنی اور ہمارے کوئل انسانی وجود پر ایسے لمحات جا  
گراں اور بھاری گزرتے ہیں تو کیا میرے شانوں کو بھی اس وجدان کا بھاری وزن تو زور ہا تھا۔ آج پہلی  
رات تھی، لہذا اساتل پر اور پہاڑی ٹیلے پر غیر معمولی چہل قدمی تھی۔ کافی خاندان چھوٹے بچوں سمیت سالانہ  
سیر کو آئے ہوئے تھے۔ مغرب سر پر آگئی تھی لیکن ابھی تک کافی لوگ ساحل کی اس ویران پٹی کے  
گرد بکھرے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد میرے اندر کی بے چینی نے مجھے ستایا تو میں ٹیلے کی چوٹی کی جانب  
گیا۔ ملگجا اندیر چھایا ہوا تھا۔ لوگ ادھر ادھر فاصلے پر ٹولیوں میں بیٹھے ہنس بول رہے تھے، مشروبات پلا  
تھے، اپنے بچوں کے ساتھ دل بہلا رہے تھے۔ میں اُن سب سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا اور دُور پہاڑی سے  
جھاگ اُڑاتے سمندر کو دیکھنے لگا۔ وہی سمندر، جس کے دوسرے کنارے پر زہرا رہتی تھی۔ جانے کتنے  
بابا نے اُسے میرا پیغام بھیجا ہوگا یا نہیں۔ میرے اندر زہرا کو براہ راست مخاطب کرنے کی جھجک آج بھی  
اُڑل کی طرح موجود تھی۔ اندیرا بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے کسی نے پشت پر موجود ٹیلے کے پیچھے سے دیر  
سے آواز دی ”عبداللہ.....“ میں چونک کر پلا، لیکن اندیرے کی وجہ سے مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میں اپنا

کر پھر سے سمندر کی جانب متوجہ ہوا۔ اس بار آواز زیادہ واضح تھی۔ ”عبداللہ۔“ عجیب سی کراخت، لیکن نسوانی  
آواز کے تعاقب میں، میں نے ایک بار پھر اندیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی اور پھر اگلے ہی  
لمحے میرے سارے جسم کا خون ایک ہی بل میں میری نسلوں میں جم گیا۔ اپنا آدھا چہرہ سرخ پلو میں چھپائے  
اور اپنے وجود کو ایک بڑی سی چادر میں ڈھکے وہ چٹان کی آڑ میں کھڑی تھی۔ ہاں..... یہ وہی تھی، جسے اُس رات  
میں نے اس جگہ اپنی سرخ سینڈل کی ایڑی ٹوٹی چھوڑ کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جس کی  
حاش میں پولیس در بدر بھگ رہی تھی اور جسے لیلیٰ کے قتل کی رات چوٹی کی جانب آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ وہ  
اس طرح چھپ کر کھڑی تھی کہ کچھ دُور موجود ایک خاندان کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑ سکتی تھی کہ وہاں کوئی  
اور موجود ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اندیرا گہرا ہو چکا تھا اور ہماری باتوں کی آواز بھی بمشکل ہی وہاں تک پہنچتی۔  
میرے حواس ابھی تک جامد تھے۔ ”تم اُس روز بھاگ کیوں گئی تھی.....؟“ وہ غرائی ”میرے پاس ان باتوں  
کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ ریحان سے دُور رہو۔ تمہارا اس معاملے  
سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالو، ورنہ جہاں ایک جان گئی ہے، وہاں دوسری بھی جاسکتی  
ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیا ”تو میرا شک صحیح ہے۔ لیلیٰ کی موت تمہارے ہاتھوں ہوئی ہے۔“ وہ دہلی آواز  
میں چلائی۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا، جیسے وہ آواز بگاڑ کر بول رہی ہے۔ ”تم اپنے کام سے کام رکھو  
بولی..... اور تم نے ریحان سے جھوٹ کیوں بولا کہ اُس رات لیلیٰ نے تم سے کوئی بات کی تھی۔ میں اسی ٹیلے پر  
بوجود تھی جب وہ نیچے گرئی تھی۔ اس وقت نیچے کوئی نہیں تھا۔ میں نے اُسے نہیں مارا۔ لیکن اگر وہ میرے اور  
ریحان کے درمیان آنے سے باز نہ آتی تو میں واقعی اسے ختم کر دیتی۔ اُس کی آواز میں اس قدر سفاکی تھی کہ  
اب اندر تک لرز کر رہ گیا۔ اُس نے آج بھی اپنا آدھا چہرہ پوری طرح ڈھک رکھا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے  
اس کی شخصیت میں کسی بڑی سی احساس ہو رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر غرائی ”میں تمہیں آج آخری بار تنبیہ کرنے  
آئی ہوں کہ اگر تم نے دوبارہ ریحان کے دل میں اس منحوس لیلیٰ کی محبت چمکانے کی کوشش کی تو اگلا نمبر تمہارا ہی  
دگا۔“ اچانک تین چار بچے اپنی گیند کے پیچھے پیچھے چوٹی کی جانب دوڑے اور ان کی مائیں انہیں روکنے کے  
لیے ان کی طرف لپکیں۔ جو بچی چند لوگ ہمارے درمیان حائل ہوئے اور ایک لمحے کے لیے میری توجہ بٹی تو میں  
نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ کسی چھلاوے کی طرح وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں فوراً بھاگ کر چٹان کے پیچھے  
نچا۔ مجھے دُور اندیرے میں ایک ہیولا تیزی سے دوڑتے ہوئے اُس جانب بڑھتا نظر آیا، جہاں کچھ لوگوں کی  
اڑیاں پارک تھی۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں جلدی میں اُس کی جانب دوڑا۔ آج وہ  
کی دوسری گاڑی میں آئی تھی۔ شاید اُسے پولیس کے پہرے کا اندازہ ہو گیا تھا، لیکن وہ شاطر تھی۔ اُس نے  
اصل پر آنے کے لیے ہفتے کی شام کا انتخاب کیا تھا، جب ویک اینڈ منانے کے لیے شہر کے بہت سے  
مراٹے اس پوائنٹ کا رخ کرتے تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اشارت کر چکی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اُس



کی گاڑی فرمائے بھرنے لگی۔ دفعتاً مجھے اندھیرے میں ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل ریت پر گر گیا۔ اٹھتے وقت میری نظر ریت میں دھنسی ایک چھوٹی سی چیز پر پڑی اور میری آنکھیں پتھر ہو گئیں۔ میں وہیں ڈھے گیا۔ میرا جان چکا تھا کہ وہ عورت کون تھی۔

## ہم زاد

اس رات میں ایک پل کے لیے بھی پلک نہیں جھپکا پایا۔ زندگی کے کتنے زاویے اور محبت نامی اس بات کے کتنے رُخ ہو سکتے ہیں۔ شاید یہ بتانا ہم میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ کم از کم میں نے تو ایہ سوچ کر آخری صفحہ پلٹا کہ شاید یہ باب بند ہوا، ٹھیک اسی لمحے خود کو پھر سے پہلے صفحے پر پایا۔ اگلی صبح ڈاک خانہ کھلتے ہی سب سے پہلا فون رحمن صاحب کو کیا اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں تھا نہ ماہی میں ہمارے بیٹھا تھا۔ میری بات سن کر اُن کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ حسب معمول اُن کا چہرہ سگریٹ کے دھواں کے پار دھند میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ ”تم جانتے ہو، تم جس جگہ مجھے رات کو چھاپے مارنے کا کہہ رہے لوں میں باقاعدہ اجازت لے کر جانے کے لیے بھی نہ جانے کتنے ایوانوں کی گھنٹیاں ہلاتا پڑتی ہیں۔ یہ اجازت ملنا تو دور، اس بات کا ذکر کرتے ہی سخت سنا کر تبادلہ کر دیا جائے گا۔“ لیکن آپ نے عرصے کی نوکری میں چند افسران بالا تو ایسے ہوں گے، جن پر آپ کا بھرم اور اعتماد قائم ہوگا۔ کیا آپ کی مدد کے لیے نہیں پکار سکتے۔ آپ بہر حال اپنا فرض ہی تو پورا کریں گے یا پھر محکمہ آپ کو صرف وہاں اُن کی اجازت دیتا ہے جہاں کارروائی کرنے سے کسی ایوان کی گھنٹی نہ بیتی ہو۔“ رحمن صاحب نے ایک ٹل لے کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ”بات تلخ ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ ہماری اُن دیکھی حدیں لیا سے مقرر ہیں۔“ وہ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں گم رہے اور پھر ایک لمبی سانس لے کر بولے ”ٹھیک ہے نا یہ جو ابھی کھیل لیتے ہیں۔ مجھے تمہارے وجدان پر بھروسہ کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بھائی بھی اسی رہا۔ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میرے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہاتھ ذرا سا بھی تر چھاپڑا تو حکام کو ناراض کرنے میں چوبیس گھنٹوں سے بھی کم وقت لگے گا اور ایسی صورت میں، میں بھی تمہاری ہی مسجد کے سامنے اپنا بستر ڈالوں گا۔“ انہوں نے چند فون نمبر گھمائے اور پھر شام ڈھلتے ہی ہم کچھ ضروری نفری کے ساتھ اپنا منزل کے دروازے پر موجود تھے۔ ممکنہ مزاحمت کے بعد دروازہ کھلوایا گیا۔ رحمن صاحب نے اپنے اہمیت کر دی تھی کہ جب تک وہ خود کسی سے بات کرنے کا نہ کہیں، جب تک کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا ایوان انہیں منتقل نہ کیا جائے۔ گھر میں عجیب سا ناٹا جاری تھا۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے تو مرکزی عمارت سے اشارے کو مقفل پایا۔ رحمن صاحب کے اشارے پر دو مضبوط جسم کے سپاہیوں نے کافی مشقت کے بعد انور والا۔ اندرونی جانب سے دو تین سبے ہوئے نوکر اور خدام نکلے، جو باورچی خانے کے دروازے سے

ہاں نے رجن صاحب سے خصوصی درخواست کی تھی کہ اس کی یہ حالت عام نہ ہونے پائے اور ہمیں ہر ریحان کا پردہ رکھنا ہوگا۔ اگلی صبح تک ریحان بالکل لائق ہو چکا تھا اور ہر سوال کے جواب میں صرف میں مھورتا رہتا۔ اُس نے صبح ہی اقرار کر لیا کہ ”وہ لیلیٰ کو مارنا نہیں چاہتی تھی“، لیکن ہاتھ پائی کے دوران اڈل پھسلا اور وہ اونچائی سے گر گئی۔ ریحان کے بیان سے لگتا تھا جیسے وہ کسی تیسری ہستی کے بارے میں بات کر رہا ہو لیکن ”وہ“ کون تھی جو ریحان کے اندر سالوں سے دبے ہوئے تھی۔ یہ وہ معما تھا جس کا ہر نفسیات دانوں کی سات رکنی ٹیم پورے پانچ دن بعد لگا پائی۔

فتیش کا آغاز ریحان کے بچپن سے ہوا۔ منہ میں سونے کا چھچھ لے کر پیدا ہونے والا ریحان ماں باپ دونوں کا تارا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں کبھی اُسے بیٹے کا پیارا دیتی اور کبھی بیٹی کا سنگھار کر کے اُس کو لپیٹتی۔ لیکن منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والے بچے کو گھر سے باہر کم ہی نکالا جاتا۔ پھر نہ جانے ریحان کے باپ غیاث الدین کی زندگی میں ایک کنول نامی لڑکی، جو اُس کی پرانی سیکرٹری کی جگہ صرف اُس کے لیے آئی تھی، داخل ہو گئی اور دھیرے دھیرے اُس کے دل و دماغ ہی پر نہیں، پورے کاروبار پر ہوتی چلی گئی۔ غیاث کا اپنی بیوی سے آئے دن جھگڑا رہنے لگا اور چار سالہ ریحان پردوں کے پیچھے چھپا لپکا پوچھ چچ کر لڑتے ہوئے دیکھ کر روتا رہتا۔ بات اتنی بڑھی کہ غیاث اپنی بیوی پر ہاتھ بھی اٹھانے لگا۔ ریحان نے اپنے باپ کو اپنی ماں کا گلا دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ بات کورٹ تک چلی گئی اور ریحان کی ماں کو اُس کے والدین آکر اپنے ساتھ لے گئے۔ ریحان کو اُس کے باپ نے نہیں دیا اور معصوم ریحان اپنے گھر کے پورچ میں کھڑا روتے ہوئے اپنی ماں کو نانا کی کار میں بچھلی ہاتھ کے لیے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پلٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی ماں کی آنکھوں سے ٹپکے آخری دواؤں سے لے کر ریحان کی رُوح کو بھگو گئے۔ شاید پہلی مرتبہ اسی دن اُس کے اندر کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ جس میں سے ایک حصہ ریحان کے پاس رہ گیا اور دوسرا حصہ ہمیشہ کے لیے اُس کی ماں کے ساتھ رہ گیا۔

اپنے ننھے، ریحان کو درختوں اور پردوں کے پیچھے چھپ کر اپنی ماں کے لیے روتے ہوئے دیکھا تو ڈاکٹر ڈرائیو ریمو کو ب کو ہدایت کی کہ اُس کے دفتر سے واپس آنے تک وہی ریحان کے بچنے کا کچھ سامان سٹے۔ ڈرائیو کو اور تو کچھ نہ سوجھی، وہ اداس ریحان کو لیے بنگلے کے پیچھے اپنے سرورٹ کوارٹر میں لے گیا۔ اس کی بیوی اور چھ بیٹیاں ہر ممکن کوشش کرتیں کہ اُن کے صاحب کے لاڈلے کا دل بہلا رہے۔ تاکہ کھل زیادہ تر وہی ہوتے، گڑیا اور گڈے کی شادی، کوکلا چھپا کی، ہنڈکلیا بنانا یا پھر ایک دوسرے کو لپٹ لپٹاؤں اور سرفری سے سنوارنا۔ سو، ریحان بھی انہی مشغلوں میں کم ہوتا گیا۔ تیسرے ماہ ریحان کی سگی ماں بھیجنے کے ساتھ ہی اُس کا باپ غیاث، کنول کو ریحان کی سوتیلی ماں کے روپ میں گھر لے آیا۔

باہر نکلنے کی تنگ دود میں تھے۔ انہیں اطمینان دلایا گیا کہ کو تو ای کو اُن سے کوئی سروکار نہیں۔ اوپر کی منزل کمرے کھلے پڑے تھے۔ مجھے ایک پردے کے پیچھے سے دو ہتھکڑوں کی جوڑیاں بھی جھلکتی نظر آئیں۔ چھوٹا سا ہال تھا، جہاں طلبہ اور ہارمونیم سلیٹے سے پڑے تھے۔ شاید یہاں رقص کی مشق کی جاتی ہو۔ اس گھر میں داخل ہونے سے لے کر اب تک لگا تار رجن صاحب کے ڈرائیو، گاڑڈ، تھانے دار اور اس کے دینی وائرلےس سیٹ (واکی ٹاک) پر درجنوں پیغام وصول ہو چکے تھے۔ جس میں رجن صاحب کو اعلیٰ شہر کے کمشنر اور آئی جی وغیرہ کی طرف سے مسلسل ہدایت کی جارہی تھیں کہ وہ جہاں بھی ہوں اپنا مشن ختم فوراً ہیڈ کوارٹر رپورٹ کریں۔ رفتہ رفتہ یہ پیغام دھمکیوں کی صورت اختیار کر گئے لیکن ایس پی صاحب آخری کشتی بھی جلا کر نکلے تھے۔ پولیس کے جوان مختلف دروازوں کو دھکیلتے جا رہے تھے۔ اور ہر کمرہ ہوا، نفیس ساز و سامان سے آراستہ اور بہترین آرائش کا شاہکار تھا۔ کمروں کی کھرا سیکیم پر بھی بہت دھیان دیا تھا۔ لیکن کمرے خالی تھے اور پھر آخری کمرہ بند ملا۔ رجن صاحب نے اندر موجود فرد کو تھمبہ دیا کہ کھول دیا جائے ورنہ وہ اسے توڑ دیں گے۔ اندر سے آواز ابھری ”تھوڑا انتظار کریں۔۔۔۔۔“ کچھ دیر کے تھکے قدم تھمبے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ زنانہ کپڑے اور کا سٹیکس ادھر ادھر بکھرے پڑے کمرے کی ڈیرنگ ٹیبل پر دنیا کی بہترین کمپنیوں کا میک اپ کا سامان بچا ہوا تھا۔ ایک پردے کے پیچھے مجھے وہ سرخ سینڈل بھی جھانکتے ہوئے نظر آ گئے، جن کی ایک ایڑی اس وقت پولیس کی تحویل میں تھی۔ عورت دروازہ کھولنے کے بعد کمرے میں اندھیرا کر کے دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ رجن صاحب اشارے پر عملے کے کسی فرد نے کمرے کی بجلی جلائی تو پہلے ہماری نظر کمرے کے سامان اور پھر اس سکرے وجود پر پڑی۔ رجن صاحب نے کڑک کر اُسے کھڑا ہونے کو کہا تو گھٹنوں میں چھپا ایک چہرہ دھیرے دھیرے اٹھا اور پولیس کا سارا علمہ رجن صاحب سمیت ہکا بکارہ گیا۔ عورت کے بھیس میں ہمارے سامنے ریحان تھا۔ اور اُس کی حالت نہایت ابتر تھی۔

آگے کی کہانی زیادہ پیچیدہ نہیں تھی۔ رجن صاحب نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اخبار اور میڈیا اس چھاپے کی خبر نہ پہنچے لیکن پھر بھی صبح کے تمام اخبارات کی شہ سرفری ملک کے بڑے صنعت کار ریحان منگیت کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتاری ہی کی تھی۔ ایک رات پہلے جب میں اُس عورت کا چھپا کرتے مگر پڑا تھا۔ تب نیچے ریت میں مجھے سفید کرچ کے جوتوں کا ایک سول نظر آیا تھا۔ یہ اُن ہی جوتوں کا ایک کا سول تھا، جو میں اُسی صبح ریحان کو گالف کورس میں پہنچے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ریحان گرفتار ہوا تو نہایت بے چین رہا اور اپنا وجود چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کا برتاؤ بھی بہت عجیب تھا۔ کبھی وہ سول میں پولیس کے عملے کو تعین نتائج کی دھمکیاں دیتا تو کبھی اُن کی منت کرتا کہ اُسے واپس جانے دیا جائے کہ گھر میں ”ریحان“ اکیلا گھبرا رہا ہوگا۔

تا اور ادھر ادھر سے چرائی سُرخ اور غارہ اپنے چہرے پر ل کر اپنے آدھے چہرے کا میک اپ کرتا۔ پھر یہی دھا چہرہ اُس کی ماں، بہن، دوست، سب ہی کچھ بن جاتا۔ دائیں حصے والی عورت ریحان سے باتیں کرتی، بے کہانیاں اور لطیفے سناتی اور چہرے کے بائیں حصے والا ریحان خوش ہوتا، ہنستا اور اپنے چہرے کے داہنے حصے سے وہ سب کہتا، جو وہ اپنی سگی ماں کو بتانا چاہتا تھا۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا کہ ریحان کو جب عورت سے بات کرنی ہوتی تو وہ اپنے چہرے کا بائیں حصہ جو بنا میک اپ سادہ رہتا، اُسے آئینے کے رُخ پر رکھتا اور سوال رہتا، ضد کرتا، کہانیاں اور لوریوں سننے کی فرمائش کرتا اور پھر جواب کے لیے، چہرے کا دایاں حصہ ایسے رُخ پر نیچے کو دکھاتا کہ صرف وہ مہربان عورت ہی اُسے ششے میں جھانکتی نظر آتی جو ریحان کی سب ضدیں، ہر فرمائش ری کرتی اور پھر جب رات نصف سے بھی زیادہ بیت جاتی تو ریحان کی دوست، ماں، بہن اور ہمدرد اُسے اب اچھی سی لوری سناتی۔ وہ لوری، جو ریحان اپنی سگی ماں سے سنا کرتا تھا اور پھر آخر کار ریحان کو نیند آ جاتی۔ تمام عرصے میں ریحان کے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل رہتا اور صبح جب ہی کھلتا، جب وہ عورت ریحان ماتھا چوم کر اگلی شام تک کے لیے رخصت ہو جاتی۔ اب ریحان کو باقی دنیا سے شدید بے زاریت اور نفرت سوس ہونے لگی تھی۔ بس ایک یعقوب اور اُس کا گھرانہ ہی تھا، جہاں کچھ دیر کے لیے ریحان کا دل لگ پاتا۔ لیکن اب وہاں سے بھی ریحان سر شام ہی بھاگنے کی کرتا کیوں کہ اندھیرا ہوتے ہی اُس کی پیاری اور ریان دوست نے جوتا ہوتا تھا۔

وہاں ریحان کی سوتیلی ماں کنول نے بھی ایک ہی بار بڑا ہاتھ مارنے کا منصوبہ بنایا اور ایک صبح جب گھر کے کین اٹھے تو تمام تجوروں اور زیورات سمیت بینک بلیٹس کو صاف پایا۔ اس دن کے بعد سے کنول اور بٹری کے فیجر کی کبھی کوئی خبر نہیں ملی۔ ریحان کا باپ اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا۔ بات صرف پیسے کی بات تھی تو وہ ایک سال ہی میں کھوئے ہوئے مال سے تین گنا زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتا تھا، لیکن اُسے بستر پر ال دینے والا صدمہ بے وفا کی کا تھا۔ رفتہ رفتہ جب باتیں کھلنے لگیں تو پتا چلا کہ کنول نے یہ سارا منصوبہ ہی پنے چاہنے والے فیکٹری منیجر کی وساطت سے بنایا تھا اور اُس کی شادی سے لے کر اب تک ہر بات پہلے سے بل منصوبے کے تحت طے شدہ تھی۔ ریحان کا باپ دوبارہ بستر سے نہیں اٹھ سکا اور پندرہ سالہ ریحان کو اپنے نادار ڈرائیور کی سپردگی میں دے کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گیا۔ اس دوران ریحان کی سگی ماں کو بھی تلاش کرنے کی بہت کوشش کی گئی مگر سب بے سود۔ یعقوب نے نمک کا حق ادا تو کیا۔ لیکن اب ریحان جوان ہو رہا تھا اور اُس نے اپنے گرد اتنا مضبوط خول بنا رکھا تھا کہ اُس کے دل کی بات کسی تک پہنچنا محال تھا۔ آخر کار، نقوب کی سب سے چھوٹی بیٹی بھی اپنے گھر سدھار گئی اور یعقوب کی بیوی کی موت کے بعد ریحان کی زندگی کا آخری روشن دان بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ لیکن یعقوب کی بیوی مرتے مرتے اپنے شوہر کو اس کے چھوٹے صاحب کے اندر بستی دوا لگ شخصیات کا حال دے گئی کیوں کہ اس نے بھی ایک ماں کی طرح ہی ریحان کو پالا

کنول نے دو چار دن غیاث الدین کو دکھانے کے لیے ریحان سے جھوٹا پیار جتایا لیکن جلد ہی وہ اس پر اُوب ہو گئی اور ریحان اُسے کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ بات صرف سوتیلی پن کی حد تک ہوتی تو بھی کنول ریحان کی موجودگی کا کڑوا گھونٹ پی ہی لیتی لیکن کچھ عرصے بعد غیاث الدین کی فیکٹری کا نوجوان منیجر غیر موجودگی میں کسی نہ کسی بہانے لکھی کے چکر لگانے لگا تو ایسے میں کنول کو ریحان کی گھر میں موجودگی پر ایسے میں یا تو ریحان کو اوپر اُس کے کمرے میں ڈانٹ ڈپٹ کر کے بند کر دیا جاتا یا پھر لکھی کے بھجوا کر دیا جاتا کہ وہ جا کر یعقوب کی بیٹیوں سے کھیلے۔ اس تمام احتیاط کے باوجود ریحان کی سوتیلی ماں اس کی طریقوں سے ڈراتی رہتی اور اُسے میز ہیوں سے جڑے کمرے کے نیچے والے تہ خانے میں بند کرنے کی دیتی تاکہ وہ اپنے باپ کی رات گئے واپسی پر فیجر کی آمد کا ذکر نہ کرے۔ ایسے موقعوں پر اگر یعقوب کی اور بچیاں کہیں گئیں ہوتیں تو ریحان اپنے کمرے میں بند ہی گڑیا اور گڈے کا کھیل کھیلتا رہتا۔ پھر اُس کے کہیں سے لپ اسٹک لگ گئی تو وہ اپنی باجیوں کی طرح ہونٹوں پر سُرخ لگانے میں مگن رہتا۔ رفتہ رفتہ راتوں آنکھوں میں کا جل بھرا اور نیل پالش لگانا بھی سیکھ لیا۔ پھر ایک دن اُسے سوتیلی ماں کی ڈریسنگ ٹیبل پر اپ کے سامان کی پوری کٹ ہی نظر آ گئی تو وہ چپکے سے وہ بھی اپنے کمرے میں اٹھالایا اور کئی دن تک شیدز سے اپنا چہرہ رنگین کرتا رہا۔ بد قسمتی سے اُس کی یہ چوری جلد ہی پکڑی گئی اور اُس کی ماں، نے، جڑا پر اس کٹ کی گمشدگی پر کئی دن سے برس رہی تھی، ریحان کو میک اپ استعمال کرتے پکڑ لیا۔ سوتیلی ماں اس دن عروج پر تھا اور اُس نے سزا کے طور پر ننھے ریحان کو اُس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف اُس کے میں قید کر کے بخش دیا جس تہ خانے کے ذکر ہی سے ریحان بھاگ کر اپنے کمرے کی الماری کے پیچے جاتا تھا۔ وہ دو گھنٹے اس تاریک تہ خانے میں ریحان نے کس طرح روتے، سسکتے اور ڈرے کا پتہ نہ لگا اس کا احساس صرف وہی کر سکتے ہیں، جن کی اپنی کوئی اولاد نہ ہو۔ اس تہ خانے کی دیواریں پر اُس روز اند میں ریحان نے اتنے عجیب و غریب ہولے بننے اور مٹنے دیکھے کہ اُس دن اُس کی اپنی شخصیت ہی ایک بن کر رہ گئی۔ شام کو باپ کے آنے سے پہلے سوتیلی ماں ریحان کے جسم کو تہ خانے سے باہر کھینچ لائی۔ کی رُوح وہیں اندھیرے میں بھٹکتی رہ گئی۔ اس رات کے بعد سے اندھیرا ریحان کو ڈسنے لگا اور وہ سوتے بھی کمرے کی تمام بتیاں جلائے رکھنے کا عادی ہو گیا۔ ایسے میں کمرے میں پڑا آئینہ ریحان کا سب سے دوست بن گیا۔ ریحان کو میک اپ کا شوق تو اپنی باجیوں سے پہلے ہی مل چکا تھا اب اس تہائی کو وہ کے لیے اور اپنے راتوں کے خوف کو مٹانے کے لیے اُس نے اپنے ہی کمرے میں ایک دوسری دنیا آ تھی، کیوں کہ اُس کے باپ کو اتنی فرصت تھی نہیں کہ وہ اپنے خوف زدہ بیٹے کے پاس دو گھنٹی بیٹھ کر باتیں ہی کر لیتا یا اسے لوری سنا کر سلا دیتا۔ ایسے میں ریحان نے اپنے خوف کو لوری دینے والی خود ایجاد رات گئے جب سارے گھر کی بتیاں بجھ جاتیں تو وہ چپکے سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے

تھا اور وہ گزشتہ کئی مہینوں سے ریحان کی سرشام شروع ہو جانے والی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ یعقوب زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن زمانہ شناس ضرور تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ریحان اپنے اندر بچی اس عورت کے ساتھ اتنی دُور آچکا ہے کہ اب اُس کی واپسی بہت مشکل ہے۔ ریحان نے شام کے بعد خود کو دنیا سے بالکل کاٹ دیا اور دنیا میں اب صرف یعقوب ہی وہ واحد فرد تھا، جسے پتا تھا کہ شام ڈھلنے کے بعد ریحان، ریحان نہیں رہتا، اُس کے اندر کی عورت باہر نکل آتی ہے۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ ریحان کے اندر کی عورت کی عمر، ریحان کے بڑے بھائی کے ساتھ ساتھ تھکتی گئی۔ بچپن میں وہ اُس کی ماں تھی، لڑکپن میں دوست اور ہم درد اور جوانی میں وہ باقاعدہ ایک محبوبہ کے حقوق حاصل کر چکی تھی۔ دن میں اگر عملے کی کسی لڑکی سے ریحان دو گھنٹی رُک کر بات کر لیتا تو کوئی ریحان کی شان دار شخصیت کو نظر بھر کر دیکھ لیتی تو شام کو کمرے میں آنے کے بعد جب ریحان آئینے کے سامنے بیٹھتا تو اُس کی رُوح کی قابض باقاعدہ اُس سے لڑتی، جھگڑتی اور دُڑھ جاتی۔ دونوں کے درمیان مکالمے کی صورت کچھ یوں بنتی کہ ریحان بائیں جانب چہرے کی اوٹ سے اُس سے پوچھتا ”آج کچھ چپ سی ہو۔ کوئی ناراضی ہے کیا؟“ داہنا میک اپ زدہ حصہ منہ بنا کر کہتا ”تمہیں اس سے کیا؟ تمہیں تو اُس جھلمھری شائستہ کے فخرے اٹھانے سے ہی فرصت نہیں۔“ ریحان اُسے مناتا ”اوہو..... اب جانے بھی دو۔ وہ نئی اکاؤنٹینٹ ہے۔ کچھ رہنمائی کی ضرورت تھی اُسے۔ سو، میں نے بتا دیا، ورنہ تم تو جانتی ہو کہ.....“ فوراً وہ پلٹ کر آئینے پر قابض ہو جاتی اور غصے سے کہتی ”ہاں ہاں..... تین چار ہزار کے عملے میں سے اُسے اور کوئی نہیں ملا تھا، اپنی اُلجھن دُور کرنے کے لیے۔ میں سب جانتی ہوں، ان عورتوں کے چلتر..... ٹھیک ہے اگر تمہیں اُس کی اتنی فکر ہے تو پھر جاؤ۔ اُس کی رہنمائی کرو۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟“ ریحان بے بس ہو جاتا ”اوہ..... تم پھر دُڑھ گئیں۔ اچھا بابا..... پکا وعدہ..... آئندہ کسی سے، کوئی کام کی بات بھی نہیں کروں گا۔ چلو اب ناراضی ختم کر دو، ورنہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔“ جو ابائیم رضامندی کا اظہار بھی مصنوعی غصے سے کیا جاتا۔ ”خوب جانتی ہو میں یہ سب بہانے، تمہیں پتا ہے تاکہ میں تمہیں بھوکا سوئے نہیں دیکھ سکتی۔ تب ہی مجھے اتنا سستاتے ہو۔ اچھا چلو اب منہ نہ بسورو۔ اُٹھ کر کھاؤ۔“ ریحان خوش ہو کر مسکرا دیتا اور وقتی طور پر جھگڑا ختم ہو جاتا۔ لیکن پھر چند دن بعد ایسی کوئی بات ہو جاتی اور پھر رات گئے گئے یہی تکرار چلتی رہتی۔ عام دنیا کے لیے ریحان اندھیرے کے خوف کا ایک عام مریض تھا اور اُس کے کاروباری حلقے میں سب ہی اس بات کو ذہنی طور پر تسلیم کر چکے تھے کہ ریحان صرف دن کے اُجالے کا ساتھی ہے۔ ریحان نے کبھی دوستیاں اور رشتے پالے ہی نہیں تھے، جو اُس کی پُرسکون زندگی میں کسی قسم کی ہلچل مچاتے۔ وہ ہمیشہ سے تنہائی پسند تھا اور تنہائی ہی اُس کی سب سے بڑی رفیق تھی۔ لیکن پھر لیلیٰ نام کی ایک معصوم سی لڑکی اُس کے عملے میں حادثاتی طور پر شامل ہوئی اور ریحان کی زندگی اچھل پھیل سی ہونے لگی۔ لیلیٰ ریحان کی فرم کے سینئر ڈرافٹس مین کی بیٹی تھی، جو اپنے باپ کی علالت کی وجہ سے یونیورسٹی کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے باپ کا کام سنبھالنے کے لیے صرف دو ماہ کے عارضی معاہدے

تہی میں رکھی گئی تھی۔ لیکن شاید یہی دو ماہ ریحان کے اندر وہ اچھوتا احساس جگانے کے لیے کافی تھے، جس سے وہ عمر بھر انجان رہا تھا۔ پہلے پہل تو خود ریحان کو بھی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیوں اس کوئل سی لڑکی کے اپنے آفس میں آنے پر ایک انجان سی خوشی محسوس کرتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے اپنی رات کی راز داں اور اپنے اندر کی عورت سے بھی کوئی بات چھپانے کی کوشش کی۔ ریحان ویسے بھی اپنے اسٹاف سے بہت کم بات کرتا تھا اور خواتین تو اُس کے دفتر سے سات در پرے ہی گزرا کرتی تھیں لیکن لیلیٰ میں نہ جانے ایسی کون سی کشش تھی، جو ریحان کو اُس کی جانب کھینچنے لے جا رہی تھی۔ شاید اُس کا عام لڑکیوں کی طرح ریحان کے ارد گرد پھرنے کا شائبہ ریحان کو بھانپ گیا تھا۔ لیکن اُس کے اندر والی سے یہ راز بھلا کہاں چھپ پاتا۔ اس رات پہلی بار ریحان کا آئینے میں بیٹھی اپنی اس ہم زاد سے جھگڑا ہوا۔ وہ اتنا مجبزی کہ اُس نے کمرے کا سارا کالج توڑ ڈالا۔ کوٹھی میں اپنے مرنٹ کو ارنڈز میں پڑے نوکر حیرت اور خوف سے اپنے صاحب کے کمرے میں اس عجیب و غریب شور شرابے کی دُور سے آتی آوازیں سنتے رہے، کیوں کہ انہیں شام کے بعد صاحب کے کمرے کی طرف جانے کی نہ تو اجازت تھی اور نہ ہی وہ کوٹھی کے اندرونی حصے میں پاؤں دھر سکتے تھے۔ صرف یعقوب ہی تھا جو ایسے موقعوں پر اندر جا کر کوئی پیغام دے سکتا تھا۔ عموماً نصف شب کے بعد کوٹھی سے گھنگھروں کی جھنکار بھی سنائی دیتی تھی۔ لیکن اس رات کچھ عجیب سا سناٹا طاری رہا۔ ریحان اپنی ہم زاد کے اپنے اندر جنم لینے کے بعد زندگی میں پہلی بار اسی رات بھوکا سو گیا تھا۔ اگلی صبح دفتر پہنچتے ہی شدید غصے کے عالم میں اُس نے انٹرکام پر لیلیٰ کو اپنے دفتر میں آنے کو کہا۔ لیلیٰ دفتر میں داخل ہوئی تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔



جس دل ہار بیٹھی تھی۔ وہ گھنٹوں اپنے شیشے کے کین کے بالکل سامنے راہ داری میں، دوسری جانب موجود ریحان کے آفس کے کالج کی دیوار سے پرے اُسے مختلف کاموں میں اُلجھا ہوا دیکھتی رہتی۔ اُسے یہ کھویا کھویا ماہ اپنے آپ سے باتیں کرتا اور نہایت شائستہ اور نفیس عادات و اطوار والا نوجوان کسی اور ہی دنیا کا فرد دکھائی دیتا۔ اسی قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت ریحان اپنے اندر چلتے اس شدید نفسیاتی پیچان کا سامنا کرتے کرتے بٹ کر بکھرنے کے بالکل قریب تھا ٹھیک اسی وقت لیلیٰ نے آکر اُسے تھام لیا اور وہ ریحان، جو لیلیٰ کو نوکری

## آدھا جنوں، آدھا فراق

سے فارغ کرنے کا لیٹر تیار کروائے بیٹھا تھا، اُسے اپنی زندگی کا ہم سفر بننے کا پیام دے بیٹھا۔ لیلیٰ کی تو جیسے کائنات ہی مکمل ہو گئی۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے، لیلیٰ کی اُلجھنیں بڑھتی گئیں۔ کبھی کبھی اچانک ہی بیٹھے بٹھائے ریحان کا رویہ بالکل ہی تبدیل ہو جاتا۔ کبھی کبھار جب وہ صبح اپنی سرخ انگارہ آنکھیں لیے دیر سے دفتر پہنچتا تو بالکل ہی تھکے سے اکھڑا ہوتا۔ ایسے میں اُس کا برتاؤ لیلیٰ سے بالکل اجنبیوں والا ہو جاتا۔ اُس بے پاری کو کیا پتا کہ رات بھر اُس کا ہم نفس کس عذاب سے گزر کر صبح کی میز پر پھلانگ کر اُس تک پہنچا ہے۔ لیلیٰ شروع میں اُسے کام کے بوجھ اور ریحان کی ازلی تنہائی پسندی کا شاخسانہ ہی سمجھتی رہی، لیکن رفتہ رفتہ بات بننے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ ان دونوں کی بحث، خاص طور پر اُس وقت طول پکڑ لیتی، جب لیلیٰ ریحان کو شام دھننے کے بعد کہیں آؤنگ کے لیے لے جانے کی ضد کرتی تھی اُس کا اصرار کچھ بے جا بھی تو نہ ہوتا، کیوں کہ ماراں تو ریحان دفتر کے کاموں اور میٹنگز ہی میں اُلجھا رہتا۔ بس گھڑی دو گھڑی کے لیے دوپہر کے کھانے یا شام کی چائے پر ان دونوں کی ملاقات ہو پاتی۔ وہ بھی تمام دفتر کے عملے کے سامنے۔ اب بھلا ایسے موقع پر کوئی دل کی بات کیسے کی جاسکتی تھی، حالانکہ تمام عملے کو بھی ریحان اور لیلیٰ کے مستقبل میں ہونے والے رشتے کے بارے میں خبر تھی اور درحقیقت سب ہی اس بات سے خوش بھی تھے، کیوں کہ ریحان نے اپنے باپ کے نسل قدم پر چلتے ہوئے ہمیشہ اپنے تمام عملے کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا لیکن پھر بھی لیلیٰ کو ریحان سے کچھ ایسے لمحوں کی ہمیشہ یاد تیار رہی، جب صرف وہ اور ریحان ہوں اور وہ دل کی ہر بات بنا کسی جھجک کے کہہ سکے۔

نہیں شام ہوتے ہی ریحان کے اندر جیسے تمام جہان کی بے چینیوں کی بھر جاتی تھیں۔ عصر کے بعد تو وہ اپنے کئی کام اور دوسرے چھوڑ کر ہی گھر واپسی کی تیاریاں شروع کر دیتا۔ ایسے میں یعقوب بھی ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا اور اُن ایک کبھی کسی نے اُسے لیت ہوتا یا ناغہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ لیلیٰ انٹر کام پر یا میٹنگ کے دوران مختلف انگڑوں پر لکھ لکھ کر تھک جاتی، مگر ریحان کا دل کبھی نہ پوچھتا۔ لیلیٰ کو بھی ریحان کے بچپن کے خوف کی کچھ خبر پہنچ چکی تھی اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ وہ ریحان کی اس خوف کے جال سے نکلنے میں مدد کرے، مگر شام کا ریحان اُن کے لیے بالکل اجنبی ہوتا تھا۔ ایک آدھ بار اُس نے جب ریحان کو زبردستی روکنے کی کوشش کی بھی تو مکان نے اُسے بُری طرح جھڑک دیا۔ پھر بھی لیلیٰ کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ اُمید ضرور دیا جلاتے رہتی تھی اور وہ شادی کے بعد ریحان کے دل میں چھپا ہر خوف اپنی محبت سے مٹا دے گی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ریحان شام

ریحان شدید اذیت کے عالم میں جیسے خود اپنے آپ سے ہی لڑتے ہوئے نڈھال ہو کر اس طرح کوڑا پڑھلکا ہوا تھا کہ اُس کا سر میز کے کونے پر اٹک گیا تھا۔ فوراً کپنی کے ماہر ڈاکٹروں کی ٹیم کو طلب کیا گیا اور معالج خاص نے اسے شدید ذہنی تناؤ کا نتیجہ قرار دیا۔ ساتھ ہی اُسے سختی سے یہ تاکید بھی کر دی گئی کہ وہ اگلے ایک ہفتے تک کسی دفتری کام یا فائل کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ لیکن ریحان بھلا کب ماننے والا تھا۔ اُسے اپنے کام سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور درحقیقت یہ کام ہی تو تھا، جو ریحان کے دن کے آٹھ دس گھنٹے گزارنے میں اُس کی مدد کرتا تھا۔ مجبوراً ہیڈ آفس کے جنرل منیجر کو ریحان کا کام گھر ہی پر بھجوانے کا انتظام کرنا پڑا۔ جنرل منیجر ریحان کے باپ کے وفاداروں میں سے ایک تھا اور ریحان کو اُس کی مانتے ہی بنی۔ یہی وہ سات دن تھے، جب لیلیٰ ریحان کے حواس پر پوری طرح چھاتی گئی۔ ریحان کے اندر کا معصوم، سہا سہا بچہ، جس نے اپنی ماں کو روٹے ہوئے، خود سے دور جاتے دیکھ کر ہمیشہ کے لیے کوئی اوٹ ڈھونڈ لی تھی۔ لیلیٰ کو دیکھتے ہی جھم سے باہر نکل آتا۔ زندگی میں پہلی بار ریحان کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نظر آنے لگی اور اُس کا دل بھی چاہنے لگا کہ وہ اپنے اندر کی معصوم سی خواہشیں اور باتیں کسی سے بانے، لیکن یہ ساری خوشی اور سرشاری صرف سویرا ڈھلنے سے پہلے تک ہی رہتی اور جب شام ڈھلے ریحان خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا تو پھر وہی طوفان آ جاتا۔ وہی اُس کی ہم زاد کے شکوے، طعنے اور جھگڑے۔ اب تو وہ ریحان کے منانے سے بھی نہیں ماننی تھی۔ اُس کا بس ایک ہی تقاضا ہوتا کہ ریحان کسی بھی طرح لیلیٰ کو کپنی سے باہر نکال پھینکے۔ ریحان اُس کے سامنے عذر تراش تراش کر تھک جاتا، لیکن وہ روشنی رہتی اور ریحان سے لڑتی رہتی کہ ریحان اب اُس سے اتنا پیار نہیں کرتا، جتنا لیلیٰ کے آنے سے پہلے کرتا تھا۔ اُس کی ہم زاد کو لیلیٰ سے شدید نفرت ہونے لگی تھی اور پھر جب ریحان کو ڈاکٹروں نے گھر پر مکمل آرام کا مشورہ دیا اور لیلیٰ دفتر کے کچھ اہل کاروں کے ساتھ ضروری فائلوں، دستخط کروانے کو بھی بھی آنے لگی، تب تو سمجھو بھونچال ہی آ گیا۔ ہم زاد نے ریحان سے بات چیت بند کر دی اور پورے تین دن تک ریحان کی بھرپور منت ساجت کے باوجود بھی چپ سادھے بیٹھی آئینے سے ریحان کی سکتی رہی۔ ریحان کی حالت ان تین دنوں میں مزید بگڑ گئی، کیوں کہ وہ ساری ساری رات اُسے منانے کے لیے روتا رہتا۔ پھر جب ریحان نے اُس سے آخر کار یہ وعدہ کر لیا کہ وہ جلد ہی لیلیٰ کو خود سے دور کر دے گا، تب وہ ذرا مانی۔ لیکن تب تک لیلیٰ خود ریحان کی اُلجھی اُلجھی، خاموش اور کسی حد تک شرمیلی سی شخصیت کے

کے بعد بہت ضروری فون بھی اینڈ نہیں کرتا تھا۔ ایک بار لیلیٰ اندھیرا ہونے کے بعد ریحان کی گٹھی سے گر کر ٹپک بھی جا پہنچی، مگر اُس کے لاکھ سر ہٹنے پر بھی دربان نے اُسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔ اُنکا اگلے روز ریحان لیلیٰ پر بُری طرح برس پڑا کہ وہاں کے انتہائی منع کرنے کے باوجود شام ڈھلنے کے بعد اُس کی چوکھڑا کیوں آئی۔ لیلیٰ اپنے آنسو روک نہیں پائی اور بھاگتی ہوئی اپنے کیمن میں واپس چلی گئی۔

دو تین روز تک دونوں میں بات چیت بند رہی اور ان تین راتوں میں ریحان کی ہم زاد نے جی بھر کر ریحان کے لاڈ اٹھائے۔ اسے اُس کی پسندیدہ شاعری سنائی۔ رقص کر کے اُس کا دل بہلایا اور اُس سے بہت سے گلے شکوے بھی کیے کہ وہ بچپن سے ریحان کی ہم زاد اور ہم نفس رہی ہے اور ہر مشکل اور کرب میں اُس نے ریحان کا ساتھ دیا، لیکن جب اُسے ریحان کی ضرورت پڑی تو ریحان اُس سے منہ موڑ کر کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اُس نے ریحان سے وعدہ کیا کہ وہ پہلی فرصت میں لیلیٰ کے رشتے سے چھٹکارا پا کر دوبارہ اپنی ساتھی کے پاس آجائے گا۔ لیکن ریحان تین دن تک ہی یہ وعدہ نبھایا اور چوتھے دن جب خود لیلیٰ نے اُس کے سامنے آکر ہاتھ جوڑ دیئے تو دونوں ہی مسکرا دیئے۔ اس رات پہلی مرتبہ ریحان کی ہم زاد نے اُس سے فرار کی کہ وہ بھی ریحان کی پسند سے ملنا چاہتی ہے۔ لہذا ریحان اُسے رات کو کہیں مدعو کر کے ریحان نے سختی سے انکار کر دیا کہ جب تک شادی نہ ہو جائے، یہ راز رازی رہنا چاہیے، لیکن ہم زاد کی تکرار بھی طول پکڑتی گئی۔ ہم زاد کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اُس کا راج صرف سورج نکلنے تک ہی قائم رہتا تھا۔ اور اُجالا ہونے ہی اُسے ریحان کی زوج کو آزاد کرنا پڑتا تھا۔ پھر سورج نکلنے سے لے کر سورج ڈھلنے تک ریحان کے دل و دماغ صرف لیلیٰ ہی کا قبضہ ہوتا تھا۔ اس لیے ہم زاد دن میں بھی ریحان کے اعصاب تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ لگی۔ پھر لیلیٰ خود بھی ریحان کی نفسیاتی پیچیدگیاں دُور کرنے کی آس میں گاہے بگاہے اُسے شام ڈھلنے کے بجائے نلنے پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ رات کو ہم زاد اُسے بڑھاوا دیتی، ”اگر وہ تم سے رات کو ملنا چاہتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم مجھے بھی اُس سے جلد از جلد ملو اور آخر شادی کی پہلی رات بھی تو مجھے ہی اُس کا استقبال کرنا ہے۔ تو کیا یہ بہتر نہیں کہ میں پہلے ہی اُس سے دوستی کر لوں۔ کہیں پہلی رات وہ مجھے تھرا کر کمرے میں دیکھ کر بالکل ہی نہ گھبرا جائے اور تمہارا راز سب کے سامنے فاش نہ کر دے۔“ کبھی کبھی تو ریحان ان دونوں کی ضد اور تکرار کے سامنے بالکل ہی لاجواب ہو جاتا اور اُسے لگتا کہ اُس کے اندر چلتی وہ عورت کی، ہم زاد ڈھیک ہی تو کہتی ہے۔ لیلیٰ کو اس راز سے پہلے ہی آگاہ کر دینا چاہیے کہ یہ اُس کا حق بھی تو تھا۔ آخر وہ اور دماغ کی جنگ میں ہمیشہ کی طرح جیت دل نادان ہی کی ہوئی اور ریحان نے پہلی اور آخری مرتبہ لیلیٰ شام کے بعد ملنے کی ہائی بھری۔ اس روز لیلیٰ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ آسمان خیمے کی زمین سے بندھی گر جیں کھول کر پورا آسمان اوڑھنی کی جگہ اپنے سر پر اوڑھ لے۔ سارا دن وہ ہوا میں اڑتی رہی۔ بات بے بات خود ہی مسکاتی رہی۔ شام کو اُس نے ریحان کی پسندیدہ سفید ساڑھی پہنے

بالوں میں سمجھا لگایا اور اپنی کالی آنکھوں میں محبوب کی دید کی آس لیے ساحل کی اس پٹی کی طرف اُسی گاڑی میں زبردستی ڈرائیو کرتی ہوئی چل دی، جس کی پہاڑی کے نیلے پر آج مغرب کے بعد ریحان نے اُس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ریحان کے ساتھ دن میں پہلے بھی کئی مرتبہ ڈرائیو پر اس جگہ آچکی تھی۔ اُسے وہاں پتنگ اڑانا بہت پسند تھا اور آج بھی وہ اپنے ساتھ بہت سی پتنگیں لے کر جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ آج وہ رات دیر تک ریحان کے ساتھ مل کر پتنگیں اڑائے گی اور اُسے اتنا اُونچا کر دے گی کہ اُس کی پتنگ اُس کے اور ریحان کے ملنے کے ستارے کو چھو کر لوٹے گی۔ جب تک لیلیٰ پہاڑی نیلے پر پہنچی، تب تک شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے وقت کا جھٹ پنا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ ریحان ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ لیلیٰ اپنی گاڑی سے نکل کر پہاڑی کے سرے تک چلی گئی اور وہاں کھڑے کھڑے اُس نے دُور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی دیکھیں، وہ خوش ہو گئی کہ ریحان آ رہا ہے لیکن جب گاڑی کچھ قریب پہنچی تو وہ مایوس ہو گئی۔ یہ تو کوئی چھوٹی گاڑی تھی لیکن وہ گاڑی تو اُسی طرف آ رہی تھی۔ لیلیٰ کچھ دیر گاڑی کو پہاڑی پر چڑھتے دیکھتی رہی، پھر اُس کی توجہ دوبارہ سمندر کی طرف ہو گئی، جو آج نہ جانے اتنا بھرا ہوا کیوں لگ رہا تھا۔ گاڑی نہ جانے کب لیلیٰ کی گاڑی کے پیچھے آکر پارک ہو گئی اور لیلیٰ تب چوکی، جب دھیرے سے کسی نے اُس کا نام لیا۔ وہ آواز کتنی اپنی اور کتنی اجنبی بھی تھی۔ لیلیٰ نے اندھیرے میں کسی لمبی عورت کو پلو نکالے کچھ دُور کھڑے دیکھا۔ چہرہ واضح نہیں تھا۔ لیلیٰ کچھ دُور سی گئی۔ ”جی..... آپ کون؟“ اور پھر وہ عورت قریب آگئی۔ لیلیٰ کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ اُس کے سامنے ریحان اپنے آدھے چہرے پر میک اپ کیے، آدھی عورت کے روپ میں کھڑا تھا۔ لیلیٰ ہم کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے لرزے ہوئے لہجے میں ریحان سے پوچھا کہ یہ کیسا بے ہودہ مذاق ہے اور ریحان نے اتنا ہیسا کھلیے کیوں بنا رکھا ہے۔ بائیں جانب والے آدھے سادے چہرے والا ریحان رُخ مڑ کر بولا کہ لیلیٰ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج وہ اُسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی سچائی سے ملوانا چاہتا ہے۔ اس کے اندر چلتی آدھی عورت اور آدھا مرد..... یہی اس کی تقسیم شدہ شخصیت کی حقیقت ہے اور اگر وہ ریحان کو اس کے اندر کی عورت سمیت اپنانے کا حوصلہ رکھتی ہے، تب ہی اس نازک بندھن کی گرہ باندھنے کی سہ ہے، کیوں کہ ریحان کی دہری شخصیت اس اندھیرے میں پلنے والے وجود کے بنا اوروری ہے۔ لیلیٰ تب تک پہلے صدمے سے کچھ سنبھل چکی تھی اور اُسے کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اُس نے چلا کر ریحان سے کہا، یہ سب اس کا وہم ہے اور خود اُس کی اپنی خود ساختہ پرچھائیں ہیں۔ ایسی کسی عورت کا کوئی وجود نہیں ہے اور ریحان نے اپنی ساری زندگی ایک سائے کے ساتھ برباد کر دی ہے، لیکن اب بھی وقت ہے، اگر وہ لیلیٰ کو ہاتھ دے تو وہ دونوں مل کر اس عفریت کی پرچھائیں پر قابو پا سکتے ہیں۔ یہ سنتے ہی چہرے کے دائیں جانب لالی ہو گئی اور غرا کر بولی کہ ”وہ بہت دیر سے لیلیٰ کی یہ بکواس برداشت کر رہی ہے۔ لیکن اب اگر اُس نے، لکے کے ریحان کو چھیننے کی کوشش کی تو انجام بہت بُرا ہوگا، کیوں کہ اُسے پہلے دن ہی سے لیلیٰ سے شدید نفرت

نہم دیا کہ چل کر اُس عینی گواہ کو دھکایا جائے۔ ریحان کی ہم زاد کو عبداللہ نامی نوجوان کا کوشی آنا اور یوں بچان کے دل میں دہلی چنگاری کو ہوادے کر لیلیٰ کی یادیں ابھارنا بھی بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اسی لیے وہ اُس ساحلی چوٹی پر اُس کے پیچھے آئی تھی۔ ریحان ابھی تک صبح کے گالف کے لباس ہی میں تھا وراس کا اپنا من لگن نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ساحل پر جائے کیوں کہ وہاں اُسے لیلیٰ کی یاد ستاتی تھی۔ اسی کش کش میں وہ چلا تو لیکن اپنے سفید کمرچ کے جوتے تبدیل کرنا بھول گیا یا شاید یہ اُس کے آدھے مردانہ حصے کا انوکھا احتجاج ہے۔ بہر حال، یہی جوتے اُس کی گرفتاری کا سبب بن گئے۔ لیکن پولیس ابھی تک محضے میں تھی کہ وہ ریحان ہی کو پکڑ لائے ہیں یا کسی اجنبی کو۔۔۔۔۔

ماہر نفسیات نے ریحان کی کہانی ختم کر کے چند لمحے کی خاموشی اختیار کر لی۔ ہم سب اس وقت رحمن باب کے کمرے میں موجود تھے، جہاں گزشتہ پانچ گھنٹوں سے یہ بریفنگ چل رہی تھی۔ کمرے میں گھیسر رہا طاری تھا۔ پولیس کی تاریخ میں یہ ایک ایسا انوکھا کس تھا، جس نے اُن سب کے دماغوں کی چولیس ہلا دی تھی۔ ریحان کو اس وقت پولیس کے پہرے میں اسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں منتقل کیا جا چکا تھا، جہاں اُس کی بات شام کے بعد انتہائی اہم بتائی جاتی تھی۔ ملک کے بڑے اور مشہور نفسیات دان اور معالج اس بحث میں حصہ لے رہے تھے کہ کیا یہ تقسیم شدہ شخصیت (split personality) کا کیس ہے یا پھر ذہنی شخصیت کا تضاد (multiple personality disorder) ہے۔ سچ ہے کہ انسانی نفسیات ایک ایسا گھنا جنگل ہے، جس کا ریحان جیسے کسی شخص کا معصوم بچپن کھو جائے تو پھر وہ ڈھونڈنے نہیں ملتا۔ یہ انسان بھی کس قدر پیچیدہ فوج ہے۔ انسانی ذہن کی بھول بھلیوں کا پہلا ادراک مجھے وہیں پہلی بار ہوا اور مجھے خود اپنے آپ سے بھی لرز خوف محسوس ہونے لگا۔ کیوں کہ میں بھی تو جانے انجانے میں اسی نفسیاتی اور اعصابی نظام کے خاتمے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری رگوں میں پھیلتے زہر کا انجام بھی تو آخر کار ایک مکمل دیوانگی ہی بیان کیا جا رہا تھا۔

بریفنگ ختم ہونے کے بعد جب معالجین رحمن صاحب کے کمرے سے نکل گئے تو میں نے بھی اُن سے نصیحت چاہی تو انہوں نے مجھے کچھ دیر رُکنے کا کہا۔ پھر مگر سٹ سٹاکا کر بولے، ”تم کون ہو؟“ میں اُن کا سوال نہ کر کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔ ”میں عبداللہ ہوں۔۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں۔۔۔۔۔“ ”نہیں۔۔۔۔۔ میں وہ جانتا چاہتا ہوں، جواب تک نہیں جانتا۔ بہت سے سوال ہیں میرے ذہن میں، مگر میں انہیں ترتیب نہیں دے پا رہا۔۔۔۔۔“ ”میں اُن کا ساتھ یقین ہے کہ تم کچھ اور ہو۔۔۔۔۔ اوروں سے کچھ سوا۔۔۔۔۔ کچھ الگ۔“ میں نے بات ٹالی ”آپ کا نام ہے۔“ میں باقی سب ہی کی طرح ہوں۔ بلکہ شاید اُن سے بہت کم، بہت عام۔۔۔۔۔“ لیکن انہوں نے میری بات سنی ہی نہیں ”ساری تقیسی ٹیم اس پر اسرار عورت کی کھوج میں تو تھی لیکن ہم میں سے کسی کے اذکار میں بھی نہیں تھا کہ وہ ریحان ہی کی دوسری شبیہ ہوگی۔ میں نہیں مان سکتا کہ یہ صرف تمہارے اذکار کی کارگیری تھی کہ تم نے ریحان سے شام کے بعد ملنے کی خواہش ظاہر کی اور پھر دھاگے سے دھاگا جڑنا

ہے۔ لہذا لیلیٰ کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ چپ چاپ یہاں سے چلی جائے اور دوبارہ کبھی پلٹ کر اس طرف نہ رخ نہ کرے۔“ لیلیٰ ریحان کو ایک بدلی ہوئی آواز میں چلاتے دیکھ کر ایک بار پھر لرز گئی۔ اُس نے ریحان کے آگے ہاتھ جوڑے کہ سارا کھیل صرف اور صرف قوت ارادی کا ہے اور اگر آج ریحان نے اپنے اندر کی طاقت سے اس عورت سے اپنے وجود سے باہر نہ نکال پھینکا تو شاید پھر ساری زندگی وہ اس کے چنگل سے چھٹکارا نہ پاسکے۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ ریحان، لیلیٰ کی منت سماجت کر کے اُسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ اُس کے اندر کی ہم زاد لیلیٰ کو دھکاک رہی تھی، اس پر چلا رہی تھی اور اُسے ریحان کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا حکم دے رہی تھی۔ لیلیٰ کبھی ریحان کے آگے روتی اور کبھی اُس کی ہم زاد سے لڑتی۔ اسی کش کش میں نہ جانے کب اور کیسے لیلیٰ پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑی کی نوک تک جا پہنچی۔ اُس کی سوت نے اُسے تھپڑ مارا اور دھکا دیا۔ ریحان والی بائیں طرف نے لپک کر لیلیٰ کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی، لیکن جب تک لیلیٰ کا توازن بگڑ چکا تھا۔ فضا میں ایک زوردار چیخ گونجی اور چند لمحوں کے لیے لیلیٰ کی سفید ساڑھی کا پلو گہرائی کے غار میں لہرایا اور پھر ایک زوردار ”دھپ“ کی آواز کے ساتھ سناٹا چھا گیا۔ نیچے ساحل پر موجود ایک آدھا آوارہ گئے کے بھونکنے کی آواز آئی، جیسے وہ گرنے والے کی طرف لپکا ہو۔ ریحان تڑپ کر لیلیٰ کے پیچھے جانے کے لیے گہرائی کی طرف دوڑا، لیکن ہم زاد نے اُسے زبردستی روکا اور جھڑاکہ نیچے کسی شخص کا ہیولا نظر آ رہا ہے، شاید کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ یہی وہ وقت تھا، جب میں ہڈیان کے عالم میں حجرے سے نکل کر ساحل کی طرف نکل گیا تھا۔ مجھے اس طرف آتے دیکھ کر وہ زبردستی ریحان کو وہاں سے لے گئی۔

اگلی صبح ریحان کو پتا چلا کہ لیلیٰ کے قتل کے الزام میں عبداللہ نامی ایک نوجوان گرفتار ہو چکا ہے۔ ریحان کا دماغ اس وقت لیلیٰ کی موت کی وجہ سے سُسن ہو چکا تھا اور اُس کی ساری مزاحمت وہ توڑ چکی تھی۔ اس وقت اُس کی تمام ذہنیں اُسی ہم زاد کے ہاتھ میں تھیں، جو اُسے یہ کہہ کر ڈراتی رہی کہ اگر ریحان نے پولیس کو حقیقت بتا دی تو وہ ہمیشہ کے لیے اپنی آدمی شخصیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیلیٰ تو پہلے ہی اُس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکی تھی۔ پھر ایک شام وہی عبداللہ نامی نوجوان اُس کے دروازے پر یہ پیغام لے کر آیا کہ اُس نے لیلیٰ کی آخری سرگوشی سنی ہے۔ ریحان اُس وقت اُس سے ملاقات تو نہیں کر پایا، لیکن اُس رات اپنی ہم زاد سے اُس کی شدید تلخ کلامی ہوئی اور ریحان نے اُس پر لیلیٰ کی قاتل ہونے کا الزام لگایا اور یہ بھی کہا کہ لیلیٰ اُونچائی سے گرنے کے بعد بھی زندہ تھی تب ہی اُس نے مسجد کے اُس طالب کو پیغام دیا۔ اگر ریحان موقع پر نیچے جاتا تو شاید وہ لیلیٰ کی جان بچا لیتا۔ پھر ہم زاد کے منع کرنے کے باوجود ریحان نے صبح سویرے اپنے ڈرائیور کو بھیج کر عبداللہ کو اپنی کوشی بلوایا اور عبداللہ نے جب اُسے یہ بتایا کہ لیلیٰ نے اپنی سانسیں رُکنے سے پہلے اُس عورت کو معاف کرنے کا پیغام دیا تھا تو خود ریحان کو اپنی سانسیں ذوقی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اُس روز شام سے پہلے وہ یہ تہیہ کر چکا تھا کہ وہ اگلے روز پولیس کو جا کر اپنا بیان ریکارڈ کروادے گا لیکن شام ہوتے ہی اُس کی روح کی قابض

## گلابی دھند

مکیا اور سبھی کڑیاں آپس میں یوں ملتی گئیں کہ آج لیلیٰ کا پورا کیس ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ اب تم ہی کہو، میں اسے کیا کہوں.....؟ ”کچھ دیر چپ رہا“ آپ اسے وجدان کہہ لیں یا الہام..... کچھ کہنا ہے کہ میں صرف ریحان کے اندھیرے سے خوف کی کہانی سن کر ہی اُس کے گھر گیا تھا۔ اور نہ جانے کیوں پہلے دن ہی سے اس عورت کی شبیہ میں کچھ ایسا اسرار جھلکتا نظر آیا کہ مجھے اس کا تعلق لیلیٰ کی موت سے نہ محسوس ہوا۔ میں خود بھی یہ بات تب ہی جان پایا کہ ریحان ہی وہ عورت ہے، جب میں نے اُس کے جوتے سول ساحل پر پایا۔ شاید قدرت کچھ راستے خاص میرے لیے ہی کھولتی مگنی اور آپ کا کیس حل ہوتا گیا۔“ لڑکی میں میز پر پڑے فون کی کھنٹی بج اٹھی۔ رحمان صاحب نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے کسی نے کچھ کہا۔ رحمان صاحب نے جلدی سے کہا ”ٹھیک ہے..... ہم ابھی وہاں پہنچتے ہیں۔“ انہوں نے فون رکھ کر میری بازو دیکھا، ”ریحان اپنے حواس میں آچکا ہے اور وہ تم سے ابھی ملنا چاہتا ہے۔“

ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد ہم شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے مرکزی دروازے کے قریب پہنچ چکے۔ سامنے کچھ بھڑکتی اور راستہ بند تھا۔ پتا چلا کہ کوئی مریض دم توڑ گیا ہے اور اُس کی میت لے جائی جا رہی ہے۔ قریبی عزیز، چند رفقا، اور آس پاس کے چند راہ گیر کا ندھا دینے کے لیے جلدی سے آگے بڑھے۔ مجھے ان کا جیسے انسان اپنی پوری زندگی میں بس اتنا ہی کماتا ہے جتنے لوگ اُس کے جنازے کو کا ندھا دینے اور اُس کے آخری سفر میں چار قدم ساتھ چلنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ باقی سب ضائع جاتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا نفع خود ”انسان“ ہی ہوتا ہے اور یہی وہ سب سے قیمتی سرمایہ ہے، جسے وہ اپنی زندگی کے دوران مختلف درجہ میں نقصان کی صورت میں کھودیتا ہے۔ کیسے کیسے بیش قیمت لوگ ہمارے ہاتھوں سے بھل جاتے ہیں۔ یہ بے رحم ”وقت“ کیسے ڈاکا مار جاتا ہے کہ ہمیں خبر تک نہیں ہوتی اور کوئی ہمارے درمیان سے ہمیشہ کے لیے اٹھ کر چل دیتا ہے اور اُس کے بعد صرف یادیں، پچھتاوے اور افسوس باقی رہ جاتا ہے۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ رحمان صاحب کی جیب نے ایک لمبا سا موٹا کاٹا اور ہم اسپتال کی مرکزی راہ داری کے بالکل سامنے والے پورچ میں پہنچ گئے۔ رحمان صاحب نے میرے کا ندھے پر ہاتھ رکھا ”جاؤ.....“ جا کر اُس سے مل لو.....۔“ ”آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ؟“ ”نہیں..... اس وقت وہ صرف تم سے ملنا چاہتا ہے۔ میری موجودگی میں وہ کھل کر بات نہیں کر پائے گا۔“ میں سامنے کھڑے مستعد اور چاق چوبند سپاہی کے ماتھ مختلف راہ داریوں سے ہوتا ہوا نفسیاتی اور اعصابی مریضوں کے لیے مخصوص کمروں تک جا پہنچا۔ سپاہی نے 13 نمبر کمرے کی طرف اشارہ کیا، جس کے باہر پہلے ہی دو پولیس کے محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو کمرہ بالکل خالی تھا۔ شاید کمرے کے مرکزی ٹھنڈا کرنے کے نظام کو ال کے آخری درجے پر رکھا گیا تھا۔ کمرے میں فرنیچر کے نام پر صرف پلاسٹک کی دو کرسیاں پڑی تھیں اور اسے کمرے سے زیادہ ہیرک کہنا مناسب ہوتا، کیوں کہ چوکور کی بجائے مستطیل ساخت کی دیواریں دُور تک بڑھ گئی تھیں۔ فرش پر بے داغ سفید ٹائلز لگے ہوئے تھے اور ریحان سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے۔ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں روشنی کا انتظام کچھ اس طرح تھا کہ آنکھوں کو مانوس ہوتے کچھ وقت لگتا تھا۔ اُمٹ سن کر ریحان نے سر اٹھایا۔ لیکن یہ..... یہ تو وہ ریحان نہیں تھا، جسے میں جانتا تھا، وہ ریحان تو بے حد سجا سورا، نہایت نفیس اور نازک سا تھا، جب کہ میرے سامنے بیٹھا شخص آنکھوں کے گرد گہرے کالے حلقے لیے،



چہرے پر برسوں کی تھکن، بال اُلجھے ہوئے اور کئی دن کی بڑھی شیو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں نے کبھی پہلے دلا ریحان کے چہرے یا لباس پر شک نہیں دیکھی تھی، لیکن اس ریحان کے لباس اور چہرے پر اتنی زیادہ شکنیں تھیں کہ یوں لگتا تھا جیسے زندگی نے عمر بھر کی ”بے شکنی“ کا حساب لے لیا ہو۔ کچھ دیر کے لیے میں اُس کی یہ حالت دیکھ کر دروازے ہی پر جمارہ گیا۔ پھر ریحان ہی نے ابتدا کی ”تم آگے عبداللہ.....“ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا.....“ میں اُس کی جانب بڑھا ”یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے..... وہ تمہیں اگر اس طرح دیکھتی ہے اُسے کتنا دکھ ہوتا.....“ ریحان نے ایک گہری سی سانس لی ”جب سارے شہر کے آئینے ہی ٹوٹ جائیں تو مجھے بننے سنورنے سے کیا فائدہ.....؟ میں نے تم سے معافی مانگنے کے لیے آج تمہیں یہاں بلایا ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں دانستہ کبھی کسی کو ذرہ برابر بھی تکلیف نہیں پہنچائی، لیکن میری وجہ سے تمہیں بے حد اذیت اٹھانی پڑی تمہیں ہتھکڑیاں لگائی گئیں، شدید بیماری کے عالم میں تمہیں اس تندور نما حالات میں راتیں کاٹنی پڑیں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔ میں یہ سب نہیں چاہتا تھا لیکن یقین جانو میں بے اختیار تھا۔“ میں نے ریحان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”معذرت غیروں کے درمیان ہوتی ہے اور پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ میرا نصیب تھا لیکن اگر معافی ہی کسی اذیت کا دوا ہے تو تم مجھے معاف کر دو، کیوں کہ تمہاری گرفتاری میرے وجدان کا شاخسانہ ہے اور میں خود کہیں نہ کہیں اپنے آپ کو بھی مجرم گردانتا ہوں۔“ ریحان تڑپ سا گیا۔ ”نہیں..... بالکل نہیں..... جسے تم گرفتاری کہتے ہو، اصل میں یہ میری پہلی رہائی ہے۔ میری ٹوٹی پھوٹی اور اندر سے کئی حصوں میں تقسیم شخصیت کے اتنے ریزے ہو چکے ہیں کہ اب ان کی کرچیاں چھٹنا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میری رُوح کی قابض نے میرا سب کچھ لوٹ لیا اور اس کا واحد علاج اسے پابند سلاسل کرنا ہی تھا۔ وہ ابھی تک میرے وجود پر اپنے پنجے کاڑھے ہوئے ہے اور میری راتوں کا اندھیرا اب بھی اتنا ہی خوف ناک ہے۔ کاش تم میری زندگی میں لیلیٰ کی موت سے قبل آئے ہوتے تو شاید میری ساری جین پونجی نہ لپٹی۔ کاش.....“ بولتے بولتے ریحان کی آواز بھرا گئی اور شدید ضبط کے باوجود اس کی معصوم آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ آنسو کیا تھے تیزاب کی دو بوندیں تھیں، جو میرے دل کی پوری کائنات کو پل بھر میں جلا کر خاکستر کر گئیں۔ ہم انسان کتنے بے بس، کتنے معذور ہوتے ہیں کہ صرف زبانی ہمدردی کے علاوہ کسی اپنے کا غم تک اپنے اندر اتار کر اس کا بوجھ بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ تھام لیے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے سامنے بیٹہ رونا والا ریحان نہیں، کوئی سات آٹھ سالہ بچہ ہے، جس کا سب سے پیارا کھلونا، کوئی اسی کے سامنے ٹوڑ کر چلا گیا اور وہ کچھ بھی نہیں کر پایا۔ میں نے ریحان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”میری ایک بات مانو گے ریحان.....؟“ معصوم سے بھولے بچے نے سر اٹھا کر گردن ہلائی۔ میں نے اُس کے ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام لیے۔ ”جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو تمہاری میں خوب زور زور سے چیخ چیخ کر رونا..... اتنا رونا کہ فلک پھٹ جائے اور اس آسمان سے پرے کی گلابی دھند میں تمہیں تمہاری لیلیٰ کا چہرہ دکھائی دینے لگے۔ مجھے

میں بہت دیر تک ریحان کے آنسو پونچھتا رہا۔ کاش اُس کے اندر بیٹھی وہ قابض قاتلہ میری رسائی میں نہ آئی اور اس کو تصرف کے لیے اپنا ناکارہ وجود پیش کر دیتا کہ یہ جسم بوسیدہ تو اب خود یوگا کی راہ پر گام زن نہ رہتا۔ میں نے مجھے بتایا کہ فی الحال نفسیات دانوں اور ڈاکٹروں نے اُس کی ہم زاد سے اُس کی جان چھڑانے کے لیے نیند کو بطور ڈھال استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور سر شام ہی اندھیرا ہونے سے قبل ریحان کے جسم کا ایک خاص مقدار میں نیند کی دو تحلیل کر دی جاتی ہے اور مغرب سے لے کر صبح دیر گئے تک ریحان سو یا رہتا ہے۔ لیکن بقول ریحان، اُسے ڈر تھا کہ یہ ترکیب زیادہ عرصہ چل نہیں پائے گی، کیوں کہ وہ بہت پہلے خود بھی ناکارہ چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اُسے نیند آ جاتی تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ بے چینی شروع ہونے لگی اور چند گھنٹوں بعد وہ اس کے خوابوں پر بھی قابض ہوتی گئی۔ نتیجتاً ریحان کو دورے پڑنے لگے اور اُسے نیند کی دوا ترک

ریحان کے سو جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں گم صم سا بیٹھا رہا۔ میری پھلکی پھلکیں مجھ سے بہت سے لگتی رہیں مگر آج بھی میرا دامن جوابوں سے خالی تھا۔

رات بہت دیر سے میں ساحلی مسجد کے قریب بس سے اترتا تو ایک نئی پریشانی میرے انتظار میں مسجد کے بیٹھ رہی تھی۔ مرتضیٰ صاحب مجھے آتا دیکھ کر تیزی سے میری جانب بڑھے اور انہوں نے بتایا کہ مغرب نماز کے بعد اچانک سلطان بابا کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ فوری طور پر بستی کے حکیم کو لایا گیا، مگر معاملہ اُس کی پہنچ نہ ہو سکا۔ لہذا بستی والوں نے شہر کے ڈاکٹر کا انتظام کیا۔ میرے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر واپس جا رہا تھا۔ میں لپک کر حجرے میں پہنچا تو سلطان بابا نیند میں تھے۔ پتا چلا کہ ڈاکٹر نے عارضی طور پر کوئی دوا اور نیند بگاڑ تو دیا ہے لیکن اس نے ساتھ ہی ساتھ یہ تاکید بھی کی ہے کہ پہلی فرصت میں صبح سلطان بابا کو شہر کے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے۔

میں ساری رات وہیں بابا کے سر ہانے ہی بیٹھا رہا اور اس ہم درد اور بزرگ مخلص کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ چند مہینوں ہی میں میری زندگی کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی کو کایا پلٹ کہتے ہیں۔ لیکن کتنی عجیب تھی کہ اس پوری راہ میں میں نے زہرا کے علاوہ کوئی اور خوشی نہیں دیکھی تھی۔ ساحر کی زندگی جتنی ہموار تھی، برائے اللہ کی زندگی اُسی قدر دشوار اور بچکولوں سے بھری ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جس مذہب کو ہم نے خوشی کا نام دے رکھا ہے وہ کہیں بھی اپنا وجود نہیں رکھتا۔ شاید کسی غم کا نہ ہوتا ہی اصل میں خوشی ہے۔ ورنہ سب طرف غم ہی غم ہوتا ہے۔ حسب معمول فجر کے وقت سلطان بابا کی آنکھیں میکانیکی انداز میں کھلتی ہیں۔ ہمارے ذہن میں لگے الارم کلاک کی سوئیاں سوتے میں بھی بالکل ٹھیک کام کرتی ہیں۔ میں نے ان کی آنکھیں کھولتے دیکھ کر اُن سے پوچھا ”آپ مجھے کیوں اتنا ستاتے ہیں؟“ سلطان بابا کے نحیف ہونے پر ہلکی سی مسکان آگئی۔ ”ستایا تو اپنوں ہی کو جاتا ہے میاں اور پھر جسے عبداللہ جیسا بیمار دارمیر ہو وہ بار بار بیمار نہ پڑے تو اور کیا کرے؟“ میں نے منت ساجت کر کے انہیں کم سے کم حرکت کرنے پر آمادہ کیا تو انہوں نے وضو کے بعد بیٹھ کر اشاروں سے نماز ادا کی۔ سورج نکلنے ہی میں نے رخصت صاحب کو فون کر کے کسی عمارت کا بندوبست کرنے کی درخواست کی اور ٹھیک پونے گھنٹے بعد ایک بڑی سی آرام دہ کار سمیت وہ خود مسجد کے باہر موجود تھے۔ ہم نے فجر کے دوران بھی اس بات کی حتی الامکان کوشش کی کہ سلطان بابا کے جسم کو راستے کے بچکولوں سے بچایا جائے، کیوں کہ رات والے ڈاکٹر کی بھی یہی ہدایت تھی۔

شہر کے بڑے اسپتال کے ڈاکٹر نے سلطان بابا کو معائنے کے دوران ہی اسپتال میں داخل کرنے کی ہدایت کر دی۔ میں اور رخصت صاحب راہ داری ہی میں موجود تھے، جب ڈاکٹر صاحب مریض کے معائنے کے لئے کمرے سے باہر نکلے۔ ہم دونوں اُن کی جانب لپکے۔ ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔ ”ان بزرگ کو قریب قریب میں کوئی سرکی شدید چوٹ لگی ہے شاید۔“ ”جی۔۔۔۔۔ کچھ حادثہ ہو گیا تھا۔“ ڈاکٹر نے سر ہلایا ”تو میرا

کردینی پڑی۔ اور پھر میں اس وقت اپنا ضبط کھو ہی بیٹھا، جب ریحان نے مجھ سے یہ پوچھا کہ ”کیا میں اُسے ایک قاتل سمجھتا ہوں اور کیا میں کبھی ریحان کے لیے دعا کروں گا۔۔۔۔۔؟“ میں جواب دیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میری اور میری دعاؤں کی کیا اوقات ہے۔ ہاں البتہ اگر اوپر والے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اور گڑ گڑا کر مانگتے ہی کو دعا کہا جاتا ہے تو میں یہ مشتق ریحان کی گرفتاری سے بھی پہلے سے کر رہا ہوں۔ کہ ”یا مالک۔۔۔۔۔ انسان کو صبر دے، سکون دے اور ہمت عطا کر۔۔۔۔۔“ میں بہت دیر سے ریحان کے ساتھ بیٹھا تھا اور مجھے اپنے گزرتے وقت کی اطلاع صرف روشن دان سے چھتی دھوپ کے مختلف زاویوں ہی سے مل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے شام قریب آ رہی تھی۔ میں نے نماز بھی ریحان کے کمرے ہی میں ایک صاف چادر بچھا کر ادا کی۔ ریحان سے بھی کہا کہ وہ نماز کی پابندی کی کوشش کیا کرے۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ بچپن میں یعقوب ڈرائیو کے ساتھ وہ ہمیشہ جمعہ اور عید کی نماز کے لیے ضرور جاتا تھا۔ یعقوب کی بیوی، جو ریحان کی زوجہ حالی مال کے برابر تھی، اُس نے اُسے نماز اور سورتیں یاد کروائیں تھیں لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ سب بھولتا گیا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ چاہے وہ مذہب کو بھلا بیٹھا ہو، لیکن مذہب اُسے کبھی نہیں بھولے گا اور جس دن ریحان با وضو ہو کر جائے نماز پر کھڑا ہوگا، اُسے خود بخود سب یاد آجائے گا۔ خود میرے ساتھ بھی تو یہی ہو چکا تھا۔ مذہب ہمارے اندر آتی جاتی سانس کی طرح زندہ رہتا ہے۔ جب ہم سانس لینا نہیں بھولتے اور کوئی ہم سانس لینا سکھاتا بھی نہیں تو پھر مذہب ہمیں کیسے بھول سکتا ہے۔ بس، کچھ طریقہ کار سیکھنے کے لیے کبھی کسی رہبر اور کبھی ماحول کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

عصر کے فوراً بعد ریحان کی دوا کا وقت ہونے لگا اور میرے جانے کی خبر سن کر نہ جانے وہ کیوں ایک ہی بہت بے چین سا ہو گیا۔ شاید میں اُس کی عمر پھر میں اُس کا واحد دوست تھا، جس کے ساتھ اس نے صبح شام تک کا وقت گزارا اور اپنے دل کی اتنی بہت سی اُمول باتیں باخفی تھیں۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر عجب درد بھرے لہجے میں التجا کی ”پھر آؤ گے تا عبداللہ۔۔۔۔۔؟“ ”ہاں۔۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔۔ اور اُس دن صرف تمہاری لیلیٰ کی بات کریں گے۔ پیٹنگوں کی باتیں، دھانی آسان اور نیلی ڈور کی باتیں۔۔۔۔۔ جھاگ اُڑا۔ سمندر اور دودھیا بادلوں کی باتیں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے نا۔۔۔۔۔؟“ وہ بہت خوش ہو کر بولا ”ہاں۔۔۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ لیکن پکا۔۔۔۔۔ تم آؤ گے نا۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ بالکل پکا۔۔۔۔۔“ میں نے مسکرا کر اُس کا ہاتھ چھپتایا اور نرس نے ریحان کے بازو میں نیند کی دوا انجیکٹ کر دی۔ میں ریحان کی پلکیں بوجھل ہونے تک وہیں اُس سر ہانے بیٹھا رہا۔ نیند کی سرمئی پری نے دھیرے دھیرے اپنے پتکے اُس کے بوجھل پونوں پر پھیرنا شروع دیے۔ ریحان کی پلکیں بھاری ہونے لگیں، لیکن سوتے سوتے بھی آج اُس کے ہونٹوں پر ایک معصوم اور سی مسکان موجود تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آج کی رات اُس کی زندگی کی سب سے بڑے سکون نیند کی رات ہوگی نیند کا یہ مکمل خزانہ آج کل ہم سب میں سے کسی کا بھی نصیب نہیں ہے۔ ہم سو تو جاتے ہیں مگر بتانے

اندازہ درست تھا۔ کچھ پیچیدگی ہوگئی ہے۔ لیکن میں حتیٰ رائے تب ہی دوں گا، جب ان کے تمام معائنوں پر رپورٹ میرے پاس آجائے گی..... اللہ خیر کرے گا۔“ ڈاکٹر میرا کاندھا تھپتھا کر آگے بڑھ گیا۔ سلطان بابا فوری نگہداشت کے شعبے میں منتقل کر دیا گیا اور پھر سے وہی شیشے کی ٹنکیاں اور بوتلیں اُن کے جسم سے چکان گئیں، جن سے انہیں شدید جڑھتی۔ رحمان صاحب بھی بہت دیر تک میرے ساتھ ہی شیشے کی دیوار سے پس کمرے میں لیٹے سلطان بابا کو دیکھتے رہے۔ پھر انہیں کوئی ضروری فون آیا تو وہ مجھ سے معذرت کر کے اپنے دفتر کی جانب روانہ ہو گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ وقت جب اُڑنے پر آئے تو پر لگا کر اُڑتا ہے اور جب سر کے پر آئے تو یوں ایک ایک صدی کر کے سرکتا ہے کہ ہم ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے کئی جنم گزار دیتے ہیں۔ میں نے بھی نہ جانے اس لکڑی کی بیج پر بیٹھے کتنے جنم پھر سے جی کر فنا کر دیئے۔ ڈاکٹروں کی نہ جانے کتنی ٹولیاں اندر آتی جاتی رہیں اور سلطان بابا کا معائنہ جاری رہا۔ نہ جانے کب پھر سے رات ہوئی اور پھر سویرا بھی ہو گیا۔ درمیان میں دوسرے رحمن صاحب کا فون بھی آیا۔ میں دو رات پہلے رحمان سے ملنے کا وعدہ کر کے آیا تھا لیکن آج دوسرا دن چڑھ آنے کے باوجود یہاں سے مل بھی نہیں سکا تھا۔ جانے ہم انسان کس بل بوتے پر ایسے وعدے اور اتنے بڑے بڑے دعوے کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس تو ایک بل کا اختیار بھی نہیں ہوتا۔

پھر سہ پہر ڈھلنے کے بعد تھکے تھکے سے رحمن صاحب بھی آ گئے۔ میں نے اُن سے رحمان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تو وہ ہوں ہاں کر کے ٹال گئے۔ میں بے چین ہو گیا اور اُن کی منت کی کہ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ آخر رحمن صاحب نے ہتھیار ڈال کر مجھے وہ اُن ہونی بھی سنا دی، جس کا خدشہ شاید میرے اندر بہت پہلے سے کہیں بیٹھا ڈنک مار رہا تھا۔ رحمن صاحب نے بتایا کہ رحمان اس رات بے حد پُر سکون نیند سو رہا تھا اور اُٹھنے کے بعد بھی وہ بہت پُر سکون رہا۔ لیکن سہ پہر کے بعد اُس کے اندر عجیب سی بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ فوراً کمرے کی کھڑکیاں کھول دی گئیں تاکہ اُسے دن ہونے کا احساس ہوتا رہے مگر وہ بے چینی سے ادھر ادھر سر پختار۔ شاید اُس کا وجود اندر سے خارج رہا تھا اور برسوں سے اُس کے اندر پلٹی دہری شخصیت کو جب لگا تار کئی راتوں تک اپنے اظہار کا موقع نہیں مل پایا تو اُس نے رحمان کے اعصاب اُکھڑنا شروع کر دیئے تھے۔ باہر نفسیات کے کہنے پر شام سے پہلے ہی کھڑکیوں کے پردے گرا کر رحمان کے کمرے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل اور میک اپ کا کچھ سامان پہنچا دیا گیا اور کمرہ باہر سے بند کر دیا گیا، لیکن کچھ ہی دیر میں رحمان نے سنگھار میز کے آئینے کو ایک ہی ضرب سے کرچی کرچی کر دیا اور سنگھار کا سارا سامان اُٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ اسپتال کے عملے نے فوراً رحمان کو قابو کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس کا جنوں بڑھتا ہی گیا اور نصف شب تک وہ خرد کی آخری حد بھی پار کر چکا تھا۔ مجبوراً اُسے بجلی کے جھٹکے دیئے گئے لیکن رحمان جس گلابی دھند کے پار جا چکا تھا، وہاں سے واپس نہ لوٹ پایا۔ اگلی صبح اسپتال کی راہ داریاں اُس کے دیوانہ وار قہقہوں سے گونگ رہی تھیں اور پھر کچھ ہی دیر میں لوگوں کو کسی معصوم بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ معصوم بچہ، جس کی

ل کروا کر سلطان بابا کے سامنے سے ہٹا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہ جبر میں نے رات بھر خود پر اس طرح جھیلا  
میرا سارا بدن بخار میں پھنک رہا تھا۔ بالآخر صبح ڈاکٹروں نے سلطان بابا کے معائنے کے حتمی نتائج  
کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ انہیں جس جدید علاج کی ضرورت ہے، وہ ملک کے صرف دو شہروں میں  
ہے، جس میں ایک میرا اپنا شہر بھی شامل تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہاں سے ہمارے شہر کے لیے ہفتے بھر  
صرف ایک جہاز اڑتا تھا اور بد قسمتی سے آج وہی دن تھا اور اڑان کا وقت بھی نکل چکا تھا۔ زمینی راستے سے  
ڈوالی سلطان بابا کی حالت نہیں تھی اور ٹرین تک پہنچنے کے لیے کم از کم یہاں سے دو دن کا زمینی سفر درکار  
ہو نہ جانے رجن صاحب کے ذہن میں کیا خیال آیا۔ انہوں نے دو چار فون گھمائے اور گھنٹے بھر بعد ہی آ  
پڑا وہ سنایا کہ شہر کی بندرگاہ پر ایک بہت بڑا غیر ملکی بحری جہاز آ کر لگا اور ٹھیک چھ گھنٹے بعد اس کی روانگی  
رجن صاحب نے ہمارے لیے دو فرسٹ کلاس کے کبین مختص کروا لیے تھے۔ ہمیں یہ بحری جہاز آج سے  
پانچویں دن شہر کی بندرگاہ پر اتار دیتا۔ بقول رجن صاحب یہاں بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ ہم اپنی منزل  
باب چل پڑتے کیوں کہ سات دن بعد بھی اگر موسم یا کسی دوسری انہونی کی وجہ سے ہم سے اگلی فلائٹ بھی  
بلی تو مزید دیر بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو انہوں نے زور سے میرا کاندھا تھپتھپایا  
برے ساتھ سامان سیٹھنے میں مشغول ہو گئے۔

جب ہم بندرگاہ پہنچے تو وہ عظیم الشان نیلے رنگ کا بحری جہاز جس کی سات منزلیں تو زور ہی سے گئی جاسکتی  
اکی فوج کے فاتح سپہ سالار کی طرح سینہ تانے لنگر انداز تھا۔ جہاز پر سنہری اور سفید حروف میں بڑا بڑا  
ملا لٹکا لکھا ہوا تھا اور اطالوی نژاد عملہ عرشے پر اور نیچے بیڑھیوں پر کھڑا آنے والے مہمانوں کا استقبال کر رہا  
اس بحری جہاز کو دیکھتے ہی مجھے اسی جیسے ایک ویو ہیکل سفینے کے ڈوبنے کا واقعہ یاد آ گیا، جس سے جڑی  
نی ایک لافانی داستان کو لوگوں نے پردے پر بھی بے حد سراہا تھا۔ رجن صاحب کے عملے نے ایبیلینس  
اتار کر اسٹریچر پر لیے سلطان بابا کو نہایت احتیاط سے مشین کے ذریعے اوپر جہاز پر پہنچا دیا۔ جہاز کے  
پہلے ایک زوردار ہنکار اُبھرا اور میں نے رجن صاحب کی جانب الوداعی ہاتھ بڑھا دیا۔ انہوں نے میرا  
ہاتھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولے زندگی رہی تو تم سے ملاقات ضرور ہوگی۔ میں جانتا ہوں تم نے  
ملاں بابا کی حالت کے پیش نظر اپنی تکلیف ہم سب سے چھپائے رکھی، لیکن تم اسے میرا حکم سمجھ لو یا درخواست  
پڑے شہر پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنا چیک اپ بھی ضرور کراؤ گے۔ تمہارے یہاں کے معالج تمہارے لیے  
مفکر مند ہیں۔ انہیں ابھی تک تمہاری بیماری بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں آئی اور تمہیں یوں درمیان میں ہی  
بھجوا کر جانا پڑ رہا ہے۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں اُن کے حکم کی تعمیل ضرور کروں گا۔ وہ جب تک  
بندرگاہ کی میلوں پھیلی سلیب پر کھڑے رہے، جب تک جہاز لہریں اُچھالتا اور کسی مست ہاتھی کی طرح  
ٹاکرے پانیوں میں نہیں نکل آیا۔

## ”ہوش والوں کو خبر کیا.....“

ریحان نے ہمیشہ کے لیے اپنا تاتا اس ہوش کی دنیا سے توڑ لیا تھا، جہاں اُس جیسے نازک احساسِ دل  
کے لیے ذی ہوش خود دیوانہ تھا۔ یہ دنیا ویسے بھی اس کے کام کی نہیں تھی، جہاں کالج کاسن رکھنے والوں کو ہر دم  
پتھروں کا سامنا رہتا ہے۔ اس شام جب سلطان بابا نے تین دن کی بے چینی کے بعد زورادیر کے لیے غنوں کی  
چادر اوڑھی تو میں رجن صاحب کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ریحان کو دیکھنے کے لیے گیا۔ آہنی سلاخوں سے  
پرے ایک ایسے کمرے میں، جس کی دیواروں کو اندر سے چکنے اسٹیل سے ڈھک دیا گیا تھا اور جس کی آہڑ  
چھت کے اندر صرف ایک بلب کے جلنے کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی۔ ریحان گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔  
ہماری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا اور کسی بچے کی طرح خوف زدہ ہو گیا اور پھر جلدی سے ہماری جانب سے  
پنچہ موڑ کر بیٹھ گیا لیکن اچانک ہی جیسے اُسے کچھ یاد آیا اور وہ جلدی سے بھاگ کر سلاخوں کے قریب آ گیا  
رجن صاحب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ”میری امی کب آئیں گی.....؟“ ”رجن صاحب نے جھوٹی مسکراہٹ  
لیوں پر سجائی۔ ”تمہاری امی جلد آ جائیں گی شرط یہ ہے کہ تم روگے نہیں، نہ ہی یہاں کے عملے کو تنگ کرو گے۔  
ریحان خوش ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے..... پکا؟“ ”رجن صاحب نے اُس کی پھلی ہوئی ہنسی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”پکا  
پکا.....“ وہ فوراً جا کر اپنی جگہ پر یوں باادب بیٹھ گیا، جیسے کوئی بہت تیز دار بچہ اپنی ماں کے حکم کے مطابق  
جگہ بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا ہے۔ مجھ سے پھر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ کتنا نازک ہوتا ہے یہ انسان، کتنا کول، آ  
ملائم احساس والا..... پھر بدل کیسے جاتا ہے۔ مکاریاں، فریب، چال بازی، دشمنیاں، حسد، برائیاں  
کینہ پروری، چوری، جھوٹ، خیانت اور دغا بازیاں کیسے سکھ لیتا ہے؟ اگر جنوں انسان کو پھر سے ریحان  
طرح معصوم بنانے کے عمل ہی کا نام ہے تو اسے کاش قدرت سب ہی ہوش مندوں کو مجنوں کر دے اور پھر  
کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ہوش والے بھلا جنوں کی حکایت کو کیا جانیں، بے خودی کی لذت تو صرف دیوانہ  
ہی کا انعام ہے۔ یہ نادان ہوش والے تو بس سا ہو کار کی طرح لین دین اور فتنہ و نقصان کے پھیرے میں پڑ  
رہتے ہیں لیکن ایک دن انہیں بھی سب کچھ یہیں چھوڑ کر دیوانوں کے ساتھ ہی کوچ کرنا پڑتا ہے۔

میں واپس اسپتال تو آ گیا تھا لیکن اپنے دل کا ایک ٹکڑا وہیں ریحان کے پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ خود  
اپنی حالت بھی نہایت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ رگوں میں سنگتی چنگاریاں وقفے وقفے سے ایک بھر کتا شعلہ  
میرے پورے سراپے کو جھلسا رہی تھیں لیکن میں ضبط کیے بیٹھا رہا۔ میں ایسے موقع پر ڈاکٹروں کی توجہ اپنی جا



جہاز نے جس وقت لنگر اٹھایا تھا اس وقت عصر کا وقت تھا اور اب مغرب بھی ڈھل چکی تھی۔ میں مسافر بابا کو ان کے کیمپن میں دوا کھلا کر، کبیل اوڑھا کر باہر عرشے پر نکل آیا۔ کھلے سمندر میں سورج ڈوبنے کے بعد بہت دیر تک شفق کی لالی برقرار رہتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب سورج غروب ہونے سے پہلے سمندر ساتھ اپنی آخری جنگ لڑ رہا تھا، تب اُس کی سنہری کرنوں نے افق تا افق لہروں کو اپنا سونا سونپ کے درخشاں کی کہ آج وہ سورج کو نہ ڈبوئے..... لیکن سمندر بھلا کب کسی کی سنتا ہے، جو ان معصوم کرنوں کی مانند تینوں لڑائی سے جاری اس لڑائی میں ایک بار پھر شام ڈھلے سورج کو تھکھار ڈالنا ہی پڑے اور سمندر ایک بار پھر جیت گیا۔ میں جانے کتنی دیر عرشے پر لوہے کی رینگ کے پاس کھڑا لہروں کو سمندر کی جیت کا جشن مناتے دیکھ رہا۔ اچانک پیچھے سے کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ چونک کر پلٹا تو احرام باندھے کوئی عازمِ نماز کھڑا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بندرگاہ پر جہاز میں سوار ہوتے، میری نظر عازمِ حج کی ایک ٹولی پر بھی پڑی تھی وہاں حق کا مسافر مجھے دیکھ کر مسکرایا "کہیں بہت دُور کھوئے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہیں سمندر کا جادو تمہیں کھینچ نہ لے..... اس لیے غل ہو گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔" میں بھی دھیرے سے مسکرایا۔ "میرے اللہ بیک وقت نہ جانے ایسے کتنے سمندر ٹھانٹیں مارتے رہتے ہیں، اس کا جادو تو نا میرے لیے نیا نہیں۔" "بہن خوب..... کوئی لمبا سفر درپیش ہے؟ اور وہ بزرگ اب کیسے ہیں، جو تمہارے ہم سفر ہیں۔ میں نے جہاز پر ہوتے وقت انہیں تمہارے ساتھ دیکھا تھا۔" "جی وہ آرام کر رہے ہیں۔ طبیعت کچھ مضطرب ہے اُن کی۔ ہم آگے بڑی بندرگاہ پر اتر جائیں گے۔ وہی میرا شہر اور ہماری منزل بھی ہے۔" اُس نے باوا بلند کہا "انشاء اللہ۔" کچھ دیر ہم دونوں پہاڑ جیسی لہروں کو نیچے جہاز کے پینڈے سے ٹکرا کر فتا ہوتے دیکھتے رہے۔ پھر میں نے آدابِ تکلم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بات جوڑی "البتہ آپ کا سفر کافی طویل ہے۔ کتنے عرصے میں پہنچ جائے گا۔" اُس کے گھر.....؟؟؟ "شاید چودہ پندرہ دن لگیں گے۔ لیکن سچ تو یہی ہے کہ یہی پندرہ دن بچپنِ سالہ زندگی کا حاصل ہیں۔ تم نے حج کیا ہے.....؟؟؟" "نہیں..... مجھے فی الحال یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔" سچ تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یہ بہت ہمت اور حوصلے کا کام لگتا ہے۔ جانے میرا ظرف اس قابل کبھی ہوگا پائے گا یا نہیں۔" وہ ہنس دے "سب بلاؤں کی بات ہے میاں..... بلاؤ آجائے تو لحوں میں انسان کا نہ تیار ہو جاتا ہے۔ خود میرا بھی حال تم سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کبھی اس سفر کے لیے نکل ہی نہ پاؤں گا۔ لیکن جب بات بننے لگی تو یوں بنی کہ جیسے بس اسی سفر کے انتظار میں ہی تو میری ساری عمر گئی ہے۔" کافی دلچسپ انسان تھے۔ اُن کا نام حبیب البشر تھا۔ تیسری منزل پر چند دوسرے ایشیائی باشندوں کے ساتھ اُن کا مشترکہ کیمپن تھا۔ وہ کافی دیر میرے ساتھ عرشے پر کھڑے باتیں کرتے رہے، انہوں نے بتایا کہ وہ پہلے نیویارک میں کاروبار کرتے تھے اور مذہب سے اُن کا دُور دُور تک کوئی واسطہ یا رابطہ نہیں تھا۔ نے بے خیالی ہی میں پوچھ لیا۔ "آپ نیویارک میں کیا کرتے تھے؟" "میرا ڈانس کلب تھا وہاں۔" دیکھا

بارہائی اور فنکشن کا اہتمام کروایا کرتا تھا میں۔" جواب سن کر میں زور سے چونکا۔ وہ میری کیفیت بھانپ گئے۔ میں نے معذرت کی کہ خواہ مخواہ اُن کی نجی زندگی کو کریدا۔ وہ ہنس دے۔ "ایسی کوئی بات نہیں میاں..... میں نے کہا تھا کہ میں چودہ پندرہ سال کی عمر میں امریکا منتقل ہو گیا تھا، لہذا میرا اسلام سے برائے نام رشتہ بھی قائم نہ رہ سکا۔ پھر ایک دن کچھ لوگ میری زندگی میں آئے اور میری راہیں بدلتی گئیں۔" وہ دُور افق کے پار کچھ دیکھتے ہوئے کھو سے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اُس روز نیویارک میں پیدل چلنے کا دن منایا جا رہا تھا لہذا لوگ فری متا تک پیدل چل کر جا رہے تھے۔ سڑکوں پر کسی میلے یا تھوڑا جیسی بھیڑ تھی۔ نوجوان حبیب بھی ہلکی ہلکی گرتی برف میں سردی سے جھٹتے ہاتھ اور کوٹ کی جیب میں ڈالے، سیٹی پر کوئی مشہور دھن گنگنا تا، کلب کی جانب جا رہا تھا۔ آسمان کے تیر بتا رہے تھے کہ کسی بھی وقت برف باری تیز ہو سکتی ہے۔ لہذا لوگوں کے قدموں میں تیزی آرہی تھی۔ تیز سرد ہوا کے تھپڑے لباس کے اندر داخل ہو کر جسم کے پار نکل جاتے تھے۔ حبیب فریبی چوراہے کے سنگل پر پہنچا تو بتی سرخ تھی۔ اچانک پیچھے سے کسی نے پکارا۔ "نوجوان..... کیا تم دلوں کے لیے ہماری بات سن سکتے ہو؟" حبیب چونک کر پلٹا۔ پیچھے پانچ باریش بزرگوں کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ "جی فرمائیے....." کیا تم ہمیں اپنے قیمتی وقت میں سے صرف دس منٹ دے سکتے ہو، اللہ کے لیے....." حبیب سمجھا کہ وہ کوئی چندہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بزرگ اُس کا مقصد سمجھ کر سکرانے "نہیں..... پیسہ نہیں..... صرف وقت..... اور وہ بھی دس منٹ....." "لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور پھر نیویارک جیسے شہر میں آپ کو کوئی بھی دس منٹ نہیں دے گا۔ یہاں وقت ہی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔" "تب ہی تو ہم نے کہا کہ اپنا قیمتی وقت دے سکتے ہو۔ اُس اللہ کے نام پر، جس نے تمہیں پیدا کیا اور اتنی اچھی صورت دی اور آرام وہ زندگی عطا کی۔ ہم تم سے تمہارے دس منٹ مانگنے کے لیے سات سمندر پار سے آئے ہیں۔ اور یہاں سب سے ہمارا بس اتنا ہی مطالبہ ہے لیکن اب تک زیادہ تر دھتکار ہی ملی ہے۔" حبیب نے کچھ دیر سوچا اور پھر نہ جانے کیوں اُس کا دل منبج گیا۔ "ٹھیک ہے..... لیکن صرف دس منٹ..... ایک سیکنڈ بھی زیادہ نہیں، کیوں کہ مجھے اپنے کلب پہنچنا ہے اور ایک بہت ضروری شوقا اہتمام کرنا ہے۔" سنگل کھل چکا تھا۔ باریش ٹولی حبیب کو سامنے ہی شیشوں کے بڑے بڑے دروازوں والے ایک کیفے میں لے گئی۔ برف باری تیز ہو چکی تھی۔ سڑک پار کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں کے نشان برف پر بننے شروع ہو چکے تھے۔ حبیب نے کیفے میں داخل ہو کر سر کے بالوں میں جی برف کو جھاڑا۔ انہوں نے کھڑکی کے سامنے والی میز سنبھال لی۔ ایک بزرگ نے بیگ میں سے ایک کتاب نکالی اور اس کی تلاوت کی۔ ساتھ بیٹھے دوسرے بزرگ نے ترجمہ سنایا "تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے.....؟" تلاوت جاری رہی اور ترجمہ ہوتا رہا۔ ٹھیک ساڑھے نو منٹ بعد بزرگ نے تلاوت بند کر دی۔ "دس منٹ پورے ہونے کو گنا۔ تمہارا بہت شکر یہ کہ تم نے اپنے وقت میں سے دس منٹ اللہ کے نام کر دیے۔ جزاک اللہ....." لیکن



انے جانے کس بات کا غصہ تم پر اُتار دیا، ورنہ وہ عمومی طور پر نہایت شائستہ اطوار کی خاتون ہے۔“ میں نے کاتاف کم کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ ”آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ لیں، یقین کریں میں ڈاننگ ہال نکلنے سے پہلے ہی سب فراموش کر چکا تھا۔ دراصل میں کچھ پریشانی میں مبتلا ہوں، اس لیے مجھے جلدی دہاں سے نکلنا پڑا۔“ ہاں مجھے پتا چلا ہے۔ اب کیسے ہیں وہ بزرگ؟“ ”کچھ بہتر ہیں۔ یہ انہی کا کیمین میرا کیمین ساتھ والا ہے۔“ اتنے میں عملے کی ایک اینڈنٹ ہمارے قریب آئی اور مودب انداز میں صاحب سے مخاطب ہوئی۔ ”جناب آپ نے فرسٹ کلاس کے ایگزیکٹو سوئیٹ کے لیے حکم دیا تھا، لیکن لوبات کرنے پر پتا چلا ہے کہ اس وقت کوئی بھی رائل یا ایگزیکٹو کیمین خالی نہیں ہے، لہذا ہم معذرت خواہ۔ البتہ اگر آپ پسند کریں تو چوتھی منزل پر ایک دوسرے درجے کا کیمین فی الوقت میسر ہے۔ آپ کہیں تو آج رات کے لیے بک کر دیا جائے۔“ راحیل صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، جیسا آپ اب سمجھیں۔“ اطالوی لہجے میں انگریزی بولنے والی اینڈنٹ سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے راحیل صاحب سے پوچھا۔ ”کیا آپ کو جگہ کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ رات میرے کیمین میں بھی گزار لیں۔ میں ویسے بھی رات بھر اپنے ہم سفر کے کمرے میں گزاروں گا۔ انہیں میری تیمارداری کی ضرورت ہے۔“ راحیل صاحب ہچکچاہٹ سے گئے۔ ”نہیں نہیں..... کچھ انتظام ہو جائے گا، آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں۔“ ان میں نے اصرار کر کے اپنے کیمین کی چابی اُن کے حوالے کر دی۔ اور خود سلطان بابا کے کیمین میں چلا آیا۔ اُن کے آخری پہر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ والے کیمین میں کچھ تیز لہجے میں بحث کی آوازیں آ رہی ہوں، لیکن میں نے دانستہ راہ داری میں نکلنے سے گریز کیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میاں بیوی میں کچھ ناہن چل رہی ہے، لہذا بہتر یہی تھا کہ میں انہیں اپنے معاملات سلجھانے کا موقع دوں۔ صبح تک سلطان بابا نے درجنہ آنکھیں کھولیں اور دونوں مرتبہ مجھے جا کر سونے کا اشارہ کیا، لیکن وہ میرے جواب سے بھی خوب غصے تھے۔ صبح کے بعد اُن کی نیند کچھ پرسکون ہوئی تو میں باہر نکل آیا۔ ٹھیک اُسی وقت راحیل صاحب بھی نکلنے کے لیے ڈاننگ ہال کی طرف نکل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف بڑھے۔ ”رات میں لک بطرح سے تمہارا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ منتاشا نے مجھے آدھی رات کو ڈھونڈ لیا تھا۔ دراصل ہمارے ہاں تمہارے معاملے پر ہی کچھ اُن بن ہو گئی تھی، اس لیے میں اپنا کیمین چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ پہلے تو وہ میرے اُن سے یوں چلے آئے پر بہت ناراض ہوئی اور پھر جب میں نے اُسے یہ بتایا کہ میں اس وقت اُسی نوجوان کیمین میں ہوں، جسے اُس نے بھرے ہال میں سخت ستائی تھی، تو وہ بہت دیر تک تو کچھ بول ہی نہیں سکتا۔“ ”تمہارا شکریہ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں رات ہی اپنے کیمین واپس لوٹ گیا تھا۔ بہر حال، تمہارا شکریہ۔“ انہوں نے کیمین کی چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ اور مجھے اپنے ساتھ ناشتے کے لیے چلنے کی مدد کی۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں لباس تبدیل کر کے نیچے ہال میں اُن سے ملوں گا۔ کبھی کبھی نیم گرم پانی

## کاسابلانکا

یہ سنتے ہی میں اُس عورت کو چننا چلا تا چھوڑ کر اپنے کیمین کی جانب لپکا، وہاں پہلے ہی سے جہاز کی ٹیبلٹ کے مستند ڈاکٹر موجود تھے۔ سلطان بابا کو آکسیجن لگائی جا چکی تھی اور ان کی سانس رُک رُک کر چل رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر ڈاکٹر سے پوچھا کہ ”کیا ماجرا ہے؟“ ڈاکٹر نے سلطان بابا کی نبض سے ہاتھ اٹھایا۔ ”عام طور پر بوڑھے افراد کو سمندری بخار (Sea sickness) ہو جاتا ہے۔ ایسے میں متلی، چکر آنا یا دل گھبراتا معمول کی بات ہے، لیکن چونکہ یہ بزرگ پہلے ہی سے بیمار چلے آ رہے تھے، لہذا دونوں وجوہ نے مل کر ان کے نظام تنفس کو ایک دھچکا دیا ہے۔ بہر حال..... ہم نے آکسیجن لگا دی ہے۔ ہمارے عملے کی نرس ساتھ والے کیمین ہی میں رات بھر موجود رہے گی۔ اگر آپ ذرا سی بھی غیر معمولی بات محسوس کریں تو فوراً اُسے طلب کر سکتے ہیں۔ شب بخیر.....“ فرانسیسی ڈاکٹر انگریزی میں مجھے تسلی دے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ نرس بھی اطالوی تھی۔ اُس نے مجھے خود کار گھنٹی کار میوٹ پکڑا دیا کہ ضرورت پڑنے پر میں صرف یہ مٹن دبا دوں تو وہ حاضر ہو جائے گی۔ میں نے سلطان بابا کے بستر کے بالکل سامنے پڑی آرام کرسی سنبھالی اور کیمین کی روشنیاں مدھم کر کے کرسی پر کمر کھائی۔ جانے کتنی دیر میں آکسیجن سلنڈر کے ساتھ جڑی شیشے کی لنگی میں پانی کے بلبلی بن کر ختم ہوتے دیکھتا رہا۔ ہماری زندگی بھی تو فقط پانی کا ایک بلبلہ ہی ہے۔ یہاں بنا..... وہاں ختم..... جانے رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ کیمین کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا لیکن دوسری مرتبہ دستک کی آواز واضح تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو راہ داری میں رات کے کھانے کے لباس (ڈنر سوٹ) میں ایک وجہہ شخص، باریک سا خوب صورت نظر کا چشمہ لگائے کھڑا تھا۔ اُس نے میری جانب ہاتھ بڑھایا۔ ”اس وقت زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں، مجھے راحیل کہتے ہیں۔“ میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں عبداللہ ہوں۔ کہیے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ ”وہ کچھ ہچکچایا۔“ دراصل میں تم سے معذرت کرنے آیا ہوں۔ ڈاننگ ہال میں تم پر بلاوجہ چلانے والی میری بیوی منتاشا تھی۔ میں جانتا ہوں کہ غلطی تمہاری نہیں تھی، لیکن اُس نے تمہاری بہت بے عزتی کی۔ اُس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ میں نے تمہارے چہرے سے اندازہ لگایا تھا کہ تم ایشیائی ہو اور پھر جب میں نے جہاز کے عملے سے تمہارے کوائف پوچھے تو پتا چلا کہ تم میرے ہم وطن بھی ہو۔ میں درحقیقت تم سے بے حد شرمندہ ہوں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”بھول جائیے۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔“ ”نہیں..... یہ بھولنے والی بات نہیں ہے، لیکن منتاشا خود شدید ڈیپریشن کا شکار ہے اور

ہ بولیں ”نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں..... تم صرف ایک بہانہ بنے، ورنہ ہمارے درمیان بہت دن ہی سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگلی بندرگاہ پر اتر کر ہم قانونی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔“ میرے اندر جیسے ایک چھٹکا سا ہوا۔ یہ بات میرے لیے کچھ اتنی ہی غیر متوقع تھی۔ وہ شاید میری بات بھانپ گئیں۔ ”شاید میں نے تمہیں دھوکا پہنچایا۔ مجھے افسوس ہے۔ مگر سچ یہی ہے۔ ہمارے درمیان طاری ہو رہا تھا اور شاید جمود محبت کی موت ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ محبت کو جمود سے بچانا بھی ہمارے اختیار نہیں ہوتا، بالکل اُسی طرح جیسے محبت کا ہو جانا ہمارے بس سے باہر ہوتا ہے۔“ میں نے چونک کر اُن کی بات دیکھا۔ مشرق کی عورت جس بات کو چھپانے کے لیے زندگی بھر چپ رہتی ہے، مغرب کی عورت نے حقیقت کتنی آسانی سے بیان کر دی تھی۔ میں چپ رہنا چاہتا تھا لیکن پھر وہی آداب گفتگو کی زنجیر آڑے آئی۔ ”ہمارے مشرق میں ہزاروں لاکھوں محبتیں ایسے جمود کا شکار ہونے کے باوجود صرف ایک بندھن کی بات کی خاطر اپنی طبعی موت کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ جانے یہ کن کی خوش قسمتی ہے یا حرام نصیبی۔ لیکن شاید رشتہ کبھی نہ کبھی ایسی قربانی ضرور مانگتا ہے۔“ وہ اپنی پلیٹ میں رکھے آلیٹ کو کانٹے سے ادھر ادھر دھکیلتی ہیں، لیکن اُن کا دھیان کسی اور جانب تھا۔ ”جانتی ہوں، ساری بات شاید اختیار کی ہے۔ کاش میں بھی ہمارے مشرق کی عورت کی طرح بہت سی باتوں پر اختیار رکھنے کے باوجود بے اختیار ہوتی۔“ میں نے تردید مناسب نہیں سمجھی۔ ناشتے کے بعد میں بہت دیر تک سلطان بابا کے کیمین میں اُن کے سر ہانے بیٹھا رہا۔ انہیں اب بھی خود سے زیادہ میری فکر کھائے جا رہی تھی اور وہ مختلف بہانوں سے مجھ سے وعدہ لیتے رہے کہ میں شہر پہنچنے ہی خود کو کم از کم ایک ہفتے کے لیے ڈاکٹروں کے حوالے کر دوں گا۔ شہر کا ذکر آنے پر ایک دم ہی میرے ذہن اُس پری کا تصور ابھر آیا، جو اس سارے فسانے کی بنیاد تھی۔ جانے میں اُس کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔ میری سانسیں تو اُس کے تصور سے ہی تھمے لگتی تھیں۔ اتنے عرصے بعد اُسے اپنے سامنے دیکھ کر جانے میرا کیا حال ہوگا۔ میں جہاز پر سوار ہونے سے قبل ہی رحمن صاحب کے ذریعے اپنے گھر واپسی کی اطلاع کروا چکا تھا اور یقیناً ملاپانے زہر اکو بھی میری آمد کی اطلاع دے دی ہوگی۔ جہاز کے بندرگاہ میں ننگرا انداز ہونے میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن مجھے ان لمحوں میں کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ کبھی کبھی انتظار خود وصل کی لذت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کیفیت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جو خود کسی طویل ریاضت سے گزر کر اپنی منزل کو بالکل سامنے پا کر بھی خود کو سوہیا ہونے تک روکے رکھتے ہیں۔ میں بھی عرشے پر بھی نیلی بان سے بنی آرام کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا دور اس افق کو دیکھ رہا تھا، جس سے پرے وہ زہر جہنم رہتی تھی، اور انتظار کی اُسی لذت کو محسوس کر رہا تھا، جو کسی کی کا مقدر ہوتی ہے۔ اتنے میں مجھے اپنے عقب سے نناشا کی آواز سنائی دی۔ ”کیا میں مغل ہو سکتی ہوں؟“ میں جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ راجیل صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ نناشائے بات شروع کی۔ ”تم نے کبھی

کا ایک طویل شاور ہماری رگوں سے تھکن یوں نچوڑ لیتا ہے، جیسے گیلی ریت پر لکھے کسی نام کو سمندر کی ایک لہر اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ میں نیچے ڈانٹنگ ہال پہنچا تو کھڑکیوں کے پردے ہٹائے چکے تھے اور آسمان پر ہلکے بادلوں سے چھن کر آتی دھوپ نے ہال کے چاروں طرف لکڑی کے چکے فرش پر دھبہ درجنوں کھڑکیاں سی بنا رکھی تھیں۔ میں ابھی بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ راجیل صاحب نے آواز دی۔ ”یہیں آ جاؤ نو جوان..... ہماری میز پر ایک کرسی خالی ہے.....“ لیکن میں نے دُور ہی سے ہلا کر اُن کا شکریہ ادا کیا اور عرشے کے جانب کھلتی ایک کھڑکی کے قریب پڑی میز پر اپنے دلیر کا پیالہ رکھا۔ جب ہی میں نے نناشا کو میز سے اُٹھ کر اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ تیس بیس سال کی ایک دلکش خاتون تھیں۔ سلیقے سے کٹے ہوئے سنہرے بال، جوفلہر سے میچنگ اسکارف سے بندھے ہوئے تھے۔ میں انہیں آج دوسری مرتبہ دیکھا تھا اور دونوں ہی مرتبہ جانے کیوں مجھے اُن کے چہرے کے ایک زاویے سے اُن کے ساحر کی پسندیدہ ہالی وڈ آرٹسٹ کیسٹرین زیٹا جونز کی جھلک بہت واضح محسوس ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اور میں اجازت لے کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کل رات راجیل صاحب بھی مجھ سے اُردو میں بات کر رہے تھے لیکن نناشا کو اُردو میں اپنے لفظ جوڑنے کے لیے کافی مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ میں نے کبھی انہیں یہ ”نا کام کوشش“ کرنے دی اور پھر دھیرے سے اُن سے انگریزی میں کہا کہ وہ چاہیں تو اب یہ کوشش ترک کر کے مجھ سے انگلش میں بات کر سکتی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھونچکا سی رہ گئیں اور پھر انتہائی غار سے بولیں۔ ”اوہ..... تو تم انگلش بول لیتے ہو، لیکن مجھے راجیل نے تو بتایا تھا کہ..... پھر تو میں مزید نام ہوا کیوں کہ تم نے میری گزشتہ رات کی ساری گفتگو سمجھ لی ہوگی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کبھی کہا ہر طرح نہیں چلائی۔“ میں مسکرایا۔ ”چلیں یہ اعزاز میری قسمت میں لکھا تھا، ورنہ عام طور پر بے چارے شہر نصیب ہوتا ہے۔“ میری بات سن کر وہ ہنس پڑی اور اُن کے چہرے پر چھایا ہوا تکدر کم ہو گیا۔ ”ویسے تم مجب لڑکے ہو، جس عورت نے تمہیں یوں سر بازار زرموا کیا، اُسی کے شوہر کو تم نے رات گزارنے کے لیے اپنا مکان پیش کر دیا۔ کیوں؟.....“ میں نے اُن سے بھی وہی کہا جو رات کو راجیل صاحب سے کہہ چکا تھا کہ وہ یہ سب انوش کر دیں۔ ہماری میز کے بالکل ساتھ والی میز پر ایک نوبیا ہٹا انگریز جوڑا ناشتہ کر رہا تھا۔ پتا نہیں کس بات پر لڑکے نے لڑکی سے بہت پیار سے پوچھا۔ ”سچ کہو، تم میرے ساتھ خوش تو ہونا۔“ لڑکی نے ہنسنے سے باز نہ آئی۔ ”ہاں“ کہا اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ قریب ہونے کی وجہ سے اُن کی ساری گفتگو ہم تک پہنچ رہی تھی۔ نناشا مسکرائی۔ ”کتنی عجیب بات ہے برسوں سے یہ سوال عورت سے تب ہی کیا جاتا ہے، جب اُس کے پاس ہاں کہنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہوتا۔“ ”ظاہر ہے، کون بے وقوف شوہر ہوگا، جو اپنی بیوی کو پہننے ہوا یہ سوال کرے گا؟“ میری بات سن کر وہ پھر زور سے ہنس پڑیں، لیکن اُن کی اداس آنکھیں کچھ اور ہی فانی رہی تھیں۔ میں نے اُن سے معذرت کی کہ کل رات میری وجہ سے راجیل صاحب کا اُن سے جھگڑا ہوا۔



محسوس کیا، ہماری زندگی کی ننانوے فی صد ضروریات کسی نہ کسی تخلیق کار کے ذہن کی مرہون منت ہیں۔ سوئی سے لے کر بجری جہاز تک، کوئی بھی ایجاد اٹھالو، انسان نے انسان کی سہولت کے لیے، کیا کچھ نہیں کیا۔ اس ایک زیادتی ہوگئی کہ ان سب آسانوں کے حصول کو کاغذ کے چند ٹکڑوں سے منسلک کر دیا، جسے ہم آج کل پیر کہتے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ..... اور شاید جہاں سے پیسے کا عمل دخل شروع ہوتا ہے، وہیں سے تخلیق کے عمل کا خاتمہ شروع ہو جاتا ہے۔ ویسے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ تخلیق یا creativity خود کو غلطیاں کرنے کی اجازت دینے کا دوسرا نام ہے جب کہ 'آرٹ' انہی غلطیوں میں سے کسی ایک کو جاری رکھنے کو کہتے ہیں۔ "نتاشا نے غور سے میری جانب دیکھا۔" ایک بات کہوں اگر بُرا نہ مانو تو..... تمہارا یہ حلیہ اور تمہاری باتیں آپس میں بالکل میچ نہیں کرتیں۔ یہ کیا معما ہے؟" میں مسکرایا۔ "اگر میں آپ سے کہوں کہ یہ باتیں مجھے یہ حلیہ اختیار کرنے کے بعد ہی سمجھ میں آئی ہیں تو آپ مزید الجھ نہ جائیں..... آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ کے اور راحیل صاحب کے درمیان صلح کی کوئی گنجائش نہیں؟ میں نے انہیں ایک بے حد نفیس انسان پایا ہے اور یقیناً وہ آپ سے شدید محبت بھی کرتے ہیں۔" نتاشا نے گہرا سانس لیا۔ "صلح وہاں ہوتی ہے، جہاں جھگڑے کی کوئی بنیادی وجہ بھی ہو۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ راحیل جیسا عمدہ اور نفیس انسان بڑی مشکل سے میسر ہوتا ہے۔ مجھے اُس کی محبت پر کوئی شک نہیں ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ ہم دونوں جُدا ہو رہے ہیں۔ ہماری بیٹی عینی ابھی بہت چھوٹی ہے، لہذا ہم یہ بھی طے کر چکے ہیں کہ وہ شروع میں کچھ عرصہ میرے ساتھ رہے گی اور پھر جب وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے گی تو آخری چناؤ اُس کے ہاتھ ہی میں ہوگا۔" نتاشا نے جتنی بارنا گھر لوٹنے کا ذکر کیا تھا میں نے اُن کی آنکھوں میں ایک خاص ڈھک کی لہر محسوس کی تھی۔ مشرق ہو یا مغرب، رشتے ٹوٹنے کی جیہن شاید یکساں ہوتی ہے۔" میں جانتا ہوں شاید یہ بہت ذاتی سوال ہوگا، لیکن کیا میں اس جُدائی کی وجہ جان سکتا ہوں؟" نتاشا نے کچھ دیر توقف کیا پھر اُن کی آواز یوں سنائی دی جیسے وہ ساحلوں سے پرے بیٹھی ہوں۔ "وفا..... ہماری جُدائی کا سبب وفا ہے۔" میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ لیکن چپ رہ کر انہیں خود کو مجتمع کرنے کا موقع فراہم کیا۔ "جو بات میں تمہیں اب بتانے جا رہی ہوں، جانے اس کے بعد تمہارے دل میں میرے لیے رتی برابر بھی عزت رہے گی یا نہیں۔ ہمارے مغرب میں آپس میں ہم آہنگی نہ ہونے پر گھروں کا ٹوٹ جانا ایسی کوئی معیوب بات نہیں رہی۔ بلکہ اب تو کسی بندھن کے تکلف ہی کو ترک کر دیا گیا ہے۔ لیکن میں نے ایک مشرقی مرد سے محبت کے بعد شادی کی تھی اور اس کی ہر روایت کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنے کی قسم بھی کھائی تھی۔ پھر نہ جانے یہ تیسری 'درا انداز محبت' کہاں سے ہمارے درمیان کی دیوار بن گئی۔ مجھے اُمید ہے تم مجھے دیگر لوگوں کی طرح ایک بے راہ رو مغربی عورت نہیں سمجھو گے۔ سچ یہ ہے کہ میری وفا مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں راحیل کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی سوچوں کے دروازے کسی اور کے تصور پر کھادوں۔ میں نے اُسی لمحے راحیل کو بتا دیا تھا کہ شاید میں کسی اور کی کشش کا شکار ہو رہی ہوں۔ اور یہ راحیل ہی

اُٹھ رہا ہے کہ اُس نے آٹھ سالہ رفاقت اور شدید محبت کے باوجود فیصلہ میرے اوپر چھوڑ دیا۔ ہم دونوں میں 'تجدید وفا' کے قائل نہیں ہیں..... اور پھر وہ وفا ہی کیا، جسے 'تجدید' کی ضرورت پڑ جائے۔ میں انہوں کہ جب محبت فرسودہ ہو کر دامن چھڑنا چاہتی ہے، تب وفا اُس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ رجت کو اس کا راستہ بدلنے نہیں دیتی۔ ننانوے فیصد کیسز میں جیت وفا ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن افسوس میرا 100 سوال تھا۔" میں چپ کر کے نتاشا کی بات سنتا رہا۔ انہیں اپنا دل کا غبار ہلکا کرنے کے لیے کسی مایع کی ضرورت شاید بہت عرصے سے تھی۔ اُن کی کہانی بھی ہر محبت کی کہانی کی طرح اُن کی پہلی بات سے شروع ہوتی تھی۔ راحیل اور نتاشا کی ملاقات پیرس کی ایک نمائش میں ہوئی تھی۔ جہاں راحیل ان سے اپنے ادارے کے ملبوسات کی تشبیہ کے لیے آیا ہوا تھا۔ راحیل کی شاندار شخصیت، متانت اور سمجھ کے اعتراف نے جلد ہی مشکل پسند اور بچی نتاشا کے دل میں گھر کر لیا۔ خود نتاشا اٹلی سے فیشن ڈیزائننگ برس کے لیے پیرس آئی ہوئی تھی، دو چار ملاقاتوں ہی میں سارے پیمانہ بندھ چکے تھے تو راحیل نے اپنے والوں سے فون پر نتاشا کی بات کروائی، کیوں کہ وہ اپنی ماں کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ ماں نے بیٹی کی آواز میں جھلکتی خوشی کو مستقبل کرنے کا عندیہ دے ڈالا اور نتاشا راحیل کی ہوگئی۔ دونوں کا ایسا تھا کہ انہیں فرانس اور پیرس ہی سب سے زیادہ چھتا تھا، لہذا ہاٹش وہیں رکھی گئی۔ اُن کی اکلوتی بیٹی یعنی پیدائش بھی پیرس ہی میں ہوئی۔ سات سال یوں پر لگا کر اڑ گئے کہ دونوں کو پتا ہی نہیں چلا۔ ہاٹش، ماں کبھی ہنسنے کھیلتے اختلاف ہوا بھی تو صرف اس بات پر کہ راحیل محبت کے حصول کو ہی محبت کی معراج تھا، جب کہ نتاشا اس حاصل پن کو صرف ایک ابتدا۔ وہ محبت میں جنوں کے سرد ہونے کو منافقت کے طور پر دیکھتی تھی اور یہیں شاید راحیل سے کچھ چوک ہوگئی اور فرہاد اُن کی زندگیوں میں داخل ہو گیا۔ فرہاد ایک ایرانی درجس کی تصویروں کی نمائش پیرس کی ایک بہت بڑی آرٹ گیلری میں لگی ہوئی تھی اور نتاشا کے لاکھ لاکھ بار جو راحیل نے گھر پر عینی کے ساتھ کھیلنے کو ترجیح دی۔ جب کہ اس سے قبل راحیل اور نتاشا ایک دوسرے پر تقریب میں نہ صرف شرکت کرتے بلکہ واپس آکر ہفتوں ان فن پاروں پر بحث کر کے اپنے خیالات افکار کرتے تھے، لیکن اس بار نتاشا کو مجبوراً تنہا ہی نمائش دیکھنے جانا پڑا۔ شاید کچھ "ان ہونیاں" سدا ہی سے ناک میں ہوتی ہیں۔ وہ تصویریں بھی کچھ یوں ہی تھیں۔ ایک حادثے کی طرح اچانک اور فن کا ایک نمائندہ کار، نتاشا چیننگنز میں کچھ ایسی کھوئی کہ خود اپنا آپ ہی بھولتی چلی گئی۔ کتنا درد، کتنی پیاس، کیسی گہری مٹی ہر تصویر میں، رُوح میں سے رُوح نچوڑ لینے والی تاثیر لیے ان رنگوں نے گیلری میں سب ہی لوگوں کو لٹ کر رکھا تھا۔ اور پھر نتاشا کی نظر فرہاد پر پڑی۔ وہ کسی شخص کو اپنی کسی تصویر کا عنوان بتا رہا تھا۔ "کھوج" اس تصویر کا عنوان کھوج ہے..... لا حاصل کی کھوج..... یوں سمجھ لیں کہ جیسے کوئی اپنے کسی نہایت عزیز اور بے لگاتار کے لیے چھپنی میں بھر کر پانی لے جانے کی ایک ناکام کوشش کر رہا ہو جو اُسی کے سامنے شدید پیاس

## ”ایک محبت اور سہمی“

سراپا عشق ہوں میں، اب بکھر جاؤں تو بہتر ہے  
جدھر جاتے ہیں یہ بادل، ادھر جاؤں تو بہتر ہے  
یہ دل کہتا ہے تیرے شہر میں کچھ دن ٹھہر جاؤں  
مگر حالات کہتے ہیں کہ گھر جاؤں تو بہتر ہے  
یہاں ہے کون میرا جو مجھے اپنا بھی سمجھے گا  
میں کوشش کر کے اب خود بھی سنور جاؤں تو بہتر ہے

نتاشا کے حالات سنورنے کے بجائے بگڑتے ہی چلے گئے، حالانکہ وہ صرف دو مرتبہ ہی فرہاد کی آرٹ  
لری میں گئی تھی۔ پہلی مرتبہ تنہا اور دوسری بار راجیل کے ساتھ اور اس کے بعد اُس نے کئی ہفتے دوبارہ اُس  
ب کا رخ بھی نہیں کیا۔ اُسے راجیل، اپنی بیٹی اور اپنی پُر سکون زندگی ہاتھوں سے پھسلتی نظر آنے لگی۔ یہ  
ت ہمارے دلوں پر تب ہی شب خون کیوں مارتی ہے، جب ہم اس کے وار سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں،  
یہی جرم ہمارے مشرق میں کسی عورت سے سرزد ہوا ہوتا تو طوفان آ جاتا۔ پھر چاہے وہ نتاشا کی طرح یک  
اندا اور بنا اظہار والا جذبہ ہی کیوں نہ ہوتا لیکن ایک مکمل بربادی عورت کا مقدر ہوتی۔ لیکن یہ پیرس تھا اور نتاشا  
بہ اعلیٰ نژاد فرانسسی شہری۔ پھر بھی راجیل کے اندر اپنی پرانی اقدار گہری جڑوں تک موجود تھیں۔ اور پھر  
اب بھی نتاشا سے شدید محبت تھی۔ وہ چاہتا تو چیختا چلاتا، اُسے بے وفائی کے طعنے دیتا، ہاتھ پکڑ کر گھر سے  
نکل کر سکتا تھا۔ لیکن اُس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو دوسرے کے پلٹ جانے پر اپنی  
ت ہی کھو دے۔ اپنا دقا، اپنی گریس ختم کر دے۔ راجیل نے ٹھیک اس ڈوبتے جہاز کے کپتان جیسا بھرم  
لکھا۔ جس کے سامنے اُس کی متاع حیات قطرہ قطرہ کر کے ڈوب رہی ہو، لیکن وہ آخری مسافر کو بھی  
نہ کی خاطر عرشے پر آخری وقت تک سینہ تانے کھڑا رہا اور جہاز سے بندھی آخری کشتی کے سمندر میں  
نہ کے بعد جہاز کے ساتھ ہی غرقاب ہو جائے۔ نتاشا نے بھی مغربی معاشرے کی ایک آزاد عورت ہونے  
اور جو اپنی کم گشتہ محبت کی حرمت قائم رکھی اور آخری وقت تک فرہاد کو اپنے دل و دماغ میں چلتی جنگ کے  
سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تا وقتیکہ اُس نے راجیل سے ہر بات بانٹ نہ لی۔ راجیل کو نتاشا کے اس آخری کڑوے

سے دم توڑ رہا ہو یا میدان جنگ میں پیاس سے تڑپتے، جان دیتے سپہ سالار کے لیے اُس کے کسی وفادار  
کپا اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں دو گھونٹ پانی لے کر بھاگنا..... بس کچھ ایسا ہی بیان کرنے کی کوشش  
میں نے اس تصویر میں.....“ نتاشا خاموشی سے فرہاد کی بات سنتی رہی۔ اور یہی وہ ابتدا تھی، جس کی  
میرے سامنے کا سا بلا نکا کے عرشے پر موجود تھی۔ شروع کے چند ہفتے تو نتاشا کو سمجھ نہیں آیا کہ یہ کوشش  
فن کی ہے یا شخصیت کی۔ وہ راجیل کو بھی اگلے ہفتے نمائش دکھانے لے گئی اور راجیل نے بھی فرہاد کے  
خوب سراپا۔ خود فرہاد اس بات سے ہمیشہ بے خبر رہا کہ انجانے میں وہ کسی کے اندر ہونے والی کتنی بڑی  
پھوٹ کا ذمہ دار ہے، کیوں کہ نتاشا نے کبھی اُسے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ نتاشا اس لیے بھی شدید الجھن میں  
کیوں کہ اس کے پاس بظاہر ایک اور محبت میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں۔ لیکن کیا کبھی محبت کو کسی  
ضرورت رہی ہے؟ کیا محبت کسی عمر کی مرہون منت ہوتی ہے؟ نہیں..... دل کوئی نہ کوئی بہانہ دھونڈ  
ہے..... کہ دل کب کسی کا دوست ہوا ہے.....

سچ پر بھی مان تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دنیا لٹتے ہوئے زیادہ دیر نہیں پائے گا۔ اُس نے نتاشا سے آخری فیصلہ کرنے کا کہا۔ نتاشا خود بھی راجیل کو یوں لمحہ بہ لمحہ ٹوٹے نہیں دیکھ سکتی۔ سو، اُس نے خود ہی اپنی فرد جرم پڑھ کر سنائی اور خود ہی اپنی سزا بھی طے کر دی۔ عمر بھر کی جدائی کی کہ جب کوئی جج کسی کو عمر قید کی سزا سناتا ہے تو وہ اصل میں ملزم کو اُس کے پیاروں سے عمر بھر کی جدائی کی سزا دے رہا ہوتا ہے۔ سو، نتاشا نے بھی اپنے لیے اک نئے طرز کی ”عمر قید“ چن لی تھی۔ راجیل نے نتاشا سے بھی پوچھا کہ کیو پڑ کے وار کا شکار اگر نتاشا کا دل ہوا تھا اور مجرم کی سرزدگی بھی اُسی کے دل کے سرے سے تو راجیل کو بھی کیوں مل رہی ہے۔ شاید دلوں کے جرم ہی ایسے ہوتے ہیں کہ کرتا کوئی اور بھرنا کوئی..... دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کے تیسرے مرکزی کردار فرہاد کو ابھی تک اس بات کی خبر نہیں تھی کہ کتنی زندگیوں میں طوفان کا باعث بن رہا تھا۔ حالانکہ اب اُس کی نتاشا سے اچھی خاصی پہچان ہو چکی تھی۔ وہ اس کے تمام خاندان سے بھی مل چکا تھا لیکن نتاشا نے راجیل کے کہنے پر بھی اپنے دل کا حال فرہاد پر نہیں کیا۔ اُس نے اپنے دل کو سزا دینے کے لیے ایک عجیب جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس کا ظرف اسے بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ راجیل کی ہوتے ہوئے فرہاد کے سامنے دل کے لٹ جانے کی دہائی دے پھر اگر کسی وجہ سے فرہاد ہی اُسے ٹھکرا دے تو پھر سے روتی دھوتی راجیل کی زندگی میں واپس آ جائے۔ لہذا نے آخری کشتی جلا کر تخت یا تختے کا فیصلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اُس نے راجیل کو بھی سختی سے منع کر دیا کہ جب تک وہ علیحدہ نہ ہو جائیں، تب تک فرہاد کو اس بات کی بھٹک بھی نہیں پڑنی چاہیے کہ اُن کی علیحدگی خود اُسی ”مرد مغرور“ کے ہاتھ سے کیونوس پر پھینکے گئے چند رنگ کے چھینے ہیں۔ بظاہر نامکمل نظر آنے ایسی داستانیں صرف مغرب ہی میں جنم لے سکتی ہیں، کیوں کہ ہمارے ہاں کسی مرد کا ایک کے بعد دوسرا پھر تیسری محبت میں ”جٹلا“ ہو جانا تو عام سی بات سمجھی جاتی ہے مگر عورت بے چاری اپنے خواب میں سا عکس سے پرے بھی اگر کسی غیر کی شہیدہ دیکھے تو گھبرا کر خود ہی اٹھ بیٹھتی ہے۔ مشرق میں وفا کے پلڑے سارا بوجھ عورت ہی کو پورا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ یہاں کا مرد اُس ترازو میں تلتا ہی نہیں۔ لیکن نتاشا نے ہوتے ہوئے بھی اپنی وفا کا ایک معیار قائم رکھنے کی یہ اونکی کوشش ضرور کی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ راجیل علیحدہ ہونے کے بعد فرہاد اُسے اپنائے گا یا اُس کی ساری داستان کو ایک قہقہے میں ختم کر دے گا۔ کیوں کہ تو صرف نتاشا ہی نے اپنی زندگی کے ساتھ کھیلا تھا۔ فرہاد کی وفا اور محبت تو کبھی اس کھیل سے مشروط نہ تھی۔ راجیل نتاشا کے اس پاگل پن سے کبھی کبھار اتنا بکھر جاتا کہ اُس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر اُسے فر آرٹ گیلری چھوڑ آئے تاکہ نتاشا یہ اندھی چال چلنے سے پہلے صرف ایک بار اپنے پتے ضرور دیکھ لے کہ مات ہی تو اس بازی کا مقدر نہیں؟ لیکن بالآخر راجیل ہی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہاں اُس کی ماں کی بل پاکستان میں مسلسل گھڑتی جا رہی تھی اور اُس کی شدید خواہش تھی کہ ایک بار اپنی بہو اور پوتی سے مل لے۔

نتاشا کی عجیب داستان کا اختتام ابھی باقی تھا لیکن میں اُس رات لمحہ بھر کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپک سکا۔ یہ محبت دوبارہ بھی ہماری زندگیوں میں چلتی ہے، وفا کیا ہے اور اس کی حدیں کہاں تک مقرر ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں جس محبت کے حصول کے لیے پاگل ہوتے ہیں، اپنے دل کے کواڑ دوسرے پر ہمیشہ کے لیے بند کر لیتے ہیں، کیا وہی ہماری ”آخری محبت“ ہوتی ہے۔ کیا ”محبت“ اور ”وفا“ کے معیار بھی ہماری معاشرتی ہڈار کے تابع ہوتے ہیں؟ اور ہم صرف انہی کی پیروی ہی کو ان جذبوں کے پرکھنے کا اصل پیمانہ تو نہیں سمجھ جاتے۔ اس ”محبت“ نامی معصے کی کتنی پر تیں، کتنے پہلو اور کتنے زاویے مزید ایسے تھے جن سے میرا پالا پڑنا ابھی باقی تھا۔ رات پھر سلطان بابا بے حد بے چین رہے اور بار بار اُن کی آنکھ کھلتی رہی۔ مجھے اُن کی طرف سے بے حد تشویش تھی اور میں اس پریشانی میں کئی مرتبہ خود اپنی دوائیں لینا بھی بھول جاتا تھا۔ حالانکہ مجھے ڈاکٹروں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اپنے شہر پہنچنے تک مجھے ہر حال میں ان دواؤں کا استعمال جاری رکھنا ہوگا۔ ورنہ سمندر کے سفر میں میری طبیعت مزید مگرڑنے کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ میرے دوروں کا دورانیہ ویسے بھی اب طویل تر ہونے لگا تھا۔ اُس رات بھی کئی مرتبہ میری رگوں میں جیسے مکمل اندھیرا سا چھانے لگتا اور کئی مرتبہ مجھے اپنا سر ہٹ کر اٹھ کے ٹھنڈا پڑا۔ نتیجتاً صبح میری طبیعت نہایت بوجھل تھی اور سر درد سے بھٹ رہا تھا۔ لہذا میں اپنے کہن ہی میں پڑا رہا۔ سلطان بابا کے کمرے میں نرس اُن کی دواؤں کا چارٹ بنا رہی تھی۔ کچھ دیر میں میرے کہن کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے راجیل صاحب کھڑے تھے۔ ”میں غل تو نہیں ہوا، دراصل تمہیں ناشتے پر ڈائننگ ہال میں نہیں دیکھا تو تشویش ہوئی۔“ ”جی۔۔۔ میری طبیعت کچھ بوجھل تھی اس وجہ سے نیچے نہیں آ سکا۔“ انہوں نے فوراً میری نبض دیکھی اور تیز بخار کا خدشہ ظاہر کیا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میں دوا لے چکا تھا۔ انہوں نے تجویز دی کہ مجھے اس حال میں بند کمرے کے بجائے عرشے پر گلنفا میں رہنا چاہیے تاکہ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں میرے پتے جسم کو کچھ راحت مل سکے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں نماز کے ڈیک والے حصے میں لکڑی کے پتے تختوں سے ایک اُونچے پلیٹ فارم نما عرشے پر کھڑے تھے۔ اُس ہاں سفید وردی پر نیلی کیر والی مخصوص ٹوپی پہنے جہاز کا عملہ صفائی کر رہا تھا اور سلیز مین اطالوی زبان میں کوئی گیت گنگنا رہے تھے۔ راجیل صاحب نے دُور بنتی لہروں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”جانتے ہو یہ ملاح اُٹا اطالوی گیت میں کیا گنگنا رہے ہیں؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ ”یہ کہہ رہے ہیں کہ بادبان اُونچے نچے کرلو۔ چور اور تیز چلاؤ، کیوں کہ ایک بڑا طوفان ہماری تاک میں ہے۔۔۔ ہمارا ساحل

ہی تھی، مگر راحیل نے بڑی مشکل سے اُسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ یہ خبر کسی طریقے سے فرہاد تک پہنچا دے کہ راحیل اور نتاشا آپس کی اُن بن اور دشمنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔ راحیل نے دنیا کو سختی سے تاکید کی کہ نتاشا کا بھرم کبھی نہ ٹوٹنے پائے اور فرہاد کو ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہیے کہ نتاشا راحیل سے کیوں جدا ہو رہی ہے۔ سونیا کو فرہاد کے سامنے یہ ظاہر کرنا تھا کہ کہ وہ اپنی عزیز از جان سہیلی کے لیے بہت پریشان ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اگر فرہاد پر پہلے سے کسی وعدے یا رشتے کا بوجھ نہیں ہے تو وہ نتاشا کو پالے۔ راحیل نے سونیا کو یہ پیغام دے کر فرہاد کے پاس تو بھیج دیا لیکن خود انکاروں پر لوٹا رہا۔ دنیا میں بھلا کون ہوگا، جو کسی لیرے کو خود مدعو کرے کہ ”آؤ اور میری متاع حیات لوٹ کر چلتے بنو۔“

دوسرے دن جب سونیا نے راحیل کو آ کر یہ بتایا کہ پہلے پہلے تو فرہاد اُن کی جدائی کے صدمے سے سنبھل ہی نہیں پایا کیوں کہ وہ نتاشا کے پورے خاندان سے واقف تھا اور اُسے ایک فرد کی حیثیت دی جاتی تھی۔ پھر اُس نے سونیا سے التجا کی کہ کیا وہ نتاشا کی ذاتی زندگی میں دخل دے کر اُسے سمجھا سکتا ہے۔ لیکن جب سونیا نے اُسے نتاشا کے بھرم کی قسم دی تو اُس نے سونیا کو بتایا کہ وہ ہمیشہ راحیل کی قسمت پر رشک کرتا آیا ہے کیوں کہ نتاشا جیسی ہم سفر قسمت والوں ہی کو ملتی ہے اور اُس نے سونیا سے کہا کہ وہ نتاشا کو اپنا نا اپنے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتا۔ یہ سب سن کر راحیل کا دل آخری بار دھڑک کر جیسے بند ہو گیا۔ شاید کہیں دور اُس کے دل میں اب بھی یہ امید تھی کہ فرہاد نتاشا کو کسی وجہ سے اپنا نہ پائے مگر اب تو کہانی ہی ختم ہو چکی تھی۔ نتاشا کو اس واردات کی خبر نہیں تھی کہ فرہاد کو سونیا نے پہلے ہی جہاز کے ذریعے ہمارے شہر بھیج دیا ہے اور راحیل اُسے بندرگاہ ہی پر الوداع کہہ دے گا۔ البتہ ماں سے کیا بہانہ کرنا ہے، وہ بعد کی بات تھی۔ دنیا کا سب سے مشکل کام ایسا ہی محبت کو خود اپنے دل میں پل پل مرتے دیکھنا ہے اور اس سے بھی مشکل خود اسی محبت کی لاش کو اپنے ماتم دفن کرنا ہے۔ میرے سامنے اس وقت ایک ایسا ہی شخص کھڑا تھا، جو اپنی محبت کے لیے اپنے دل میں لڑا کھود چکا تھا اور اب صرف اُسے دفنانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے حبیب البشر صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ اُن کے ساتھ جانے والے سبھی حاجیوں سے انہوں نے میرے لیے دعا کرنے کا وعدہ لیا ہے۔ انہیں شاید جہاز کے طبی مشن سے میری ناسازی طبیعت کا بھی پتہ چل گیا تھا۔ وہ بہت دیر میرے ساتھ عرشے پر بیٹھے رہے۔

عشاء کے بعد جب اُن کے جانے کا وقت ہوا تو مجھے اُوپر والے چوبی ڈیک پر جہاز کے آخری ریلنگ کے پاس نتاشا نظر آئی۔ عام طور پر جہاز کا عملہ کسی مسافر کو مغرب کے بعد اتنی اُوچائی پر کھڑے رہنے کی اجازت نہیں دیتا، کیوں کہ کوئی بھی بڑی لہر انسان کا توازن بگاڑ کر اُسے سچ سمندر میں پھینک سکتی ہے۔ ایک لمبے کے لیے تو خود نتاشا کے ارادے بھی مجھے کچھ بدلے سے نظر آئے۔ میں جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر اُن کے قریب پہنچا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر وہ پلٹیں ”کہیں آپ نے کسی شارک مچھلی کے ساتھ ڈنر کا وعدہ

دور ہے اور کپتان کی محبوب پھول لیے اس کا انتظار کر رہی ہے۔“ ”آپ کو اطلاع دی جاتی ہے؟“ ”ہاں۔۔۔۔۔ کچھ عرصہ رہا ہوں وہاں۔۔۔۔۔ نتاشا کے گھروالوں کے سامنے بہت پاپڑ بنینے پڑے تھے مجھے وہاں کی بہت سی رسمیں اب بھی ہم سے ملتی چلتی ہیں۔“ میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ ”کیا یاد باں اُونچے کرنے اور پتوار تیز چلانے سے طوفانوں سے بچا جاسکتا ہے؟“ انہوں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ شاید وہ میرا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ ”نہیں۔۔۔ طوفان تو آکر ہی رہتے ہیں۔ لیکن طوفانوں کے ڈر سے سمندروں کو دیران بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا اور پھر جن کی ناؤ ہی میں چھید ہو جائے انہیں طوفانوں سے کیا گلہ۔۔۔۔۔ گروڈ بنانا ہی مقدر ہے تو پھر مسکون سے بنا کسی آواز کے کیوں نہ ڈوبا جائے۔ شور مچا کر اور دواویلا کر کے سمندر کا تقدس پامال کرنے سے کیا فائدہ؟ میں اُن کے چہرے ہی سے اُن کے اندر اُٹھتے طوفانوں کی ایک جھلک دیکھ سکتا تھا۔ میں نے انہیں پھر ٹولا ”آپ اتنی آسانی سے کیسے ہار مان سکتے ہیں۔ جو ڈوبنے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ طوفانوں کا رُخ بھی تو موڑ سکتے ہیں۔“ وہ مسکرائے۔ کتنی گھائل مسکراہٹ تھی۔ ”وہ جس معاشرے میں پلٹی بڑھی ہے، وہاں محبت کا ہو جانا حادثہ تو ہو سکتا ہے، جرم نہیں۔ اور محبت جرم تب بنتی ہے جب وہ اپنے ساتھ احساس جرم لے کر آئے۔۔۔ اور پھر یہ دلوں کے سودے ہیں۔ یہاں ڈوبنے والے ہی فاتح قرار پاتے ہیں۔ اس کے دل میں بال آجانے سے میری محبت پر کوئی فرق پڑے تو پھر یہ محبت نہیں ”سودا گری“ ہوئی۔ میں صرف اپنے احساس کے ساتھ بھی تو ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہوں۔ جانتے ہو، محبت جتنی پرانی ہوتی ہے، اتنی ہی خون میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ کوئی بھی نئی محبت، پچھلی محبت کا خون میں بسایہ زہر نچوڑ نہیں سکتی۔“ ”پھر آپ خون میں سرایت کی ہوئی اس محبت کو اتنا بڑا جو کھینے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟ آپ پاکستان میں رہ جائیں گے اور وہاں فرانس میں فرہاد انہیں قبول نہیں کرے گا بھی یا ان کے اتنے بڑے قدم اٹھانے، صرف افسوس کا اظہار کر کے اپنی زندگی میں پھر مگن ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے اُسے پہلے سے کسی اور سے محبت ہو۔ محبت بھلا کس کی کا انتظار کرتی ہے؟“ ”میرا لہجہ شاید جذبات کی وجہ سے کچھ زیادہ تلخ اور بلند ہو گیا تو تب ہی ہمارے پاس سے گزرتی ایک بوڑھی خاتون مسافر نے اپنے کالے جالی دار ہیٹ کے نیچے سے ہم خشکیمیں سی نگاہ ڈالی۔ راحیل صاحب کچھ دیر چپ رہے۔“ ”جو نتاشا نے کھیلا ہے۔ لیکن بازی میں نے بجا ہے۔ میں اپنی ہم سفر کو اُس کی زندگی کے سب سے مشکل سفر میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ دو دن بعد ہم بندرگاہ پر اتر رہے ہیں وہاں فرہاد پہلے سے موجود ہوگا۔“ میرے پاؤں تلے سے جیسے کسی نے عرشے کا تختہ لیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں دھڑام سے سمندر میں جا گرا ہوں۔ راحیل صاحب میری کیفیت سے بے خبر مجھے تفصیل بتاتے رہے کہ کس طرح پیرس میں جب وہ نتاشا کی ضد کے آگے ہار مان گئے اور انہوں نے اُن آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، تب انہوں نے نتاشا کی سب سے قریبی دوست سونیا سے رابطہ کیا۔ سونیا، نتاشا کی کلاس فیلو بھی رہ چکی تھی، لہذا راحیل اور نتاشا کی علیحدگی کا سن کر وہ خود حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ نتاشا سے



ل کے من کے ہولے کو ٹولا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ خود آپ بھی اس کے اندر کی شبیہ کا صرف بانچہ فی صد ہی لرتی ہوں۔“ نتاشا نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ”لیکن راحیل نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا، ورنہ ہر دو میں اُس کے من کے اندر موجود ہر تصویر کو اُس کے سامنے لا کھڑا کرتی۔ میں اُس کے لیے کچھ بھی کر ہوں۔“ ”کتنی تصویریں جمع کر پاتیں آپ.....؟ اور کیا انسان ساری زندگی انہی سراہوں کے پیچھے بھاگتے گزار دے۔ اور آخر میں خود ایک ہیولہ بن کر رہ جائے۔ کہا یہی مقدر ہے ہم مجبور اور بے کسی انسانوں کا۔ میں زندگی تو صرف ایک ملتی ہے مگر خواہشیں ہزار صدیوں کے وزن جتنی۔“ نتاشا کی طرف سے بہت دیر تک بولی چھائی رہی۔ پھر جب وہ بولی تو آواز سمندر کے اندر سے آتی محسوس ہوئی۔ ”پھر ان ہزار صدی کی ہشوں کا کیا ہوا؟ دل پر قفل کیسے لگایا جائے؟“ میں نے اُن کی جانب دیکھا۔ ”اگر اس دل نے ہمارے ساتھ مائل کو خاص سے عام کرنے کا کھیل رچایا ہوا ہے تو پھر ہمیں بھی اس کے لیے کسی ایک کو ہمیشہ کے لیے ”لا مل“ رکھ چھوڑنا چاہیے تاکہ وہی ”لا حاصل“ اس کی آخری چاہت ثابت ہو۔ ہم اگر کسی ضدی بچے کی طرح مائل کی ہر بات مانتے گئے اور اس کی پسند کا ہر کھلونا اس کی جھولی میں ڈالتے رہے تو پھر یہ بھی اُسی بچے کی رنج چندون کھیل کر اس کھلونے کو پرانا کر دے گا یا دل بھر گیا تو توڑ دے گا اور پھر سے کسی نئے کھلونے کے لیے نکلے لگے گا۔ تو کیوں نہ اسے ہمیشہ کے لیے ایک کھلونے کی آس ہی میں منتظر چھوڑ دیا جائے..... تاکہ وہ بڑے کے لیے اس کے لیے خاص رہے۔“

میں نتاشا کو سوچوں کے سمور میں چھوڑ کر نیچے کیمین میں چلا آیا۔ اگلی شام جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے کے لیے اپنی رفتار دھیمی کر چکا تھا۔ میرے سامنے وہی ساحل بانہیں کھولے کھڑا تھا، جس کی ایک درگاہ پر نظر آئی یک جھلک اور جلوے نے میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ دُور سے میں نے ماما اور پاپا کو میزبانوں والے حصے کی جالی کے پرے دیکھا۔ اُن کی نظر ابھی مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ لیکن مجھے زہرا کا دھانی اٹھل تو ہمیشہ پہلی نظر میں نہار جاتا تھا مگر کیوں آج ابھی تک میری نظر اُسے ڈھونڈ نہیں پاتی تھی۔ جہاز بندرگاہ پر لنگر لگ گیا۔ ہم سب ایک ایک کر کے میزہیاں اتر کر زمین پر قدم رکھتے گئے۔ راحیل کے بعد اُس کی بچی عینی اور اُنہا نے آخری میزگی کو الوداع کہا۔ دفعتاً نتاشا کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑے ایک سچے سنورے شخص پر پڑی اور اُس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ میرے دل نے دھڑک کر مجھ سے کہا ”فرہاد.....“

تو نہیں کر رکھا؟“ وہ مسکرائیں۔ ”نہیں! میری شارک مچھلیوں سے کبھی اچھی سلام دعا نہیں رہی.....“ ”ہم دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے لہروں کو گھمتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا۔ ”تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے عبداللہ؟“ ”نہیں..... میں ابھی محبت کے ”م“ اور عشق کے ”عین“ تک بھی نہیں پہنچ پایا اور پھر سچ یہ ہے کہ آپ سے ملنے کے بعد تو مجھے اپنے جذبے کو پھر سے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“ اُن کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ”کیوں؟“ میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ ”آپ سے ملنے کے بعد میں نے یہ جان لیا ہے کہ ہماری محبتوں کا کوئی اختتام نہیں ہوتا، شاید محبت کی بقا صرف اس کے لا حاصل رہنے ہی میں ہے۔ جسے پالیا جائے، شاید وہ محبت نہیں رہتی، ورنہ انسان کا دل اس معراج کو پالنے کے بعد پھر سے خاک میں کیوں لوٹتا؟ رشتوں کے نیلے بھنور بھی جب محبت کی سنہری کند کوئی فصیلوں پر اٹکتے سے نہیں روک پاتے تو پھر ہم ایک نیا کلیہ کیوں نہ ایجاد کر لیں؟“ نتاشا کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔ ”کیسا کلیہ؟“ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ ”یہی کہ ہم اپنی زندگی کی سب سے پہلی اور شدید محبت کو اس شرط سے متصل نہیں رکھ سکتے کہ خود ہم بھی اس کے لیے آخری محبت ہی ثابت ہوں گے۔ بلکہ ہمیں یہ گنجائش بھی رکھنی ہوگی کہ خود ہمارا دل بھی پلٹ سکتا ہے۔ تو پھر ایسی پلٹ جانے والی چیز کے لیے سر دھڑکی بازی لگانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ مجھے ایک نئی راہ دکھا دی۔“ نتاشا کی آواز میں بے چینی تھی۔ ”لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ جو واردات میرے دل کے ساتھ ہوئی ہے، وہ سب ہی کے ساتھ ہو۔ تم اپنے نظریہ کیوں بدل رہے ہو۔ یہ صرف میری بدبختی بھی تو ہو سکتی ہے۔“ میں نے آخری وار کر دیا۔ ”تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سیاہ نقیبی پھر سے اپنے آپ کو نہیں دہرائے گی؟“ ”کیا مطلب؟“ ”مطلب یہ کہ جس راستے پر آپ چل رہی ہیں وہ تو سودا کا بے نشان و منزل ہے۔ کل تک راحیل آپ کی پہلی محبت تھے۔ آپ کا ہر خواب اُن سے وابستہ تھا۔ لیکن آج آپ کو اپنا من فرہاد کی جانب کھینچا محسوس ہوا ہے۔ ایک اجنبی آپ کے سارے خوابوں پر قابض ہو بیٹھا۔ تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کل یہ من اپنے دھاگے کہیں اور نہیں اُلجھا بیٹھے گا؟“ نتاشا کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ”لیکن تم.....؟“ ”میں صرف اتنا سمجھ پایا ہوں کہ بات اگر دل کے اختیار پر چلنے کی ہے تو پھر ہمارا ایک شاعر صدیوں پہلے کہہ گیا تھا کہ دل پر زور نہیں..... آپ جس ماحول میں پلٹی ہوئی ہیں، اُس معاشرے میں انسان کی آخری سانس تک، ایسے دل کش ہولے اُس کا دل کھینچنے کے لیے اُس کے آس پاس بھٹکتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی فلم اسٹار، کبھی کوئی کھلاڑی، کبھی کوئی منکر..... تو پھر آپ کے کھینچے کے حساب سے ایک پل کا سکون ملنا بھی محال ہوگا۔ انسان کی ذات اندر سے جن سینکڑوں، ہزاروں خانوں میں بٹی ہوئی ہے دوسرا کوئی بھی ایک انسان ان سب خانوں کے خلا کو بھرنے کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھتا۔ یہ کسی فرد واحد کے لیے ممکن ہی نہیں۔ ہم خود بھی کئی دوسرے کے بنائے ہوئے ہولے کا صرف پندرہ یا بیس فی صد ہی پورا کر پاتے ہیں۔ اسی لیے ہم ان مشہور لوگوں (سیلیبرٹیز) میں اپنے من کے بنائے خاکے کی خوبیاں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے

## آخری محبت

بدا کرو کہ اپنا نظریہ کبھی نہیں بدلو گے۔ کیوں کہ آج سے میرا بھی یہی نظریہ ہے اور میں یہ پیغام ہر محبت کرنے والے تک ضرور پہنچاؤں گی۔“ میں نے مسکرا کر اس نئی نشا کو دیکھا۔ ”ہر محبت آخری محبت ہوتی ہے اور آخری محبت بن کر ہی نازل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید ہم کبھی محبت میں مبتلا ہی نہ ہو پاتے۔ محبت سورج کی کرنوں کی طرح درازوں سے چھن کر ہمارا آس پاس منور کر سکتی ہے، مگر محبت کو کسی بھی شرط سے متصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بندھن اور رشتے خود محبت کے آخری ہونے کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ محبت کے ہزاروں سورج ہیں، مگر ہمیں بس اپنے حصے کے ایک آفتاب ہی کی روشنی سمیٹنی ہوتی ہے۔ لیکن سورج کی طرح چمکنے کے لیے پہلے اس کی طرح جھلنا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ آج آپ بھی تپ کر کندن بن چکی ہیں۔ جائیے..... آپ کی محبت کا سورج آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“ نشا نے میرے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں دُور کھڑے راحیل کی جانب دیکھا۔ فرہاد کو سنانے کے لیے اس بار میں نے انگریزی میں بات کی تھی۔ نشا پلٹنے سے پہلے راحیل کی طرف بڑھی۔ ”تمہارا بہت شکریہ فرہاد کہ تم میرا استقبال کرنے کے لیے یہاں تک آئے، لیکن ابھی مجھے

پانا ہے، راحیل کے ساتھ۔ ہاں البتہ، اپنی نمائش کا دعوت نامہ ضرور بھیجنا۔ میں، راحیل اور یعنی نمائش دیکھنے فرور آئیں گے اور تم سے اچھی سی ٹرینٹ بھی لیں گے۔ یہ وعدہ رہا۔“ نشا نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھیں اور راحیل کو یوں ہی ہکا بکا چھوڑ کر راحیل کے سنگ آگے بڑھ گئی۔ کافی دُور جا کر اُس نے پلٹ کر میری جانب دیکھ کر اُٹھ بلایا۔ راحیل صاحب نے بھی پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ اُن کی ایک نگاہ ہی سارا خراج ادا کرنے کے لیے کافی تھی اور پھر اگلے لمحے وہ تینوں بندرگاہ کی بھیڑ میں غائب ہو چکے تھے۔ فرہاد بھی تھکے تھکے قدموں سے ہٹ گیا۔ اُسے اپنی محبت کے سورج کے لیے ابھی کچھ اور آسمان چھاننا باقی تھے۔ میں سلطان بابا کے لیے آئے

کین اسٹریچر کے ذریعے انہیں لے کر نیچے اُتر آیا تھا کہ پکا کہ ہمیشہ کی طرح زندگی سے بھرپور آواز سنائی دے۔ ”ساحر..... ہم یہاں ہیں.....“ پکا کے ساتھ ماما بھی کھڑی تھیں لیکن اُن کی آواز اُن کے بپتے آنسو پہلے ہی گونٹ چکے تھے۔ میں لپک کر اُن کے قریب پہنچا اور پھر ہم تینوں ہی ایک دوسرے کو چپ کراتے کراتے رو رہے تھے۔ میں قریب آچھ ماہ کے بعد اُن سے مل رہا تھا اور ماما بار بار میرا چہرہ اپنے ہاتھوں سے یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں، جیسے انہیں اب تک یقین نہ آ رہا ہو کہ میں واقعی اُن کے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ مائیں سدا سے اولاد کے معاملے میں اتنی بے یقین کیوں ہوتی ہیں۔ اتنی دیر میں ایبوی لینس بھی بندرگاہ کے مرکزی داخلے سے ہوتی ہوئی مقررہ جگہ تک پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹروں کی یہی ہدایت تھی کہ اب مزید کوئی دیر کیے بنا سلطان بابا کو بڑے اسپتال پہنچا دیا جائے۔ میری آنکھیں بار بار میزبانوں کی گیلری کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جتنی دیر میں سلطان بابا کو ایبوی لینس میں منتقل کیا گیا، جب تک میں شاید سینکڑوں بار اُس جانب دیکھ چکا تھا، جہاں سے اس

از آفریں کو آتا تھا۔ لیکن وہ راستہ اتنے زیادہ جھوم کے باوجود میرے لیے سنسان ہی رہا۔ ماما پاپا دونوں میری بے چینی بہت اچھی طرح بھانپ چکے تھے، لیکن نہ جانے کیوں دونوں ہی چپ سے تھے۔ بالآخر میں نے ماما

میں نے بھی نشا کی نظروں کی تعاقب میں نگاہ ڈالی۔ وہ یقیناً فرہاد تھا۔ اُس کے انداز میں جو ایک خاص لاپرواہی تھی اور اُس کے سفید لباس پر چھتی نیلی پی کیپ اُسے دُور ہی سے کوئی مصور بتا رہی تھی۔ یہ سب ہی غنچن کاموں سے تعلق رکھنے والے ایک جیسے ہی کیوں ہوتے ہیں۔ وہ عمر میں نشا سے کچھ کم دکھائی دے رہا تھا۔ نشا ابھی تک شاک کی کیفیت سے نہیں نکل پائی تھی۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی ”فرہاد..... تم..... یہاں.....“ فرہاد مسکراتے ہوئے اُس کی جانب بڑھا ”ہاں مجھے سونیا سے پتا چلا کہ تم پاکستان آ رہی ہو۔ اتفاق سے میری بھی ایک تصویری نمائش ہے، اسی شہر کی آرٹ گیلری میں۔ سوچا تمہیں سر پرانز دے کر حیران کر دوں۔“ نشا ابھی تک کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔ راحیل کی آنکھیں نم ہونے کو تھیں، مگر وہ ضبط کیے کھڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر نشا سے کہا۔ ”چلیں..... آپ کا کام آسان ہو گیا۔ لوگوں کو خواب دیکھنے کے لیے رات بھر آنکھیں بند کر کے نیند کا محتاج ہونا پڑتا ہے، جب کہ آپ کا خواب خود چل کر آپ کے پاس آ گیا ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اب اپنے سنے کے ساتھ ہی لوٹ جائیں۔ خوابوں کو جینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ سہانے خوابوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔“ اتنے میں راحیل نے بھی تائید کی ”عبداللہ تھیک کہہ رہا ہے نشا! میں اپنی ماں کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تم یہاں تک میرے ساتھ آئیں میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ اب یہاں سے آگے ہمارے راستے جدا ہیں۔“ نشا شاید سمجھ گئی تھی کہ فرہاد کی یہاں آمد کے پیچھے کا مقصد کارفرما ہے۔ اُس کے بدن پر جیسے ایک لرزہ سا طاری تھا۔ وہ کسی پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور اُلٹی لرزاہٹ چھپانے کی کوشش میں اُس کا وجود مزید ریت ہوا جا رہا تھا۔ راحیل نے یعنی کا ہاتھ پکڑا اور مخالف سمت میں قدم اٹھائے۔ یعنی نے حیرت سے اپنی ماں کو وہیں جے دیکھا اور پھر اُسے جاتے جاتے آواز دلا۔ ”ماما.....“ نشا کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ جلدی سے پلٹ کر چلائی ”رک جاؤ راحیل.....“ راحیل کے قدم جم گئے، لیکن اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ نشا شاید تیزی سے میری جانب بڑھی ”کل رات تم نے ٹھیک کہا تھا۔ دل جیسے ضدی بچے کی بات سنی جائے تو ہماری محبتوں کا کبھی اختتام نہ ہو۔ تو پھر کیوں نہ کسی ایک کو اپنی آخری محبت بنا لیا جائے۔ میرے رشتوں کے نیلے بھنور نے آج ہمیشہ کے لیے وہ سنہری کند توڑ ڈالی ہے، جو آس پاس بکھرے ہزاروں دل کش ہیولوں کی فسیل پر ہر بار اپنی کندی اٹکا بیٹھتی ہے۔ میں پیرس واپس جانے سے پہلے تم سے ملنے ضرور آؤں گی عبداللہ۔ اس ’تجدید وفا‘ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ لیکن تم بھی مجھ سے الگ

سے پوچھا ہی لیا کہ زہرا کیوں نہیں آئی؟ ممانے بتایا کہ انہوں نے میرے آنے کی خبر اسی دن زہرا کے کمر والوں تک پہنچادی تھی، جس دن انہیں پتا چلا تھا۔ پھر بھی زہرا میرے استقبال کو نہیں آئی..... کیوں؟؟

سلطان بابا کو اسپتال لے جاتے ہوئے بھی میرے اندر خود ہی سوال اٹھتے رہے اور میرا نادان دل غریب ان دوسو سوں کے جواب اور جواز تراشا رہا۔ ہو سکتا ہے، اُسے ٹھیک خبر ہی نہ ملی ہو۔ یا ہو سکتا ہے وہ کہیں بھڑی میں پھنس کر رہ گئی ہو۔ یہ بڑے شہروں کا ٹریفک بھی تو کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے بندرگاہ سے نکلنے ہی وہاں پہنچ گئی ہو۔ ہم بھی تو سلطان بابا کی وجہ سے وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہیں پائے تھے۔ وہ آئی ہوگی اور مجھے وہاں نہ پا کر کتنی پریشان ہوئی ہوگی۔ میرا ذہن کسی ایک خدشے کا سرا اُبھارتا تو ایر سودائی دل اس کے سوغد تراش کر میرے سامنے رکھ دیتا۔ محبت ہمیں کتنے بہانے بنانا سکھا دیتی ہے۔ بندرگاہ سے نکلنے سے پہلے میں خاص طور پر عرشے پر کھڑے حبیب البشر صاحب سے ملنے کے لیے اُپر گیا۔ وہ مجھے بہت دیر تک گلے لگائے تھکتے رہے اور میرے شانے اُن کی پلکوں سے نم ہوتے رہے۔ آتے وقت انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے سے بولے ”ہم اگر اس کی جانب ایک قدم بڑھاتے ہیں تو وہ ہماری جانب سر قدم آتا ہے۔ یقین جانو، تم اُس کے بہت قریب ہو۔ میں جتنی بار بھی اُس کے گھر پر نگاہ ڈالوں گا میرے دل سے تمہارے لیے دعا ضرور نکلے گی اور مجھے یقین ہے ایک دن تمہاری کھوج ضرور اپنے انجام کو پہنچے گی۔“ میں اپنے خیالات سے تب چونکا جب ایسولینس اسپتال کے ”انتہائی نگہداشت“ کے شعبے کی پارکنگ میں جا کر رُک گئی۔ ماما بھی اپنی گاڑی میں ہمارے ساتھ ہی پہنچ چکے تھے اور اگلے چند لمحوں میں ہم سلطان بابا کو علیحدہ کمرے میں منتقل کر چکے تھے۔ جہاں ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم ہماری منتظر تھی۔ سلطان بابا نے غصہ دنگی کے عالم میں ایک دوبار مجھ پر نگاہ ڈالی اور پھر دواؤں کے اثر تلے اُن کی پلکیں جھکتی چلی گئیں۔ ہمیں بڑے معانہ کی ہدایت پر باہر انتظار کرنے کا کہا گیا۔ پاپا چاہتے تھے کہ میں کچھ دیر کے لیے گھر سے تازہ دم ہواؤں، تب تک اسپتال میں ٹھہرتے لیکن میں نے منہ کر دیا اور ہم دونوں نے تقریباً زبردستی ماما کو گھر واپس بھیجا، کیوں کہ انہیں اسپتال کے ماحول اور ارد گرد ہوتی انہونیوں سے ہمیشہ ہی خوف آتا تھا۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ سلطان بابا کی طبیعت سنہلتے ہی میں کچھ دیر کے لیے گھر ضرور آؤں گا اور پھر ہم سب رات کا کھانا ایک ساتھ کھائیں گے۔ وہ بادل نخواستہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے وہاں سے چلی تو گئیں، لیکن تقریباً ہر قدم ہی پر مڑ کر انہوں نے مجھ سے میرے عہد کی تجدید ضرور چاہی۔ دنیا کا کوئی بھی فرد اپنے ماں باپ کا قرض نہیں چکا سکتا۔ یہ وہ سوا ہے، جو سودور سودو ہر پل بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور شاید اس جہان کا یہ واحد اُدھار ہے جس کی ادائیگی کیے بغیر ہم سب کیے بعد دیگرے الوداع کہتے جاتے ہیں۔

مما کے جانے کے بعد میں نے کافی وقفے سے مناسب الفاظ میں پاپا کو اپنی بیماری کے بارے میں بتا دیا اور میری توقع کے مطابق وہ میرے لاکھ بھل انداز اور تسلی کے باوجود ایک دم ہی گھبرا سے گئے۔ اگر سلطان بابا

کی طبیعت کا خیال نہ ہوتا تو وہ اُسی وقت مجھے بھی اسی اسپتال میں داخل کروا دیتے۔ پھر بھی جب تک میں نے ان سے وعدہ نہیں کر لیا کہ اگلی صبح سب سے پہلے میں اپنے تمام معائنہ خود انہی کی نگرانی میں کرواؤں گا، تب تک وہ چین سے نہیں بیٹھے اور راہ داری ہی میں ٹپکتے رہے۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ جب تک میں اپنے کمر میں تھا اور ماما کے لاڈلے کے طور پر اُن کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، تب تک مجھے کبھی پاپا کے اندر سلطان بابا جیسی بزرگانہ جھلک نظر نہیں آئی تھی، لیکن آج میرے سامنے ماٹھے پر تل ڈالے، بڑبڑاتے اور مجھے ڈانٹتے ہوئے ٹپکنے والا یہ شخص مجھے اپنا پاپا سے زیادہ اپنا بزرگ دوست لگ رہا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ بزرگی کا تعلق صرف انسان کی عمر بڑھنے سے نہیں ہوتا۔ نہ ہی صرف عقل و دانش اس کی وجہ ہوتی ہے۔ ”بزرگ“ کچھ اس سے بڑھ کر، کچھ سوا ہوتا ہے۔ پاپا ہی نے مجھے میرے جگری دوست کاشف کے بارے میں بتایا کہ وہ ان دنوں کسی کاروبار کے سلسلے میں لندن گیا ہوا ہے۔ وہ میرے اندر کی بے چینی سے خوب واقف تھے، لہذا مختلف بہانوں سے میرا دھیان بٹانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن میرے ذہن کی جو کنڈی اس زہرا جیوں کی ہلکے خم میں انک چکی تھی، اُسے شام ڈھلے تک اُس کی مسلسل غیر موجودگی کے تمام جواز بھرے ہوتے نظر آئے۔ اگر کسی وجہ سے وہ بندرگاہ پر میرے استقبال کے لیے نہیں پہنچ سکی، تو پھر بھی اب تک اُسے مجھ تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے شہر میں اترے سات گھنٹے ہو چکے تھے لیکن اُس کی طرف سے کوئی پیام، کوئی رقعہ، کوئی سندیس تک موصول نہیں ہوا تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں تحصیل ماہی کے مجذوب کی آواز گونجی ”جا..... تجھے خدا ملے گا، نہ ہی وصال منم.....“ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ٹھیک اُسی لمحے سلطان بابا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سب ہی ڈاکٹر ایک ایک کر کے باہر نکل آئے۔ میں لپک کر اُن کے سربراہ کے پاس پہنچا۔ وہ کچھ فکر مند سے تھے ”آپ اُن سے مل سکتے ہیں..... لیکن دھیان رہے کہ انہیں آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔ سر پر گہری چوٹ لگنے کے بعد مسلسل آرام نہ کرنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی گئیں ہیں۔ بہر حال مایوسی کفر ہے..... ہمیں ایک آدھ دن ہی میں بڑا آپریشن کرنا ہوگا۔“ میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں اور پاپا کمرے میں داخل ہوئے تو آہستہ آہستہ کمرے میں کربابانے آنکھیں کھولیں اور مسکرائے۔ لیکن اُن کی آواز میں نقاہت نمایاں تھی۔ ”تم نے پھر ایک بار اپنی ضد پوری کر لی نامیاں..... اب یہ ڈاکٹر دن رات تمہیں ڈراتے رہیں گے، حالانکہ ان کے ہاتھ میں شفا تو ہو سکتی ہے، لیکن ”جزا“ نہیں۔ قضا اور جزا کا اختیار صرف اُس کے پاس ہے۔ جتنی سانسیں لکھوا کر لائے ہیں وہ تو بہر حال کاٹھی ہی ہیں۔“ میں نے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ ”بات اگر سانسوں کی کتنی کی ہے تو پھر مجھے دکھائیے آج بتا ہی دیں، جس کے ذریعے میں اپنی باقی ماندہ سانسیں بھی آپ کے حساب میں منتقل کروا سکوں۔“ انہوں نے میری بھگی پلکیں پوچھیں۔ ”زندگی صرف سانسوں ہی میں نہیں بانٹی جاتی۔ تم نہیں جانتے تم مجھے کتنی زندگی دے چکے ہو اور ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی ہمیشہ سانسوں ہی سے منسلک نہیں ہوتی۔ ایک سفر ختم ہو گا تو دوسرا شروع ہو جائے گا۔“ پاپا نے دھیرے سے میرے کان دھکے کو دبا کر مجھے یہ احساس دلایا کہ مجھے سلطان بابا

کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ گھر سے خود ہی گاڑی لے کر نکل پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور بھی پہنچ گیا۔ اسے بھی زہرا کے پیچھے دوسری گاڑی دے کر بھیج دیا گیا اور پھر بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ ہجوم ہو کر ڈرائیور نے بریک لگائی اور پھر اپنی مالکن کی گاڑی کے گرد خون بکھرا دیکھ کر اُس کے تو ہوش ہی گم ہو گئے۔ پتا چلا کہ کوئی موٹر سائیکل سوار زہرا کی گاڑی تلے آ گیا ہے۔ نو جوان کی بنیضیں ابھی چل رہی تھیں۔ لہذا اُس کے چیتنے چلانے کے باوجود ڈرائیور نے اُسے اپنی گاڑی میں ڈالا اور زہرا سمیت اُسے لے کر قریبی ہسپتال کی طرف گاڑی بھگادی۔ یہ فون وہیں سے زہرا کے والد نے کیا تھا۔ جب زہرا گھر سے نکلی تھی، تب تک اپنے دفتر سے واپس نہیں لوٹے تھے اور پھر جب گھر پہنچے تو اس افتادہ سننے ہی وہ زہرا کی اماں کو لے کر فوراً ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہیوی بائیک پر سوار نو جوان کسی اونچے گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور دوسری بائیک کے لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ زہرا کے ابا نے پپا اور مجھ سے بھی وہاں آنے کی درخواست کی تھی، کیونکہ معاملہ پولیس کا تھا۔ نہ جانے غلطی کس کی تھی، لیکن ماما کے بقول زہرا کے ابا کی آواز سے شدید پریشانی ٹھک رہی تھی۔ میرے دل سے بے اختیار صدا نکلی کہ ”یا میرے مولا..... اُس گھائل کو اپنی امان میں رکھنا۔“ اُسی ہم نے گھر سے نکلنے کے لیے قدم اٹھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی اور اس مرتبہ میں نے ازتہ ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سلطان بابا کے وہ سینئر معالج تھے، جنہیں میں خاص طور پر اپنے گھر کا فون نمبر دے کر آیا تھا کہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں مجھے فون پر اطلاع دے سکیں۔ میں صرف اتنا ہی سن سکا کہ سلطان بابا کی سانسیں اُلجھنے لگی تھیں، لہذا انہیں پھر سے آسکین پر منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ نونگی میں کئی بار میرا پوچھ چکے ہیں۔ میں ریسیور رکھ کر باہر کی جانب لپکا، جہاں ماما پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ دونوں طرف ہی کچھ ایسی صورت حال تھی کہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پہلے کس طرف کو نکلا جائے۔ میں نے پپا کو زہرا لوگوں کی جانب جانے کا کہا اور خود دوسری گاڑی میں سلطان بابا کی جانب روانہ ہونے کا ارادہ کیا۔ ڈرائیور جلدی میں گیراج سے گاڑی نکال کر ابھی پورج تک پہنچا ہی تھا کہ میری رگوں میں بھرے والے اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا، لیکن میری بصارت سے رنگ غائب ہوتے گئے اور میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ذہن میں جیل کی قید کے دوران کیے گئے معائنے والے بڑے اکثر کے الفاظ پھر سے گونجے۔ ”کوئی بھی شدید پریشانی یا اچانک خوشی کی خبر ان کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر اس فام کو متحرک کر سکتی ہے جو آگے چل کر کسی بھی بڑے اعصابی حملے کی بنیاد بن سکتا ہے۔“ افسوس وہ نظام متحرک و ابھی تو کس گھڑی، جب چاروں طرف سے مصائب میرا گھبراؤ کر چکے تھے۔ میں زور سے لہرایا اور گاڑی کے بونٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ میری حالت دیکھ کر پپا تیزی سے میری جانب بڑھے۔ ”ساحر..... خود کو منہالو بیٹا.....“ لیکن میں شاید بہت پہلے سننے کے مقام سے آگے گزر آیا تھا۔ میری ذہنی آنکھوں اور بند ہوئی پلکوں نے ماما کو چیتنے ہوئے میری جانب بڑھتے دیکھا۔ لیکن میری سماعتیں آس پاس کے شور سے بے نیاز

کو آرام کا موقع دینا چاہیے۔ میری آنکھیں بہتی رہیں۔ جانے ہم اپنے سب سے زیادہ عزیز رشتوں سے ہیرو یہ توقع کیوں لگا بیٹھے ہیں کہ وہ ہم سے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ میرا دل اور ذہن کسی طور پر بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ ”بزرگ دانش“ بھی باقی سب کی طرح ایک دن اپنی پلکیں موند کر گہری نیند کی چادر اوڑھ کر چلے نہیں گئے۔

عشاء کے بعد رات کی ڈیوٹی والی نرس نے ہمیں یاد دلایا کہ اسپتال کے قوانین کے مطابق کوئی ایک بیمار دہریہ وہاں رات گزار سکتا ہے اور وہ بھی سلطان بابا کے کمرے سے ملحقہ گیسٹ روم میں۔ مجھے ماما سے کیا گیا وعدہ بھی یاد تھا۔ سو، میں سلطان بابا کو آرام کرتا چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے پپا کے ساتھ گھر چلا آیا۔ وہی مالوس دیواریں، وہی جانی پہچانی سی خوشبو..... وہی ماما کی اپنی اپنی نوکروں کو ڈانٹنے کی آوازیں، وہی دیواریوں سے لپٹی بلیں۔ شاید اگلی زندگی میں جسے جنت سے بھی بڑھ کر کسی کو کچھ عطا کرنے کا فیصلہ ہوا تو اُسے واپس اپنے ہی گھر بھیج دیا جائے گا۔ میرا کمرہ بھی بالکل اُسی طرح ”بکھرا“ ہوا تھا جیسے میں اپنی عادت کے مطابق اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔ شاید ماما نے میرے جانے کے بعد کسی کو میرے کمرے میں داخلے کی اجازت ہی نہیں دی ہوگی۔ میرے پرفومز، سی ڈیز، سن گلاسز، سوئس، میوزک سسٹم اور ذاتی تھیٹر..... سبھی کچھ ویسا ہی تو تھا۔ حتیٰ کہ میرے کف لکس اور ٹائی بزنز بھی اُسی طرح اپنی جگہ پر پڑی تھیں۔ ایک پل کے لیے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں صرف تھوڑی دیر کے لیے اپنا کمرہ چھوڑ کر دوست کے پاس گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح آوارہ گردی کر کے واپس لوٹ آیا ہوں۔ میں نے اپنے کمرے کے فون سے زہرا کے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف بجتی ہر گھنٹی پر میرے دل کی دھڑکن اتھل پھٹل ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ گھنٹی دوسری جانب کے فون کی بجائے میرے اپنے من مندر میں بج رہی ہو۔ لیکن بہت دیر بچنے کے باوجود دوسری جانب سے فون نہیں اٹھایا گیا۔ زہرا موبائل استعمال نہیں کرتی تھی اور اس ایک رابطہ نمبر کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی اور نمبر بھی نہیں تھا۔

کھانے کے دوران بھی میرا دھیان اُسی جانب اٹکا رہا۔ ماما نے آج کھانے پر پچھلے تمام مہینوں کی کمر ایک ہی بار نکالنے کی ٹھان رکھی تھی۔ مجبوراً مجھے اُن کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھانا پڑا۔ مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر پپا نے تجویز پیش کی کہ ہم تینوں کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے زہرا کی طرف سے بھی ہوائے ہیں۔ لیکن مجھے اس وقت وہاں جانا کچھ معیوب سا لگا اور پھر دیے بھی مجھے واپس اسپتال پہنچنا تھا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ پپا مزید اصرار کرتے، اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں اندر تک جھنجھٹا اٹھا۔ لیکن دوسری جانب کی بات سننے ہی ماما کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ”کیا..... اوہ..... اچھا..... جی جی..... لیکن کس اسپتال میں..... اچھا ٹھیک ہے.....“ ماما نے فون رکھا اور اپنی سانس درست کرنے کی کوشش کی ”زہرا کی گاڑی تلے کوئی شخص آ گیا ہے۔“ میرے ہاتھ سے نوالہ پلیٹ میں گر گیا۔ ماما نے جلدی میں بتایا کہ زہرا کا ڈرائیور ٹھیک وقت پر اُسے بندرگاہ لانے کے لیے نہیں پہنچا تو اُس نے خود ہی اپنی گاڑی ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی



## ”من کی دیوار“

عجب جنون مسافت میں گھر سے نکلا تھا  
 خبر نہیں کہ یہ سورج کدھر سے نکلا تھا  
 یہ کون پھر سے مجھے راستوں میں چھوڑ گیا  
 ابھی ابھی تو عذاب سفر سے نکلا تھا  
 یہ تیر دل میں مگر بے سبب نہیں اُترا  
 کوئی تو حرف لب چارہ گر سے نکلا تھا  
 میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا  
 کہ دل کا زہر مری چشم تر سے نکلا تھا  
 وہ قیس اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فراز  
 تیری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا.....

ہو چکی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میں پپا کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ پھر نہ جانے میں ہوش میں تھا یا کوئی پر  
 تھا۔ ایبولینس کی گھوٹی سرخ جتی، شور مچاتی سڑک، کسی غیر ملکی اسپتال کی ہمارے شہر میں موجود کڑی کامیابی  
 بورڈ، سفید گاؤں پہنے اور میرے اسٹرچ کے ساتھ بھاگتے ڈاکٹر، بدحواس سی نرسیں، آپریشن تھینر کی ایک جگہ  
 سے جلنے والی گول فانوس نما روشنیاں، کچھ جھپکتے اوزار، خون کے چھینٹے، درد، کسک، بوجھل پن، میری کھلی  
 بائیں جانب کسی انتہائی تیز نشتر کی نوک کی جھین اور پھر جلد سے گزر کر ماس کے اندر تک کاٹ کا احساس.....  
 پھر وہی سرخ اندھیرا..... کئی صدیوں کے بعد میری سماعت میں کچھ ہلکی سی سرگوشیاں گونجیں..... ہمیں انہیں  
 ہے..... آپ کے پیٹے کے نیچے کی امید بہت کم ہے۔ البتہ آپ اگر چانس لینا چاہیں تو اسے فوراً لندن کے  
 ویل اسپتال تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ وہاں ڈاکٹر البرٹ ہی واحد ماہر اعصابی امراض ہیں، جو شاید  
 کچھ کر سکتے ہیں۔“ پھر ماما کے رونے کی آواز، ایئر پورٹ ٹرمینل کے مخصوص اعلانات، ہوائی جہاز کے پہول  
 رن وے پر رگڑ سے اُڑتی چنگاریاں، اور پھر ایک ملائم آواز، ”ہم لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر آپ کو خوش آمد  
 کہتے ہیں۔“

۲۳۲

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
 www.pdfbooksfree.pk

جج تو یہی ہے کہ میں خود ہی اپنی راہ کی سب سے بڑی دیوار تھا۔ میرے ہوش و حواس تب میرا ساتھ چھوڑ  
 گئے، جب دو چار ہاتھ ہی اُس بام کی منڈیر چھونے کو رہ گئے تھے، جس پر میری قسمت کا واحد چاند چمک رہا  
 تھا۔ لیکن چکور کی قسمت میں بھلا چاند کو پانا کب ممکن ہوا ہے۔ اس کا مقدر تو صرف اُسے چھونے کی خواہش میں  
 اُڑتے جانا ہے۔ اُونچا اور اُونچا تر، حتیٰ کہ اُس کی سانسیں رُکے لگیں، دم گھٹنے لگے اور پھر بے دم ہو کر فلک سے  
 زمین پر نیست و نابود ہونے کے لیے ایک آخری قلابازی اور پھر سب ختم..... شاید میرا خاتمہ بھی قریب تھا۔  
 جگہ جگہ گزریوں کے چند لمحے مجھے ایک بہت بڑی سی شے کی کھڑکی دکھاتے، جس کے کانچ پر پھسلتی بوندوں سے  
 ہاسے مجھے ایک دریا رواں دکھائی دیتا۔ میں اس دریا کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ بلکہ کئی کئی گھنٹے میں نے اس کے  
 کنارے بچے بیٹوں پر اس سے باتیں کرتے گزراے تھے۔ ہاں..... شاید یہ دریا بے نیل ہی تھا۔ میں اس کی  
 نیلی لہروں کی خاموش سرگوشیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ پھر کچھ دقنوں سے دھیرے دھیرے میرے  
 ہڈوں میں حرکت ہونے لگی۔ شاید نصف صدی بعد میں اپنی بوجھل پلکیں اٹھانے میں کامیاب ہوا اور سب سے

ایڈیٹ وہی تو نہیں، جہاں سے ہمیں نکالا گیا تھا؟ اچانک میری نظر کرے کی دیوار پر لگے پتلے سے اسکرین ٹی وی پر پڑی، جو بند آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ پتا وقت گزاری کے لیے مختلف چینلوں بدل رہے تھے اور پھر لمحے کے لیے ٹی وی کے پردے پر وہ منظر گزرا، جس نے میرے وجود کے اندر جیسے ایک کرنٹ سا دوڑا۔ پچاس تک تین چار مزید چینل گزرا چکے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں آواز دے کر پھر سے چینل پلٹنے کو کہا۔ وہ میری حالت دیکھ کر کچھ پریشان سے ہو گئے اور انہوں نے جلدی سے چینل پلٹ دیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکنے کو کہا۔ ہاں..... یہی وہ چینل تھا۔ حجاج آخری مناسک حج ادا کرنے کے بعد میدان میں جمع ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا چکے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان میں سے ہر ہاتھ حبیب البشر صاحب ہی کا ہو۔ میں نے جلدی سے اپنے چارٹ پر نظر ڈالی۔ میرے ہوش میں آنے کا وقت ٹھیک وہی تھا، جب حبیب صاحب کی پہلی نظر اُس کے گھر پر پڑی تھی۔ ٹھیک چار دن پہلے..... جب حجاج پہلی مرتبہ حرم میں داخل ہوئے اور جب دل زندگی میں پہلی مرتبہ کسی خشک پتے کی طرح لرز کر چند گھنٹوں کے لیے رُک گیا ہوگا، جب پوری کائنات میں اپنے ایک مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس ماموں سے پسینے کی صورت بہا ہوگا اور جب رواں رواں سجدے میں جھک کر رو پڑا ہوگا۔ تب وہ لمحہ تھا، جب میں نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہاں مغرب میں ڈاکٹر اب ساری عمر سر کھپاتے رہیں گے کہ یہ اُن ہونی کیسے ممکن ہوئی۔ جس بیماری کو وہ لاعلاج قرار دے کر میرے لیے ساری عمر مد ہوشی یا جنون کے عالم میں مبتلا رہنے کا اعلان بہت پہلے کر چکے تھے، ایک ماہ میں اس کے آثار کیسے مٹنے لگے۔ یہاں مغرب میں ایسے واقعات پر فوراً ایک لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ Miracle (معجزہ)..... اور لوگ چند دن بعد سب کچھ بھلا کر پھر سے زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہاں نادانوں کو کون سمجھائے کہ ”سانس کی آمد و رفت“ سے بڑا بھی کیا کوئی ”معجزہ“ ہوگا اس دور کا؟ اُس نے گھر سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر بھی جب اُس کے حضور مانگی گئی دعا لپک جھپکنے سے پہلے اُس کی بارگاہ میں ٹانگ جاتی ہے تو پھر اُس کی چوٹ کو چومتے ہوئے ماتھے کی سرسراہٹیں وہاں تک پہنچنے میں بھلا کیا وقت لیتی گی؟ ڈاکٹر البرٹ کی ٹیم کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئے گی۔ اس کی تشخیص کے مطابق رے بیز کے کچھ جراثیم بے ہوشی میں جو صحیح وقت پر دیکھیں دیئے جانے کے باوجود دین موقیے پر اپنے آپ کو کسی سیپ نما چادر میں چھپا کر خود پر کوئی ”جھوٹا خول“ چڑھا لیتے ہیں لہذا دیکھیں کے خلیے اُسے پہچان نہیں پاتے اور اُس کا اثر ختم ہونے کے بعد یہ زہریلے جراثیم اپنی قلعہ نما پناہ گاہوں سے باہر نکلتے ہیں اور دوا کے بچے کچھ اور دم توڑتے ہیں۔ انہیں ایک تازہ دم فوج کی طرح حملہ کر کے اعصاب پر قابض ہو جاتے ہیں۔ البرٹ کی تشخیص کے مطابق جب مجھے لندن کے روز ویل اسپتال لایا گیا تھا، تب میرے تقریباً 90 فی صد اعصاب پر وہ زہریلی فوج اپنا ٹخرا کچلی تھی اور ایسے مریضوں کا زندگی کی طرف لوٹنا یا پھر اپنے اعصاب ہی کو واپس پالنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن اُن کے سامنے ایک ایسا مریض موجود تھا، جس کے جھکے ہوئے اور قریب المرگ اعصاب کے چند

پہلے جو شبیہ میری بصارت کے سامنے دھیرے دھیرے متعارف ہوئی، وہ اپنے پورے جسم اور سر کو ایک چادر سے اچھی طرح ڈھانپے جانماز پر سجدہ میں پڑی ہوئی میری ماں کی تھی۔ ہاں..... وہ ماما ہی تھیں، جن کی جنہیں نے ہاتھ نیکنا سیکھ ہی لیا تھا۔ اولاد کی محبت میں کتنی طاقت ہوتی ہے، اس کا ایک دوسرا مظاہرہ کھڑکی کے قریب بیٹھے تسبیح کے دانے گراتے اپنے والد کی صورت مجھے نظر آیا۔ محبت چاہے کیسی بھی ہو، سجدہ کرنا سکھایا دیتی ہے۔ میری پلکیں اٹھتی دیکھ کر پیتا کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی اور وہ باہر کی جانب لپکے۔ ماما بھی وہیں جانماز پر جمی رہ گئیں اور آنکھیں بند ہونے سے پہلے میں نے ایک غیر ملکی ڈاکٹر کو چند معاونوں کے ساتھ تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

دوسری بار جب میرے حواس جاگے تو میں نے کینڈر پر مزید تین ہندے سے بڑھے ہوئے دیکھے اور ہر لمحے احساس ہوا کہ میں پورے پندرہ دن تک اس سوتی جاگتی حالت میں بیٹا جیسے گزار چکا ہوں۔ ہم لندن کے روز ویل اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے اعصابی حصے میں موجود تھے اور میرے گرد ڈاکٹروں کا ایک جھوم جگمگ تھا، جو اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور پھر ایک معمر ڈاکٹر کی آمد پر سب چپ ہو گئے۔ اُس نے اپنا تعارف کروایا ”ہیلولو کے..... میرا نام البرٹ ہے ڈاکٹر البرٹ۔ تمہیں نئی زندگی کی جانب پہلا قدم مبارک ہو۔“ مجھ سے جواب میں کچھ بولا نہیں گیا۔ میں پاپا سے سلطان بابا کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری زبان تالو سے جیسے چپک کر رہ گئی تھی۔ شدید پیاس کا احساس میرے حلق میں کانٹے چھو گیا۔ ڈاکٹر البرٹ کو شاید میری کیفیت کی کچھ خبر تھی۔ ”تمہیں کچھ عرصہ احتیاط کرنی ہوگی۔ اس وقت پانی کی ایک بوتل بھی تمہارے لیے زہر ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں رے بیز کا ایسا کیس آج تک کبھی نہیں دیکھا۔ تمہارا موت کے دم سے واپس لوٹ آنا میرے لیے ایک معجزے سے کم نہیں۔“ وہ میرے گال تھپتھا کر پلٹ گئے۔ چند گھنٹے بعد جب میں لکنت کے ساتھ بولنے کے قابل ہوا تو میں نے پہلا سوال بابا کے متعلق ہی کیا۔ پپا نے مجھے بتایا کہ ہمارے ملک سے روانہ ہوتے وقت وہ تقریباً کوئے میں تھے اور ڈاکٹر اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں مگر مجھے پپا کی بات ادھوری سی لگی۔ لیکن میں خود اس وقت کچھ ایسی معذوری کے عالم میں بستر پر ہوا تھا کہ خود اٹھ کر اور دو قدم چل کر پاکستان فون بھی ملا سکتا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ جن لمحوں میں، میں ہوش کی سرحد سے پار تھا، تب سلطان بابا بھی دنیا والوں کے نزدیک بے ہوش پڑے تھے۔ لیکن مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس تمام بے ہوشی کے دوران بھی میرا اُن سے مسلسل رابطہ تھا۔ میں اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹا کھڑکی سے باہر دیکھتا تھا۔ شیز کی روالا لہروں میں ضم ہو کر فنا ہوتی ہوندوں کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ پانی اپنے اندر پانی کو کتنی آسانی سے جذب کر لیتا ہے۔ شاید ساری بات (میڈیم) عنصر کی ہوتی ہے۔ ہر عنصر اپنے ہم جنس کو اتنی ہی آسانی سے قبول کرتا ہے گویا ہم انسانوں کا میڈیم بھی اس دنیا سے کچھ عرصہ ہی ہوتا ہوگا، کیوں کہ ہم اپنی ساری زندگی اس جہاں میں کاٹ کر بھی اس سے کتنے انجمنی رہتے ہیں، کتنے جدا اور کتنے الگ سے کہیں

مجھے اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں کسی دن اس شکستہ بدن کے ساتھ اس کی دیوار سے پرے اسپتال میں یوں بے بس اور لاچار بھی پڑا ہوں گا؟ ہماری زندگی میں کون سا ہم پر کس وقت، کس صورت میں کھلے گا، یہ ہم اگر پہلے جان جائیں تو شاید بہت سے مقامات سے کبھی ادب سے بھی نہ ہو پائے۔ اس روز بھی میں ڈھیل چتر پہ بیٹھا اسپتال کے وسیع گھاس کے میدان میں بے سرخ اور زرد پتوں کی چادر پر سفید برف کے نغصے ستاروں کو اپنے موتی ٹانکتے ہوئے دیکھ کر کچھ ایسی چوں میں گم تھا۔ موسم کی پہلی برف باری لندن کے درو دیوار کو سفیدے کی لعل سے ڈھک رہی تھی۔ برف گرتی ہے وہاں کے لوگ جانتے ہوں گے کہ پہلی برف کی کوری چادر زمین کو یوں ڈھانپتی ہے، جیسے ماں اپنی بیٹی کے داغوں پر سفید مرہم لگاتی ہے۔ اس کی بد صورتی چھپانے کے لیے اُسے سفید نور کی اور چھٹی اڑتی ہے۔ جب برف کے سفید گالوں نے میرے بالوں میں جمع ہو کر میرے ماتھے پر میرے سیاہ مقدر کی دل کی تلاش شروع کی تو نرس نے میرے متع کرنے کے باوجود ڈھیل چتر کو جلدی سے آگے دھکیلا اور ٹھیک لمحے مجھے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس ہوا، میں نے نظریں اٹھائی۔ گیزوے رنگ کا چولا، ہاتھوں میں آہنی کڑے ڈالے اور سر پر عام گول ٹوپی کی گولائی سے نصف ایک چھوٹی سی سفید ٹوپی پہنے ہوئے ایک عمر کا شخص بالکل میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی پوری شخصیت ہی میں ایک عجیب سی چکا چوند تھی۔ جیسے آخری دن کا پھر کا سوانیزے پر کھڑا سورج، جس پر کبھی نگاہ تک نہیں پاتی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں..... کس چمن تھی اُس کی نظر میں۔ میں ایک پل ہی میں اہولہان سا ہو گیا۔ ”مجھے یہاں سب گرو کے نام سے جانتے ہیں۔ ویسے میرا نام پارکر گولڈمین ہے اور میں آسٹریلیئن نژاد یہودی ہوں۔“ مجھے لگا تمہیں ابدی سکون کی لڑ ہے لڑکے..... نرس گروتامی اس پُر اسرار شخص کو دیکھ کر مودب سی ہو گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اسپتال کے عملے کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ گروتے میرے ماتھے پر اپنی دو انگلیاں رکھیں اور منہ ہی منہ میں ہائے کیا بوبڑا نہ لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے گرم دیکھتے الاؤ میں کسی نے برف کی دو سلاخیں گاڑ دی ہوں۔ اتنے امانے دوسری منزل پر موجود میرے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا اور زور سے بولیں ”ساتر برف باری رات ہو چکی ہے..... فوراً اندر آ جاؤ۔“ وہ جانتی تھیں کہ میں گھنٹوں بیٹھ کر آسمان سے اس نور کی برسات کو دیکھتا ہوں، تب بھی میرا دل نہیں بھرے گا۔ گروتے مسکرا کر ہمارا راستہ چھوڑ دیا۔ لیکن وہ دو آنکھیں ساری رات نیند نہ لگی مجھے اپنی پلکوں کے پیچھے چھپتی رہیں۔

صبح ہوئی تو دو دھیا برف، لندن کے سب گناہوں پر پردہ ڈال چکی تھی۔ باہر بہتا دریائے ٹیمز اور دُور نظر ڈاکٹر منٹر کا پل بھی برف سے بنا سا نچا لگ رہے تھے۔ کیا دنیا کا کوئی بھی دوسرا نظارہ کسی برقی صبح سے زیادہ حیرانہ اور مبہوت کر دینے والا ہو سکتا ہے۔ جانے کیوں مجھے ایسی ہر برقی صبح کے بعد اپنی رُوح پھر سے اپنا جہنم لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں کھڑکی کے قریب پڑی آرام کرسی پر ادھ لیٹا باہر بنے نور کے مجسوں

آخری سپاہی اُس پوری فوج کا مقابلہ کر کے یہ آخری جنگ جیت چکے تھے۔ میرے کمزور اعصاب کی فضا پر لگا میرے ذہن کا قلعہ مفتوح ہونے سے بچا لیا گیا۔ لیکن جدید ایلو پیتھی اور سائنس اس معصے کو کبھی نہیں پائے گی۔ سچ ہے، انسان سدا سے خسارے میں ہے۔ سدا کا کوتاہ نظر ہے۔ اپنے سامنے روزانہ سورج نکلے چاند تارے ڈوبتے دیکھ کر بھی اُسے یقین نہیں آتا۔ یہ پانی سے بھرے بادل، یہ ہوائیں، یہ روشنی، یہ پہاڑ، آسمان..... بھلا اور کیا نشانی باقی رہ جاتی ہے اپنے اندر بیٹھے ”دلیل کے سوداگر“ کو مطمئن کرنے کے لیے؟ لیکن میرے اندر پھیلتی بے چینی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ پندرہ دن سے زہر اسے ماما پاپا کو کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بار اُس کا فون آیا بھی تو بس چند لمحوں کے لیے۔ پاپا ایسی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے، لیکن ماما کو کچھ ہوئی سی لگتی تھیں، جیسے زہر کا ایسی حالت میں مجھ سے لا تعلق رہتا انہیں پسند نہ آیا ہو..... تب ہی شام کو میرے حلق میں سوپ کے چھوٹے چمچ اُٹھتے ہوئے اُن کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا۔ ”کون بے وقوف ہوگی، جو موت کے منہ میں جانے والے کو الوداع کہنے ایئر پورٹ پر آئے گی یا اُس کا انتظار کرے گی.....“ پاپا نے نظروں نظر میں ماما کو ڈانٹا۔ وہ بوڑا کر چپ ہو گئیں، لیکن میرے ذہن میں کئی سوال کھلبلائے لگے۔ وہ میری حالت جانے کے باوجود ایئر پورٹ تک کیوں نہیں آئی؟ اور اگر کوئی مجبوری بھی تھی، تب بھی وہ ایک بار فون کر کے میری خیریت تو پوچھ سکتی تھی۔ کہتے ہیں محبت دوسروں کا آئینہ ہوتی ہے۔ جس زاویے سے بھی اس کا عکس دیکھیں کوئی نیا دوسرے کچھ الگ ہی خدشہ نہ اُٹھاتا ہے۔ ایک پل پہلے ل کر جانے والا محبوب بھی موڑ مڑتے ہوئے آخری بار پلٹ کر نہ دیکھے تو دیوانوں کی دنیا اٹھل پھٹھل ہونے لگتی ہے کہ جانے کیا ہو گیا؟ کہیں وہ رُوٹھ تو نہیں گیا۔ کوئی بات بُری تو نہیں لگ گئی اُسے.....؟ اور پھر اگلی ملاقات تک سارا چین و سکون غارت ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال میرا بھی تھا لیکن میں کتنا بے بس تھا کہ اپنی مرضی سے قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس انسانی جسم کی لا چاری پر بے حد غصہ آتا تھا۔ ہمارے جسم کو ہماری سوچ جیسی پرواز کیوں نہیں عطا کی گئی؟ ایسا ہونا تو میں اُڑ کر اُس بے پروا کے در پر جا پہنچتا کہ اس تغافل کی وجہ تو بتا دے؟ مجھے سلطان بابا کی فکر بھی گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟ عجیب بات یہ تھی کہ جب میں بے ہوش تھا، خود کو اُن کے بے حد قریب محسوس کرتا تھا، لیکن جب سے میں دنیا والوں کے لیے ہوش میں آیا تھا، اس خرد نے انہیں مجھ سے جیسے چھین لیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جب ہم اپنے عزیز ترین رشتوں سے جسمانی طور پر دُور ہوں تو ہمارے اندر موجود کوئی غیر مرئی نظام ہمیں رُوحانی طور پر ان کے قریب تر کر دیتا ہو؟

میں ابھی تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا، لیکن تین دن بعد ڈاکٹر البرٹ کی ہدایت پر مجھے ایک نزل بیساکھی اور ڈھیل چتر کی مدد سے اسپتال کی اندرونی حدود میں واقع، باغیچوں یا نہر کے کنارے مختصر سیر کے لیے لے جانے لگی۔ یہ اسپتال دریائے ٹیمز کے بالکل کنارے اور ایک چوڑی سڑک سے ملتی تھا۔ میں جانے کتنی بار اس سڑک سے گزرا ہوں گا، کیوں کہ لندن کی زرد شام کے سب رنگ اس سڑک پر بکھرے پتوں کی صورت میں

اُس کا یہ حلیہ اور ہاں بہت مقبول بھی تھا اور بھنگی رُوحوں کے ستائے جسم اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اُس کا یہ حلیہ اور ہاں کا لقب اُس کے ہندوستان کے ایک دورے کے بعد کے عطا کردہ تھے، جب اُس نے وہاں بہت بول کا کھڑے کھڑے علاج کر کے اُن کی رُوحوں کو سکون بخشا تھا۔ لیکن نہ جانے میرے ساتھ یہ آلٹ کیوں تھا کہ وہ جتنی بار بھی میرے سامنے آیا تھا، میری رُوح میں بیک وقت کئی کانٹے چبھو گیا تھا۔ لیکن کیا لگا ہوں کی طرح رُوحیں بھی آپس میں کچھ بھید بھاؤ رکھتی ہیں؟ ہاں..... بظاہر یہ رُوح کی ناپسندیدگی لگتی تھی۔ کیوں کہ اُس کی ظاہری شخصیت عام لوگوں کے لیے بے حد پرکشش تھی۔ میں مہمپا کے سلطان بابا کی خیریت تو کسی نہ کسی طور پر دریافت کر دیا تھا، لیکن زہرا کی خبر ملنا محال ہوتا جا رہا تھا۔ ایک آدھ بار میرے کمرے ہی سے زہرا کے گھر بھی فون ملا کر دیکھا لیکن زیادہ تر اُس کے گھر کے سامنے ہی بات ہو سکی۔ ایک بار زہرا کی اماں نے فون اٹھایا بھی تو پتا چلا کہ زہرا گھر پر نہیں ہے۔ ممانے ہو کر فون کرنا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن میں اپنے دل کا کیا کرتا۔ جودن کسی نہ کسی طور گزرا ہی لیتا تھا مگر شام ہی جانے کہاں سے سارے جہاں کی بے چینی اس کے مٹھی بھر وجود کے چار خانوں میں در آتی کاش ہمارا دل بھی ان ٹیلی فونوں کی طرح یادوں کے لیے خاص نمبر اور ڈائل کا محتاج ہوتا اور جب تک نمبر نہ گھمایا جاتا، تب تک یاد کی گھنٹی بھی نہ بجتی۔ یہ قدرت بھی ہمارے ساتھ کیسے عجیب کھیل کھیلتی ہے بلوں کو آزاد چھوڑنا چاہیے تھا، انہیں ٹیلی فون جیسی ایجا دوں میں قید کر دیا اور جن بے لگام جذبوں کو میں بند کر کے رکھنا لازمی تھا، انہیں دل جیسی بے پروا سلطنت کے حوالے کر ڈالا۔ مگر تقدیر کو گلہ پھر بھی ہم انسانوں ہی سے رہتا تھا۔

رات ڈھل رہی تھی اور میں گھنٹوں کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند سے کوسوں دُور تھا۔ تنگ آ کر وہیل چیئر لیے کھڑکی کے پاس آ بیٹھا اور باہر گرتی برف اور درختوں کی آپس میں ہوتی سرگوشیاں سننے لگا۔ برف دل سوکھی ٹہنیوں سے گلہ کر رہے تھے کہ ابھی تو وہ انہیں خود سے لپٹائے بیٹھی ہیں، لیکن بہار آتے ہی جب انہیں گلے سے تو وہ ان سے ناتا توڑ لیں گی اور ٹہنیاں بے وفا محبوب کی طرح ان سے کبھی پورے نہ اٹے عہد و پیمان کر رہی تھیں۔ اچانک میری نظر برف میں جے ایک وجود پر پڑی جو یوگا کے کسی آسن کو لگتی برف میں کھڑا تھا۔ وہ گرو تھا۔ گرو کی آنکھیں کھلیں اور تیر کی طرح میری نظروں میں گڑ گئیں۔ لیکن مجھے اُس کی آنکھوں میں شدید غصے کی جھلک نظر آئی۔ گرو نے مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں کسی کی طرح پلٹا۔ مجھے لگا میں خود پر اختیار کھو بیٹھا ہوں۔

کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور گرو اپنے مخصوص حلیے میں دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر ڈر ہی گئیں۔ اُس نے ششہ انگریزی میں سب سے معذرت کی کہ وہ صرف میری خیریت دریافت کرنے آیا ہے۔ پاپا اُس کا مدعا سمجھ کر اپنی جگہ سے اٹھے اور مہمپا کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ مہمپا اس طرح کے ساتھ اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں لیکن پپا نے اپنی آدھی زندگی اسی ماحول میں گزاری تھی اور وہ یہاں آداب سے واقف تھے، لہذا بادل نخواستہ مہمپا کو بھی ساتھ ہی اٹھنا پڑا۔ گرو نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”مسلمان ہو.....؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”الحمد للہ.....“ گرو چونک سا گیا۔ خود مجھے اپنی اس سانحگی پر حیرت ہوئی۔ مجھے یہ انداز اختیار پہلے تو کبھی نہیں سوجھا تھا۔ شاید اُس کے سوال ہی میں کچھ ایسا پڑا تھا کہ میرے اندر سے خود بہ خود یہ آواز باہر نکل آئی ”کیا نام ہے تمہارا؟“ ”عبداللہ“ کچھ دیر تک میں کوئی سے باہر اور وہ میرے چہرے پر نہ جانے کیا تلاش کرتا رہا۔ ”پورے روز وہیل اسپتال میں تمہارے عجیب مرض اور پھر عجیب ترین شفا کا چرچا ہے۔ یہاں کے ڈاکٹر اسے حسب معمول کسی معجزے سے تعبیر کر رہے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ آج کل معجزے اتنی آسانی سے رُومنا نہیں ہوتے، ان کے پیچھے ضرور کچھ راز پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کیا تم مجھے وہ راز بتاؤ گے.....؟“ میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ لگی لپٹی رکھے بغیر اُس نے اپنے دل کی بات پہلی باقاعدہ ملاقات ہی میں میرے سامنے رکھ دی تھی۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے شخص بہت خطرناک محسوس ہوا۔ میں نے پہلی مرتبہ اُس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا ”معجزے ناقابل بیان ہوتے ہیں اور بات اگر راز کی ہے تو پھر وہ راز ہی کیا جو انشاء ہو جائے.....“ گرو نے بے چینی سے ہلا ”ٹھیک کہا تم نے..... راز کا واسطہ انخفا سے ہے۔ لیکن یہ معاملہ انسان کی بھلائی کا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارے افشا سے کسی دوسرے مریض کی حالت سدھرنے کی ترکیب بھی ہو جائے.....“ میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو، لیکن مجھے یوں لگا کہ اُس کی آنکھیں ہر لمحہ مجھے تسخیر کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ”بات اگر کسی کی بھلائی کی ہے تو پھر جان لو کہ میری رُوح پر صرف دُعا کا مجرہ رُومنا ہوا ہے۔ ہزاروں میل دُعا بیٹھے کسی شخص کے اٹھے ہاتھوں کے پیالے میں میری مسیحا کی تہرک ڈال دیا گیا۔ دعا میں تو میرے لیے میرے اپنوں نے بھی بہت مانگی ہوں گی، لیکن کچھ اعجاز جنبیوں کے حصے آتے ہیں۔ بس، اتنا سا افسانہ میرا.....“ گرو غور سے میری جانب دیکھتا رہا، جیسے اُسے میری بات کا یقین تو ہو لیکن نصف۔ لیکن اُس نے مجھ سے مزید بحث نہیں کی اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں مجھے اُس کے بارے میں بہت کچھ پتا چل چکا تھا۔ مغرب میں آج کل لوگوں کا زحجان رُوحانی علاج کی طرف بہت بڑھ چکا ہے۔ باقاعدہ رُوحانی علاج کے کلینک کھل چکے ہیں۔ جہاں لوگ اپنے بے چین من اور رُوح کی کک دور کرنے کی نیت سے آتے تھے۔ گرو بھی یہاں کا ایک ویسا ہی رُوحانی مسیحا تھا جسے اسپتال کے بعض مریضوں کی خصوصی درخواست پر مختلف اوقات میں رُوحانی سیشن کرنے کے لیے خاص دعوت دی جاتی تھی۔ پار کرنا مہمپا کا یہ یہودی اپنی شفا کے



## پہلی قیامت

ٹی۔ گروہیں برف میں کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ بعد میں مجھے اُس کی عمر کی ہیڈنرس کا نام اسٹاف ایکی معلوم ہوا۔ صبح  
 ب وہ میرا معمول کا چیک اپ کرنے آئی تو کافی خفا معلوم ہو رہی تھی۔ مہاپا رات کو میرے کمرے سے ملحق  
 کمرے میں ہوتے تھے لہذا انہیں گزشتہ رات کی واردات کی خبر نہیں ہو سکی۔ میں نے نظروں نظروں میں ایکی کو  
 منع کیا کہ وہ میرے رات بھر برف اوڑھنے کا ذکر نہ کرے۔ وہ ناراض ناراض سی، تھرمائیڈ دیکھتے ہوئے  
 بولی۔ ”تمہیں بخار ہو گیا۔ اب تمہیں ڈانٹ پڑنی چاہیے۔“ مہاپا ڈور بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر  
 ان کی طرف دیکھا۔ ”یہ فریضہ مہار دو گھنٹے بعد ادا کرتی رہتی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارے معمولات میں  
 فوری بہت تبدیلی ضروری ہے۔“ وہ بھی ہنس پڑی۔ ”باتیں خوب بنالیتے ہو۔ تم رات کو اُس عجیب شخص کے سا  
 تھ کون سی بحث کر رہے تھے؟“ ”کون.....؟ وہ گرو.....؟ وہ میرے ساتھ کوئی سودا کرنا چاہتا تھا۔“ ایکی کے  
 چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ ”دیکھو، میری مانو تو اُس شخص سے ڈور ہی رہو۔ پتا نہیں اسپتال والوں نے  
 اُسے اتنا سر پر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ میرا بس چلے تو اُس کا یہاں داخلہ ہی بند کر دوں۔“ ایکی، گرو سے کافی بد  
 دل دکھائی دیتی تھی۔ ”میں نے سنا تھا کہ نرس ہرڈی زوح کے لیے ایک نرم دل رکھنے والی ہستی کا نام ہوتا ہے،  
 لیکن آپ تو گرو کے لیے کافی تلخ جذبات رکھتی ہیں، ایسا کیوں؟“ ایکی نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”دیکھو لڑکے! میں  
 تمہیں پوری بات نہیں بتا سکتی، بس اتنا جان لو کہ وہ ایک ’مسیحوتی‘ ہے۔ دراصل.....“ ابھی ایکی نے بات  
 شروع ہی کی تھی کہ ڈاکٹر البرٹ اپنے دو معاونین کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور ایکی جلدی سے سامان  
 کی کڑے اٹھا کر چل پڑی۔ میں اخبارات اور ٹی وی پر روزانہ کی بارسیہونیت اور سیہونیت کی اصطلاح سنتا اور  
 ہتھارتا ہوتا تھا، لیکن مجھے ابھی تک اس لفظ کے اصل معنی نہیں آتے تھے۔ شام تک میں اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ  
 ایکی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی۔ شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل آسمان پر جڑے بادلوں میں سے کسی ایک شریر  
 بوڑے نے کچھ دیر کے لیے، اپنے ایک دوسرے سے بندھے ہاتھ کھول دیئے، تو چند لمحوں کے لیے فلک پر کسا  
 اودے بادلوں کا خیمہ ایک جانب سے کھل گیا۔ اور مٹھی بھر آسمان جھلکنے لگا۔ ٹھیک اُسی لمحے سورج کے نصف پیا  
 لے نے مسکرا کر زمین سے چھڑ خانی کی اور اس کی الوداعی کرنیں نیچے پھٹی برف پر کچھ اس طرح پڑیں، جیسے  
 بچپن میں ہمارے محلے میں گولے گنڈے والا سفید دودھیا برف کے گولے پر نارنجی رنگ کا شربت اُٹھاتا تھا۔  
 میرا اس وقت شدت سے جی چاہا کہ میں کسی اونچی عمارت سے سارے لندن کا نظارہ کروں۔ مجھے یقین تھا کہ  
 اس وقت پورا لندن سورج کبھی کے کسی پھول کی طرح دمک رہا ہوگا..... زرو لندن کی تاریخی بہتی زمین اور جما  
 ہوا دریائے ٹیمز، وہی شام اور وہی زہرہ کی یاد کا پھندا، جو ڈھلتے سورج کے ساتھ ساتھ یوں کسا جاتا تھا، جیسے  
 گیل بان کی رسی خشک ہونے پر سکڑتی جاتی ہے۔ سورج چند لمحوں کے لیے جھلک دکھلا کر پھر سے گہرے بادلوں  
 کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

برف باری کے بعد ہونے والی شام عام شاموں سے کہیں زیادہ اُداس، بوجھل اور تھکا دینے والی ہوتی

میں نے پینا نزم کے بارے میں آج تک جتنا کچھ سنا تھا، اس کے تمام آثار میں اپنے وجود پر اس  
 محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی میرے ذہن کا کوئی ایک حصہ ایسا ضرور تھا جہاں جو تک جاگ رہا تھا۔ تب تک  
 جب برف کی چادر پر اپنی موثر انڈویل چیز کے پہیوں کے نشان ثبت کرتا ہوا نیچے گھاس کے برف سے  
 میدان میں گرو کے قریب پہنچا تب بھی سوچ سکتا تھا اور یہ سب محسوس کر سکتا تھا۔ گرو کچھ دیر تک فاتحانہ انداز  
 میں مجھے دیکھتا رہا، جیسے کہہ رہا ہو کہ ”دیکھا..... کیسے کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے.....“ لیکن اگلے  
 ہی میری زبان سے نکلے سوال نے اُس کی نظر کا سارا غور چکنا چور کر دیا۔ ”کیا تم پینا نزم بھی جانتے ہو؟“  
 گرو کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ ”کیا مطلب..... یعنی کہ تم..... تم یہ سب کچھ محسوس کرنا  
 ہو.....؟“ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”ہاں میرا وجود تمہاری نظر کے اثر میں یہاں نیچے تک خود کو دکھانا  
 ہے لیکن میں اب بھی جاگ رہا ہوں۔“ آسمان سے برسی برف ہمارے وجود ڈھانپ رہی تھی۔ رات کے  
 جب آسمان سے برف گرتی ہے تو برف کی اپنی ایک خاص روشنی ہوتی ہے، جیسے صفر سے بھی کہیں کم  
 والے بہت سے دودھیا بلب آس پاس جل رہے ہوں۔ میں اور گرو بھی ایسی ہی مدہم روشنی میں رات۔  
 سرکتے پہروں کو اپنی جھولی میں جمع کر رہے تھے۔ گرو مزید بے چین ہو گیا۔ ”میں پہلے ہی سے دن سے  
 کر رہا ہوں کہ تمہاری زوح میرا تسلط قبول کرنے میں شدید مزاحمت کر رہی ہے۔ کوئی ہے، جو تمہارے اندر  
 کر تمہاری حفاظت کرتا ہے، وہی تمہاری طاقت ہے۔ لیکن میں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ وقت آگیا ہے کہ تم  
 مجھے بتا دو کہ کس ہستی کا سایا ہے تم پر.....؟“ میں اپنے آپ کو اندر سے انتہائی مضطرب محسوس کر رہا تھا۔ ”تم  
 ے وجود پر تو شاید کبھی اپنا تسلط قائم کر بھی لو، لیکن میری زوح کے کواڑ صرف چند مخصوص دستکوں کا  
 ہیں۔“ گرو کچھ دیر نظروں ہی نظروں میں مجھے توتا رہا۔ ”ٹھیک ہے، تو پھر کچھ کمزور اور کچھ دو کی بنیاد پر سودا ہوگا  
 مجھے اپنا راز دو گے اور بد لے میں تمہیں کچھ ایسا بتا جاؤ گا کہ تمہاری عاقبت سنور جائے گی بولو منظور ہے؟“  
 حال میں بھی میرے ہونٹوں پر ایک نامکمل اور زخمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اگر میری عاقبت کا سنورنا اور  
 تقدیر نے تمہارے ذمہ ہی لگا چھوڑا ہے تو ٹھیک ہے۔ ایک سودا اور سہی.....“ اتنے میں ہم پر رات والی  
 شفٹ کے خاتمے کے بعد واپس جاتی کسی نرس کی نظر پڑ گئی اور وہ جلدی سے شور مچاتے ہوئے میری بل  
 دوڑی اور جلدی سے میرے برف سے بھرے وجود کو وکیل چیز سمیت دھکیلتی ہوئی اندر راہ داری کی جانب

ن نے یہ بات کسی خاص نقطہ نظر یا طرزِ لیے لہجہ میں نہیں کی تھی۔ میرا مقصد صرف دو مقدس مقامات کے لیے چنے اپنے جذبات کا زاویہ بیان کرنا تھا۔ لیکن گردیوں اُچھلا، جیسے اُسے کسی بچھونے ڈک مار دیا ہو۔ وہ شدید ہ میں بولا۔ ”تو گویا تم مجھے چیلنج کر رہے ہو۔ تم جانتے ہو آج زمانے بھر میں تم لوگوں کی ناکامی اور رسوائی کی بادی وجہ کیا ہے۔ یہی کہ تم لوگ بولتے زیادہ اور عمل کم کرتے ہو۔ لیکن آج میں تمہیں عملی طور پر ایک مظاہرہ ملانا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ تمہیں کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن اور حواس پر میرا تسلط قبول کرنا ہوگا۔“ میں نے حیرت سے گردی کی طرف دیکھا ”لیکن یہ کیسے ہوگا؟“ ”کوئی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ رات کو سونے سے قبل پنے دماغ کو سسٹ چھوڑ دینا اور میرا تصور اپنے ذہن میں تواتر سے دہراتے رہنا۔ جیسے تم مجھے اپنے اعصاب کے ذریعے مدعو کر رہے ہو۔ لیکن یاد رہے کہ تمہیں ٹھیک رات بارہ بجے سو جانا ہوگا۔“ میں نے گردی کو ٹھولا۔ ”کیا تم پھر سے مجھ پرنا ناز کرنا چاہتے ہو، یا پھر ٹیلی پیٹھی کا سہارا لو گے.....“ گردی کچھ جھنجھلا سا گیا۔ ”جنہیں پنے چاہنے والوں کی دعاؤں اور خدا پر اتنا کامل یقین ہو..... انہیں ان پنا نازم یا ٹیلی پیٹھی جیسے معمولی شعبہوں سے نہیں ڈرنا چاہیے.....“ گردی میرے اندر کے ساحر کو جگا چکا تھا۔ اب مزید کسی دلیل یا وضاحت کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ مہمپا کے واپس لوٹنے سے قبل میں اپنے کمرے کی ساری بتیاں بجھا کر بستر پر لیٹ چکا تھا۔ مہمپا نے دھیرے سے کمرے میں جھانکا اور پھر میرا کبل دُور کر کے آہستگی سے پلٹ گئیں۔ میری نظرس گھڑی کی ایکنڈی سوئی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے بارہ کے ہندسے تک پہنچ گئیں۔ میں نے گردی کی ہدایت کے مطابق اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ رکھا تھا اور میری بار بار بند ہوتی پلکوں تلے گردی کی ہیمیدہ وقفے وقفے سے ابھرتی رہی۔ اور پھر ٹھیک بارہ بجے میری مکمل غنودگی سے پہلے میرے ذہن میں گردی کی وہ جیتی آنکھیں بری طرح کلکنے لگیں۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے میں گردی کی آنکھوں ہی سے سارا منظر دیکھ رہا ہوں۔ وہ بہت بڑا سا ہال تھا، جس کی اونچی دیواروں پر درجنوں وسیع روشن دانوں سے برف میں چٹکی چاندنی کی لہروں روشنی اس طرح اندر آ رہی تھی کہ لکڑی کے پتلے تختوں سے بنے فرش پر چوکور نیلی روشنی کے مستطیل ٹکڑوں کے ایک دائرہ سا بن گیا تھا۔ دائرے کے درمیان میں یہودیوں کے مقدس نشان، داؤد کا ستارہ (David Star) بنا ہوا تھا، جس کے گرد دائرے میں گرد سمیت تیرہ لوگ اپنے سر، چہرے اور جسم کو بڑے بڑے کالے فوں سے ڈھکے ہوئے موڈب کھڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چاندی کا پیالہ تھا، جس کی بھیڑ کا خون بھرا ہوا تھا۔ نیچے زمین پر بنے ہوئے ستارے کو میں نے غور سے دیکھا تو وہ باقاعدہ دھات کی تانبائی لہیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ گردی نے دھیرے سے زیر لب عبرانی زبان میں کوئی آیت پڑھی۔ یوں لگتا جیسے وہ سب جس تقریب کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، اُس کا وقت پورا ہونے کو ہے۔ گردی نے عبرانی زبان میں زور زور سے قوم یہود پر مبعوث ہونے والے پیغمبروں کے عبرانی نام دہرا نا شروع کر دیے۔ ”میکا، عاموس، پرمیاہ، جون، یوحنا.....“ پھر سب سے پہلے گردی اور پھر اُس کی تقلید میں باقی سب چند پوشوں نے

ہے۔ ایسے میں جن کے دل دار اُن کے قریب ہستے ہیں، وہ گرم چینیوں کے سامنے بھاپ اُڑاتی کافی کے مگر لیے، کشادہ کھڑکیوں کے کالج سے پرے درختوں کو برف سے بوجھل شاخوں کو بچدے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں تنہا اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر ٹیڑھی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ تب ہی گردی دروازے پر ہلکی سے دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ مہمپا اور پکا کو میں نے آج زبردستی لندن کے مشہور ویچلے تھیٹر میں بہت عرصے سے لگا تار چلنے والا شیکسپیر کا ڈراما میکبث (Macbeth) دیکھنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک زمانے میں پکا لندن کا تھیٹر دیکھنے کے لیے خصوصی طور پر یہاں آیا کرتے تھے، لیکن میری پریشانی کی وجہ سے وہ آج لندن میں موجود ہوتے ہوئے بھی باہر نہیں نکل پارہے تھے۔ گردی نے میرا حال چال پوچھنے کے بعد پھر سے وہی سوال دُہرایا۔ لیکن آج میرے پاس بھی اُس کے لیے ایک سوال موجود تھا۔ ”مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے ہوش میں لوٹ آنے کا واقعہ تمہارے لیے اتنا اہم کیوں ہے۔ ایسے درجنوں واقعات تمہارے آس پاس روزانہ ہوتے ہوں گے، پھر یہی ایک شفا تمہارے لیے معجزہ کیوں بن کر رہ گئی ہے؟“ ”اس لیے کہ میرا علم کہتا تھا کہ تم کبھی اپنے حواس میں واپس نہیں آؤ گے۔ تمہارے علم میں شاید یہ بات نہ ہو، مگر سچ یہ ہے کہ جب تم کوے میں تھے، تب مجھے ڈاکٹر البرٹ نے تمہارے روحانی علاج کے لیے خصوصی طور پر تین مرتبہ آئی سی یو میں بلایا تھا۔ تمہاری بے ہوشی میں بھی ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ اور میں نے گھنٹوں تمہارے سر ہانے تنہا کھڑے ہو کر تمہاری روح میں جھانکنے کی کوشش کی اور ہر مرتبہ مجھے یہی جواب ملا کہ تمہاری واپسی کے تمام راستے بند کر دیئے گئے ہیں۔ یہی بات میں نے تمام عملے کو بھی منتقل کر دی تھی، لیکن انہوں نے باعثِ مصلحت تمہارے والدین سے یہ بات چھپائے رکھی، حالانکہ مجھے بلانے سے پہلے خود ان کی تمام تر جدید طب تمہاری عجیب و غریب بیماری کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی، لیکن ایک ہی رات میں یہ ساری کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔ میں ابھی تک شدید حیرت کا شکار ہوں۔“ میں غور سے گردی کو دیکھتا رہا۔ بظاہر سیدھا سا دانت پر آنے والا شخص اندر سے کتنا گہرا تھا، اس کا اندازہ لگانا میرے لیے بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا، لیکن ایک بات تو طے تھی کہ خود اُس کے پاس بھی کوئی ایسا علم ضرور تھا، جو اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ میں نے اس بار اُسے تفصیل سے پانی کے جہاز، کاسا بلانکا، میں حبیب البشر صاحب سے ہونے والی ملاقات سے لے کر دس ڈی انچ کے دن پہلی بار کچھ دیر کے لیے اپنے حواس میں آنے تک کے تمام واقعات سنا دیے۔ گردی کی آنکھوں میں کبھی حیرت، کبھی بے چینی اور کبھی بے یقینی کی لہریں وقفے وقفے سے جنم لیتی رہیں۔ شاید کہیں بہت گہرائی میں اپنے اندر خود کو یقین دلانے میں اُسے بہت مشکل ہو رہی تھی۔ میری بات ختم ہونے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ ”تمہاری کہانی میں اب بھی بہت سی باتیں میرے لیے وضاحت طلب ہیں، لیکن میرے پاس یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔ کیوں کہ ایک بات تو طے ہے کہ تم کچھ خاص ہو۔“ میں مسکرایا۔ ”میں تمہاری بے چینی کی وجہ سمجھ سکتا ہوں۔ اگر یہی دُعا کوئی میرے لیے یروٹلم میں مانگتا تو شاید تم اتنے بے یقین نہ ہوتے.....“ حالانکہ

اپنے اپنے پیالے کا خون زمین میں کھدے آہنی داؤدی ستارے کے بالائی کونے میں اُٹھیل دیا۔ خون تیزی سے چھ کونوں کی جانب یوں دوڑا کہ ترتیب وار پہلے کونے سے دوسرا کونا، پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔ مجھے احساس ہوا کہ زمین میں ستارہ کھود کر اُس میں چکنا فولاد اس طرح بھر گیا ہے کہ کسی بھی سیال مادے کو بہنے میں کوئی وقت نہ ہو۔ اور ستارے کو خاص طور پر اس طرح ڈھلان کی ایک سمت دی گئی ہے کہ اس کی ہموار فولادی نالیوں میں اُٹھا جانے والا مائع پہلے کونے سے ہوتا ہوا ترتیب وار اور یکے بعد دیگرے باقی پانچ کونوں تک یوں بہتا ہے کہ چھٹا کونا چھوٹے ہی داؤدی ستارہ مکمل ہو جائے۔ لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ نالیوں میں بہایا جانے والا خون رُک رُک کر آگے بڑھ رہا تھا، جیسے کوئی اُن دیکھی رُکاوٹ اس کی راہ میں مزاحم ہو۔ سب ہی ہنر پوشوں نے بے چینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے گرد کو اس مزاحمت کی وجہ سمجھ آ گئی۔ اُس نے زیر لب کچھ پڑھ کر ایک جھٹکے سے آنکھیں بند کر لیں اور ٹھیک اُسی لمحے میرے ذہن کے چلتی وہ فلم بھی ایکن دم یوں غائب ہو گئی، جیسے کسی سینما کی اسکرین پر ریل کا فینٹوٹ جانے سے سب کچھ ہل بھر میں مٹ جاتا ہے۔ با کسی ٹی وی کا پردہ بجلی جانے سے ایک چمک کے بعد سیاہ پڑ جاتا ہے۔ گرد کی آنکھیں بند ہوتے ہی کھٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر ہوتی طرف باری اور شدید ٹھنڈ کے باوجود میرا جسم پسینے سے تر تھا۔ کچھ دیر تو مجھے کچھ ہی نہیں آیا کہ میں پہلے عالم خواب میں تھا یا اب کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟ باہر گرتی برف کے گالوں کا حجم اور ان کی رفتار، دونوں ہی زیادتی کی جانب مائل تھے۔ بارش کے موسم اور برف باری میں بھی ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔ بارش بے صبری ہوتی ہے، چیختی چلاتی، شور مچاتی، سارے آنگن کو سر پر اٹھا لینے والی، جب کہ برف صابر ہوتی ہے، خاموشی اور سکون سے برسنے والی۔ ایک سکوت سا طاری کر کے مہبوت کر دینے والی..... مجھے اس لمحے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ بارش اگر ”عاشق“ ہے تو برف ”معشوق“..... کہ دونوں کا مزاج خود اُن کی وجہ بندی کا آئینہ ہے۔ رفتہ رفتہ صبح کا سپیدہ نمودار ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرے کمرے کی کھڑکی کے شیشوں پر کوئی تازہ سفید قلعی پھیر گیا ہو۔ مہاپا سے پہلے ایسی نے میرے کمرے میں جھانکا۔ ”لندن کی خوبصورت پرلٹا صبح بخیر.....“ میں مسکرایا۔ ”ڈاکٹر البرٹ جانتے ہیں کہ مسیحا گری کی ابتدا خوبصورت لفظوں اور ایک بھرپور مسکراہٹ سے ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے انہوں نے ٹیم بھی خوب چنی ہے۔“ ایسی بھی ہنس دی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہے، لیکن پہلے مہم پرپا اور پھر ڈاکٹر البرٹ کی آمد نے اُس کا مقصد پورا نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر البرٹ نے میرے معائنے کے بعد اطمینان سے سر ہلایا۔ ”بہترین..... لگتا ہے تم نے بہت جلد ہمیں الوداع کہنے کی تیاری کر رکھی ہے نوجوان.....! سے جاہل رکھو۔“ ایسی وہاں کچھ دیر مزید رکنا چاہتی تھی، لیکن البرٹ نے کمرے سے نکلنے وقت کچھ کام بتائے، مجبوراً اُسے بھی ڈاکٹر کے ساتھ ہی وہاں سے جانا پڑا۔ انہیں نکلے ہوئے ابھی دو منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ گردانے مخصوص طبعے میں کمرے میں داخل ہوا۔ مہم کی تیوریاں چڑھنے سے پہلے ہی میں نے چپا کو نظروں نظروں میں

دوسرے کمرے میں لے جانے کی درخواست کی۔ پپانے مسکرا کر پاپ کا ایک بھرپور کش لیا اور کسی سے مہم کا وہاں سے لے کر اٹھ گئے۔ گرد نے بات جوڑنے میں دیر نہیں کی۔ ”کیا مجھے گزشتہ رات کی اذہرانے کی ضرورت ہے، یا ہم اگلی بات کریں؟“ تو گویا رات میں نے جو کچھ بھی دیکھا، وہ خواب نہیں رہا کوئی شعبہ تھا۔ اس لمحے مجھے شدت سے سلطان بابا کی یاد آئی۔ اگر وہ مہینوں میری اتنی سخت تربیت نہ دے تو آج میں گرد کے اس پہلے حملے ہی میں چاروں خانے چت ہو چکا ہوتا، لیکن میں یا قوت سے لے کر تیک جانے ایسی کتنی انہوئیاں جھیل چکا تھا۔ اطمینان سے تنکے سے فیک لگا کر گرد کو دیکھتا رہا۔..... میں نے رات کو وہ سب کچھ دیکھا، جو تم مجھے دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ تم چابک چلتی ہوئی فلم کی ریل کیوں کاٹ دی؟“ اب چونکے کر باری گرد کی تھی۔ ”گویا تم سمجھ گئے تھے کہ نے جان بوجھ کر تم سے اپنا ذہنی رابطہ ختم کر دیا تھا۔ دراصل تمہاری وہاں موجودگی سے ہماری عبادت میں اڑ رہا تھا،“ لیکن میں تو یہیں تھا..... اپنے کمرے میں.....“ گرد مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ ”اس کمرے میں تمہارا جسم موجود تھا، لیکن تم اتنے خطرناک ہو کہ تمہاری صرف میرے ذہن میں موجودگی بھی ہماری ت میں رُکاوٹ کا باعث بن رہی تھی۔ اسی لیے مجھے تم سے رابطہ توڑنا پڑا۔“ گرد نے مجھے بتایا کہ رات جو میں نے اپنے ذہن کے پردے پر چلتے ہوئے دیکھی، اُسے قدیم عبرانی زبان میں ”مقدس بہاؤ“ اور بڑی میں ”پورا دور“ (Pour over) کہتے ہیں۔ صدیوں پہلے قوم یہود کے تیرہ معزز خاندانوں کے ابو بھڑکی مقدس قربانی کے بعد تبرک کے طور پر بھڑکا خون سات دن تک اپنے گھر کے دروازے پر لگا کر نہ تھے اور پھر ساتویں دن ایک بہت بڑے جشن کی صورت میں اس رسم کا خاتمہ ہوتا تھا۔ بقول گرد قدامت یہودیوں میں یہ رسم اب بھی کسی نہ کسی صورت موجود تھی۔ اور کل رات میں نے جو منظر دیکھا، وہ دراصل اُن دن کے خاتمے پر اُسی پورا دور کی رسم کی اختتامی تقریب تھی۔ جس وقت گرد سرگوشی میں مجھے یہ ساری بات بتا رہا تھا، جب ایسی نے دوبارہ قفوں سے میرے کمرے میں جھانکا اور نظروں نظروں میں کسی ناراض ل کی طرح ڈانٹا کہ میں اُس کے منع کرنے کے باوجود، کیوں اس شخص کے ساتھ دوبارہ بات کر رہا ماہوہ ماسے بہت چھوٹی تھی، لیکن نہ جانے کیوں اس لمحے مجھے اُس میں مہمائی کی جھلک دکھائی دی۔ شاید ”اے بزرگیت“ سب ہی جگہ یکساں ہوتی ہے۔ اب میں ایسی کو کیا بتاتا کہ اسکول اور کالج میں بھی مجھے ہمیشہ سے زیادہ تجسس اور بات کرنے کی خواہش اُسی نیچے سے ہوتی، جس سے بات کرنے یا کھیلنے سے مجھے مہم اُٹھ کر تھیں۔ لیکن ایسی کو مجھے باقاعدہ ڈانٹنے کا موقع نہ پہنچا۔ بعد ہی مل سکا۔ جب مہم اور پپا لے کے لیے نیچے جا چکے تھے۔ ”لو کہ..... میں نے تمہیں منع کیا تھا، اس گرد کے ساتھ بات کرنے سے“ مجھے اُس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ”آخر آپ اُس شخص سے اس قدر خفا کیوں ہیں؟ بظاہر تو مجھے وہ کافی مالکھا اور شائستہ اطوار کا دکھتا ہے.....“ ایسی کو غصہ آ گیا۔ ”اس کا یہی علم نہ جانے کتنے گھروں کے بچوں کی

## 21 دسمبر 2012ء

زندگی برباد کر چکا ہے۔ میں ڈرتی ہوں، کہیں وہ اپنا سحر تم پر بھی نہ آ رہا بیٹھے.....“ گویا ایسی کو بھی گرد کے کلاں کی کچھ خبر تھی۔ اُس نے جلدی میں مجھے بتایا کہ آج کل لندن کے اعلیٰ طبقے میں گرد کا کافی اثر دوسوں سے ہے۔ اس نے ایک بہت مہنگے علاقے میں اپنا نروانا ہاؤس (Nirvana House) بھی بنا رکھا ہے، جہاں وہ ہر ہفتہ اپنے درجنوں پیروکاروں کو سکون حاصل کرنے کے گرتاتا ہے۔ ان ہی نوجوان شیدائیوں میں ایسی کا اپنا ہاؤس پٹیر بھی شامل تھا، جو بقول ایسی گرد سے ملنے کے بعد باقاعدہ اُس کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔ اور اپنا گھریا چھوڑ کر اب سارا دن گرد کی خدمت ہی میں لگا رہتا تھا۔ ایسی مجھے ابھی اتنا ہی بتا پائی تھی کہ باہر کی راہ داری کے ابھرنے کسی ایمر جنسی کے لیے ایسی کا نام پکارا جانے لگا۔ ایسی کو جلدی میں جانا پڑا۔ باہر سہ پہر تک تھکی برف باری بار سے ہلکے گالوں کی صورت آغاز کی تیاری کر رہی تھی۔ گرد جاتے وقت مجھے شام 5 بجے نیچے نہر کی جانب آنے کا کہہ کر گیا تھا، لیکن مجھے اپنی مددگار نرس کو منانے میں بہت دیر لگی کہ وہ مجھے کچھ دیر کے لیے کھلی ہوا میں لے جائے۔ میں نیچے پہنچا تو مجھے دُور سے گرد اپنے لیے جوتوں سمیت برف کے میدان میں لیے لیے ڈگ بھرتا ہوا جانب آتے نظر آیا۔ اُس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت دیر سے برف میں کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ نرس کچھ قائلہ پر زک گئی۔ گرد نے میرے قریب پہنچ کر میری دھکیل چیر پر اپنی چھتری تان لی۔ ”اچھا ہوا تم آگئے۔ میرا تم وعدہ تھا کہ میں تمہیں ایک ایسا راز بتاؤں گا، جسے پانے کے لیے دنیا صدیوں سے انتظار کر رہی ہے۔“ میں نے اپنی پلک پر برف کے ایک موٹے گالے کی غمی محسوس کی۔ ”میں سننے کے لیے تیار ہوں.....“ گرد نے عجب سے لہجے میں سرگوشی کی۔ ”تو پھر سنو..... میں جانتا ہوں کہ وہ دن، جسے تم مسلمان روزِ حساب کہتے ہو.....“ جس ”قیامت“ کا انتظار یہ زمانہ ازل سے کر رہا ہے..... مجھے خبر ہے کہ وہ ”قیامت“ کب آئے گی.....؟“

میں گرد سے باقی کسی بھی بات کی توقع کر سکتا تھا لیکن اُس نے قیامت کا ذکر چھیڑ کر مجھے چونکا ہی دیا کیا مطلب.....؟“ ”مطلب یہ کہ میں تمہیں قیامت کی صحیح تاریخ بتا سکتا ہوں، کیوں کہ میرے حساب سے قیامت آنے کی تمام نشانیاں ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔“ برف ہمارے چاروں طرف بجے بجے قلعے کی فصیلیں کھڑی رہی تھی۔ سرد ہوانے میرے جسم کو کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ ”تم کن نشانیوں کی بات کر رہے ہو؟“ ”لا تعداد نیاں ہیں۔ جن میں سے بیشتر کا ذکر ایک ذہین نجوی ماسٹر آف میس، صدیوں قبل کر چکا ہے مثلاً چار فولادی ندوں کا عظمت کے دو میناروں سے ٹکرانا (ٹائن الیون)، یہودیوں کو اپنی مادر ملت (اسرائیل) کا واپس ملنا، ری دنیا پر یہود کا قبضہ ہونا (ڈالر اور بینک سودی نظام) وغیرہ وغیرہ۔ اب بس ایک آخری نشانی باقی ہے۔ لیم دجال کی آمد اور یہود کی آخری فتح اور میرے عمل کے مطابق یہ سمندروں میں بہت پہلے ہو چکی ہے۔ اب رف لدگشت کے مقام پر اُن کا ظہور باقی ہے اور پھر قیامت اُٹل ہے.....“ میں گم سم سا گرد کی یہ ساری بحث نہا۔ اب مجھے ایسی کے کہے ہوئے لفظ ”مسیہونی“ کی اصل تشریح سمجھ آ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار جبل میں سلطان بابا نے بھی قیامت کے آثار اور اُس کی واضح نشانیوں کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا تھا۔ بن ہمارے عقیدے کے مطابق ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور باقی تھا اور گرد جس فتح کو یہود کی آخری اُتار رہا تھا وہ دراصل ہمارے ایمان کی فتح کا وقت تھا۔ مجھے اس لمحے اُس آخری لڑائی کا نام بھی یاد آ گیا جسے ”دو آرمیڈون“ (Armageddon) کے نام سے یاد کرتے تھے اور جس میں ایک فوج کے اسی (جھنڈے) بتائے جاتے تھے۔ برف باری تیز ہو چکی تھی اور گرد کا پورا جسم برف سے ڈھک چکا تھا۔ اُس نے مجھ پر تانی ہوئی چھتری کو زور سے جھٹکا، جو برف کے بوجھ کی وجہ سے تقریباً چھٹنے ہی والی تھی۔ چھتری ہٹنے اور برف کے موٹے گالوں نے میرے بالوں میں چاندی بھردی۔ میں نے غور سے گرد کی چھیتی آنکھوں میں مانکا۔ ”کیا ہے وہ تاریخ؟“ گرد دریائے ٹیز سے بھی پرے خلا میں برستی برف کے ستاروں کے پار کسی اُن لمبی مخلوق کو دیکھتے ہوئے بولا ”21 دسمبر 2012“ کیا۔ اتنی جلدی؟ یعنی صرف تین سال بعد، ”ہاں میرا علم لیا کہتا ہے۔ اور یہی وہ پیغام ہے جو میں اپنے سب ہی چاہنے والوں میں عام کر رہا ہوں کہ آنے والے وقت کی تیاری کو لو، وقت بہت کم ہے۔“ گرد واپس پلٹا اور ٹخنوں سے ذرا اونچی پڑی برف میں اپنے قدموں کے نشان بنا تا برف کی دُھند میں کہیں عائب ہو گیا، لیکن میرے وجود کے اندر جو دُھند چھوڑ گیا تھا، وہ اس باہر کے



کبرے سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

مجھے اُس لمحے سلطان بابا کی شدت سے یاد آئی۔ ساری رات یہی سوچتے ہوئے گزرنی کہ یہ نئی جنگ اُن کے بنائیں کیسے لڑاؤں گا۔ پھر نہ جانے کس پہر کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگی تو نیند میں بھی میرے خوابوں کو اس گہری سفید دُھند نے ڈھانپ رکھا تھا اور پھر اچانک اسی دُھند میں سے دُودھیا سفید لباس پہنے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے لبوں پر وہی اپنی ازلی اور مخصوص مسکراہٹ سجائے سلطان بابا نمودار ہوتے چلے گئے۔ ”کیوں میاں! پھر اُلجھا بیٹھے اپنے دھاگے کہیں.....؟“ مجھے شدید حیرانی کے ساتھ بے پایاں خوشی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ ”آپ کہاں رہ گئے تھے مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر۔ آپ جانتے ہیں ایک قدم بھی آپ کے بنا اٹھنا دو بھر ہو جاتا ہے میرا.....؟“ وہ میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ”موجودگی صرف جسمانی ہی تو نہیں ہوتی۔ اور پھر اب تمہاری تربیت مکمل ہونے کو ہے۔ اب تمہیں تنہا فیصلے کرنے کی عادت ڈالنا ہوگی ساڑھ میاں.....“ میں شدید پریشان ہو کر بولا ”آپ آج یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں کیا آپ کہیں جا رہے ہیں.....؟“ ”سب ہی کو جانا ہے، کوئی پہلے اور کوئی بعد میں۔ سب ہی اسی رستے کے مسافر ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ جانے والوں کے ساتھ کاروبار زندگی رُک نہیں جاتا اور پھر جب جسم دُور ہو جائیں تو رُوحیں مزید قریب ہو جاتی ہیں۔ عبداللہ کو خود کو سلطان کا جانشین ثابت کرنا ہوگا۔ جیتے رہو۔“ سلطان بابا نہ جانے اچانک ہی اُس دُھند میں کہاں کھو گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔ یہ کیسا خواب تھا۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پسیلیوں کا کمرور بجنے تو ذکر باہر نکل آئے گا۔ فجر کا وقت ہو رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ میری یادداشت میں دریائے یئمز یا دیسٹ منسٹر ہل کے علاقے میں کوئی بہت بڑی مسجد نہیں آرہی تھی، لیکن میرے کانوں میں اذان کی واضح آواز پہنچ رہی تھی۔ بے خیالی میں ویل چیر کے بجائے بستر کے قریب رکھی اسٹیل کی بیساکھیاں تھام کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کا خیال سایا ہوا تھا۔ بہت دیر بعد مجھے خیال آیا کہ میرے بے جان قدم اور مفلوج ٹانگیں آج میرا بوجھ سنبھالنے کے قابل ہو چکی ہیں۔ چاہے بیساکھی کا سہارا اب بھی درکار تھا، مگر یہ بیساکھیاں ڈاکٹر البرٹ نے دو روز قبل صرف ناپ لینے کے لیے منگوائی تھیں اور اُن کی تشخیص کے مطابق مجھے ابھی اپنے قدموں پر بوجھ ڈالنے کے لیے مزید کئی ہفتے درکار تھے۔ بقول ایملی، جب اُس نے البرٹ کو صبح کے معائنے سے قبل اُن کے دفتر میں یہ خبر سنائی تو اُن کے ہاتھ میں پکڑا شیٹہ گر گیا اور وہ بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں پہنچ گئے۔ ”کیا تم نے ہمیں مستقل حیرت زدہ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے نوجوان.....؟“ ڈاکٹر البرٹ بہت دیر تک اپنی ٹیم کے ساتھ میرے مختلف ٹیسٹ اور معائنے کرتے رہے۔ ”نا قابل یقین..... اگر یہ صرف قوت ارادی کا کمال ہے تو پھر مجھے کہنا پڑے گا کہ تم آہن سے بھی کہیں بڑھ کر مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔“ ممپا بھی بے حد خوش تھے۔ لیکن میرا دھیان ابھی تک رات والے خواب میں اُلجھا ہوا تھا۔ دل بار بار ڈوبا جاتا تھا لہذا ڈاکٹروں کے جاتے ہی میں نے اپنے سامنے بابا

ار کے ہسپتال کا نمبر ملانے کا کہا، جہاں سلطان بابا داخل تھے۔ وہاں کے بڑے ڈاکٹر کی بات سن کر میرا ہانک گیا۔ انہوں نے بتایا کہ کل رات سلطان بابا کی طبیعت بہت خراب ہوئے لگی تو انہیں مصنوعی کے لیے آکسیجن پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کسی طرح اُڑ کر وہاں اپنے شہر پہنچ سکوں۔ مجھے سلطان بابا نے ہمیشہ یہی سبق دیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ فانی یہ انسانی جسم ہی ہوتا ہے اور فانی ہی اصل زندگی کی ابتدا ہے۔ لیکن ہم انسانوں کو ازل سے اب تک اسی فانی جسم کی محبت ہی میں مبتلا رہے۔ ہم اس کی جدائی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے، پھر چاہے وہ جسم ہمارا اپنا ہو یا پھر ہمارے کسی فانی..... سب کچھ جانتے ہوئے بھی کسی کو کھود دینے کا احساس ہی ہماری سانسیں گھونٹنا شروع کر دیتا ہے۔ زندگی بھر جی کر بھی جینے کا ظرف تو خود میں پیدا کر نہیں پاتا، تو پھر ایک ”اجنبی موت“ کو گلے لگانے کا کہاں سے لائے گا۔ مجھے جب ڈاکٹر البرٹ نے یہ بتایا کہ فی الحال میں ہوائی سفر کے قابل نہیں تو مجھے بے بسی پر شدید غصہ آیا اور چند لمحوں کے لیے جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ دراصل ہمارا یہ جسم خود ہماری راہ ب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ میں اسی خیال میں بیساکھیاں ٹیکتا شیٹے کی چھت اور شفاف دیواروں والی اوداری میں نکل آیا، جو ایک لمبی سی سرنگ یا ٹیوب کی مانند بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کی دیواروں پر ایک جانب بہت سے زرد رنگ کے پلاسٹک کے بیج نما تختے درجنوں کی تعداد میں جڑے ہوئے تھے۔ ہسپتال کے مریض باہر موسم کی دست برد سے محفوظ رہتے ہوئے تختوں پر بیٹھ کر باہر ہوتی بارش، برف یا دلوں کی دھوپ کا مزہ لے سکتے تھے لیکن اس وقت شیٹے کی چھت اور کاٹچ کی دیواروں کے پرے کا ہر منظر

میا تھا۔

تب ہی میری نظر سامنے سے آتے گرد پر پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ”میں اب ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ تو تم نے ایک بار پھر یہاں سب کو چونکا ہی دیا۔ تمہارے اندر جو بھی چھپا ہے۔ اُسے ساتھ ہی سب پر ظاہر کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ کیل کیوں کھیل رہے ہو؟“ گرد کا فانی غصے میں لگ رہا تھا۔ نہ نے اُس نے اپنے اندر یہ رقابت کیوں پال رکھی تھی۔ لیکن آج میں پہلے ہی سلطان بابا کی وجہ سے شدید ذہنی ڈاکٹر کا تھا لہذا بہتر یہی سمجھا تھا کہ اُسے کوئی جواب دیئے بنائی آگے بڑھ جاؤں۔ لیکن دو قدم ہی آگے مارتا کہ پیچھے سے گرد کی آواز نے پھر میرے قدم جکڑ لیے۔ ”کیوں خود پر سے بھر دوسا اٹھ گیا ہے یا پھر اپنے اعلیٰ استاد کی ناکامی کا ڈر ہے.....؟“ مجھے یوں لگا جیسے عبداللہ کے وجود کا ہر بند کو اڑتوڑتے ہوئے ساحر باہر لڑکر گرد کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی بلند ہوتی آواز کو دھیمار کھنے کی کوشش کی۔ ”تم میں اور مجھ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ تم جسے شعلہ سمجھتے ہو، وہ میرے لیے ایک مجرہ ہے۔ تم جس ہنر اُٹھانے کے لیے جانے کتنی صدیوں سے سرگرداں ہو میرے نزدیک وہ دعا کی صورت مل بھر میں قبول ہو سکتا ہے۔ بات صرف یقین کی ہے۔ اٹل یقین..... لیکن افسوس تم نے سب کچھ کیجھ کر بھی یقین کرنا نہیں سیکھا.....“

ہذا پارک میں تقریباً روزانہ ہی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔ کوئی دنیا سے مشینوں کے خاتمے کا جارہا ہے تو کسی کو چاند پر کچنے والے پلانٹوں سے اختلاف تھا، کوئی ہم جنس پرستوں کا پیشوا تھا تو کوئی بنیاد سے ویزا پابندی کے خاتمے کے لیے بھوک ہڑتال کیے بیٹھا رہتا تھا۔ ایسے میں گروا گر کھلے عام اپنے کارپرجار کر رہا تھا تو یہ کوئی انہونی نہ تھی۔ میں نے تو لندن میں ایسے گروہ بھی دیکھے تھے جو حکومت ملائیہ اجتماعی خودکشی کو جائز قرار دینے کے لیے قانونی جنگ شروع کرنے کی تیاری میں تھے۔ اس لحاظ ان کے معاشرے میں گرو کی ”تعلیمات“ کو خاصی عزت کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو بھی کمی نہ تھی۔ ایک طبقہ ایسا بھی تھا، جس نے گرو کو باقاعدہ ”روحانی دیوتا“ کا درجہ دے رکھا تھا اور انہی سرپھروں میں ایکی اجماعی پیئر بھی شامل تھا۔

اگر گرتی برف کے گالے بڑے ہو گئے تھے اور ایسے میں اگر کوئی دور سے مجھے اور گرو کو اس شیشے کی ایوب میں کھڑا دیکھتا تو اُسے یہ جھگمگاتی بقتہ نور بنی راہ داری بالکل ایسے ہی دکھائی دیتی، جیسے برف سے دھیا سمندر میں روشنیوں سے بھرا کوئی لشکارہ تیر رہا ہو۔ راہ داری کی اندرونی حدت کی وجہ سے شیشے کی ل اور بیضوی چھت پر برف جم نہیں پاری تھی اور مستقل پگھل کر یوں بہ رہی تھی، جیسے ہم کسی شیشے کے لی بند گھر سے دریا میں ڈوب رہے ہوں۔ اسنے میں اچانک اسپیکر پر ڈاکٹر البرٹ کی آواز گونجی۔ وہ گرو کو راضی کی درخواست پر زبکی کے لیے خصوصی کرہ نمبر 137 میں طلب کر رہے تھے، کیوں کہ یہ گرو کے کے دورے کے مخصوص اوقات تھے۔ سو، اُس نے ایک لمبی سی سانس لی۔ ”مجھے تمہارے جواب کا رہے گا۔ مجھے اُمید ہے تم اس سچ کے سفر میں میرا ساتھ دینے سے انکار نہیں کرو گے۔“ وہ اپنی بات ختم، لے لے بے ڈگ بھرتا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ شام تک میرا ذہن گرو کی شخصیت کی بھول بھلیوں میں الجھا رہا۔ اسے اس بار قدرت کو میرا کون سا امتحان مقصود تھا۔ مجھے اپنی کوئی پروا نہیں تھی، لیکن میں اس اجنبی دیس پنے والدین کو مزید کسی نئی اُٹھن میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ پہلے ہی وہ دونوں میری وجہ سے انتہائی پریشان نامیرے چا۔ پنے اور نہ چاہنے سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے کاتب تقدیر نے قسمت کی سیاہی کچھ زیادہ گاڑھی بنا ڈالی تھی۔ شام ہوتے ہی زہرا کی یاد کا پھندا پھر سے میری شہ رگ ٹانگے کے لیے اپنے بل کے لگا۔ ہمارے تھکے ہوئے بے دم پھیپھڑے اپنا پورا زور لگا کر کرتازہ ہوا کی ایک پنے اندر اُتارنے کے لیے بے تابی سے پھڑ پھڑاتے ہیں لیکن عشق کی ڈالی ہوئی خاک ہمارے سانس کا نام راستے پہلے ہی مسدود کر چکی ہوتی ہے۔ ایسے میں انسان جتنا بے چین ہو کر میاں رگڑتا ہے، اتنی اُسے اذیت ہوتی ہے۔ جان رُک رُک کر ٹپکتی ہے۔ ایسے میں فدا ہونے کا بہترین کلیہ یہی ہے کہ لے لے کر اور دم کھینچنے کی ہر کوشش ترک کر دی جائے اور محبت کو اپنی رگوں سے زندگی کی نچوڑ کی اجازت دے لے۔ سو میں نے بھی زہرا کی یاد کے پھندے کو اپنی شہ رگ کے ساتھ بے حد مضبوطی سے لپٹنے دیا۔ شاید

اور شاید اسی لیے تم اس قدر خوف زدہ ہو.....“ گرو میری بات سن کر دھیرے سے مسکرایا ”نہیں..... میں سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں نے ابدیت کا راز پایا ہے۔ پھر مجھے بھلا کیا خوف؟ ڈرنے کی ضرورت تو جیسوں کو ہے، جنہیں آنے والے خطرے کا ادراک ہوتے ہوئے بھی کیوٹر کی طرح آنکھیں موند لیتے عادت ہے۔“ میں نے غور سے گرو کی طرف دیکھا۔ ”مجھے صاف صاف کہو تم چاہتے کیا ہو.....؟“ گرو چہرے کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ”میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی شخصیت کے گرد لپٹے یہ سارے قدر اُتار دو۔ پہلے پہل تو میں واقعی تمہیں کوئی چھوٹا موٹا شعبہ باز ہی سمجھا تھا لیکن اُس رات عبادت کے دوران جب تم نے ہم سب کا ارتقا توڑنے کی کوشش کی، تب مجھے سنجیدگی سے تمہارے بارے میں سوچنا پڑا۔ تم واقعی اُس ابدی راہ کے مسافر ہو تو مجھ سے نہ چھوڑو۔ میں تمہیں منزل تک پہنچانے کا وعدہ کرتا ہوں۔“ گرو باتیں حسب معمول اُس کی شخصیت کی طرح ابھی ہوئی تھیں لیکن آج میں نے اُسے ٹٹولنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ ”اور اس ابدی منزل کو پانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ظاہر ہے تم یہ سب کسی صلے کی اُمید میں کرو گے۔“ گرو مجھے راستے پر آتا دیکھ کر مطمئن سا ہو گیا۔ ”تمہاری ذہانت پر مجھے پہلے بھی کوئی شبہ نہیں تھا لیکن بے فکر ہو، مجھے تم سے کوئی دنیاوی صلہ نہیں چاہیے، میرا مقصد مقدس ترین ہے۔ دراصل ہمارا مشن ہی اعلیٰ دماغوں کو اپنے ساتھ شامل کرنا ہے اور پھر تم تو یوں بھی میرے لیے بہت قیمتی ہو، کیوں کہ تمہارے ہاں دوسروں سے کچھ سوا ہے۔ تم اگر میرے دائرے میں شامل ہو جاؤ تو میں تم سے ابدی سکون کا وعدہ کرتا ہوں وہی ابدی سکون جس کی تلاش میں دنیا کا ہر ذی روح ازل سے بھٹک رہا ہے اور ابد تک سرگرداں ہی رہے گا بولو منظور ہے میری پیش کش.....؟“ گرو اُمید طلب نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اب میری سمجھ بات کچھ کچھ آنے لگی تھی۔ گرو چاہتا تھا کہ میں اُس کے گروہ میں شامل ہو کر اُس کے نظریے کا پرچار کر دوں میری دن بدن تیزی سے بہتر ہوتی حالت کو وہ اب بھی میرے کسی خاص علم یا شعبہ سے محمول کر رہا تھا۔ مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ گرو اپنی رہائش گاہ ہی پر باقاعدہ ایسی محافل کا انعقاد کر داتا تھا، جہاں اُس کی شخصیت اور تعلیمات سے متاثر طبقہ حاضر ہو کر وہ صرف اُسے سنتا اور سراہتا بلکہ اس کے گروہ کے رُکن باقاعدگی سے گرو کی روحانی تعلیمات کا پرچار بھی کرتے اور لوگوں کو اپنی جماعت میں شمولیت کی دعوت بھی دیتے تھے۔ اگر لیے گرو کے فدائین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، لیکن گروہ کا اصل نظریہ آخر کیا تھا؟ یہ بات ابھی تک میرے لیے ایک معماری ہی تھی۔ اتنا تو میں جان چکا تھا کہ اُسے کامل یقین تھا کہ 21 دسمبر 2012ء کو قیامت ہونے والی ہے اور بظاہر وہ اپنی تعلیمات کے ذریعے اُس پاس کے لوگوں اور خاص طور پر نوجوان نسل کو آنے والے وقت کے لیے تیاری کا سبق دیتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک زاویے سے بہت آسان اور سادہ دکھائی دینے والی گرو کی یہ مہم بے حد پیچیدہ اور پُر اسرار دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں مغرب کو لوگوں کو اپنے نظریات کے پرچار کی کھلی آزادی تھی تاوقتیکہ کسی کا نظریہ ریاست کے قوانین سے نہ ٹکرائے، اس لیے لندن

لو اپنی اوقات سکھانے کا سبق۔ میرے بس میں ہوتا تو میں دنیا کے تمام انسانوں کو ایک مرتبہ کچھ روز کے لیے بسا کیوں کے سہارے چلانا لازمی قرار دے دیتا، تاکہ یہ کمزور حافظے والی مخلوق جب کبھی اکثر اس زمین پر چلنے کی کوشش کرتی تو اسے اُس کی حیثیت یاد دلائی جاسکتی۔

آج لندن میں بہت دنوں بعد کچھ دیر کے لیے شام کا سورج جھلکا تھا۔ زمین پر جب سورج کی شریر کرنیں چھم سے گرتیں تو کچھ دیر کے لیے برف بھی گدگدائی جاتی اور روشنی کی ایک خیرہ کن چمک سے آنکھیں بندھی جاتی تھیں۔ ہسپتال کے مرکزی احاطے میں کسی نے برف سے مدد میری کا مجسمہ تراشا ہوا تھا، پاس ہی برف میں راستہ بنانے والی مشین کی اینٹوں والی روش سے برف ہٹا رہی تھی۔ تب ہی مجھے ایسی ایک سترہ، اٹھارہ سالہ لڑکے کے ساتھ اپنی جانب بڑھتی نظر آئی۔ لڑکے کی حالت کافی ابتر دکھائی دے رہی تھی اور وہ مارے راستے ایسی سے کسی بات پر الجھتا ہوا بڑھا چلا آ رہا تھا۔ ایسی نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور قریب پہنچ کر تعارفی کلمات کہے۔ ”پیٹر..... یہ ہے عبداللہ..... تمہارا بڑا بھائی۔“ پیٹر نے بے دلی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ”ہیلو بڑے بھائی! مجھے تمہارا نام پسند آیا۔“ میں مسکرایا۔ ”تمہیں پسند ہے تو تم بھی رکھ لو۔“ پیٹر عبداللہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ پیٹر ہنس دیا۔ ”میں نے سنا تھا کہ مشرق بڑا بخشنے والا ہے، آج دیکھ بھی لیا“ میں نے بات جوڑی ”ہاں..... اگر سخاوت صرف نام بانٹنے سے ہی پوری ہو جاتی ہو تو مجھ جیسے بخیل بھی بخشنے ہو جاتے ہیں۔“ اس بار پیٹر اپنے قبضے کو روک نہیں پایا۔ ایسی نے شاید بڑے عرصے بعد اپنے ماں جانے کے ہونٹوں پر یہ جادو دیکھا تھا۔ وہ رو پڑی۔ پیٹر نے شکوہ کیا۔ ”دیکھو نا! میں روؤں تو یہ روتی ہے اور میں ہنسوں تو مزید رو پڑتی ہے۔ اس کا علاج کیا جائے۔“ میں خاموشی سے کھڑا بہن بھائی کی یہ اموں کھراستار ہا۔ پھر پیٹر مجھ سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے پلٹ گیا۔ جاتے جاتے اُس نے ایسی سے کہا کہ وہ رات دیر سے گھر لوٹے گا، کیوں کہ اُسے کسی خاص تقریب میں جانا ہے۔ ایسی کی بڑبڑاہٹ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ خاص تقریب ضرور گرو سے متعلق تھی۔ ایسی کو رخصت کر کے میں پلٹا ہی تھا کہ مجھے گرو اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ ”پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟“ ”میں نے تمہاری پیش کش پر کافی غور کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل مجھے تمہارا پیغام سن لینا چاہیے۔ تو کیا تم آج رات مجھے اپنی عبادت کی تقریب میں مدعو کر سکتے ہو؟“ گرو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میرا مقدر یہی یادوں کی امرتیل تھی، کیوں کہ جس کی ذات سے ان یادوں کی ڈور بندھی تھی، وہ تو نہ جانے کب جا چھپی تھی۔ دوسرے محبت کا آئینہ ہوتے ہیں، میری چاہت بھی انہی دوسروں کے عکس کا شکار ہو رہی تھی۔ کہتا ہے کہ محبت دنیا کا مضبوط ترین جذبہ ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک اسے تاریک گتوں ہی پائیز بدنامیاں، زسوائیاں، نا کامیاں، درد، تڑپ، کسک اور جلن ہی عاشقوں کا سدا سے مقدر ہے اور لندن کی کالی سیاہ رات جیسی نہ جانے کتنی سیاہ راتیں اس مقدر کو روکنے کے لیے اپنی زلفیں کھولے ہم جیسوں کا کٹھن کرتی ہیں۔ مجھے بھی ایسی ہی ایک اور رات چھلینا ابھی باقی تھا۔

اگلی صبح ایسی میری دواؤں کی فہرست مکمل کرنے کے لیے آئی تو اُس کے چہرے پر معمول کی روشنی سے بہت کم تھی۔ کچھ چہرے اتنے روشن ہوتے ہیں کہ ہلکا دھیمپن بھی اُن کی پوری شخصیت کو بجا کر دکھا دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ایسی کے ساتھ بھی تھا۔ میرے بے حد اصرار پر وہ رندھی ہوئی آواز میں صرف اتنا بتا پائی کہ اُس کے چھوٹے بھائی پیٹر کو گزشتہ رات خون کی دو بوتلیں چڑھائی گئی ہیں، کیوں کہ وہ گزشتہ رات سے چوری چھپے کسی ”مقدس عبادت“ کے لیے اپنے جسم سے تھوڑا تھوڑا کر کے خون بہاتا رہا تھا۔ میری نظر کے سامنے ایک لمحے ہی میں گرو کا عبادت خانہ اور پورا وہی رسم کا منظر کوئٹے کی طرح لپک کر رہ گیا۔ میں نے ایسی کے سامنے اس ذکر سے گریز کیا۔ وہ پہلے ہی بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں کو چھلکنے سے روکے ہوئے تھی۔ وہ کام ختم کر کے پلٹ کر جانے لگی تو میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میری کوئی بہن نہیں ہے ہے بڑی بہن ماں کی غیر موجودگی میں ڈانٹنے کے تمام فرائض بخوبی ادا کرتی ہے۔ کیا آپ وہ جگہ پر میری ماما کا ہاتھ بنانے کی رحمت کریں گی۔ ویسے بھی اب ماما..... مجھے ٹھیک طرح سے ڈانٹ بھی نہیں سکتا جلد ہی تھک جاتی ہیں۔“ میرا وار کا گر رہا اور ایسی کا چہرہ پھر سے جگمگا گیا۔ ”بے فکر رہو میں اس صفت خود کفیل ہوں۔ اچھا ہے پیٹر کو بھی تمہاری بدولت کچھ رعایت مل جائے گی، ورنہ بچپن سے اب تک وہ انعام کا اکیلا حلق دار تھا۔ آج سے عبداللہ بھی اس فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔“ ایسی جتنی اداس آئی تھی اُسی خوش اور مسکراتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ جاتے جاتے میں اُس سے یہ وعدہ لینا نہیں بھولا کہ وہ پہلی فرس کسی بھی طرح میری پیٹری سے ایک ملاقات ضرور کروائے گی۔ سلطان بابا سے ملاقات کے بعد میری زندگی جتنے بھی واقعات رونا ہو چکے تھے، اُن سب کا کوئی ایک خاص مقصد ضرور رہا تھا۔ آج ایسی سے ملاقات بعد مجھے گرو سے ملنے کا مقصد بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ گرو ممالکی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدہ جذبات محسوس کر چکا تھا لہذا اب اُس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اُن کی غیر موجودگی میں ہی مجھ سے مل کرے۔ لیکن اس شام پہلی مرتبہ میں خود اسے تلاش کرنے کے لیے چہل قدمی کے بہانے اپنے کمرہ نکل آیا تھا۔ مجھے ان بیساکھیوں کے سہارے چلنا اور لوگوں کی ہمدردی بھری نظروں کو جھیلنا بہت دشوار لیکن شاید یہ بھی قدرت کا میرے لیے ایک سبق ہی تو تھا۔ لا چارگی، بے بسی اور انسان نامی اس کم ظرف

ہاں یا نہیں..... کیا وہاں کے اور یہاں کے گناہ گار ایک ہی سزا پائیں گے اور کیا جزا کاروں کو ایک ہی سی لے گی؟ میں انہیں سوچوں میں گم تھا کہ گرد کے ڈرائیور نے ایک طویل احاطے میں گاڑی موڑ لی۔ گرد خود اپنے نہیں آیا تھا۔ اُسے اچانک کوئی مصروفیت درپیش ہو گئی تھی۔ گاڑی رکتے ہی ایک خادم کی معیت میں ایک بڑے سے ہال کی بالکونی میں پہنچا دیا گیا۔ ہال اور بالکونی پہلے سے کچھ کھج بھرے ہوئے تھے۔ پتا چلا آج گرد کا لیکچر ہے۔ اس کے بعد وہ یہیں اسٹیج پر لوگوں کا روحانی علاج بھی کرنے گا۔ مجھے تیسری رو میں ہوئے پیٹر کی ایک جھلک بھی دکھائی دے گئی۔ کچھ ہی دیر میں گرد اپنے مخصوص جتنے میں اسٹیج پر نمودار ہوا تو میں مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے کھڑا رہا، پھر اُس نے یونہی آنکھیں موندے ہال سے گزارش کی کہ سب لوگ ابدی سکون کے لیے ایک منٹ تک آنکھیں بند کر کے دل کی گہرائی دعا کریں۔ سب کے ساتھ میری آنکھیں بھی میکا کی انداز میں بند ہو گئیں اور ٹھیک اُسی لمحے میری بند ہوں کے پردے کے پیچھے گرد کی شبیہ مسکرائی ”خوش آمدید“۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ گرد طرح آنکھیں موندے اسٹیج پر کھڑا تھا۔ جانے کیوں، پر ایک لمحے کے لیے میرا دل زور سے دھڑکا۔ اس بار اقبال ٹیلی ویشن کے تھنڈا ریس لیس تھا اور میں بالکل جی دامن۔ ہال میں زیادہ تر تعداد اُن لوگوں کی تھی رو کی شہرت سن کر پہلی مرتبہ اُس کے اس ہفتہ وار روحانی درس میں شامل ہونے آئے تھے۔ گرد کے چاق نڈشاگرد ہال کے انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے۔ علاج کے لیے آنے والوں کی نشستیں علیحدہ لگائی گئی تھیں۔ کچھ دیر میں باقی تمام ہال کی روشنیاں دم گم کر دی گئیں اور صرف اسٹیج پر کھڑے گرد کے گرد نور کا ایک ہالہ ناک کے دائرے کی صورت میں باقی رہنے دیا گیا۔ گرد کو لوگوں کو مسخر کرنے کا فن بخوبی آتا تھا۔ سب ہی لوگوں مل ارتکاز اب اسٹیج کی جانب ہو چکا تھا۔ میں نے اُس لمحے محسوس کیا کہ اس جدید دنیا کے سب سے ترقی شدہ شہروں کی فہرست میں سے ایک شہر، لندن بھی ایسے باسیوں سے خالی نہیں، جنہیں روح کی پیاس ایسی ال پر کھینچ لاتی ہے، جہاں روحانیت اور توہم پرستی کے درمیان بہت معمولی سا فرق رہ جاتا ہے۔ شاید ان جس قدر زیادہ سائنسی ترقی کرتا جاتا ہے، اُس کی روحانی پیاس بھی اُسی قدر بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے لائن میں گرد جیسے لوگوں کی کامیابی اور تعظیم سونی صدیقینی ہوتی ہے، کیوں کہ اس جدید معاشرے کے ترقی یافتہ سب کچھ پالنے کے باوجود بھی کسی روحانی مسیحا کی تلاش میں در بدر بھٹک رہے ہوتے ہیں۔

گرد نے اپنے درس کا آغاز عبرانی زبان میں چند دعاؤں کے ساتھ کیا ”قسم ہے مجھے اُس خدا کے عظیم و کی جس نے ہمارے اکابر پر کبھی من و سلویٰ برساتی تھی، جو موسیٰ سے کلام کرتا تھا اور جس نے ہمیں عظیم تر جس نے ہمارے لیے بارہ جتنے تعویض کیے اور فرعون سے مقابلے کو سمندر پھاڑ کر راستہ بنایا۔ اُسی رب کے آید دنیا بہت عارضی اور جلد مٹ جانے والی ہے۔ سو، میرا یہ پیغام ہے، جہاں تک پہنچے کہ آؤ ہم سب مل اگلے جہاں کی تیاری کر لیں۔ کوئی شک نہیں کہ ہمارے رب نے ہمیں یہاں اس دنیا میں بھی عظیم پیدا

## صیہونی

شاید گرد مجھ سے ایسی توقع نہیں کر سکتا تھا کہ میں خود اس کے ہاں ہونے والی کسی مذہبی تقریب میں شرکت کی فرمائش کر بیٹھوں گا۔ لیکن اُسے اپنے جذبات اور تاثرات کو چھپانا خوب آتا تھا۔ لہذا اگلے لمحے وہ خود پر قابو پا چکا تھا۔ ”ہاں ضرور، کیوں نہیں۔ آج نہیں، تو کل تمہیں وہاں آنا ہی تھا، تو پھر آج ہی سہی۔ لیکن تم اسپتال سے چھٹی کیسے لو گے..... اور پھر تمہارے والدین..... وہ شاید تمہیں کبھی بھی یوں تنہا میرے ساتھ نہ جانے دیں۔“ ”والدین کی تم پر روانہ کرو۔ میں انہیں منالوں گا۔ البتہ اسپتال سے باہر لے جانے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ تمہیں ڈاکٹر البرٹ سے میرے لیے خصوصی مختصر چھٹی لینا ہوگی۔ کہہ دینا کہ تم مجھے اپنے روحانی علاج کے کسی سیشن میں لے جانا چاہتے ہو، جو میری بیماری کو دُور کرنے میں فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔“ گرد مسکرایا۔ ”ٹھیک ہے، تو طے رہا کہ ہم رات ٹھیک نو بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔ تم تیار رہنا۔“

ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر پاپا اس آڑے وقت میں میرے کام آئے۔ نہ جانے انہوں نے کس طرح نما سے مجھے گرد کے ساتھ باہر جانے کی اجازت دلوائی۔ میں گرد کی گاڑی میں اسپتال سے باہر نکلا تو سارے راستے یہی سوچتا رہا کہ لوگ ماں کے رشتے کے بارے میں ہمیشہ بہت کچھ کہتے اور لکھتے رہے ہیں، کاش کوئی باپ بیٹے کے اس انوکھے اور خوب صورت رشتے کو بھی کبھی اُس طرح بیان کرے۔ ابھی رات زیادہ نہیں ڈھلی تھی، لیکن قدامت پسند لندن کی سڑکیں سونے کی تیاری شروع کر چکی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے پر جمع کیے ہوئے برف کے ڈھیر سرد ہوا کی وجہ سے جم چکے تھے اور سنٹرل لندن کی خاموش گلیوں میں کہیں کہیں بے گھر بنجارے لوہے کے بڑے ڈمرز میں آگ سلگا کر اس کے گرد دکھڑے ہاتھ اور جسم تپ رہے تھے۔ جدید لندن کی طرف سے آتی گاڑیوں میں زندگی ابھی جاگ کر انگرائی لیتی محسوس ہو رہی تھی۔ خوب صورت چروا، خوشبوؤں، کلوز اور ملبوسات کے جھوم تیزی سے شہر کے ڈسکوز، اوپر اٹھیں زور و گلوں کی جانب رواں دواں تھے۔ جہاں فجر کے اُجالے تک سب ہی کو مدھوش رہنا تھا، رقص کرنا تھا اور اپنے جیسے انسانوں کی دنیا کو کھوجنا تھا۔ اس رنگ و خوشبو کے سیلاب میں کون یقین کرتا کہ اسی دنیا میں کال گڑھ اور تحصیل ماہی جیسے اندھیرے قطعے بھی موجود ہیں جہاں چراغوں کا تیل پوری طرح شام ڈھلنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں رات اتنی لمبی ہوتی ہے کہ ستارے بھی تھک کر بھج جاتے ہیں۔ میرے ذہن میں تب ہی ایک عجیب سا خیال آیا کہ کیا اگلے جہاں میں ان اندھیری راتوں اور ان روشن اُجالوں کی بنیاد پر بھی کوئی فرق، کوئی امتیاز برتا جائے گا؟ کوئی صلہ دے



لیکن اگر ان کے دل میں کوئی چور ہو تو میری یہ دعا بھی چند لمحوں بعد اپنا اثر کھو بیٹھتی ہے۔ لہذا تم بھی عہد کہ ہمیشہ اپنی رُوح کو پاک رکھو گے۔“ گرد کی آواز برقی ٹانگ کے ذریعے پورے ہال میں پھیل رہی تھی سب ہی دم سادھے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا دیکھ رہے تھے۔ شاید میرے انداز میں ت کی لہر کو ان سب ہی نے محسوس کر لیا تھا۔ جانے کیوں، مگر جتنی بار بھی میرا گردو سے سامنا ہوا تھا میں نے اندر سے کچھ منفی لہریں نکلتی محسوس کی تھیں، حالانکہ اب تک کی ہر ملاقات میں اُس نے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور پایا تھا، جسے دیکھ یا سن کر عام انسان خود کو صرف حذر زدہ ہی محسوس کر پاتا۔ لیکن میرے اندر کوئی ایسی قوت رہتی تھی، جو مجھے گردو سے دُور دھکیلتی رہتی تھی۔ وہی قوت اس وقت اسٹیج پر اُس کے سامنے کھڑے ہونے کے بعد بھی مجھے بار بار خبردار کر رہی تھی کہ مجھے اپنا آپ اُس کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اُس نے مجھے کچھ نہ کا موقع ہی نہیں دیا اور اگلے ہی لمحے اُس کی شہادت کی انگلی سمیت دو انگلیاں میرے ماتھے میں جیسے اندر پوسٹ ہو چکی تھیں۔ گرد کے لب تیزی سے ہل رہے تھے اور ایک پل ہی میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ماتھے کے مرکز سے ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ اب حیات نے میری نُس نُس میں ٹھنڈا، تازگی اور خمار آلود سکون کی ایک لہریں دوڑا دی تھی۔ میں نے اس مدہوشی سے بچنے کے لیے اپنے قدم زور زور سے زمین پر جانے کی کوشش کی، لیکن اگلے ہی لمحے میں کسی مخمور شرابی کی طرح لڑکھڑایا اور میرے ہاتھ سے ہاتھیاں چھوٹ گئیں۔ گرد نے سے پہلے مجھے بھی دوسرے لوگوں کی طرح تھام لیا گیا اور اس کے بعد نشست پر پہنچائے جانے کے مرحلے سے لے کر واپس اسپتال آنے تک میں جیسے ایک خواب کے عالم میں مدہوش رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے جسم میں سُن کرنے والے بہت سے نیچے بیک وقت پوسٹ کر بیٹھے ہوں۔

میری یہ کیفیت اگلی صبح تک برقرار رہی۔ گھنٹوں نیم گرم پانی کے شاور کے نیچے کھڑے ہونے کے بعد میں جا کر میرے حواس کچھ بحال ہوئے۔ ممانے جب چوٹی بار دروازہ دھڑ دھڑا کر مجھے ناشتا ٹھنڈا ہونے کی آواز دی، تب میں باہر نکلا۔ اور تب ہی میری نظر دروازے سے باہر کھڑے پیٹر پر پڑی، جو ہاتھوں میں گلدستہ لیے بے چین سا کھڑا تھا۔ میں نے اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ممانے دونوں کو کافی کے گگ تھما کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ پیٹر اُن کے جاتے ہی جلدی سے بولا ”بڑے بھائی، تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم بھی لڑکے کے معتقد ہو۔ میں تو کل رات تمہیں وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ تم اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ میں نے کرا کر پیٹر کو دیکھا ”ٹیلی بیٹھی اور پٹنا زوم کے اتنے شدید وار کے اثر سے نکلنے میں وقت تو لگتا ہے۔“ پیٹر کو کچھ لگا لگا۔ ”گویا تم بھی.....؟ ایسی بھی ایسی باتیں کرتی ہے۔ جانے تم لوگوں کو گرد کی روحانی طاقتوں پر کتنی کیوں نہیں آتا۔“ میں نے غور سے پیٹر کی جانب دیکھا۔ ”یقین ایک ایسا سوا ہے، جسے دلیل کی تلواریں نہیں کیا جاسکتا۔ ہم یا تو یقین کرتے ہیں یا پھر نہیں..... تم اپنے یقین کے ساتھ خوش رہو اور مجھے میری بے یقینی

کیا ہے اور وہاں بھی وہ اپنے لاڈلے بندوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرے گا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ہم اُس کا محبوب بندہ ثابت کریں اور اس ابدی سکون کی دعوت کو دیگر بے چین لوگوں تک پہنچائیں جنہیں تلاش ہے مگر وہ ابھی تک سچ کو جان نہیں پاتے۔“ گرد کافی دیر تک مختلف حوالے اور ترغیبات دے کر لوگوں اپنے حلقے میں شامل ہونے کی دعوت دیتا رہا اور پھر اُس نے اپنے درس کا اختتام بھی چند عبرانی آیات ساتھ ہی کیا۔ ہال میں ابھی تک ملگجا اندھیرا اور مکمل سکون چھایا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر اُن بڑے بڑے دانوں پر پڑی، جہاں سے برف باری شروع ہونے سے پہلے کا سرخ انگارہ آسمان پر جھلک رہا تھا۔ وہ چھت پر بنے داؤدی ستارے کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ تو وہی ہال تھا، جہاں ”نور بہاؤ“ کی رسم ادا کی گئی تھی۔ میں نے بے چینی سے زمین پر کھدے آہنی ڈیوڈ اسٹار کو ڈھونڈنے کے لیے دوڑا لیکن فرش پر اس وقت لکڑی کی نشیمنیں بھی ہوئی تھیں اور ان پر بیٹھے لوگ محویت سے گرد کی بات رہے تھے۔ درس کے بعد روحانی علاج کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک یہودی عورت ترتیب وار نام پکار کر مریم کو یکے بعد دیگرے اسٹیج پر بلانے لگی۔ مریض بد حال اور بد حال حالت میں اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے جاتے۔ ان میں سے کئی ڈھیل چیز اور بعض دوسروں کے سہارے گرد کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے۔ گرد اُن نام پوچھ کر مرض کی نوعیت معلوم کرتا اور پھر اپنے دانے ہاتھ کی دو انگلیاں مریض کے ماتھے پر رکھ کر منہ پر ہاتھ میں کچھ پڑھ کر مریض کے سر پر پھونک ماردیتا۔ نہ جانے اس طلسماتی لمس اور پھونک میں کیا اثر ہوتا کہ مریض ایک لمحے کے لیے بالکل ہی بے سندھ ہو کر وہیں جھول جاتا، جسے سنبھالنے کے لیے آس پاس دو خادم پہلے ہاتھ کھڑے تھے، اور پھر چند لمحوں پر بعد جب اُسے ہوش آتا تو وہ بالکل ہشاش بشاش اپنے پیروں پر چل کر واپس اپنی نشست پر آ بیٹھتا۔ ہر بار مریض کے ہوش میں آنے اور ٹھیک ہونے پر پورے ہال میں داد و تحسین کا طوفان سا اُٹھتا۔ عورتوں نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا اور نوجوان طبقہ زور زور سے چلا کر گرد سے میٹائی کا درخواست گزار تھا۔ میں حیرت سے گنگ بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اچانک گرد نے ہاتھ اٹھایا اور پورا ہال ایک دم یوں خاموش ہو گیا، جیسے وہاں کبھی کوئی ذی رُوح موجود ہی نہیں تھا۔ گرد کا اشارہ میری طرف تھا ”عبداللہ..... میرے دوست..... تم بھی یہاں نیچے آ جاؤ۔ میں تمہاری بے یقینی کو یقین میں بدلنا چاہتا ہوں۔“ سب ہی کی نظریں مجھ پر گز گئیں اور میرے تمام جسم میں چیونٹیاں سی ریگینے لگیں۔ میرے پاس انکا کا کوئی موٹہ نہیں تھا۔ گرد کا یہ جملہ میرے لیے اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چند لمحوں کے لیے میرا ذہن جیسے سُن ہو کر گیا۔ ہوش جب آیا جب میں اپنی بیساکھیاں نکیتے ہوئے گرد کے سامنے اسٹیج پر جا کھڑا ہوا۔ گرد نے غور سے میری جانب دیکھا ”اپنے دل سے ہر شک و شبہ کو نکال دو میرے دوست۔ یاد رہے کہ دائمی علاج صرف میرے رب کی دسترس میں ہے۔ میں صرف رُوح کو پاک کرنے کی دعا کر سکتا ہوں اور اس دعا کا اثر صرف اُن پر ہوتا ہے جو آئندہ کے لیے اپنی رُوح کو کسی گناہ سے پرانگندہ نہ کرنے کا عہد کر کے میرے پاس آئے

کمرے میں گھپ اندھیرا ہونے کے باوجود نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا، جیسے کوئی آنکھ مسلسل میری لٹانی کر رہی ہو۔ کھڑکی سے باہر دیر یا ئے ٹیڑھا جگما ہوا بخ پانی آسمان سے گر تکی برف کی ہلکی پھوار کے ساتھ لسلے ہوئے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ پھر مجھے نیند نہیں آئی اور میں نے ابھی کی لٹائی کتابوں کے صفحے پلٹے شروع کر

کے ساتھ جینے دو..... جانتے ہو، کامل یقین بھی کسی دولت کی طرح ہوتا ہے اور یہ خزانہ کم خوش نصیبوں کی نصیب ہوتا ہے۔ تمہیں تمہاری دولت مبارک، ہمیں ہماری غریبی۔“ پیٹر میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ”مجھے تمہاری یہی بات سب سے اچھی لگتی ہے عبداللہ۔ تم ایسی کی طرح مجھ پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی جلد ہی گرو کو اپنا استاد مان لو گے۔ وہ زبردست انسان ہے۔“ ”میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں گرو کی عقل تسلیم کر لوں گا، لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اگر زندگی میں تمہیں کسی لمحے بھی ایسا محسوس ہوا کہ تم نے غلط راہ چنی ہے، وہ منزل کی طرف نہیں جاتی، تو تم ایسی کا فیصلہ تسلیم کر کے اپنی تعلیم مکمل کر دو گے اور ایسی کے خواب پورے کر دو گے۔“ پیٹر نے خوش دلی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ”چلو وعدہ رہا..... پکا وعدہ۔“ ٹھیک کر لمحے ایسی دواؤں کی ٹرے دھکیلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور پیٹر کو دیکھ کر بولی ”چلو بچے، ڈاکٹر الہرٹ کے راونڈ کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہارے کہنے پر میں تمہیں یہاں لے تو آئی ہوں، لیکن اسپتال کے نظم کا خیال رکھنا بھی میرا فرض ہے۔“ پیٹر مجھ سے ہاتھ ملا کر وہاں سے اٹھ گیا۔ ایسی نے بیگنی پگلیوں کے ساتھ میرا شکر پیار کیا۔ ”آج سالوں بعد پیٹر نے خود کسی سے ملنے کی فرمائش کی۔ جانے کیوں۔ پر اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ میرا پیٹر بہت جلد گھر واپس لوٹ آئے گا۔“ میرا دل اندر سے لرز سا گیا اور بس ایک ہی صدا اٹکی کہ یا اللہ! معصوم بہن کے یقین کی لاج رکھنا۔ میں نے گزشتہ روز ایسی سے یہودیوں کے بارے میں لکھی گئی چند اہم کتابیں لانے کو کہا تھا۔ ایسی نے دو کتابیں میرے حوالے کیں۔ ”تمہاری فہرست میں موجود کچھ کتابیں لندن کے کسی بھی بک اسٹور سے نہیں مل پائیں، لیکن میں نے ہالینڈ میں اپنی ایک دوست کو ای میل کی ہے وہ جلد وہاں سے کتابیں ڈھونڈ نکالے گی۔ میں جانتی ہوں، تم ان کے بارے میں کیوں جانا چاہتے ہو۔ چاہو تو میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں۔ میں یہود کے بارے میں یہودیوں سے بھی زیادہ جانتی ہوں۔“ میں نے چونک کر ایسی کو دیکھا۔ ”وہ کیسے.....؟“ ایسی نے گہرا سانس لیا۔ ”کیوں کہ میری سگی ماں ایک یہود تھی۔“ میرے ہاتھ سے کتابیں گر کر رہ گئیں۔ ”ہاں، بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ میری ماں قوم یہود سے تھی۔ یہ باپ سادہ لوح عیسائی تھا۔ لیکن میری ماں کی زندگی برباد کرنے والا بھی ایک صیہونی ہی تھا۔ تم اُس دن صیہونیت کے بارے میں پوچھ رہے تھے نا۔ تو سنو، یہ سچ ہے کہ ہر صیہونی یہودی ہوتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر یہودی صیہونی نہیں ہوتا۔ بس، یوں سمجھ لو کہ قوم یہود کا وہ شدت پسند طبقہ، جو اپنے نظریے اور مقصد کے حصول کے لیے ہر ناجائز کو جائز سمجھتا ہے اور اس کے لیے پوری دنیا کا امن برباد کرنے پر تیار ہے، اُسے صیہونی کہا جاتا ہے۔“ ایسی بولتی رہی اور میں دم سادھے بیٹھا سنتا رہا۔ ایسی نے مجھے بتایا کہ اُن کی زندگی بہت ہر سکون تھی۔ جب وہ اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی پیٹر کے ساتھ لندن کے مضافات میں رہتے تھے۔ ایسی جب اپنے اسکول کی نويس جماعت کی ذہن طلبہ تھی۔ اُس کا باپ مضافات میں موجود ایک ٹیکٹر میں فائرن کاکام کرتا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا، تا وقتیکہ اُن کے قصبے میں جم نامی وہ یہودی اسکول بچر آیا، جس کی

## آخری مسیحا

مجھے یوں لگا، جیسے وہ رات بھر میرے اندر کو پڑھتا رہا ہو۔ میں نے گرد کا سوال سن کر جانے کیوں اثبات سر ہلا دیا۔ ”ہاں، میں گزشتہ رات خواب میں بیت المقدس میں تھا۔“ گرد نے گہری سی سانس لی، وہ کچھ رب سا لگ رہا تھا۔ ”تم..... آخر کون ہو تم؟“ میں پلٹا۔ ”یقین جانو میں خود اسی سوال کی کھوج میں یہاں پہنچا ہوں، لیکن کل رات ایک جواب تو مجھے زندگی نے دے ہی دیا ہے اور وہ یہ کہ تمہارا اور میرا راستہ جدا۔ تم 21 دسمبر 2012ء کو جس قیامت کی آمد کی تیاریاں کر رہے ہو میرے نزدیک وہ سراب ہے۔ تمہارا ہی مسیحا کوئی اور..... اور میرا نجات دہندہ کوئی اور ہے۔“ گرد نے اطمینان سے میری بات سنی۔ پھر تاسف بولا، ”تو آخر تم بھی اُس مذہبی تعصب کا شکار ہو ہی گئے، جو ہر مسلمان کا خاصہ ہے۔ جانے کیوں میں تمہیں دال سے کچھ الگ سمجھ بیٹھا تھا۔ یاد رکھو کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔“ اچانک گرد کی نظر مابستر کے ساتھ جڑی چھوٹی سی میز پر پڑی، جہاں ابھی تک ایسی کی لائی کتابیں رکھی تھیں۔ گرد کے ہونٹوں بظنریہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”جانتے ہو تم میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ میں نے تمہیں اپنے خدا کی فطرت سے جانا ہے، جب کہ تم مجھے ابھی تک ان کتابوں میں ڈھونڈ رہے ہو۔ جس دن مجھے جانے کے لیے خدا کی رسی ہلاؤ گے۔ سارے پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں گے۔“ گرد اپنی بات ختم کر پلٹا اور پھر رُک گیا۔ ”اور ہاں، مقدس دجال کا ظہور ہو چکا ہے اور تم دیکھنا کہ قیامت بھی اپنی مقررہ تاریخ پر آئے گی۔ میں اپنے رب سے دعا کرتا ہوں کہ اُس وقت تم فائدہ پانے والوں کے ساتھ رہو۔“ گرد پلٹ کر چلا لیکن میرے لیے اُن گنت سوالوں کا سمندر ارا پیچھے چھوڑ گیا۔ میں جانتا تھا کہ میں اور میرا عقیدہ ہی سچ، لیکن مجھے پورا اطمینان کیوں نہیں سونپ رہا تھا۔ کوئی ایک چیز ایسی تھی، جو میرے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی لیا آنکھوں سے ابھی تک اوجھل تھی، لیکن کیا.....؟ میں شام تک سر پختہ رہا، لیکن وہ سادہ سا کلیہ میرے ذہن اندر بیٹھ نہ سکا۔ گرد ٹھیک ہی تو کہتا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں تو پھر اس نے اپنے خدا کی فطرت سے میری حقیقت اتنی جلدی کیسے جان لی تھی، جب کہ میں ابھی تک مکمل اندھیرے میں تھا۔ شام نے ہی میرے اندر کی بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ میں مہمیا سے ضد کر کے تمہارا اپنی بیساکھیاں ٹھیکتا باہر برف سے میدان میں چلا آیا۔ کچھ درختوں پر ابھی تک خزاں کی نشانی کے طور پر زرد پتوں کے سوکے ہار جمبول رہے۔ شاید خزاں کا واسطہ بھی موت کی طرح رگوں سے زندگی نچوڑ لینے سے ہوتا ہے۔ میں اپنی زندگی سے

دیئے اور صبح کا اُجالا پھیلنے تک مجھے قوم یہود کے بارے میں جو کچھ پتا چلا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ کبھی یہ قوم واقف خدا کی محبوب ترین قوموں میں سے تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اپنے اعمال کی وجہ سے ہر اعزاز سے محروم ہوتی گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک اس قوم کی ناشکری اور بدعہدیوں کی ایک لمبی داستان ہے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے نبیوں کو بھی قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا اور ذکر یا علیہ السلام، یوحنا (جون) اور میکھا پاہ کا خون ناحق اسی قوم کے سر ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مسلسل نافرمانیاں اور ناشکرے پن سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کر دینے کی سازش تک ہر موقع پر خود اس قوم نے خدا کے غضب کو دعوت دی اور آخر کار ان سے نبوت اور وطن چھین کر قدرت نے ان کی سزا پر مہر لگا دی۔ یہ قوم در بدر ہوئی، زمانے بھر کی لعنت اور پھٹکا راس کا مقدر بنی، لیکن اس نے پھر بھی اپنے اعمال نہ بدلے اور سو خوری کی شکل میں خدا سے جنگ جاری رکھی، جو آج تک جاری ہے۔ رفتہ رفتہ سود کے ذریعے انہوں نے دہ کی معاشیات کو اپنے قبضے میں لے کر مختلف سلطنتوں کو آپس میں لڑانا شروع کیا اور پھر ایک وقت یہ بھی آیا جب دنیا کی عظیم طاقتیں (شہر پاورز) ان کے پنجہ سود تلے دبی ان کی انگلیوں پر ناچ رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ انہی یہودیوں میں سے ایک انتہا پسند طبقہ ابھر تا گیا، جو بعد میں صیہونی کہلائے اور جن کے اندر نبوت چھنے اور وطن ہونے کا غصہ انتقام میں بدلتا گیا اور انہوں نے قبلہ ازل کو ڈھانے کی ناپاک سازشیں شروع کر دیں اور نبوت کی جگہ دجال کو اپنا آخری مسیحا مان کر اُس کی آمد کی تیاریاں شروع کر دیں، جو بقول اُن کے، اُن کی آخری فتح کا باعث ہوگا۔ مسلمانوں سے ان کی بنیادی نفرت کی ایک وجہ ہمیشہ یہی رہی کہ مسلم عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی اصلی مسیحا ثابت ہوں گے، جو دجال کو قتل کر کے اس دنیا میں امن قائم کریں گے۔ مذہبی عقیدے سے قطع نظر یہ قوم بے حد منظم، متحد اور ذہین تھی اور ہے۔ اصل یہود اسلام کی سچائی اور عظمت واقف ہونے کے باوجود فطرت سازشی ہونے کی وجہ سے اسے کبھی دل سے تسلیم نہیں کر پائے، اور کہیں نہ کہیں اب بھی اسلام ہی کو اپنی بربادی کی اصل وجہ گردانتے ہیں اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کے کسی موقع سے فائدہ چوکے۔ جب کہ انہی یہودیوں میں آج بھی ایک ایسا معتدل طبقہ موجود ہے، جو صیہونیت کو یہودیت کے لیے ایک گالی سے کم نہیں سمجھتا، لیکن ایسے یہودی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کہیں کم ہے۔

میں نے کتاب کا آخری صفحہ پلٹا تو نسبتاً صاف آسمان سے سورج اپنی پہلی جھلک دکھلا چکا تھا۔ میرا بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے گرم پانی کا شاور لینے کے ارادے سے اٹھنا چاہا، تب ہی میرے کمرے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دروازے کے پتوں سچ مجھے گرد کا متمنا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر گرد ہی نے سانپ جیسی پھٹکار ڈال دیا اور اس خاموشی کو توڑا۔

”کیا تم کبھی بیت المقدس گئے ہو.....؟“

نچرے ہوئے چٹوں کے ڈھیر تلے دبے ایک چوٹی بیٹھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ سرد ہوا میرے منہ سے نکلتی ساہل کو بھاپ میں تبدیل کر رہی تھی، لیکن میرے دل سے جو دھواں اٹھ رہا تھا اس کی شاید کسی کو خبر نہیں تھی۔ شاید عصر کی اذان تھی، جس کی آواز کہیں دُور مضافات سے ہوا کے دوش پر ایک سرسراہٹ کی طرح میرے کان سے ٹکرائی۔ میرے کان خود بخود اپنی تمام تر سماعتوں کو جگا کر فضا میں گم ہوتی اس آواز کے تعاقب میں کھڑے ہو گئے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی میں نے کہیں پڑھایا سنا تھا کہ اذان دنیا کی وہ واحد آواز ہے، جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں، تمام وقت، دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں گونج رہی ہوتی ہے۔ مؤذن کی آواز میں عجیب سا ہوا تھا، جو میں اتنی دُور بیٹھ کر بھی اس سرگوشی نما صدا میں محسوس کر سکتا تھا۔ ”اشھد ان محمد رسول اللہ۔ اشھد ان محمد رسول اللہ۔“ اور تب ہی میرے ذہن میں پہلا جھماکا ہوا، پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ ٹپے یوں لگا، جیسے میرے ذہن میں بارود کے کسی ڈھیر کو فیتہ دکھا دیا گیا ہو۔ ہاں یہی تو تھا وہ کھلا راز، حیرت ہے اتنے سامنے کی بات مجھے اتنی دیر سے کیوں سمجھ میں آئی؟ جھگڑا خدا کا تو کبھی تھا ہی نہیں کہ خدا تو ازل سے ہم سب کا ایک ہی ہے۔ فرق تو پیارے نبی ﷺ کی آمد کا ہے۔ اسلام تو ہمیشہ کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نازل ہوا تھا۔ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک ہر مذہب اسلام ہی کی ایک شکل تھی۔ ہاں مگر آخری نبی الزماں ﷺ کی نبوت کا طرہ امتیاز مسلمانوں کے حصے میں آیا اور یہی یہودی ہم سے منافرت کی بنیادی وجہ تھی۔ صدیوں تک یہ تاج یہود کے پاس رہا اور اللہ انہیں اُن کی بے تحاشا نافرمانیوں کے باوجود نبیوں کی فرمائش پر معاف کرتا رہا، لیکن پھر یہ امتیاز ان سے آخر کار چھین گیا۔ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی یہودی کہیں مسلمانوں کو ہی اس ذلت کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے دھوکے سے اپنے لیے ایک زمین کا ٹکڑا تو حاصل کر لیا، لیکن اپنا قبلہ وہ ہمیشہ کے لیے کھو چکے تھے۔ اور ہمارے قبلے کو کبھی انہوں نے دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اچانک ہی میرا جسم ناتواں اس احساس سے لرزنے لگا کہ میں آخری نبی ﷺ کا آئین ہوں جس کے لیے اس ساری دنیا کا کھینڈا کھڑا کیا گیا ہے۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے کہ کس قدر بد نصیب ہوں کہ خود اپنی ہی عظمت سے بے بہرہ ہوں۔ ایک عالم ہماری عظمت و بڑائی سے واقف ہونے کی بنیاد پر بھیڑیوں کی طرح ہماری بوٹیوں کو نوچنے کے لیے ہمارے درپے درپے ہے اور ہم خود کو کھاتی ہیں۔ کرائیں پیش کر رہے ہیں۔ گرد ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ میرا اور اُس کا بھلا کیا مقابلہ۔ اُس نے ہم سے کچھ نہ نہائی۔ وہ ہماری نفرت میں علم کے کتنے سمندر پی گیا اور میں جو مذہب کی محبت کا دعویٰ دار تھا، میں نے سیکھا؟ صرف چھ کلمے اور پانچ نمازیں..... کیا بس اتنا ہی تھا میرا دین.....؟ صرف ایک سال پہلے تک میں نے اسی لندن کے کلیمز اور ڈسکوز میں بھٹکتا پھرتا تھا اور آج سال بعد اللہ کے اتنے نیک بندوں کی صحبت کے بعد میں کیا تھا۔ دُور دُور بھٹکتا ہوا ایک بھکاری..... وہ تلاش ہی کیا، جو آپ کو اندر سے مومن نہ کر سکے، انسان کے جذبہ کو پاک نہ کر سکے۔ کیا میں اُس نبی آخر الزماں ﷺ کے اُمتی ہونے کے اعزاز کا حق دار تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

وہ یہودی، جو خدا کی محبت کے بل، اپنی ساری زندگی ایک مقصد کے سپرد کر چکا ہے اور ایک میں، جسے خدا بت پانے کے لیے اُس کے نبی ﷺ کی محبت کا سادہ اور آسان کلیہ بتا کر، خدا نے ساری کائنات اس اُمتی روئے وعدہ کیا ہے، جو صرف اس کلیے ہی کو شرط بنا لے۔ مگر مجھ جیسے اور نہ جانے کتنے کم نصیب ہوں گے، رف زبانی ہی اس محبت کا دعویٰ کرتے ہوں گے۔ میں جتنا سوچتا جاتا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہتی اور پھر کچھ دیر بعد ہی آسمان سے گرتی برف کو میرے آنسوؤں میں پر جمنے سے قبل ہی دھونے لگے۔ کاش ان کے گناہ بھی اس برف کی طرح اتنی ہی آسانی سے دھل پاتے۔ پھر نہ جانے کب ایسی میری تلاش میں طرف آنکلی اور کب وہ مجھے میرے شکستہ وجود سمیت، سمیٹ کر میرے کمرے تک لے آئی۔ میری حالت پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا مگر اگلی صبح ایک اور خبر میرے حواس مغلط کرنے کے لیے تیار تھی۔ اور اصل گزشتہ روز ہی خبر سنانے کے لیے مجھے تلاش کرتی ہوئی اسپتال کے احاطے میں آئی تھی، لیکن مجھے حال دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ گرو اس ہفتے کے درس کے بعد یروشلم اور فلسطین کے رے کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور پیٹر نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ بھی گرو کے وفد کے ساتھ ضرور اس ”مقدس ر“ پر جائے گا، جب کہ پیٹر کی اپنی حالت اس بیماری کی وجہ سے پہلے ہی بے حد خراب تھی۔ ایسی کوڈر تھا کہ وہ بارگرو کے ساتھ چل پڑنے کے بعد اپنے بھائی کی صورت دوبارہ کبھی نہیں دیکھے گی۔ برسوں پہلے ٹھیک اسی راج ایک روز اُس کی ماں بھی اپنا سب کچھ تیاگ کر کسی مقدس فریضے کی انجام دہی کے لیے گھر سے نکلی تھی اور کبھی نہیں لوٹی۔ ایسی کو سونی صدیقین تھا کہ گرد بھی اپنے ساتھ جانے والے سب ہی نوجوانوں کو کسی اسرائیلی فزری کے حوالے کر دے گا، جہاں سے آج تک کسی کی واپسی نہیں ہوئی۔ ایسی اپنی بات ختم کر کے آنکھیں بھٹی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ خلاف توقع گرو نے دودن سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اپنے سفر کی تیاری میں مشغول تھا۔ شام تک میری طبیعت بے حد حال ہو گئی، لیکن میں چپ چاپ بستر پر آنکھیں بند کیے پڑا۔ کبھی کبھی جب انسان کا ٹوٹ کر بکھرنے کو جی چاہے لیکن اُسے اپنوں کی دل جمعی کی خاطر خود کو سمیٹے رکھنا اسے تو زندگی کتنی مشکل ہو جاتی ہے۔

اچانک بند پلکوں کے عقب سے مجھے گرو کی آواز سنائی دی ”کیا تم میرے بارے میں سوچ رہے ہو؟“ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ میرے سامنے ہی دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ کمرے میں مغرب سے آگے کا اداس اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ماما شاید مجھے سوتا سمجھ کر باہر چہل قدمی کے لیے نکل چکے تھے۔ حسبِ معمول گرو کی آنکھوں میں وہی جیت لینے والی چمک اور ہونٹوں پر فتح کا غرور لیے ہلکی سی مسکراہٹ۔ میں نے ہلکا تر بہ گرو سے درخواست کی ”کیا تم میری ایک بات مان سکتے ہو؟ پیٹر بہت بیمار ہے، اُسے اپنے ساتھ مت لے جاؤ۔“ گرو زور سے ہنسا ”تمہارے لبوں پر یہ عاجزانہ درخواست کچھ جتنی نہیں۔ جنہیں قدرت کے عزیز نے کاغذ پر ہووہ گز ارشاد نہیں کرتے، حکم دیا کرتے ہیں۔“ میں گرو کا یہ طنز بھی جھیل گیا۔ ”شاید میں کبھی خود



یہی ہنسا، اچھا..... تو پھر میدان بھی تم خود ہی منتخب کرلو۔ کل تمہیں یہ گلہ نہ ہو کہ گرو نے اپنے علاقے میں ہر ادیا۔ میں نے غور سے گرو کو دیکھا۔ ”علاقہ بھی تمہارا ہی ہوگا اور مجھ سے ایسے کسی گلے کی کبھی توقع نہ رکھنا۔ میں تو سدا ہی ہارتا آیا ہوں اور شکست کے تمام آداب سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ہماری یہ جنگ اسی اس آنے والے درس کے دور میں ہوگی۔ تمہارے ہی گھر پر۔“ گرو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تو آخر بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ ویسے میں تمہاری ہمت کی داد ضرور دوں گا۔ ٹھیک ہے، مجھے اس مناظرے سے روت قبول ہے۔ لیکن شرط اب بھی وہی ہے۔ ہار کی صورت میں تمہیں سدا کے لیے میری غلامی قبول کرنا پڑے گی۔“ میں نے حتمی فیصلہ دے دیا۔ ”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے.....“ ایسی گنگ سی کھڑی میری اور گرو کی یہ بات سن رہی تھی۔ گرو کے کمرے سے نکلتے ہی چلا پڑی۔ ”یہ تم نے کیا کیا لڑ کے! وہ وہ بہت طاقت ور ہے اور تم اہل۔ یہ کیسا سودا کر لیا تم نے؟“ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ”کچھ سودے تمام تر نقصان جان کر بھی طے ہار پڑتے ہیں۔ دلوں کی سودوں کی طرح، سدا گھائے والے۔“ ایسی بے بسی سے ہاتھ ملتی رہی۔ میں نے یہ بات کی کہ وہ گرو کے اگلے سیشن میں پیٹر کے ساتھ خود بھی درس والے ہال میں آئے۔ لیکن وہ ابھی تک پہنچ نہیں۔ ”آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو۔ کیا واقعی تمہارا گرو کے ساتھ باقاعدہ کوئی ’مناظرہ‘ کرنے کا ارادہ ہے؟“ میرا سرا بھی تک جھکا ہوا تھا۔ ”میں نہیں جانتا کہ مناظرہ کسے کہتے ہیں۔ بلکہ میں نے اپنی پوری گی میں یہ لفظ بھی دو چار مرتبہ ہی سنا ہوگا۔ لیکن میں لڑے بنا ہا نہیں مان سکتا، کیوں کہ اب معاملہ صرف میری بات کا نہیں، بلکہ میرا ایمان، میرے عقیدے اور کامل یقین کا ہے۔ میں نے آج تک جو بھی اس ایمان سے لاپس ہے، وہ ساری جمع پونجی لگا کر بھی مجھے یہ آخری داؤ کھیلنا ہی ہوگا۔“ لیکن شاید قدرت کو میرا یہ آخری جواب بھی لہ نہ تھا۔

اگلے روز مجھے ایسی نے بتایا کہ پیٹر کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور اُسے اسی اسپتال کے انتقال خون والے بے کے وارڈ میں داخل کر دیا گیا ہے۔ گرو کے رُوحانی درس میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن ایسی کی رپورٹ، مطابق پیٹر کی حالت سنبھلنے میں کئی ہفتے بھی لگ سکتے تھے۔ زیادہ تھوڑی سی بات یہ تھی کہ پیٹر اب بھی بے ہوش تھا۔ وہ جیسے ہی چلے پھرنے کے قابل ہوا، گرو کی ہر اسی اختیار کر لے گا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ یہ لمحے بھی نہ ظالم ہوتے ہیں، جب ہم ان کے ٹلنے کی دعا کرتے ہیں تو یہ صدیوں میں ڈھل کر جنموں میں گھلتے ہیں اور ہم ان کے رُکنے کی آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں تب انہیں ہزاروں پر لگ جاتے ہیں۔ میرے نصیب کے ہارواز کرنے لگے اور آخر کار وہ رات بھی آجینچی جس سے پرے کا سورج میرے اور گرو کے فیصلے کا اعلان کر آتا۔ ماما اور پاپا میری بے چینی دیکھ دیکھ کر مزید پریشان ہو رہے تھے۔ پاپا نے حسب معمول براہ راست سوال کرنے کے بجائے صرف اتنا پوچھا کہ کیا وہ اور ماما میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟ میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ میں نے اُن کا اپنے کاندھے پر کھرا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ”میں ایک ایسی جنگ لڑنے جا

کو حکم دینے کا اہل ثابت نہ کر سکوں۔ تمہیں اپنی اس جنگ کے لیے اور بہت سے جان نثار مل جائیں گے۔ اگر معصوم لڑکے کو بخش دو۔ وہ اپنی کمزور بہن کا آخری سہارا ہے۔“ گرو کو جیسے میری بے بسی دیکھ کر لطف آ رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔ تو پھر ایک سودا کرتے ہیں۔ میں پیٹر کو منع کر دوں گا، لیکن اس کے بدلے تمہیں میرے ساتھ بیت المقدس چلنا ہوگا۔ بولو منظور ہے.....؟“ میرے اندر بیک وقت جیسے بہت سی بدشعور ہواؤں کے جھجک چلنے لگے۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی اور پھر میرے لب ہلے ”ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔ پیٹر کی جگہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ گرو کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی، لیکن ٹھیک اُس وقت اُس کے عقب سے ایسی کی تیز آواز ابھری ”نہیں، عبداللہ تمہارے ساتھ کہیں نہیں جائے گا۔ میں اپنے ایک بھائی کو بچانے کے لیے دوسرے کی قربانی نہیں دے سکتی۔ اگر پیٹر کی جدائی ہی میرا مقدر ہے تو یوں تو سہی۔“ گرو ایسی کی بے وقت مداخلت سے کچھ بد مزہ دکھائی دے رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے، جیسی تم لوگوں کی مرضی! وہ غصے سے مزار واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔ میرے ذہن میں جیسے کوئی گھنٹی بجی۔“ ”رکو..... اگر بات اختیار کر ہی ہے تو واقعی تمہیں اس وقت پورا اختیار حاصل ہے۔ اور اس اختیار کا گھنڈ بھی تمہارے انداز سے ظاہر ہے۔ تو پھر ایک بیمار اور کمزور لڑکے پر اپنی مرضی چلانے سے کیا حاصل.....؟ اگر تمہیں پیٹر کو ساتھ لے جانا ہی ہے اُسے ٹھیک کر کے کیوں نہیں لے جاتے۔ تم تو مسیحا ہو، پھر اپنی اس مسیحائی کا اعجاز اپنے ایک چاہنے والے کیوں نہیں آزماتے۔ یا تمہاری ٹیلی پتھی صرف لمحات اور کچھ دیر کے لیے مندل کرنے کا ہنر ہی جانتی ہے۔ پیٹر کے جسم میں تازہ خون نہیں بن رہا۔ اس حالت میں وہ منزل پر پہنچنے سے قبل ہی اپنی سانسیں ہار جائے گا۔ اگر اُسے تندرست کر دو تو میں خود تمہارا بے دام غلام بن کر رہوں گا۔ بولو منظور ہے یہ سودا.....؟“ میری بات سن کر وہ سودا گر پلٹا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ”تو گویا تم مجھے لکار رہے ہو۔ تم شاید یہ بھول رہے کہ سودا کرنے کا حق صرف فاتح کے پاس ہوتا ہے، اگر ہمت ہے تو لڑ کر فتح حاصل کر دو اور پھر اپنی مرضی کے فیصلے صادر کرنا۔“ گرو نے بڑی ہوشیاری سے پتے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں اس وقت ایک اپنی ہارڈ ہوئی فوج کا آخری اور تنہا بچا ہوا سپاہی تھا، جس کے سامنے جیتی ہوئی سپاہ کا سالار اپنے تمام ساتھیوں سمیت کھڑے ہو کر مذاق اڑا رہا تھا، اُسے اکسار ہاتھ کا یا تو وہ گھٹنے ٹیک کر پوری فاتح فوج کے سامنے ناک رگڑ کر معافی مانگے یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ہارے ہوئے سپاہی نے کراہ کر اپنی تھکن سے چور لکھ لکھ اٹھائیں۔ فاتح سپہ سالار جیت کے نشے میں جنگ کا ایک بنیادی اصول بھول گیا تھا کہ ہارے ہوئے کو اتنا ہارانا چاہیے، جتنی اس میں ہارنے کی سکت ہو، کیوں کہ ہر شکست کی آخری حد سے پرے ایک نئی جنگ چھپا ہوتی ہے۔ پھر چاہے لڑنے والا وہ ایک آخری بچا ہوا گھائل سپاہی ہی کیوں نہ ہو اور چاہے انجام میں اس سپاہی کو اپنے گھائل جسم میں ہزاروں تیروں کے نئے شکاف ہی کیوں نہ ملیں، سپاہی وہ جنگ لڑنا ضرور ہے۔ میں نے بھی لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ”ٹھیک ہے، اگر فتح صرف لڑ کر ہی ملتی ہے تو یونہی سہی۔ میں تیار ہوں۔“ ”مگر

ہم بڑی تیاری سے دعاؤں کی فہرست ذہن میں ترتیب دے کر اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں۔ ہمیں ہی سب بھول بھال کر کسی چھوٹے بچے کی طرح صرف ”بیٹھا“ مانگنے ہی پر اکتفا کیے رہتے ہیں۔ اپنے والے کی وسعت ہے کہ وہ پھر بھی ہم بے زبانوں کو، نادانوں کو، صرف ”بیٹھے“ کے لالچوں کو سب کی ت کے مطابق دیتا ہے، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری طلب، کبھی اس قابل نہ تھی کہ ہمیں کچھ عطا کیا جاتا۔

میں بھی ساری رات ہڑکتا رہا لیکن ڈھنگ سے کچھ مانگ نہ سکا، حالانکہ دینے والے نے اپنے سب ہی کے منہ کھول رکھے تھے۔ صبح لندن کا موسم بہت اداس تھا۔ برف کی تازہ جھڑی نے پرانے سفیدے پر پھیر دی تھی۔ باسی برف پر جب تازہ برف کی چادر پڑتی ہے، تو یوں لگتا ہے جیسے پرانی رضائی پر نیا لالاف ادا کیا گیا ہو۔ سہ پہر تک ایسی تین مرتبہ چکر لگا کر مایوسی سے سر ہلا گئی تھی۔ مطلب پیڑ کی حالت ابھی تک ل نہیں پائی تھی۔ جانے کیوں، میرے دل میں ایک نئے خدشے کے سانپ نے پھن پھیلایا، کہیں گردنے جنگ شروع تو نہیں کر دی۔ شام کو جب میں گردی رہائش گاہ جانے کے لیے نکلنے لگا، تو ماما اور بابا پہلے سے لی میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت اپنے ساحر کو تنہا نہیں جانے دیں گے، میں چپ ہی رہا۔ اندھیرا ہونے کے قریب ہم گردے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ باہر میڈیا کے رپورٹرز، اور ٹی وی چینلوں کے مایک دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھنکا۔ میں جانتا تھا کہ گردا اس موقع کی تشہیر سے نہیں چو کے گا۔

ایک بہترین موقع مل رہا تھا کہ وہ اسلام کے مقابلے میں اپنا عقیدہ اور مسلک کو فاتح ثابت کر کے اُس کے ذہن مزید تسخیر کر سکے۔ میں ہال میں داخل ہوا تو کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔ کچھ کچھ بھرے ہوئے کی ایک نشست بھی خالی نہیں تھی۔ لوگ دیواروں کے ساتھ، بالکنی میں اور نشستوں کے درمیان والی جگہ پر بھرے پڑے تھے۔ کیمروں کے زاویے اور فلش کی چکا چوند سے صاف ظاہر تھا کہ یہ سب کچھ ٹی وی سے راست بھی نشر ہو گا۔ گرد پہلے سے اسٹیج پر مایک سنبالے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے آواز بلند کر دیا۔ ”خواتین و حضرات..... آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ ہمیں جس شخصیت کا انتظار تھا وہ اب ہمارے ہاں ہے۔“ سارے ہال پر ہل بھر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور سب ہی کی نظر میکا کی انداز میں میری طرف مٹی۔ مجھے اپنی ریڑ کی ہڈی پر پسینے کی ایک بوند چھلکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ قدموں کے نیچے سے زمین جیسے کئی کئی۔ مناظرہ شرع ہو چکا تھا۔

رہا ہوں، جس کی ہار یا جیت پر شاید میری پوری زندگی کا انحصار ہے۔ یہ جنگ ہی اس بات کا تعین کرے گی کہ اب تک درست راستے پر تھا یا غلط..... میرے مستقبل کا فیصلہ بھی اسی جنگ سے ہو گا۔ مگر افسوس مجھے جنگ لڑنے کے لیے کوئی اوزار، کوئی ہتھیار میسر نہیں۔ مجھے خالی ہاتھ صرف اپنے یقین کے سہارے ہی پر لڑنا ہو گی۔ مجھے آپ دونوں کی دعا کی ضرورت ہے۔ اور بس۔“ پس منظر میں کھڑی ماما میری بات سن کر پڑیں۔ مائیں تو یوں بھی رونے کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں کہ ان کا واسطہ خوشی سے کچھ کم ہی ہوتا ہے، مگر نہ جانے کیوں اس پل میرے مضبوط پایا بھی اپنے آنسو چھپا نہیں پائے۔ میں نے تڑپ کر انہیں گلے لگایا۔ جب کہ بیٹا اپنے باپ کو تسلی دینے کے لیے اپنے سینے سے لگاتا ہو تو روفو گری کا باقی ماندہ کام قدرت خود سنبھال لے گا۔ آنسوؤں کا سیلاب آتا ہے۔ آہوں، ہچکیوں کے طوفان گزرتے ہیں اور آخر کار دل کے غبار دھل جاتا ہے۔ پتا بھی مجھ سے اپنی بیگنی ہوئی آواز میں صرف اتنا ہی کہہ پائے ”مجھے اپنے ساحر اور اس کے یقین پر نذر سے زیادہ بھروسہ ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس لڑائی میں اس کی جیت ہو یا ہار..... میرا بیٹا یہ جنگ اپنی پوری قوت اور ایمان داری سے لڑے گا۔ میں جانتا ہوں کبھی کبھی ہار یا جیت سے بھی زیادہ اہم جنگ لڑنا ہوتا ہے۔“ پتا مجھے تھکتے رہے۔ اس روز مجھے پتا چلا کہ جنگیں صرف ہتھیاروں ہی سے نہیں لڑی جاتیں۔ جنگ کا بنیادی عنصر ”حوصلہ“ ہوتا ہے اور یہ ہمت و حوصلہ ہمیں ہمارے ”اپنے“ دیتے ہیں۔

رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ باہر آسمان اور اندر کمرے میں میرا دل برسنے کو بے تاب تھا۔ آج کی رات میرے لیے بہت اہم تھی۔ اپنوں کے سامنے تو میں نے کسی طور بھرم قائم رکھ ہی لیا تھا مگر وہ اہم والا تو میرے من کی حالت جانتا تھا۔ سو میں نے کھڑکی کے قریب جائے نماز بچھالی اور پلکیں زمین پر بچھا کر سجے میں جس قدر گر گڑا سکتا تھا، اس سے بھی کہیں بڑھ کر گر گڑا لیا۔ ”یا خدا..... تو جانتا ہے کہ میں تیری کائنات کا سب سے حقیر ذرہ ہوں، لیکن میری کم ظرفی کی داستانیں آسمان سے بھی بلند ہیں۔ میری حقیقت سے اور میرے دل میں چھپے ہر چور سے بس تو ہی واقف ہے۔ میرے گناہوں کی فہرست کتنی بھی طویل سما، تیری بے کراں رحمت سے کم ہے۔ سو، میری منافقت بھری توبہ و معافی کو یہ جانتے ہوئے بھی قبول فرما کہ توبہ کرتے وقت بھی میرے دل کا چور مجھے تیری نافرمانی پر مستقل اکساتا رہتا ہے۔ پھر بھی تجھے تیرے پیارے نبی ﷺ کا واسطہ، میری راج رکھنا۔ میرے عیبوں پر اور میری جہالت پر پردہ ڈالے رکھنا۔ میرے مولا! تیرا ہی آسرا ہے، تو ہی عیبوں کا پردہ دار ہے۔ میری جھولی میں سو چھید ہیں، پھر بھی یہ جھولی تیرے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ اے بھروسے میرے مالک.....“ میں جس قدر گر گڑا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی اتنی ہی تیزی سے بہتی۔ اُس روز مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو دعا مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ اور آتا بھی کیسے مجھے آج تک دعا مانگنے ہی سب کچھ جو ملتا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ دعا صرف لفظوں سے مانگنے کا نام نہیں۔ اللہ کے سامنے تو دیے ہی ہمارے بہترین لفظ کھو جاتے ہیں۔ ہم بس ”غوں غاں“ ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور دعا کا وقت نکل

## مناظرہ

دفترا مجھے احساس ہوا کہ آج خصوصی طور پر ہال میں ایک بہت بڑی اسکرین بھی لگائی گئی تھی جس پر ذریعہ ہال کے آخری کونے میں بیٹھا شخص بھی آج کا تمام منظر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ دو شخص میرا ہاتھ تمام کر رہے تھے۔ مجھے اسٹیج پر لے گئے اور باقی دو نے مہما اور پیا کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھال لی اور انہیں لے کر ہال کے نیلگوں اندھیرے میں نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ گرد نے ”عبداللہ“ کے نام سے میرا تعارف کروایا۔ اسٹیج پر کیمروں کے فلش کی چکا چوند اتنی زیادہ تھی کہ مجھے سامنے ہال میں بیٹھے جھوم کا بس ایک دھڑا سا خاکہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ گرد نے بات کا آغاز کیا۔ ”آج ہم یہاں ایک عظیم اور مقدس مقصد کی تکمیل کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہے، جو میرے اور اپنے عقیدے کی جانچ کے لیے یہاں تک آیا ہے۔ سچ اور جھوٹ کی کسوٹی پر پرکھے جانے سے قطع نظر اور کسی بھی فیصلے کے اعلان پہلے میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اس شخص کی ہمت کا اعتراف کریں۔“ سارے ہال نے تالیاں بجا کر گرد کی بات کی تائید کی۔ ہال میں داخل ہوتے وقت میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ناظرین میں زیادہ تر تعداد نوجوان اور جو شیلے طبقے کی ہے، جو ذہنی طور پر پہلے ہی گرد کی فتح تسلیم کر چکے ہیں۔ بزرگ طبقہ، البتہ کچھ خاموش اور بے چین سادکھائی دیتا تھا۔ گرد کی تقریر جاری تھی۔ ”ہم دنیا میں صرف مذہب اور عقیدے کے لیے داروہو۔ ہیں اور وقت زرخست یہی ہمارا زادراہ ہوتا ہے۔ میں اپنے گزشتہ کئی لیکچرز میں وقت کا پہیہ رک جانے کی حقیقت بیان کر چکا ہوں۔ اور میرے عقیدے کے مطابق وہ گھڑی اب زیادہ دور نہیں، جو ہمارے لیے صدمہ اور سالوں کا وقفہ ہے۔ وہی وقت قدرت کے پیسے کے لیے بس ایک پل کی ساعت ہے۔“ گرد نے چھت فانوس کی صورت لگے ہوئے داؤدی ستارے اور اس کے اطراف کھینچی دو نیلی لکیروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”مقدس نشان دو جڑی ہوئی مثلثوں اور دو لکیروں سے مل کر بنا ہے۔ اس میں اوپر کی جانب اشارہ کرتی مثلث اس خدائے بزرگ و برتری عظیم الشان بڑائی کا استعارہ ہے اور اوپر والی نیلی لکیر آسمان پر خدا کی خدائی کو بیان کرتی ہے، ٹھیک اسی طرح نیچے کی جانب اشارہ کرتی مثلث اس ذات کا استعارہ ہے، جو آخر کار خداوند مرضی سے زمین پر آخری مسیحا کی صورت میں وارد ہوگا اور ہمیشہ کے لیے خدا کا قانون نافذ کرے گا۔“ اس مثلث کے نیچے والی لکیر اس روئے ارض پر موجود مسندروں کا استعارہ ہے۔ جہاں میری معلومات کے مطابق اس وقت وہ آخری مسیحا (دجال) وارد ہونے کے بعد خود کو دنیا کی نظر سے خفیہ رکھے ہوئے ہے۔“ بے خیا

امیری نظر بھی گرد کی انٹھی انگلی کے تعاقب میں اٹھ گئی اور اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ یہ تو مذے پر بنی ہوئی شبیہ تھی۔ ہاں، یہود کا جھنڈا زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس شبیہ کی تو جیسہ سمجھ میں آئی۔ وہی بات ختم ہو رہی تھی۔ ”میں ایک بار پھر آپ سب کو سچ کے سفر کی دعوت دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ہم سب اس سفر کے لیے روانہ ہوں، تو عبداللہ ہمارا ہم سفر ہو۔“ تالیوں کی شدید گونج میں گرد اپنی بات ختم کے پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہ آیا کہ اب مجھے دو قدم آگے بڑھ کر اپنا نقطہ نظر پیش کرنا ہوگا اور کے بعد اصل مناظرہ شروع ہوگا۔ ہال میں کچھ آوازے کسے گئے اور بوڑھوں نے میرے اپنی جگہ چپ پ جے رہنے پر کھانس کر اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور کوئی درمیانی نشستوں میں سے چلایا۔ ”آگے بڑھ کر اصفائی پیش کرو لو کہ..... ہم تمہیں سننے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔“ تب میرا ہاتھ ٹھکا اور میں کچھ یہ قہقہوں کی بازگشت میں قدم بڑھا کر مائیک کے قریب پہنچ گیا۔ میرے کھنکھارتے ہی ہال میں پھر سے نا سنا نا چھا گیا۔ میری زبان لڑکھڑائی۔ ”میرا نام عبداللہ ہے اور میں نہیں جانتا کہ ایسی محفل کے تقاضے کیا تھے ہیں۔ میں تو ابھی تک اپنے نام کی لاج ہی نہیں رکھ پایا تو ”آداب مناظرہ“ سے بھلا میری کیا واقفیت لی۔ مذہب اور عقیدے کی سچائی کے لیے لڑنے والے تو بہت عظیم لوگ ہوتے ہوں گے۔ مجھ پر تو ابھی ٹھیک رح سے منصب اور عقیدہ کھلا بھی نہیں، درود کی ٹھوکریں کھاتا ہوں یہاں تک پہنچا ہوں اور میرا واحد اثاثہ نجی صرف اور صرف میرا کامل یقین ہے۔ یقین اپنے مذہب پر، عقیدے پر اور اپنے خدا اور اس کے خزانہ نبی ﷺ پر اور میرا ایمان ہے کہ وقت کا پہیہ تھمے گا اور ضرور تھمے گا، مگر ابھی اس گھڑی میں ذرا دیر باقی ہے۔ میرا آخری مسیحا ابھی تک آسمانوں میں ہے اور وہ تب زمین پر بھیجا جائے گا، جب اُسے صلیب پر سے اندہ اٹھالینے والا میرا مالک حکم دے گا۔ مجھے بھی اس آخری جنگ کا پورا یقین ہے، البتہ میرا فاتح کوئی اور ہے۔ آسمانوں، زمینوں اور مسندروں کا مالک بس وہی میرا اللہ ہے، جو یہاں موجود ہر بندے کا (سچ) ہے۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو پورے ہال میں ایک تالی کی گونج بھی نہیں تھی۔ پھر ایک کونے سے کسی شخص کا جیولا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور تالی بجنے کی آواز اُبھری۔ کوئی بھرائی ہوئی آواز میں زور سے بولا۔ ”جیتے ہو سارے، تم جیتے ہو فرخ ہے۔“ اور پھر پیا کی تالیوں کی آواز میں مہما کے ہاتھ بھی شامل ہو گئے۔ کیا ہوا جو پورے ل میں میرا ایک حمایتی بھی نہیں تھا۔ میرے اپنے، مجھے جنم دینے والے عظیم ترین ماں باپ تو تھے۔ کیمروں کا سا مہمپا کی طرف ہو گیا۔ ہال میں گئی اسکرین پر مجھے دونوں کی آنکھ سے بہتے آنسو صاف دکھائی دیے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جلتی آنکھوں کو بچنے سے روکا۔ سپاہی جنگ میں رویا نہیں کرتے۔ ہال میں نگر گرگوشاں ہونے لگیں۔

گرد نے پہلے دور میں اپنا اثر کچھ زائل ہوتے دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھا۔ ”اب میں عبداللہ کو ہمارا دعوت دیتا ہوں کہ اگر اس کے پاس اپنے عقیدے کی سچائی کے حق میں کوئی بھی ثبوت، علم، معجزہ یا

ہن کے دوست اور وہ بادلوں کی بوریاں ڈھوتے معصوم فرشتے اب کہاں ہوں گے۔ میں اسی سوچ میں گرد کی آواز نے مجھے پھر سے اسی ہال میں پہنچا دیا۔ وہ آخری مریض کو شفا یاب کرنے کے بعد اب تہ دے رہا تھا۔ تب، عین اسی وقت میں نے ایک اور فرشتے کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ فرشتہ بے لیے کچھ ڈھوک لایا تھا اور میرے دل کی دھڑکن آج بھی اتنی ہی تیز ہو گئی، جتنی کبھی برف کے پہلے ہلکوں پر ٹہرانے سے ہوتی تھی۔ ہاں، وہ ایسی ہی تھی جو میری درخواست پر نہ جانے کس مشکل سے زہ پڑنے پہنچ کر اتنی خراب طبیعت کے باوجود اس ہال تک لانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ل کے سانے میں وہیل چیئر کے پیروں کی آواز گونجی تو سب ہی کی کیمروں کا رخ پیڑ اور ایکی کی دگیا۔ گرد نے بھی چونک کر ایکی کی جانب دیکھا اور جلدی سے عملے کو اُس کی مدد کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں، چیئر سمیت اسٹنچ پر موجود تھی۔ میرا دل کچھ ایسی تیزی سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پلسیوں کی دیوار توڑ نکل آئے گا۔ ہال میں پھر سے سرسراہٹیں ہونے لگیں۔ گرد کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر گڑی تھیں۔ میرے لے۔ ”میں گرد کے علم کا پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں۔ اور میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، جس سے گرد علم کی کسی ساخت یا قسم پر تبصرہ کروں، کیوں کہ اگر یہ ٹیلی پیتھی یا پیناٹزم کی بھی کوئی شاخ ہے تو بہر حال اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ میری گرد سے صرف اتنی درخواست ہے کہ وہ اس نڈھال لڑکے کو کبھی بکدے، جس کے جسم میں تازہ خون بننا بند ہو چکا ہے۔ یہ گھائل لڑکا پیڑ خود گرد کا بہت بڑا پرستار اور ہے اور گرد کے ساتھ اس کے اگلے دورے پر جانے کا خواہش مند بھی ہے۔ مجھے امید ہے گرد میری یہ بات رد نہیں کرے گا۔“ گرد کے چہرے پر پیڑ کے ہال میں آنے پر جو کشت تاثر ابھرا تھا، اب وہ ایک ث میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اُس نے مجھے یوں دیکھا جیسے بڑے بچوں کی کسی ”شرارت“ پر تنبیہ کرنے لے دیکھتے ہیں۔ وہ بولا۔ ”میں عبد اللہ کو پہلے بھی یہ بات کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ ات، انسان کو ان بیماریوں سے شفا یاب کرنے کا نام ہے، جو کسی روحانی پیچیدگی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ میں بھی انسان بظاہر کسی طبی بیماری کا شکار تو نظر آتا ہے مثلاً درد، بخار، جسم کی معذوری، فالج کے لہلہ، اصل میں ان تمام بیماریوں کی اصل وجہ انسان کے جسم کے اندر موجود روح کا گھائل ہونا یا زوج کی نہ ہے۔ روحانی علم سے ہم ایسی ہی بیماریوں کا علاج کرتے ہی اور روح کے مندل ہوتے ہیں جسم کی خود بخود دور ہو جاتی ہے، لیکن روحانی علاج کے ذریعے ہم خاص خاص جسمانی بیماریوں کو فوری طور پر کھٹکتے مثلاً اگر کوئی حادثہ، جسم سے چوٹ کی صورت میں خون بہنا، کسی جسمانی بیماری کی وجہ سے ناعضاء کی ٹوٹ پھوٹ۔ ایسی صورت میں پہلے مریض کو فوراً جسمانی طبی علاج کی طرف متوجہ کیا جاتا ہاں، البتہ ایسی صورت میں روحانیت اپنا کردار ضرور ادا کرتی ہے۔ پیڑ کی بیماری بھی خاص ایک جسمانی

کرشمہ ہے تو وہ پورے ہال کے سامنے پیش کرے۔ یا اگر وہ چاہے تو میں پہل کروں؟“ ہال میں موجود سب ہی افراد کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ ہال میں لگی اسکرین پر صرف میرے چہرے کو فوکس کیا جا رہا تھا۔ ”میں پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ میں یہاں ثبوت یا کرشمے کے بنا، صرف اپنے یقین کے بل پر آیا ہوں اور اگر میرا یقین سچا ہے تو اسے کسی معجزے یا کرامت کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس کوئی مخصوص علم بھی نہیں، جس کے ذریعے میں لوگوں کو مسخور کر سکوں۔ سچ تو یہ ہے کہ گرد نے روحانیت کی تعلیم کے دوران جتنا کچھ سیکھا ہے، مجھے اس کا عشر عشر بھی نہیں آتا۔ میں یہاں کسی سے مقابلے کے لیے نہیں آیا۔ بنا کسی ثبوت اور بنا کسی دستاویز صرف اپنے عقیدے کی سچائی بیان کرنا ہی میرا مقصد ہے۔ لہذا میں پہلے گرد سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام حاضرین کے سامنے اپنے وسیع علم کا مظاہرہ کرے۔“ گرد نے فاتحانہ انداز میں یوں میری طرف دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، ”تم نے تو لڑے بنا ہی آدھی بازی ہار دی۔“ ہال میں بھی جو لوگ کسی بڑے ”تمائشے“ کی امیدیں گھروں سے نکل کر آئے تھے، سب ہی کے چہروں پر مایوسی اور بددیہی چھانے لگی۔ ہال میں لگے کیمروں اسکرین پر ناظرین کے تاثرات جھلکیوں کی صورت پیش کر رہے تھے۔ پھر گرد کے عملے نے مریضوں کے نام اور ان کی بیماریوں کی تفصیل فہرست سے پڑھنا شروع کی اور یکے بعد دیگرے مختلف مریض اسٹنچ پر آکر گرد کی کراثی شفا سے فیض یاب ہونا شروع ہو گئے۔ لوگوں کی جبینوں سے گرد کی دو انگلیاں چھوتے ہی سارے دروازے کھنچاؤ اور تکالیف غائب ہو جاتیں۔ گرد نے مجھے پیش کش کی کہ اگر مجھے کسی قسم کا کوئی شک ہو تو آج کے دن کے لیے خصوصی طور پر معالجین کی ایک ٹیم بھی طلب کی گئی ہے، جو یہیں اسٹنچ پر دستی مشینیں لگا کر باقاعدہ مریضوں کی طبیعت سنبھالنے سے پہلے اور بعد کی رپورٹ پیش کر کے میرے شبہات بھی دور کر سکتی ہے، لیکن میں نے گرد سے کہا کہ مجھے اُس کی سیجا گری پر پورا یقین ہے۔ اسکرین ہر چند لمحے بعد ماما اور پاپا کے چہرے کے تاثرات فوکس کر رہی تھی۔ دونوں کے چہروں پر مجھے رفتہ رفتہ شدید پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے نظر آنے لگے تھے۔ دنیا کے کوئی بھی والدین اپنے نالائق ترین بچے کو بھی یوں بھری دینا کے سامنے شکست کھانا نہیں دیکھ سکتے کیوں کہ ہر ماں کے لیے اُس کا بیٹا دنیا کا سب سے بڑا فاتح اور ہر باپ کے لیے اُس کا لخت جگر سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن ہال کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت میرے والدین کو کچھ اور ہی آئینہ دکھا رہی تھی۔ ہال کے بڑے بڑے روشن دانوں سے باہر برف کے گالے لگتے نظر آ رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا، تو میں اور میرے دوست کو بیٹھ کر پیٹھ پیٹھ میں گھڑاے اپنے بچپن کے دبیر کے دوران، ان برقی شاموں میں گھنٹوں سر جھوڑے بیٹھ کر یہ سوچا کرتے تھے کہ آخر اللہ میاں نے صرف ہمارے محلے پر برف برسانے کے لیے کتنے فرشتوں کی ”ڈیوٹی“ لگا رکھی ہوگی اور فرشتے آخر کیسے اتنی بہت سی برف اکٹھی کر کے بور یوں میں بھر بھرا لے ہوں گے، اور پھر کسی بہت بڑی چھنی سے چھان کر ہم پر گراتے ہوں گے۔ ہم ان دودھیادلوں ہی کو فرشتوں کی بوریاں سمجھتے تھے، جسے وہ اپنی پیٹھ پر لادے رات بھر آسمان پر ڈھویا کرتے تھے۔ جانے وہ



اپنے اس عاجز گناہ گار، عاصی، منافق اور ریاکار بندے کا پردہ رکھ لے، رحم کر میرے مولا..... رحم  
 میرا ایک ہاتھ پیڑ کے سر پر تھا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی کسی تیز بارش کی طرح جاری  
 میں نے سحر کے توڑ کے لیے ہمیشہ سلطان بابا کو سورہ فاتحہ کے بعد چاروں قل پڑھتے ہوئے سنا تھا اور  
 نے مجھے بھی خصوصی طور پر یاد کرانے کے بعد ان چاروں قلوں کا ورد ہر امتحان میں جاری رکھنے کا حکم دیا تھا۔  
 رب تیزی سے اس وقت ہی یہ ورد دہرا رہے تھے..... قل یا ایہا الکفرون..... قل هو اللہ احد.....  
 عوذ برب الفلق..... قل اعوذ برب الناس..... جس تیزی سے میرے ہونٹ میرے دل کی آواز پر  
 ہے تھے، اتنی ہی تیزی سے میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ پیڑ کا جسم ابھی تک مختلف تاروں کے ذریعے ان  
 یں سے جڑا ہوا تھا، جو اس کی حالت کے بل بل کی خبر پورے ہال تک بذریعہ اسکرین پہنچا رہی تھیں۔ بند  
 دن کے پردے تلے مجھے کسی ڈاکٹر کے چلانے کی آواز آئی۔ ”پیڑ کا دل ڈوب رہا ہے۔“ اود میرے  
 ”..... ہال میں سراسیمگی سی پھیل گئی، جسے میں بند آنکھوں کے پردے تلے بھی خوب محسوس کر سکتا تھا۔ کوئی  
 ت زور سے چلائی۔“ اس لڑکے کو روکو، یہ پیڑ کو مار دے گا۔“ میرے لب مزید تیزی سے ہلنے لگے۔ پیڑ کی  
 میں اکھڑنے لگیں۔ ”روح کے سفید اور کالے قابضوں کے درمیان جنگ شدید ہونے لگی۔ ایسی کے رونے  
 آوازیں میری سماعتیں شل کر رہی تھیں۔ اس کی ڈوبتی فریاد ابھری۔“ مجھے تم پر بھروسہ ہے عبداللہ۔ میں نے  
 اوت پر قربان کیا۔“ میرے جسم کے مساموں سے پسینہ یوں تیزی سے بہہ رہا تھا، جیسے تیز طوفان اور شدید  
 ب کے دوران پانی چھوٹے ٹکاسوں سے سارے بند توڑ کر بہتا ہے۔ پھر کوئی ڈاکٹر زور سے چیخا ”اود  
 بے خدا۔“ بند کر دے سب کچھ..... مگر..... ٹھہرو.....“ میری گزارش جاری رہی۔ ”قل یا ایہا الکفرون  
 “..... ارے یہ لڑکا تو ابھر رہا ہے.....“ ”قل هو اللہ احد.....“ ”پیڑ کو جھکے لگ رہے ہیں.....“  
 ال اعوذ برب الفلق.....“ ”پیڑ کا بخار کم ہو رہا ہے۔“ ”قل اعوذ برب الناس.....“ ”پیڑ کا دل معمول پر  
 آیا ہے۔ اُسے ہوش آرہا ہے.....“ میری التجا اور ہال کے ہجوم کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں اور پھر  
 نماز سے چلائی..... ”یسوع مسیح کی قسم، پیڑ کے جسم میں سرخ خلیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔“ میں نے بے  
 ہو کر آنکھیں کھول دیں۔

ہال پر سکتہ طاری تھا۔ سب ہی کی نظریں اسکرین پر مرکوز تھیں۔ جہاں پیڑ کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی حالت کی  
 فیصل جگمگا رہی تھی۔ پیڑ وہیل چیئر پر بیٹھا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ خود اس کا جسم بھی پسینے سے تر  
 لڑک کو جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر سب سے پہلے امی کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ وہ روتے  
 سنے بھی تالیاں پیٹ رہی تھی۔ دُور سے میری ماں نے مجھے پکارا..... ”عبداللہ.....“ میں نے بیگلی پلکوں سے  
 ناکی جانب دیکھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ ممانے سلطان بابا کے دیئے ہوئے نام سے مجھے پکارا تھا۔ وہ خود  
 نماز اور وقار رو رہی تھیں۔ لیکن انہیں اور پاپا کو شاید اپنے آنسوؤں کا ادراک نہ تھا۔ ممانے دُور سے مجھے اپنی

بیاری ہے، جس میں ہڈیوں کے گودے کے پورا کام نہ کرنے کی وجہ سے جسم میں سرخ خلیوں کی پیدا  
 ہونے کے قریب ہے۔ یہ بیماری بھی ایک چوٹ کا نتیجہ ہے اور پیڑ جانتا ہے کہ گزشتہ تین ماہ سے طبعی علل  
 کہیں زیادہ اس کا دار و مدار میرے رُوحانی علاج پر ہی ہے۔ آج بھی میں رُوحانی عمل کے ذریعے پیڑ کی  
 کو اس حد تک ضرور مندل کر دوں گا کہ وہ اس ابتر حالت سے باہر نکل آئے اور پھر سے کچھ دن تک اپنی  
 بنا کسی رُوحانی درد اور تکلیف کے گزار سکے۔ ہاں البتہ اس کا طبی علاج جاری رہے تو مجھے اُمید ہے کہ پیڑ کی  
 اس بیماری سے چھٹکارا پائی لے گا۔“ گرو نے زیر لب کچھ پڑھنا شروع کیا اور وقفے وقفے سے اپنی دو انگلی  
 پیڑ کے ماتھے پر رکھ کر چھوٹتا رہا۔ چند لمحوں بعد ہی پیڑ کی حالت میں بہتری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔  
 میں لگی برقی اسکرین پر پیڑ کا چہرہ اور لڑکتی، دھیرے دھیرے کھلتی پلکوں کا منظر واضح تھا۔ گرو اب اپنی آنکھ  
 بند کر کے مکمل ارتکاز کرتے ہوئے بنال بھائے پیڑ کی رُوحانی مسیاجری میں مشغول تھا۔ میں نے آواز  
 جتنی مرتبہ پیڑ کو دیکھا تھا۔ جانے کیوں ہر مرتبہ وہ مجھے کسی سحر کے زیر اثر دکھائی دیا۔ ٹیلی پتھی اور پٹانم  
 جادو کی قسمیں ہیں۔ چند لمحوں میں گرو نے آنکھیں کھولیں اور پیڑ سے پوچھا۔ ”اب تم کیسا محسوس کر رہے  
 پیڑ.....؟“ ”پیڑ مسکرایا۔ وہ اب مکمل ہوش میں آچکا تھا۔“ ”میں پہلے سے بہت بہتر ہوں.....“ ہال نے بڑے  
 آواز سنستے ہی تالیوں کے شور سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ گرو نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا، جیسے کہ  
 ہو ”تم مکمل ہار چکے ہو۔ لہذا اب ہتھیار ڈال دو۔“ میں نے طبی ماہرین کی ٹیم کو اشارہ کیا، جنہوں نے چند  
 میں پیڑ کی تمام تر جسمانی حالت کی رپورٹ بیان کر دی۔ اسکرین پر بھی وہی تفصیلات لفظوں کی صورت  
 نمایاں ہونے لگیں۔ پیڑ کو ابھی تک بخار تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ زیادہ اور اُس کے فو  
 دباؤ بھی بڑھا ہوا تھا۔ ایک فوری معائنے کے ذریعے پیڑ کے جسم میں موجود تازہ سفید اور سرخ خلیوں کی  
 بھی بیان کر دی گئی، جو تازہ خون بناتے جسم کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ گرو کچھ حیرت اور  
 سے یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا، لیکن چپ رہا۔

اب وہ آخری بازی کھیلنے کا وقت آچکا تھا، جو میرے یقین کی پہلی اور آخری بنیاد تھی اور جس کے غلبہ  
 کی دیواروں پر کھڑی ہو کر میں نے اپنی زندگی کا یہ سب سے بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے آنکھیں  
 کیں اور میرا دل زور سے جیسے آخری بار دھڑکا، اندر سے آخری فریاد ابھری ”تیرا ہی آسرا ہے.....“  
 مولا۔“ بس تیرا ہی توکل ہے۔ میرے اعمال کو نہ دیکھ، میرے دل میں چھپے کسی منافق اور چور سے دُور  
 میری ریاکاری اور عیبوں کو صرف نظر کر دے۔ میرے گناہوں کو نہ دیکھ، اپنی رحمت جلوہ گر کر، اپنی رحمت  
 صدقے، پیارے نبیؐ کی رحمت کے صدقے، میرے امتی ہونے کے صدقے اور اپنی اس عظیم  
 شفقت کے صدقے کہ جس کے آگے ساری کائنات کے تمام جرم اور گناہ مل کر بھی ریت کے ایک حبیہ  
 جتنا وزن بھی نہیں رکھتے۔ بس، اُسی رحمت کی ایک جھلک دکھلا دے میرے مولا۔ آج تو ہی میرا پردہ

آنکھیں پونچھنے کا اشارہ کیا، جیسے وہ مجھے رونے سے منع کر رہی ہوں مگر خود وہ دونوں بھی تو رو رہے تھے اور جہاں  
ماں روتی ہے تو دنیا کا کوئی بھی بیٹا اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ چاہے وہ دنیا کے لیے کتنا ہی بڑا اور بہادر  
کیوں نہ ہوں پھر رفتہ رفتہ ہال کے پچھلے کونوں سے لوگ کھڑے ہونے لگے۔ تالیاں بجنے لگیں اور پھر کچھ  
دیر میں پورا ہال اس شور سے گونج رہا تھا۔ آج ایک بار پھر ایک انتہائی گناہ گار بندے کی التجا رد نہیں ہوئی تھی۔  
میرے سارے گناہوں اور کم ظرفی کے باوجود اُس کی عظیم الشان رحمت نے جوش مارا تھا۔ ڈاکٹر دوڑ دوڑ کر پڑ  
کا معائنہ کر رہے تھے۔ اور خود پیڑ بھی بیٹھی پکلیں لیے حیرت زدہ سا منگ کھڑا تھا۔ ایکی کبھی اُسے اپنے ساتھ  
لپٹائی اور کبھی میرا سر اور ماتھا چومتی۔ ماما سے رہا نہ گیا اور وہ دوڑ دوڑ کر میرے پاس چلی آئیں۔ پاپا بھی اُن کی تقلید  
میں اسٹیج پر چڑھ آئے تھے۔ ہال میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کیمروں کے زادیے، فرش کی کچا  
چوند، ٹی وی اور اخبار کے رپورٹرز کے بڑھتے مائیک، بیک وقت سینکڑوں سوال..... لیکن میرے پاس کوئی  
جواب نہیں تھا۔ میں اس قابل بھی کب تھا کہ کسی کو کوئی جواب دے سکتا۔ میں تو خود ایک سوال تھا..... سہرا  
سوال..... آج ایک بار پھر ثابت ہو گیا تھا کہ اُس کی رحمت ہمارے گناہوں سے متصل نہیں۔ بس، یقین کی کہ  
لا محدود ہونی چاہیے۔ اور رحمت طلب کرتے لمحے دل کو اتنا ہی عاجز، پاک اور منافقت و ریا سے مبرا ہونا  
چاہیے۔ جتنا کسی معصوم بچے کا دل دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے وقت ہوتا ہے۔ اگر مجھ جیسے نالی کے کپڑے کے  
لیے اُس کی رحمت کی یہ وسعت تھی تو پھر نیک اور پاک باز بندوں کے لیے یہ ابر کس قدر وسیع ہوگا۔ میری عقل  
اسے ماننے سے عاجز تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر بمشکل ہال کو خاموش رہنے کی التجا کی۔ کافی دیر بعد شور مچا، میری  
آنسوؤں سے لرزتی آواز ابھری۔ ”شروع اللہ کے نام سے، جو نہایت مہربان اور رحیم ہے۔ سب تعریفیں اُسی  
اللہ کے لیے ہیں، جو ہم سب کا مالک اور پالنے والا ہے۔ جس نے آج اپنے اس عاجز، گناہ گار اور ناکارہ  
انسان کی فریاد کی لاج رکھی۔ یہ کسی کی ہار ہے اور نہ کسی کی جیت۔ یہ تو بس ایک اشارہ ہے، فلاح کی جانب  
بڑھنے کا اشارہ..... خود اپنا راستہ طے کرنے کا اشارہ..... یہ کوئی معجزہ ہے نہ کوئی کرشمہ..... یہ بس اُس کی بے  
کراں رحمت کی چھوٹی سی ایک بوند ہے اور اُس کی نعمت ہمیں دن رات یوں تلاش کرتی ہے، جیسے اندھیرے کی  
تلاش میں روشنی کے جگنو..... اور یہ رحمت اور اُس کا کریم کسی ایک انسان کے جسم میں خون کے چند خلیے بڑھ  
جانے سے کہیں زیادہ اور عظیم تر ہے۔ میرا مذہب صرف سلامتی ہے اور سارے زمانوں کے لیے ہے۔ اور میرا  
پیغام آپ سب کے لیے، بس یہی رحمت ہے..... خدا ہم سب کو اس رحمت کا سایہ نصیب کرے۔“ میں اپنی  
بات ختم کر کے ماما، پاپا اور ایکی کو لیے اسٹیج سے اتر تو میرے باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ جہم  
بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی روتی ہوئی ماں کا سراپے کا نہسے سے لگا رکھا تھا۔ پاپا لوگوں سے درخواست  
کر کے راستہ بنا رہے تھے۔ اچانک میں اور گردو آسنے سا سننے آگئے۔ اُس کی آنکھیں سرخ اور آواز دہلی ہوئی  
تھی۔ ”تم نے میری برسوں کی بنی ساکھ اور محنت برباد کر دی۔ آج تمہیں بتانا ہو گا کہ تم کون ہو.....؟“ میں نے

اور حیرت سے اس گم راہ کو دیکھا، شاید دلوں کو آہنی پردوں سے ڈھک دیے جانے کی ایک مثال میرے  
انے کھڑی تھی۔ گردنے پھر اپنا سوال دہرایا، اس مرتبہ اس کا انداز ہجانی تھی۔ ”خدا کے لیے مجھے بتاؤ تم کون  
.....؟“ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا ”عبداللہ۔ اللہ کا ایک بندہ.....“ گردو اپنی جگہ جمادہ گیا اور ہم اسے  
اگر ہال سے باہر نکل آئے۔ باہر گرتی برف تیز ہو چکی تھی۔ لندن کی سڑکیں پھر سے دوبارہ برف سے ڈھک  
لی تھیں۔ چوراہوں پر میں نے بہت سے لوگوں کو اونچی عمارتوں پر لگی برقی اسکرینوں کے نیچے کھڑے ہال  
ماں ہوئی کارروائی پر بحث کرتے دیکھا۔ اسپتال میں پہنچنے سے پہلے شاید ہماری خبر پہنچ چکی تھی۔ اسی لیے ڈاکٹر  
برٹ سمیت بہت سا عملہ استقبال پر ہماری راہ تک رہا تھا۔ پاپا نے میری بیساکھیاں جانے کہاں پھینک دی  
میں اور میرا سارا بوجھ، اپنے جسم پر سنبھالے ہوئے تھے۔ ایکی کو جیسے پر سے لگے ہوئے تھے اور وہ بھاگ  
اگ کرسب کو ہدایات دے رہی تھی۔ ہمارے اپنے کمرے میں پہنچنے سے قبل ہی عملے کی ایک نرس تیزی سے  
لتی ہوئی میری جانب بڑھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ ”آپ کے ملک سے آپ کے لیے ضروری  
بس آیا ہے۔ اس پر اجنٹ کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔“ پاپا نے جلدی سے کاغذ لے کر اس پر نظریں دوڑائیں۔  
اجنٹ اسپتال میں سلطان بابا داخل ہیں، وہاں سے خبر آئی ہے کہ اُن کی حالت اتر ہے۔ تمہیں جلد از جلد ملک  
پہنچنے کی تاکید کی گئی ہے۔“ میرا جسم بے جان سا ہونے لگا۔ میں نے پاپا سے التجا کی۔ ”کل صبح کی فلائٹ  
ہے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ اس بار میری التجا رد نہ کیجئے گا۔“ پاپا نے گہری سی سانس لی اور اگلے روز ہم  
اکٹر البرٹ کے ہزار منع کرنے کے باوجود تھروائر پورٹ کے ٹرمینل پر موجود تھے۔ گاڑی سے اترتے ہی  
اپنی پہلی نظر جس شخص پر پڑی وہ گردو تھا۔

## ایک اور عبداللہ

نے ابھی کچھ مزید اندھیر اس کی تقدیر کے لیے بچار کھا تھا۔ آمنہ نے پیڑ کا ہاتھ تھاما اور اُسے میرے  
بکرا کر دیا۔ ”اور یہ رہا اس راستے کا ایک اور راہی۔ اس نے اپنے نام کا حق تمہارے لیے بچار کھا ہے۔  
اس کا نیا نام تجویز کر دو۔ جو اس راہ حق پر تاجر اس کے ساتھ رہے۔“ مجھے یوں لگا جیسے میری رُوح روشنی  
ردی گئی ہو۔ نور کے جھماکے میرے چہرے سے چھلک کر اُس پاس کھڑے لوگوں کے چہروں پر بھی  
ہو رہے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میری لندن آمد کا مقصد پورا ہو گیا۔ ہمارے گرد الوداع کہنے  
کی دائرہ نما بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی اور لاؤنچ میں لگے اسٹیکر، ہمارے جہاز کی روانگی کا آخری اعلان نشر کر  
تھے۔ میں نے پیڑ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ گرو کے اندر کا کرب شدید بے چینی کی صورت، اُس کے  
سے جھلک رہا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ چند لمحوں کے لیے اپنی ٹیلی جیٹھی کے ذریعے سارے ایئر پورٹ  
باتی اور ساعت سلب کر لیتا تاکہ وہ دلوں کے پلٹنے کی کرامت نہ دیکھ سکیں۔ لیکن آج گرو بے بس تھا کہ  
لڑائیں رونما ہوں تو تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں۔ پیڑ کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ میں نے اپنی تھیلی سے  
ذنب کی۔ ”آج میں پیڑ کو وہ نام دیتا ہوں، جس نے میری کاپیٹل کر رکھ دی۔ عبداللہ..... پیڑ آج سے  
نہ ہے۔“ سارا ایئر پورٹ تالیوں سے گونج اٹھا۔ عبداللہ نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ میرے سامنے میرا  
پاجم کھڑا تھا۔ ایک عبداللہ لندن سے پلٹ رہا تھا اور دوسرا اپنے اندر ایمان کی روشنی لیے فرنگ و یہودی  
لیوں کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، جہاں اب اُس کے لیے قدم قدم پر گرو جیسے فتوں کی سازشوں کا جال بچھا  
میں نے رن وے سے فیک آف کرتے جہاز کی کھڑکی سے آخری بار دُھند میں لپٹے لندن کو دیکھتے ہوئے  
دعا کی کہ ”یا میرے اللہ! ان دونوں بہن بھائی کی ہر مشکل آسان کرنا۔“

ایئر ہوسٹس نے اخبار میرے حوالے کیا اور میری ناگوں پر پڑا کبل درست کر کے آگے بڑھ گئی۔ جب ہی  
انٹرنیشنل انگریزی اخبار کی ایک ذیلی سرخی پر جیسے جم ہی گئیں۔ ”فلسطینی مسلمانوں کا قبلہ اول کے  
لڑھوئی غیر قانونی کھدائی کے خلاف یروٹلم کی سڑکوں پر مظاہرہ.....“ میں نے جلدی سے پوری خبر پر نظر  
دالی، جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ برسوں سے یہودی کسی نہ کسی بہانے بیت المقدس کے گرد کھدائی جاری  
کے ہوئے ہیں، جس کا واحد مقصد ”ہیکل سلیمانی“ کی تلاش تھی صیہونیوں کا ایک گروہ اس بات پر یقین رکھتا  
تھا کہ ان کا مقدس ترین نشان یعنی ”ہیکل سلیمانی“ اسی قبلہ ازل کے نیچے کہیں دفن ہے، لہذا اس تک پہنچنے کا  
بیت المقدس کی بنیادوں سے ہی ہو کر گزرتا ہے۔ اس تلاش کے لیے انہیں (نعوذ باللہ) بیت المقدس کو  
نا ضروری تھا۔ میرے ذہن میں گرو کی آواز گونجی ”میری اور تمہاری آخری ملاقات بیت المقدس میں ہو  
گئی۔“ جانے کیوں میں نے اس لمحے اپنی رگوں میں ایک عجیب سی بے چینی پھیلی محسوس کی، اور پھر اس بے چینی  
تک میرا اچھا نہیں چھوڑا، جب تک جہاز کے پیہوں نے میرے شہر کی زمین کو چھو نہیں لیا۔ ایئر پورٹ  
نکلنے ہی مجھے سلطان بابا کی فکر نے یوں گھیرا کہ دنیا کی ہر یاد جیسے ذہن سے محو ہو گئی۔ ہم ایئر پورٹ سے

میں گرو کو دیکھ کر چونکا، دُور کہیں پس منظر میں مجھے ایسی اور پیڑ کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے الوداع کہنے  
کے لیے اسپتال کے سارے عملے سمیت ایک جہوم بے کراں اس وقت بیتھرو ایئر پورٹ پر موجود تھا۔ گرو میری  
جانب بڑھا۔ ”تم نے واپسی میں بہت جلدی دکھائی۔ میرا خیال تھا تم کچھ دن مزید لندن میں بتاؤ گے تاکہ اپنی  
فتح کا لطف لے سکو..... لیکن میری توقعات کے برعکس شاید تمہیں ہر فتح کے بعد آگے بڑھ جانے کی عادت  
ہے۔“ میں نے غور سے گرو کی جانب دیکھا۔ ”تم اپنے ہر گزرتے دن کو یونہی فتح اور شکست کے پیمانے  
پر جانچتے رہے تو زندگی بہت مشکل ہو جائے گی تمہارے لیے صرف جیت اور ہار سے بہت بڑھ کر یہ ہے  
حیات۔ وقت ملے تو کبھی سوچنا۔“ میں آگے بڑھنے لگا لیکن گرو کی ڈوبتی آواز نے میرے قدم پھر روک  
دیے۔ ”میرے لیے میرے عقیدے کی فتح سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے لڑکے۔ اور میں آج تمہیں یہی بتانے  
کے لیے یہاں آیا ہوں کہ میری اور تمہاری ایک آخری جنگ ابھی باقی ہے۔ اور جانتے ہو، یہ جنگ کہاں ہوگی  
یروٹلم میں۔“ میں چونک کر پلٹا۔ ”یروٹلم میں.....؟“ ”ہاں، بیت المقدس میں۔ میرا گمان کہتا ہے کہ تم سے  
میری اگلی ملاقات فلسطین میں ہوگی۔“ جانے کیوں اس لمحے گرو کی آنکھوں میں مجھے اُس زخمی بھیڑنے کی ایک  
جھلک دکھائی دی، جس کے بچوں سے میں اُس وقت شکار چھین لیا گیا ہو، جب وہ اپنی کھجار میں معصوم سمیٹے کو  
چیز پھاڑ کرنے کی تیاری میں ہو۔ اور تب ہی مجھے اپنے عقب سے سمیٹنے کی آواز سنائی دی۔ ”عبداللہ..... تم لپٹ  
ہو رہے ہو میں۔“ پیڑ اور ایسی بھیڑ کو چیرتے ہوئے میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ دُور ماماچا، ڈاکٹر البرٹ اور  
عملے سے رخصت لے رہے تھے اور ڈاکٹر البرٹ اس آخری لمحے میں پاپا کو میرے لیے برتی جانے والی ہدایات  
کی فہرست دہرانے میں مصروف تھے۔ ایسی کی سدا برسنے والی آنکھیں آج بھی بن بادل برسات لیے تیار  
کھڑی تھیں۔ جانے یہ بہنیں اتنا بہت سائیکین پانی کیسے جمع رکھ لیتی ہیں ان کٹوروں میں۔ میں نے پیڑ کا کار  
درست کیا۔ ”کیسے ہو کھلنڈرے لڑکے؟ اپنا بہت خیال رکھا اور ایسی کا بھی۔“ پیڑ کی آواز مجھے کہیں دُور سے آتی  
محسوس ہوئی۔ ”وہ اب ایسی نہیں رہی، آمنہ بن چکی ہے۔“ مجھے یوں لگا، جیسے سارا ایئر پورٹ ہی پل بھر میں  
رنگ و نور کی بارات میں نہا سا گیا ہو۔ ”کیا.....؟ آمنہ.....“ میں ایسی کی جانب پلٹا۔ اُس کی آنکھیں برس رہی  
تھیں۔ ”ہاں عبداللہ! میں نے سچ کی وہ راہ پالی ہے، جس کی ایک جھلک تم نے گزشتہ رات پورے لندن کو  
دکھائی تھی۔ دعا کرنا میں ثابت قدم رہوں۔“ میں نے گرو کے چہرے پر کالی آندھی سی چلتی دیکھی۔ لیکن شاید

وقت تو میری معذوری اور بیساکھیوں کے سہارے کا بھی سارا زمانہ شاہد تھا۔ دیوانے کو تو چلتے پھرتے بھی برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ سو جنوں اگر بیساکھیوں پر اپنا وجود گھسیٹتا پھرتا ہو تو پھر کسی بھی ہوش مند کو اپنے قدم روک ہی لینے چاہئیں۔ لیکن کیا میری زہرا بھی ایسی ہی تھی۔ وہ صرف ایک بار مجھے اشارہ تو کرتی، میں خود اپنا بوسیدہ جسم لے کر ہمیشہ کے لیے اُس کی دنیا سے دور چلا جاتا۔ آخر، اُس نے ساحر کو اتنا کمزور کیوں جانا۔ جب میں اپنی ہر سانس اُس کے نام کر چکا تھا، تو پھر خود اپنے ہاتھوں سے اپنا دم گھونٹنے میں بھلا مجھے کیا مشکل ہوتی۔ صرف ایک بار..... بس ایک بار وہ اپنے ابرو گر کر اشارہ تو کرتی، میں جس قدر سوچتا رہا، اُسی قدر میرے اندر کی اُلجھی ڈوریں مزید اُلجھتی گئیں۔ جب تک میں واپس سلطان بابا کے کمرے کے باہر والے برآمدے تک پہنچا، تب تک رات اسپتال کے دروازے پر پوری طرح اپنی سیاہی مل چکی تھی۔ ہم انسان کتنے بھولے ہوتے ہیں۔ روشنی کے چند فانوس اور برقی قہقہے جلا کر اور ان کی مکمل روشنی کے دائروں میں بیٹھ کر یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ہم نے ”رات“ کو شکست دے دی۔ ہم کبھی نہیں سمجھ پاتے کہ رات تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ تو بھلا ازل کو کیسی شکست۔ میرے اندر کی رات بھی ازلی تھی۔ میرے اندر کے اندھیرے بھی سدا کے لیے تھے۔ اچانک ایک ڈاکٹر کی آواز اس اندھیرے میں کسی جگہ کی طرح لپکی۔ ”آپ کے مریض کو ہوش آرہا ہے، جلدی کریں۔ یہ ہوش کا وقفہ نہایت عارضی بھی ہو سکتا ہے“ میں تیزی سے اٹھا۔ میری بیساکھی چپکنے فرش پر پھلتی اور میں گرتے گرتے بچا۔

جس وقت میں سلطان بابا کے کمرے میں داخل ہوا، تب تک وہ اپنی پلکیں دھیرے دھیرے کھول چکے تھے۔ میری بیساکھی پر اُن کی نظر پڑی تو اُن کی آنکھوں کا وضو ہو گیا۔ میں نے تڑپ کر اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں قلم لیا۔ ”کیوں ستاتے ہیں آپ مجھے اتنا۔ جلدی سے ٹھیک کیوں نہیں ہو جاتے۔ عبد اللہ بہت تھک گیا ہے۔ اسے اور نہ رلائیں۔“ انہیں چپ کراتے کراتے خود میری آنکھیں برسنے لگیں۔ سلطان بابا کو فضاہت کی وجہ سے بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔ اُن کی سرگوشی نما آواز ابھری۔ کیا ہے میاں.....؟ رلاتے بھی خود ہو اور الزام بھی ہم ہی کو دیتے ہو۔ یاد رہے، جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سوسو ہوتا ہے۔ تمہیں ابھی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا ہے۔ ابھی سے عبد اللہ تھک گیا تو پھر.....“ اُن کی آواز ڈوب سی گئی۔ میں جو اُن کے سینے پر سر رکھے رو رہا تھا، گھبرا کر جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اُن کی پلکیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے ڈاکٹر کو پکارا۔

نرس دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر سلطان بابا کو پھر سے آسجین اور مختلف انجکشن اور ڈرپ کے کیولا ز سے لا دیا گیا۔ میں بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹا دوں کمرے کے ایک کونے میں بے دم رہ بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اگر ہماری رُوح ہی سب کچھ ہے، تو پھر ہمیں اس نازک اور خستہ جسم کے اندر قیامت کیوں کر دیا گیا ہے۔ ہمیں رُوح کی صورت ہی کیوں نہیں بھیجا گیا، اس فانی دُنیا میں۔ یہ روز روز اپنوں کے

سیدھے اسپتال پہنچے تو پتا چلا کہ سلطان بابا ابھی تک کمرے میں ہیں۔ ماما پتا جانتے تھے کہ میں اب اسپتال ملنے والا نہیں، لہذا وہ میری ضرورت کا سامان لینے گھر روانہ ہو گئے۔ میرے قدم اب میرا بوجھ سہارا بن گئے۔ لیکن کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹر البرٹ نے مزید کچھ روز کے لیے مجھے بیساکھی کا سہارا لینے کی تاکید کی تھی۔ میری ایک بیساکھی اب بھی راہ داری میں پڑے بیچ کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی، جہاں میں چپکھٹا ہوا ہوں۔ سے بیٹھا ڈاکٹروں کے سلطان بابا کے کمرے سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے بالکل سامنے والی دیوار شیشے کی قد آدم کھڑکیوں کا سلسلہ اس طرح سے جڑا تھا کہ باہر پھلتی پھٹتی شام کے ڈیرے دھیرے دھیرے طویل برآمدے میں بھی اترتے محسوس ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی شام کچھ اس طور ڈھلتی ہے کہ ہمیں اپنے سمیت سب کچھ ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ زوال چاہے بھر پور دن کا ہو یا پھر کسی بھی عروج کا، ہمیشہ اُٹا جاتا ہے۔ میں بھی اُس ڈھلتی شام میں اُداسی کا گہرا نیلا رنگ اپنی نگوں میں اترتے محسوس کر رہا تھا۔ اچانک مجھے باہر کی جانب مل کھاتی اسپتال کی مرکزی سڑک پر ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ کون تھا وہ؟ اچانک ذہن دوسرا جھماکہ ہوا۔ ”ارے..... یہ تو انور تھا۔ زہرا کی مرشدین کا ڈرائیور۔“ میرے قدموں میں جیسے بجلی سی۔ اور میں بیساکھی بھول بھال کر لڑکھڑاتے قدموں سے باہر کی جانب لپکا۔ ایک نرس میری دیوانگی دیکھ کر ہلکا مٹی اور جلدی سے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے ایک جانب رکھ کر میری بیساکھی میرے حوالے کرنے لگی۔ لیکن وقفے میں انور میری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں اس نیم اندھیری سڑک پر ڈور تک بیساکھی تقریباً دوڑتا چلا گیا، لیکن اُس پاس گزرتے چروں میں مجھے انور کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں انور ہی کو دیکھا تھا۔ اچانک ذہن میں ایک نئے خیال نے گھنٹی بجائی اور میں جلدی سے اسپتال کی پارکنگ جانب لپکا، لیکن شاید تقدیر ہمیشہ تدبیر سے دو قدم آگے چلتی ہے، اور میں قسدا کا تقدیر کا مارا تھا۔ لہذا جس دن میں زہرا کی کالی مرشدین کار کی تلاش میں پارکنگ میں مارا مارا بھٹک رہا تھا، میں نے انور کو سفید رنگ کی ایک ایم ڈبلیو میں پارکنگ کے آخری گیٹ سے نکلنے دیکھا۔ میرا ہوا میں اٹھا ہاتھ اٹھایا رہ گیا، لیکن گاڑی مجھ اتنی دُور تھی کہ میں صرف ہونٹ ہلا کر رہ گیا اور آواز کہیں اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ شاید کار کی پچھلی نشست پر نے کسی کا ہولنا بھی دیکھا، لیکن کون، شاید وہ زہرا ہی ہوگی۔ میری آنکھوں سے دو آنسو بے اختیار نکلے پارکنگ کے چکیلے فرش پر کہیں لڑھک گئے۔ جن آنسوؤں کی قسمت میں کسی دلبر کا شانہ نہیں ہوتا، وہ یونہی فنا میں مل کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں۔ کاش میں بھی کسی کی آنکھ کا ایسا ہی ایک فانی آنسو ہوتا۔ جس کے لیے میں ساری دنیا کا سفر طے کر کے واپس یہاں تک پہنچا تھا، وہ آج بھی مجھ سے اتنی ہی دُور تھی۔ میری پہلی نظر کی خطا والے لمحے میں تھی۔ لیکن ایسی کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ جس نے اُس کو میری خبر لینے سے روک رکھا۔ کہیں ماما کے خدشات سچ تو نہیں تھے۔ ایک دیوانے ہوتے جنوں کے لیے کون اپنی عمر بے ادب کو تیار ہوگا۔ فرزا لگی کا یہی تقاضا ہوگا کہ خاموشی سے اپنا دامن چھڑا لیا جائے۔ اور پھر یہاں سے لندن جا



اُڑا۔ کارنے زور کی بریک لگائی۔ ڈرائیور غصے میں بکنا جھٹکا گاڑی سے اُترا۔ ”مرنے کا ارادہ ہے یا؟“ میں نے اپنا خاک آلود چہرہ اُپر اٹھایا۔ ”مار ہی ڈالو، لیکن دھیان رہے کہ پوری موت دینا۔ تڑپتے اے نہ چھوڑ جانا؟“ انور کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔ وہ تڑپ کر میری جانب لپکا۔ ”ارے..... ساحر بابا.....“ یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ آپ نے.....“ انور نے جلدی سے اپنی جیب سے رُومال نکال کر میرے چہرے پر خاک صاف کی۔ کاش قدرت ایسے رُومال بھی بنا دیتی جو ہمارے مقدروں پر پڑی گرد بھی جھاڑ سکتے۔ انور نے جلدی سے گاڑی ایک جانب پارک کی اور میرے قریب اُسی بیچ پر آ بیٹھا، جہاں میری بیساکھی پڑی ہوئی تھی۔ وہ رو پڑا ”ساحر بابا..... یہ کیا.....؟“ آپ ابھی تک.....؟“ میری کئی زبان پر آئی گئی ”ہاں..... میں ابھی تک معذور ہوں..... کیا تم بھی اپنی مالکین کی طرح معذروں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے؟“ انور نے جلدی سے بے ہاتھ جوڑے ”میرے بچے آپ پر قربان ہوں ساحر بابا! ایسا کیوں کہا آپ نے.....؟“ پھر نہ جانے کیوں خود ہی کچھ کہتے کہتے چپ سا ہو گیا۔ شاید وہ میرا دعا کچھ گیا تھا۔ ”کیا آپ کی زہرابی بی سے ملاقات نہیں ہوئی؟“ میں رو ہانسا ہو گیا۔ ”نہیں انور..... تمہاری زہرابی بی مجھ سے کہیں کھو گئی ہے۔ کیا تم مجھے اُس سے ایک باتوا سکتے ہو.....؟“ انور کچھ دیر چپ رہا پھر اُس نے دھیمے لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ اب زہرا کے ہاں نوکری نہیں کرتا۔ کسی ذاتی مجبوری کی وجہ سے اب وہ شہر کے معروف صنعت کار، کمال صاحب کے ہاں ڈرائیور تھا اور پینڈی بی ایم ڈبلیو بھی انہی کی تھی۔ انور یہاں اپنے مالک کے کسی جاننے والے مریض کے لیے کھانا وغیرہ لے آتا تھا۔ مجھے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ انور مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے اُس سے زہرا کا پتا پوچھا۔ کیوں کہ اُس کے پرانے گھر پر سوائے نوکروں کے اور کوئی شخص موجود نہ تھا۔ انور نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ زہرا کے لبا کا اسی شہر کے مضافات میں ایک اور بہت بڑا بنگلا ہے، جو سالوں سے بند پڑا تھا، لیکن کچھ عرصہ پہلے ہانک نہ جانے کس وجہ سے برسوں سے بند پڑے کوڑکھول کر پھر سے تازہ قلمی پھروائی گئی اور سب ہی گھر والے وہاں منتقل ہو گئے۔ میں نے لمبی سی سانس لی، تب ہی زہرا کے پرانے گھر پر ہمارا فون اٹھانے والا بھی لٹی نہیں بچا۔ انور کی آنکھیں بار بار چھلک جاتی تھیں۔ اُسے میرے ساحرے عبداللہ بننے تک کا پورا احوال معلوم تھا اور یہ انور ہی تھا، جس کی گاڑی دیکھ کر میں پہلی مرتبہ درگاہ پر رُکا تھا۔ میں نے انور سے زہرا کے گھر سے گھر کا پتا پوچھا۔ وہ کچھ ہلکایا۔ ”آپ وہاں نہ جاؤ ساحر بابا..... میرا مطلب ہے پہلے آپ پوری طرح لگ ہو جاؤ۔ پھر جانا۔ ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے غور سے انور کو دیکھا ”تم جانتے ہو انور، ہزار جنوں اُس مقام پر ہے، جہاں مجھے منزل تک پہنچنے کے لیے راستوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں جس راستے پر بھی چلوں وہ راستہ خود مجھے زہرا کی چوکھٹ پر پہنچا دے گا۔ تم اگر مجھے آزمانا چاہتے ہو تو یونہی سہی۔“ لٹ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ انور نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ساحر بابا..... میں آپ کو بھی خوب جانتا ہوں اور آپ کی دیوانگی کو بھی۔ میں نے آپ کی نظر کی تپش سے سخت فولا دو کھٹکتے دیکھا ہے۔ لیکن میری آپ

پھڑنے اور اُن کے جسم کے تڑپنے کی تکلیف سے تو نجات مل جاتی ہمیں۔ یہ کیسی سزا دے دی تھی قدرت نے ہمیں اس جسم کی قید کی صورت میں۔ میں ساری رات سلطان بابا کو جسم کی قید کی یہ سزا کھٹکتے دیکھتا رہا۔ اُن کی سانس رُک رُک کر اور کچھ اس اذیت سے سینے کے بنجر سے نکل رہی تھی کہ خود مجھے اپنے پیچھے ہڈوں میں بیک وقت ہزاروں چھریاں کھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی حلق سے سانس بھی کچھ اس طور نکلتی ہے، جیسے جسم سے رُوح۔ شاید وہ رات میری زندگی کی سب سے بھاری رات تھی۔ صبح تک خود میری رُوح بھی نہ جانے کتنی بار جسم سے نکل کر واپس اس قید خانے میں داخل ہوئی۔ صبح کا اُجالا پھیلنے تک سلطان بابا کی طبیعت ذرا سنبھل توئی میں بھی باہر برآمدے میں نکل آیا۔ مہمان ناشتا لیے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے مہمان کی طرف دیکھا۔ وہ میرا دعا سمجھ گئی، لیکن اُن کی نظر جستجی چلی گئی۔ اور میں اُن کے کچھ کہے بنا ہی سمجھ گیا کہ اُن کا زہرا سے اب تک کوئی رابطہ نہیں ہو پایا۔ اب تو یہ سوال خود ایک بوجھ بنا جا رہا تھا۔ میں نے انور کا ذکر نہیں کیا۔ ناشتا کیا کرنا تھا میں مہمان کے اصرار پر چائے کے کچھ کھونٹ حلق سے نیچے اُنڈیل کر دیں برآمدے کے بیچ پر اُن کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا اور نہ جانے کس پل میری آنکھ لگ گئی۔ یہ ماں کی گود بھی کس قدر نشی ہوئی ہے۔ اندر چاہے کتنا ہی بڑا درد کیوں نہ پل رہا ہو، تھک تھک کر بن بولوں والی مٹھی لوری سنا کر سلائی دیتی ہے اور یہ مائیں بھی اپنی گود میں سر رکھے اپنے لاڈلے کے لیے کیسی سنگ مرمر کی صورت بنے بیٹھی رہتی ہیں۔ مجال ہے ذرہ برابر بھی جنبش ہو جائے ان کے جامد وجود میں۔ میری ماں بھی یونہی اکڑی بیٹھی رہی، تب تک، جب تک میری پلکیں دھیرے دھیرے دوبارہ کھل نہیں گئیں۔

دو پہر ہو رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ مہمان کے گالوں پر اُن کے بچے آنسوؤں کی دھاریاں اب بھی موجود تھیں۔ میں نے جلدی سے اُن کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا ”آپ رورہی تھیں۔ اتنی دیر ہو گئی مہمان۔ آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں.....؟“ وہ مسکرا دیں۔ ”بڑی مشکل سے اپنے آنسو تمہاری پلکوں پر گرنے سے روکے رکھے میں نے۔ میرا عبداللہ برسوں بعد میری گود میں سر رکھ کر سویا تھا، کیسے جگا دیتی.....؟“ مہمان مجھے ساحر کی جگہ عبداللہ کے نام ہی سے پکارتی تھیں اور میں جانتا تھا کہ وہ اپنے سیاہ نصیب بیٹے کے کالے مقدروں پر آنسو بہا رہی تھیں۔ سلطان بابا اُسی طرح اپنے کمرے میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ میں شام سے ذرا پہلے کسی شکستہ اُمید کی آس لیے پارکنگ کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے بچے ایک بیچ پر آکر بیٹھ گیا۔ بھکاریوں کو تو سودا راہ میں بیٹھے رہنا ہوتا ہے۔ چاہے بھیک کا سکہ کشکول میں پڑے یا خالی کشکول لے کر ہی رات گئے گھر واپس لوٹنا پڑے۔ میں بھی اپنے نصیب کا خالی کشکول لیے، تقدیر کی راہ پر بیٹھا اندر آنے والی ہر گاڑی کو اُسی نظر سے دیکھنے لگا، جیسے کوئی گداگر چپکتے سکوں کو دیکھتا ہے اور پھر میرے نصیب کا سکہ چمکا۔ میں بیجان انداز میں کھڑا ہو گیا۔ سفید بی ایم ڈبلیو نے لبا سا موڑ کا انا اور پارکنگ کی جانب بڑھی۔ میں تیزی سے سڑک کی جانب لپکا۔ جلدی میں بیساکھی مجھ سے چھوٹ گئی اور میں منہ کے بل ٹھیک اُسی گاڑی کے سامنے

## جانشین

سے التجا ہے کہ ابھی وہاں نہ جاؤ، جہاں تک میری معلومات ہیں، اس ماہ زہرا بی بی کی مٹکنی کی تیاری ہے۔ پر..... خرم میاں اسی شہر کے ایک بڑے رئیس کی اکلوتی اولاد ہیں۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں، آپ وہاں نہ جائیں۔ اسی میں شاید سب کی بھلائی ہے۔“ انور نہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا لیکن میرے کانوں میں وہ پہلا ایک ایسا پگھلا سیسہ انڈیل چکا تھا کہ جس کے بعد میری سماعتوں کو اور کچھ سننے کا چارہ ہی نہ تھا میں وہیں ٹھہر ڈھے گیا۔

جاتے جاتے انور میری حالت کے پیش نظر مجھے زہرا کے دوسرے مکان کا پتہ دے گیا بلکہ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ خود مجھے وہاں لے کر جائے گا لیکن اب بھلا میرا وہاں کیا کام تھا۔ میرا ہم سفر تو اپنی راہ بدل چکا، پھر وہاں جا کر اُس کی راہ کھوٹی کرنے سے بھلا کیا فائدہ۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے ہمیشہ سے اپنی وفا کی باتیں دینے والے بہت بُرے لگتے تھے۔ جیسے وہ اپنے کسی اُن مول جذبے کی توہین کر رہے ہوں۔ وہ وفا ہی کیا، جسے زور اور دہائی دے کر بیان کرنا پڑے۔ اگر دنیا کا بازار ہی کھوٹا ہے تو پھر اپنے وفا کے چمکتے سکے کی بے رخی کرنا فضول ہی تو ٹھہرا۔ بے وفا کی سولی چڑھنا ہی مقدر ہو تو پھر خاموشی سے چپ چاپ یہ پھندا اپنے گلے میں ڈال لینا چاہیے۔ چیخ و پکار کر کے اور زمانے بھر کو اپنی زسوائی کا تماشا دکھا کر خود کو کم ظرف ثابت کرنا کئی کئی گوارہ نہ تھا لیکن یہ دل..... ہاں..... یہ دل ہی تو ہمیں عرش سے فرش پر لا پھینکتا ہے۔ ہماری خودداری،..... ہمارا سب کچھ، اسی دل کے پاس ہی تو گروی پڑا رہتا ہے۔ تب ہی یہ ہماری انا اور خودداری کے سودے پر بازار کرتا پھرتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے ہم جس ارادے کا اٹل فیصلہ کر کے سکون کا ایک سانس بھی پوری طرح نہیں لے پاتے کہ دوسرے ہی لمحے یہ ہمارا فیصلہ بدل دیتا ہے۔ ہمیں پھر سے اُس بے چینی اور اُسی تڑپ کی تنگی بھجوں کے جنگل میں لا پھینکتا ہے، جہاں پل پل مرنا ہی ہمارا مقدر ٹھہرتا ہے۔ ہم لوگوں کی اور خود اپنی نظر میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ بار بار فیصلے بدلتے ہیں، ارادے باندھتے ہیں، پھر توڑ دیتے ہیں، لیکن کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ خود اپنا آپ بچ کر بھی ہم اس دلبر کو جیت نہیں سکتے، جس کے لیے ہم اپنے اس دشمن دل کے ہاتھوں کو زلت ٹھگت رہے ہوتے ہیں۔ میں بھی پوری رات اُسی عذاب سے گزرتا رہا۔ ایک پل میں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کے بعد مجھے کبھی زہرا کی چوکھٹ کا رخ نہیں کرنا چاہیے، پھر دوسرے ہی پل میرا دل کوئی ہرا پتا پھینک دیتا۔ نہیں، ضرور اُس کی کوئی مجبوری ہوئی ہوگی۔ ورنہ وہ ایسی تو نہ تھی۔“ میں پھر تڑپ کر لڑت بدلتا۔ ”تو کیا مجھے ایک آخری بار اُس سے مل کر سب سوالوں کے جواب نہیں مانگ لینے چاہیں.....؟“

نہیں، اُسے تمہاری اتنی فکر ہوتی، تو وہ خود آخری بار اُس سے اپنی مجبوری بیان کر دیتی۔ اب خبردار جو تم نے اُس جانب کا رخ بھی کیا تو.....“ اسی ادھیڑ بن میں ساری رات گزر گئی لیکن بعض مرتبہ ہمارے رات کے اندھیرے میں کیے گئے فیصلے دن کے اُجالے کے ساتھ ہی اُس تاریکی کی طرح غائب ہو جاتے ہیں، جو صرف رات کا خاصہ ہوتی ہے۔ رات ہمیں بہت بہادر بنا دیتی ہے اور دن پھر سے ہمارے نازک دل کو صل کر خوف، خدشات اور

پہلے یہاں ساحلی درگاہ سے کچھ ملاقاتی آئے تھے.....؟“ ممانے نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیا خواب تھا۔ اتنے میں نرس نے آکر بتایا کہ سلطان بابا کی بے ہوشی کا وقت کچھ دیر کے لیے پھر ٹوٹ گیا ہے۔ میں لپک کر اُن کے بستر کے قریب پہنچا مجھے دیکھ کر وہ دھیسے سے مسکرائے۔ میں نے اُن کے اشارے پر اپنا کان اُن کے ہونٹوں کے قریب کر دیا اُن کی آواز بشکل مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ ”ساحر میاں! اب عارضی جدائی کا وقت ہو چلا ہے۔ میں اپنے حواس کی آخری حد سے پہلے حجاز کے سفر پر جانا چاہتا ہوں۔ میں نے حاکم اور خضر کو پیغام بھیج دیا ہے۔ بس، اب تم بھی مجھے رخصت کر دو۔“ میری بدحواسی فزوں تر ہو گئی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ اس حالت میں کیسے جا سکتے ہیں۔ اور پھر جانا طے ہی ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ جہاں سلطان بابا، وہیں عبداللہ۔ آپ نے اکیلے سفر کا تصور بھی کیسے کر لیا؟“ اُن کی مسکراہٹ گہری، لیکن آواز دُور ہوتی گئی۔ ”عبداللہ بھلا سلطان سے کب جدا ہوا ہے۔ لیکن تمہیں یہاں ابھی میرے بہت سے اُدھورے کام سرانجام دینا ہیں، لہذا تمہارا یہیں رُکنا ضروری ہے۔ اور یاد رہے، ثابت قدم رہنا۔ وقت کی آندھی اپنا آخری زور ضرور لگائے گی تمہارے قدم اُکھاڑنے کی کوشش بھر پور کرے گی، مگر تمہیں جتنے رہنا ہوگا۔ یہی میرا آخری حکم ہے۔“ میں نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اُن کی تھیلیوں کی پشت بھیکتی چلی گئی۔ ”لیکن میں یہاں اکیلا کیسے رہ پاؤں گا۔ مجھے تو ابھی ٹھیک سے چلنا بھی نہیں آتا اور آپ مجھے براہِ راست دوڑ کے میدان میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ میں ٹوٹ جاؤں گا آپ کے بنا.....“ اُن کی آواز ٹوٹ کر ابھر رہی تھی۔ ”کوئی بھی کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتا ساحر میاں۔ ہم سب کو ایک نہ ایک دن جدا ہو جانا ہے۔ لیکن اطمینان رکھو، یہ جدائی صرف اس خاکی جسم کی جدائی ہو گئی۔ سلطان بابا ہمیشہ تمہارے آس پاس موجود رہے گا۔ اب مسکرا کر میری طرف دیکھو ایک بار۔ تم نے سلطان کو ابھی اپنے سحر کے حصار میں ہی لیا میاں۔ واقعی کچے ساحر ہو۔“ میں اُن کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر خود بھی اُن کی دل جوئی کے لیے مسکرا دیا۔ انہوں نے اپنا لرزنا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور پھر غنودگی میں ڈوبتے گئے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ سلطان بابا نے حجاز جانے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا اُن کی وہ تمنا کیسے پوری ہوگی۔ اور سلطان بابا یہ جدائی کی بات بار بار کیوں کر رہے تھے؟ انہی اُلجھنوں میں گھرے جانے کب صبح کا سورج بھی نمودار ہو گیا۔ صبح اُن کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم کے چہرے پر مایوسی کے اثرات میں صاف طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے اُسی ہجوم میں کسی ڈاکٹر کی سرگوشی سنائی دی۔ ”صرف دماغ ہی کام کر رہا ہے، باقی تمام اعضاء تقریباً کام چھوڑ چکے۔“ میرا جی چاہا کہ میں اس شخص کا گریبان پکڑ لوں اور چیخ چیخ کر پورے اسپتال سے کہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو انہوں نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں اُن کے منہ میں پانی ٹپکایا تھا۔ پھر یہ ڈاکٹر کیا ان اپ شاپ بولے جا رہا تھا۔ اچانک ایک دوسرا ڈاکٹر ہاتھ میں ایک کاغذ لیے کمرے میں نمودار ہوا۔ ”سعودیہ اسپتال کا فلکس آگیا ہے، ڈاکٹر حیات بن حبیب نے مریض کو حجاز منتقل کرنے کی

دوسو سو سے بھر دیتا ہے۔ اس کش مکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے شدید تیز بخار نے آگھیرا۔ میں ابھی تک سلطان بابا کے کمرے سے ملحق ملاقاتیوں کے کمرے ہی میں لیٹا ہوا تھا۔ پہانے میری بگڑی حالت دیکھی تو دوڑ کر ڈاکٹر بلا لائے۔ ماماٹھنڈی پٹیاں میری پیشانی پر رکھ کر نہ جانے کیا پڑھ پڑھ کر پھونکتی گئیں۔ یہ مائیں بھی کتنی بھول ہوتی ہیں۔ انہیں اتنی خبر بھی نہیں ہوتی کہ انہیں اپنی اولاد کے لیے کسی خاص وظیفے کی ضرورت بھلا کب ہوتی ہے۔ وہ تو بس خالی پھونک ہی ماردیں تو اُن کی محبت کی معجزاتی تاثیر اولاد کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اگر شام تک میرا بخار نہ اُترتا تو مجھے بھی اسپتال میں داخل کر لیا جائے گا۔ شام تک میری حالت کیا سنبھلتی، البتہ سلطان بابا کی سانسیں پھر اُکھڑنے لگیں اور پھر میں نے کچھ شناسا چہروں کو اسپتال کی راہِ داری میں چلتے دیکھا۔ ارے..... یہ تو سب سے آگے حاکم بابا تھے، پھر مولوی خضر، پھر عامر، ہاں، وہی پہلا عبداللہ جس نے اپنی گدی مجھے سونپی تھی اور پھر آخر میں نعمان..... وہ جسے میں عبداللہ کے لقب کے ساتھ ساحلِ دال درگاہ کا انتظام سونپ کر آیا تھا اور ابھی کچھ لوگ تھے، لیکن میں اُن کے نورانی چہروں میں اپنی پہچان کی کوئی شبہ تلاش نہیں کر پایا۔ وہ سب لوگ چلتے ہوئے میرے بستر کے گرد جمع ہو گئے۔ حاکم بابا نے میرا ہاتھ قیام قیام ”میرے جوگی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا شاید..... کیا سب ہی بازیاں تم ہی مار جاؤ گے میاں۔“ میں نے اُنہیں کی کوشش کی، لیکن پہلے عبداللہ نے میرا کا نہ ہا دبا کر مجھے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔ میری آواز میں نفارت تھی۔ ”آپ سب ایک ساتھ..... یہاں کیسے؟“ ”ہمیں سلطان بابا نے یاد کیا تھا۔ اُن کے حکم کی تعمیل میں آئے ہیں۔“ میں نے حیرت سے اُن سب کی طرف دیکھا ”لیکن سلطان بابا تو..... میرا مطلب ہے کہ کیا حکم.....؟“ ”مولوی خضر نے مسکرا کر میری جانب دیکھا ”اب بھی وہی سوال کرنے کی عادت..... ہم سلطان بابا کو لے جانے آئے ہیں۔ وہ حجاج مقدس کی زیارت کو جانا چاہتے ہیں۔ ہم سب انہیں رخصت کرنے آئے ہیں۔“ میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ ”حجاز مقدس۔ لیکن وہ تو بہت پیار ہیں، وہ اتنا لمبا سفر کیسے کریں گے؟“ حاکم بابا نے مجھے یوں دیکھا جیسے کوئی بزرگ کسی ضدی بچے کو دیکھتا ہے اور پھر انہوں نے میرے سر کو یوں تھپتھپایا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ”فکر نہ کرو بچے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ نہ جانے اُن کے ہاتھوں میں کیسا جادو تھا کہ مٹا پل بھر ہی میں مدھوش سا ہو گیا۔ مجھ پر غنودگی کا شدید حملہ ہوا اور پلکیں بوجھل ہو کر خود بخود دگرتی چلی گئیں۔ تب ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہولے ہولے میرا شانہ ہلا رہا ہو۔ پھر مجھے دُور کہیں سے پاپا کی آواز سنائی دئی ”آنکھیں کھولو بیٹا۔ دیکھو شام ڈھل رہی ہے۔“ میں نے نفارت کے بوجھ تلے دبے پتھوؤں کو دھیرے دھیرے کھولا۔ میرا جسم پسینے سے تر تھا، مطلب بخار اُتر چکا تھا، لیکن وہ جو کچھ میں ابھی چند لمحوں پہلے محسوس کر رہا تھا، سب کیا صرف ایک خواب تھا۔

میں نے جلدی سے ادھر ادھر کمرے میں نظر دوڑائی، لیکن وہاں نہ تو مولوی خضر موجود تھے اور نہ ہی حاکم بابا..... باقی سب لوگ بھی نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے پاس بیٹھی ماما سے پوچھا کہ ”کیا ابھی کچھ“

اجازت دے دی ہے۔ اب ان کے علاج کی آخری امید بس ڈاکٹر حیات ہی ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اجازت نامے پر دستخط کون کرے گا؟ ان کا کوئی قریبی عزیز بھی تو نہیں ہے آس پاس۔“ سب کی نظر میری جانب اٹھ گئی۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ سلطان بابا کی تمنا پوری ہونے پر ہنسوں یا اُن کے جدا ہونے پر زور زور سے روؤں۔ جانے ڈاکٹر حیات بن حبیب کون تھے اور اُن کا سلطان بابا کی بیماری سے کیا تعلق تھا۔ لیکن اتنا تو صاف ظاہر تھا کہ سلطان بابا نے اپنے حجاز کے سفر کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ میں نے اجازت نامے پر اُن کے شاگرد کے طور پر دستخط کروائے اور ضمانت نامہ بھی بھر دیا کہ کسی بھی اُن ہونی کی ذمہ داری میری ہوگی۔ یہ نادان طبیب کیا جانیں کہ جو اُن ہونی ہونی تھی، وہ تو ہونے جا رہی تھی۔ میرے جسم سے جیسے میری رُوح جدا ہو رہی تھی۔ سلطان بابا کے چہرے پر کومے کی حالت میں بھی ایسا سکون آمیز تاثر تھا، جیسے گہری نیند سور ہے ہوں۔ ایک بار میرے جی میں آیا کہ اُن سے کیا وعدہ تو ز دوں اور اُن کی حکم عدولی کرتے ہوئے، میں بھی اُسی جہاز پر سوار ہو جاؤں، جو ابھی کچھ دیر بعد انہیں لے کر حجاز کی مقدس سرزمین کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ لیکن ایبوی لنس سے اُترتے ہی میرے دل کا یہ جو بھی پکڑا گیا۔

مریضوں کے لیے بنائی گئی خصوصی راہ داری جو اسٹریچر سمیت مریض کو سیدھا رانے تک لے کر جاتی تھی، اس کے سرے پر مجھے حاکم بابا اور مولوی خضر سمیت اپنے پرانے سب ہی ساتھی انتظار کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اب مجھے ان باتوں پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ شاید رفتہ رفتہ میں خود بھی اسی غیر مرئی نظام کا حصہ بننا جا رہا تھا، جو سلطان بابا کے ارد گرد اور اُن کے معتقدین کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا۔ تب ہی مجھے پتا چلا کہ حاکم بابا اس سفر میں سلطان بابا کے ہم سفر ہوں گے۔ کتنا بے بس تھا میں اس لمحے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بیماری تو صرف ایک بہانہ ہے۔ سلطان بابا نے خدا کے گھر کی زیارت کرنی تھی اور بس..... وہ جانتے تھے کہ میں انہیں اکیلے کہیں نہیں جانے دوں گا، لہذا انہوں نے چپ سا دھ کر میری ضد کا راستہ ہی بند کر ڈالا تھا۔ حاکم بابا بہت دیر تک مجھے سینے سے لگا کر تھکتے رہے۔ کچھ سفر آغاز ہی سے اپنا انجام بیان کر دیتے ہیں۔ مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے علاوہ وہاں موجود سب ہی لوگ اس انجام سے واقف ہیں۔ صرف ایک میں ہی ہوں ان سب میں ایسا کم ظرف تھا جسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں فضا میں ہوائی جہاز کو بلند ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں میرے دل سے ایک خاموش صدا نکلی..... ”الوداع.....“ کبھی کبھی ہماری زندگی میں اچانک ہی کچھ ایسے خلا پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہمیں خود اپنا آپ ہوا میں معلق نظر آتا ہے، کچھ ایسی ہی میری بھی صورت حال تھی۔ مولوی خضر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں رات گزارنے کے لیے گھر چلا جاؤں اور جی چاہے تو صبح ساحل والی پرانی درگاہ پر آ جاؤں۔

گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی نہ جانے کیوں اسی پرانے ساحر کی یاد نے شدت سے آگہرا۔ شاید اس یاد کے پیچھے بھی زہرا کی سلتکی یادوں کے انگاروں کی آج اور حدت موجود تھی۔ مجھے ساحر اس لیے بھی

لہوہ جھٹ کر چھین لینے کا عادی تھا، جب کہ اس کے برعکس عبداللہ خود اپنی دنیا لٹتے دیکھ کر بھی ہونٹ بٹا تھا۔ آج اگر وہ پرانا ساحر ہوتا تو کسی کیا مجال تھی کہ وہ یوں اطمینان سے اُس کی محبت کو چھین کر لے وہ زہرا کے محل کی چوکھٹ پر جا بیٹھتا اور اپنی قضا یا پھر زہرا کا ہاتھ، کوئی ایک سوغات لے کر ہی واپس بن۔ یہ کیسا الیہ تھا کہ سلطان بابا نے میرے اندر کے ساحر کی تمام گرہیں عبداللہ نام کی عاجزی سے باندھ لیں۔ جب ہم مجبور اور لاچار انسان بہت زیادہ بے بس ہو جاتے ہیں تو ہمارا جھگڑا، ہمارے خدا سے شروع ہے۔ ہمیں اپنے گزشتہ تمام گناہ جائز لگنے لگتے ہیں اور ہمارے دل میں کہیں دُور یہ خواہش انگڑائیاں اٹھانے کہ کہ ہمارا خدا بھی ہمیں اُسی طرح منالے، جس طرح کسی بے جا ضد پر رات کو کھانا کھائے بغیر سو پر ہماری ماں مناتی ہے۔ بالوں میں انگلیاں پھیر کر، کبھی گدگدا کر اور کبھی رُور..... میں بھی اپنے خدا سے اسبابا کھانا کھائے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ جب انتقام لینے کے لیے کوئی ہستی میرے نہ ہو پھر انسان خود آپ سے انتقام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور میں تو خود ہی اپنے آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ مجھے بھلا در دشمن کی ضرورت ہی کب تھی، لہذا میں خود ہی اپنی رُوح کو غم، دکھ اور جلن کی برچھیاں گھونپتا، نہ جانے بند کی وادی میں پہنچ گیا۔ تب ہی مجھے یوں لگا جیسے سلطان بابا میرے پکلیں موندنے کے انتظار ہی میں بیٹوں کے پیچھے کہیں چھپے بیٹھے تھے۔ اُن کا لباس سفید اور وسیع کارنگ دودھیا تھا۔ دُور پس منظر میں سبز لی ہلکی سی پرچھائیں دکھائی دے رہی تھی۔ سلطان بابا کے چہرے پر خلاف معمول بے حد تازگی اور ن کے آثار نمایاں تھے۔ انہوں نے تردد تازہ لہجے میں مجھے اُسی طرح چھیڑ کر مخاطب کیا جو اس دنیا میں بس افاغ تھا۔ ”کیوں میاں! تمہاری خدا سے ضد کی عادت نہ گئی۔ کبھی دو گھڑی کے لیے اپنے اندر کی اس لڑک بھی لیا کرو۔ کیوں خود کو ہر مل ہو لہان کیے رکھتے ہو۔“ میرے لہجے میں شکوہ تھا ”آپ کو اس سے؟“ آپ تو مجھے تنہا چھوڑ گئے نا..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس راہ پر آپ کا ہاتھ پکڑے بنا ایک قدم کے نہیں چل سکتا۔ پھر بھی آپ مجھے یوں ہی درمیان بھی بھٹکتا چھوڑ کر چل دیئے۔“ سلطان بابا دھیرے لائے۔ ”پوندے کو پرواز سکھانے کے لیے اُس کے اپنے شہپر کو بھی ایک مرتبہ اُسے چوٹی سے نیچے پھینکا نا ہے۔ یہ اس نوزائیدہ کے پر کھولنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ مخالف ہوا کا دباؤ، تیزی سے قریب آتی مازمین کی کشش اور آندھی جیسی چٹکھاؤتی آوازیں اس شاہین بچے کو اپنے پتکے پھڑ پھڑانے پر مجبور کر ہی لاتی۔“ میں گڑگڑایا ”لیکن میرے پر تو پہلے ہی کسی کے ناکام عشق نے کاٹ دیئے ہیں۔ مجھے پرواز کا سبق ملے گا آپ۔ میری اُڑان تو بھرنے سے پہلے ہی کسی کی زہریلی محبت نے گھونٹ دی ہے۔ اب میرا مقدر ہنٹی سے نیچے کی جانب جھانکتی قاتل چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا ہے۔ فنا ہی میرا مقدر ہے، اُنک کہ میری تباہی کا یہ منظر دیکھنے کے لیے آپ یہاں نہیں ہیں۔ کم از کم مجھے آخری کندھا تو دے۔“ میری آواز خلا میں بھٹک کر واپس آ گئی اور اگلے ہی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ پھر پوری رات میں



کر دھیں ہی بدلتا رہا۔

شاید وہ فجر سے ذرا پہلے کی کوئی ساعت تھی، جب کسی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں میرے کمرے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ میں نے ہڑبڑا کر جلدی سے دروازہ کھولا تو ماما اور پاپا دونوں ہی تاریک چہرے لیے باوجود تھے۔ میری سانسیں اٹکنے لگیں۔ ”کیا ہوا.....؟“ ”ممانے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اُن کی آواز اندر گھٹ گئی اور وہ رونے لگیں“ میں نے پاپا کو پکڑ کر جھنجھوڑا..... ”خدا کے لیے کچھ تو بولیں.....“ پاپا نے میرے کاندھے زور سے تھام لیے۔ ”ابھی ابھی درگاہ سے مولوی خضر کا پیغام آیا ہے، سلطان بابا اب ہمارے دربار میں نہیں رہے.....“ میری سامتیں شل ہو گئیں۔ اس کے بعد پاپا نہ جانے کیا بولتے رہے مجھے صرف اُن کے ہلنے ہوئے محسوس ہوئے۔ شاید میں وہیں گھٹنوں کے بل زمین پر گر بھی گیا تھا اور شاید نیچے ڈھٹے دروازے کی چوکت میرے سر سے ٹکرانی بھی تھی کیوں کہ میں نے ماما کو جلدی سے اپنا دوپٹہ بچھا کر سر پر باندھتے محسوس کیا، لیکن کیا میری نسوں میں ابھی خون کی روانی باقی تھی اور کیا میری سانس ابھی چل رہی تھی۔ میری بصارت کا ہر رنگ ابھی قائم تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر میں واقعی بڑا ”کم ظرف“ تھا۔ عقیدت اور محبت کا تقا تو یہ تھا کہ میرے حواس بھی ٹھیک اُسی لمحے ہمیشہ کے لیے معطل ہو جاتے، جس لمحے میں نے پاپا سے وہ لفظ سنا تھا۔ لیکن حیف مجھ پر کہ میں اب بھی پاپا کو زور زور سے چلاتے ہوئے سن رہا تھا۔ ”ساحر ہوش میں آؤ۔ مولوی خضر نے ظہر کے بعد درگاہ پر سلطان بابا کی غائبانہ نمازہ جنازہ کا پیغام بھیجا ہے اور تمہارے لیے خاص کلمہ وہاں پہنچنے کا۔ شاید یہ بھی سلطان بابا ہی کی کوئی آخری خواہش ہو۔“ لیکن میں اس وقت کسی حکم کی تعمیل کے قابل ہی کہاں تھا۔ پتا نہیں کب سورج چڑھا اور کب پاپا مجھے دو نوکرانوں کی مدد سے سنبھالے اپنی گاڑی میں درگاہ کے جانب روانہ ہوئے۔ کچھ انہوئیاں ایسی ہوتی ہیں، جو ہمیں صاف نظر آتے ہوئے بھی درپیش آنے کے بعد ہی بڑا اعصابی جھٹکا دے جاتی ہیں، جیسے کہ ہم ان کی حقیقت سے بالکل ہی بے خبر ہوں۔ میں کہیں نہ کہیں بات سلطان بابا کے حجاز کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہی جانتا تھا کہ شاید یہ اُن کا آخری سفر ہے، لیکن اُن قضا کی خبر نے میرے اندر سب ہی کچھ ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اُن کی رخصتی کا ٹھیک وقت تھا جس وقت وہ میرے خواب میں مجھ سے ہم کلام تھے۔ میرے ذہن میں اُن کی بات گونجی۔ ”یاد رہے یہ جدائی صرف اس خاکی جسم کی دُوری ہوگی۔“ لیکن میرے لیے تو اب بھی یہ جسم ہی سب کچھ تھا۔ میں اُن رُوح کی حدود تک پہنچا ہی کب تھا۔ ہم درگاہ پہنچے تو حاکم بابا کے علاوہ باقی سب لوگ موجود تھے۔ جانے کس نے محن میں وہیں بٹھا دیا جہاں میں کبھی سلطان بابا کے سامنے دوڑا نو ہو کر بیٹھا کرتا تھا۔ مجھے تو اب جانب دہی نظر آ رہے تھے، پھر یہ لوگ اُن کی جدائی پر اس قدر افسردہ کیوں بیٹھے تھے۔ مجھے مولوی خضر کی آواز کہیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی ”سوگ صرف تین دن کا ہوتا ہے.....“ ”سوگ.....“ میں نے حیرت اُن کی جانب دیکھا ”کیسا سوگ.....؟ آج یہ سب کیسی ہلکی ہلکی باتیں کر رہے تھے۔“ ظہر کی نماز شروع ہوئی

سی نے مجھے بھی صف میں لاکھڑا کیا اور پھر فرض نماز کے بعد غائبانہ نماز جنازہ کی نیت بھی باندھ لی گئی۔ کبھی سی نے زندوں کی نماز جنازہ بھی پڑھی ہے؟ نماز کے بعد درگاہ کے لوگوں کے علاوہ باقی سب لوگ تتر بتر ہو گئے۔ مجھ سے پہلے اور بعد والے عبداللہ، مولوی خضر اور کچھ انجان لوگ سر جوڑے پتا نہیں کیا باتیں کر رہے تھے۔ پاپا میرے قریب ہی خاموش سے بیٹھے تھے۔ آج پہلی مرتبہ مجھے اس درگاہ سے وحشت ہو رہی تھی۔ جانے دن بتا رہا تھا کہ سلطان بابا کی وصیت کے مطابق انہیں مکہ کی سرزمین کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ میرا جی چاہا تھا کہ پاپا سے کہوں کہ آج رات ہی نکلت کر واپس۔ میں بابا کے پاس سوویہ جانا چاہتا ہوں۔ عصر کے بعد مولوی خضر نے حجرے سے ایک کاغذ منگوا یا اور دھیرے سے بولے ”سلطان بابا کی وصیت پڑھنے کی اجازت ہوں گا۔“ پھر مولوی خضر دھیرے دھیرے سلطان بابا کی استعمال کی چیزوں کو اُن کی وصیت کے مطابق نشتہ گئے۔ کسی کے حصے میں شیعہ آئی تو کسی کو اُن کا جنازہ ملا۔ کوئی لباس اور لاٹھی کا حق دار ٹھہرا، میرے لیے کچھ نہ بچا۔ مولوی خضر نے وصیت ختم کی..... ”اور اب میں آخر میں سلطان بابا کی وصیت کے مطابق اُن کے ہاشمین کا اعلان کرنا چاہوں گا۔ سلطان بابا نے اپنا جانشین اُسے مقرر کیا ہے جو اُن کے مطابق سب سے زیادہ سزا کا حق دار ہے اور وہ ہیں ساحر میاں..... سلطان بابا کے عبداللہ.....“ میرے ہاتھ سے شیعہ گر گئی۔

## فریفتہ

میں..... البتہ پچاس کپے سے بہت اچھی طرح واقف تھے کہ غم سے عارضی فرار کا بہترین ذریعہ نیند ہے۔ سو، انہوں نے گھر پہنچتے ہی نہ جانے کسی بہانے، مجھے نیند کی کوئی دوا پلا دی۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ اب نیند میرے لیے دوسری بیداری بن چکی تھی۔ ایک جہاں کی طرف سے آنکھیں بند ہونے لگتیں، تو دوسرا جہاں نظروں کے سامنے کھل جاتا تھا، لہذا..... آنکھیں بند کرتے ہی میری روح کے بند کوڑ کھلنے لگے۔ میں نے خود کو کسی میلاد کی محفل میں پایا۔ سب ہی چپ چاپ درد میں مشغول تھے۔ میری آنکھیں سلطان بابا کو ڈھونڈتی رہیں، پر وہ مجھے وہاں کہیں نظر نہیں آئے۔ میں نے قریب بیٹھے ایک بزرگ سے اُن کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے ہونٹوں پر اُننگی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھ پر ہلکی سی سرزنش بھری نظر بھی ڈالی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ سب لوگ کیا پڑھ رہے ہیں، لیکن میں بھی اُن ہی کے ساتھ فرش پر بھی چٹائی پر بیٹھ گیا اور خود بھی باقی سب حاضرین کی تقلید میں آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھیک اُسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر دن چڑھ کر اترنے کے قریب تھا۔ شاید عصر سے کچھ پہلے کا وقت ہوگا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گویا میں پوری رات اور سارا دن سوتا رہا۔ عام طور پر میں قضا نمازوں کو بھی بہت پابندی سے ادا کرتا تھا، لیکن اس روز نہ جانے کیوں عصر کی فرض نماز میں بھی میرا دھیان کسی اور جانب ہی بٹا رہا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ میں نے آج تک اپنی ایک بھی نماز مکمل خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی ہو۔ ہر بار کوئی سوا ذہن میں سلایا ہی رہا۔ کبھی نفس اور کبھی جنس..... بس اتنا ہی محدود دائرہ تھا میرا۔ پھر مغرب ہوئی اور پھر عشاء، لیکن میں اپنے کمرے ہی میں بند رہا۔ ممانین چار بار کمرے میں جھانک کر واپس چلی گئیں، لیکن مجھے باہر نکلنے کا سوچ کر ہی دشت ہونے لگتی تھی۔

شاید وہ تیسرا دن تھا، جب میرے بعد والا عبداللہ (نعمان) مجھے لینے کے لیے آن پہنچا۔ مولوی خضر نے بلاوا بھیج دیا تھا۔ میں درگاہ نہیں جانا چاہتا تھا، مگر مولوی خضر کی بات ٹالی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ میں چپ چاپ درگاہ چلا آیا۔ صحن میں بہت سے لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ سب ہی میری آمد پر یوں چونکے اور مجھ سے کچھ ایسا خاص برتاؤ کیا گیا کہ مجھے اُلجھن سی ہونے لگی۔ خدا خدا کر کے عصر کے بعد دعا ہوئی تو کچھ تہائی میسر آئی۔ میں ڈھلتی دھوپ کے ایک شریر، لیکن نامکمل کلڑے میں دیوار کی منڈیر کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ شاید دھوپ بھی زندگی کی غلامت ہوتی ہے، تب ہی وہ ہم سے اس قدر جلد روٹھ جاتی ہے، خاص طور پر عصر کے بعد کی دھوپ تو کچھ یوں لپکتی جھپکتی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے، جیسے اس نے شام کے اندھیرے سے کچھ وعدے جوڑ رکھے ہوں، کچھ قسمیں باندھ رکھی ہوں۔ میں بھی اسی عصر کے بعد کی دھوپ کو گاؤں کی اس الہڑکی طرح تیزی سے پلٹے ہوئے دیکھ رہا تھا، جسے کنویں کی منڈیر پر پانی بھرنے کے بہانے اپنے محبوب کے انتظار میں شام پڑ گئی ہو۔ اس کے محبوب کے گھوڑے کی ٹاپیں کنویں تک آتی پگ ڈنڈی پر نہ گونجی ہوں اور اب وہ بے چاری اس سوچ میں تیز قدموں سے گھر لوٹ رہی ہو کہ گھر کے آگن میں ٹھیلے بابل کو یوں اندھیرے تک باہر رہنے کا کیا جواز بتائے گی۔ میں نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا کہ قریب ہی کسی کے ہلکے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ ”مخل

کچھ لمحوں کے لیے مجھے لگا، جیسے اس ساحلی درگاہ کے آس پاس کا تمام شور بالکل ساکت ہو گیا ہو۔ لہریں اپنی اپنی جگہ تھم کر ڈک گئیں اور فضا میں تیرتے پرندے بھی جامد و معلق ہو گئے۔ میں تو خود اپنی ذات کا جانشین بننے کے قابل نہیں تھا، پھر یہ مولوی خضر کیا کہہ گئے تھے؟ ضرور انہیں وصیت نامہ پڑھتے، نظر کا کوئی دھوکا ہوا ہوگا۔ وہ بھی تو شدید غم کے عالم میں تھے۔ اور غم میں انسان کے سامنے لکھی تحریر کے لفظ اکثر آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، لیکن وہ سب خاموش بیٹھے میری جانب یوں دیکھ رہے تھے، جیسے اُن کا فریضہ تمام ہوا اور اب جو بھی کہنا ہے، مجھے کہنا ہے۔ پر میرے پاس لفظ ہی کہاں بچے تھے؟ میری تمام لغت تو سلطان بابا اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے اور اب بھلا مجھے الفاظ اور قوت گویائی کی ضرورت ہی کب تھی۔ جن کے لیے اظہار کا یہ ذریعہ، یہ فن گفتگو میرے اندر پنپ رہا تھا، وہ دونوں ہی مجھے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ کبھی کبھی جب زبان تالو سے چپکی رہنا چاہیے اور لوگ آپ کو کچھ کہنے پر مجبور کریں، تو یہ لفظ بھی کتنا بڑا ابوجھ بن جاتے ہیں۔ میں نے بھی یہ بوجھ ڈھونے کی ہر ممکن سعی کی، لیکن ہونٹوں سے الفاظ تو نہ نکل پائے، البتہ آنکھوں سے دو موٹے آنسو نکل کر درگاہ کے چکنے فرش پر سجدہ ریزہ ہو گئے۔ مولوی خضر جلدی سے میری جانب لپکے ”ارے..... یہ کیا عبداللہ میاں..... یہ آنسو.....؟“ بس پھر کیا تھا۔ سیلاب کا راستہ روکنے والے سب ہی بندش و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ میں یوں بلک بلک کر رو رہا تھا، جیسے کوئی معصوم بچہ میلے میں اپنوں سے پیچھے کر تباہ ہوتا ہے، جب شام ڈھلنے لگتی ہے۔ آس پاس کے تمام جھولے اور ٹھیلے سسنا ہو جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے چھاتا اندھیرا اُسے ڈرانے لگتا ہے۔ درگاہ پر بھی شام ڈھل رہی تھی اور میری آنکھوں کا ساون ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ مجھے چپ کراتے کراتے سب ہی غڈ حال ہونے لگے اور پتا تو باقاعدہ خود بھی رو پڑے۔ شاید ہم انسانوں کے آنسوؤں کا کچھ باہمی رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ تب ہی ہم اکثر کسی دوسرے کو رو دنا دیکھ کر خود بھی رو پڑتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ہمارا رونا اُن دوسرے باوقار اور سنجیدہ طبع لوگوں کے لیے بھی ایک نعت ثابت ہوتا ہے، جو دوسروں کے سامنے رونے میں پہل سے ہچکچاتے ہیں۔ میری حالت کے پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ مغرب کے بعد پچانے مولوی خضر سے مجھے گھر لے جانے کی اجازت طلب کی۔ مولوی خضر نے میری جانب یوں دیکھا جیسے وہ مجھ سے میری رائے جاننا چاہتے ہوں، لیکن اب مجھے زبان و مکان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں پتھر ہو چکا تھا اور پتھر کو اس بات سے کیا غرض کہ وہ کسی درگاہ کی دیوار میں بڑا رہے یا پھر کسی مکان کی طاق

ب صورت چہروں کے ارد گرد گھٹنوں منڈلانے کے لیے چل چل جاتا تھا۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ میری حد م، بلکہ کسی حد تک بھڑی شخصیت کے لیے میری ہم عمر لڑکیوں اور آس پاس کی دیگر خواتین کے دل میں بند نہیں تھی۔ لڑکیاں پیٹھ پیچھے مجھ پر ہنسی اور میری مذہب داری اور باوقار بنے رہنے کی کوششوں پر آوازے اتے۔ کالج ختم ہوا اور یونیورسٹی کا دور شروع ہوا، تو میں بزم ادب کا منتظم منتخب ہو گیا۔ تب تک میری ن کے برعکس میری شاعری کافی نکھر چکی تھی۔ اردو شعبے میں میری کافی دھماکے بیٹھتی تھی اور جو نیر لڑکیاں ہفتوں کی وجہ سے میرا احترام بھی کرنے لگی تھی۔ لیکن یہ ساری عزت میرے شعروں کی مرہون منت فو میرا وجود ان کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے، میرے اندر چاہے جانے کی خواہش امرتیل کی طرح پھلتی چلی گئی، لیکن پوری ٹی میں کوئی بھی ایسی لڑکی نہ تھی، جس نے کبھی نظر بھر کر بھی میری جانب دیکھا ہو۔ ان ہی میں میری کلاس والا بھی تھی۔ یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت لڑکی۔ جس کی ایک جھلک پانے کے لیے اعلیٰ طبقے کے ہی لڑکے اپنی بڑی بڑی گاڑیوں میں صبح سویرے اُس کی راہ میں پکلیں بچھائے اور ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ میرا دل بھی گل لالہ کے لیے اسی شدت سے دھڑکتا تھا، لیکن اُسے متاثر کرنے کے لیے کچھ بھی تو فامیرے پاس، نہ شکل و صورت، نہ روپیہ پیسہ اور نہ ہی کوئی منفرد اور بھرپور صلاحیت۔ بد قسمتی سے اُسے ادب کی محفلوں سے بھی کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا، لہذا یونیورسٹی کے چار سالوں میں چار مرتبہ بھی میری اُس بات نہیں ہو پائی۔ لیکن میرا دُشمن دل مزید وحشی ہوتا گیا اور نتیجتاً مجھے جگتے میں بھی خواب دیکھتے رہنے کی پڑ گئی۔ میرے خواب عموماً کچھ اس طرح کے ہوتے کہ میرے ارد گرد خوب صورت چہروں کا جھنگھا ہے اور ان سب کی نظروں میں محبوب ہوں۔ کبھی میں خود کو کسی انتہائی شعلہ بیان مقرر کے روپ میں دیکھتا، جو بی کے اسٹیج پر سارے ہال کو انقلابی تقریروں سے گرم رہا ہے، تو کبھی پوری محفل لوٹ لینے والا موسیقار یا رہن جاتا اور کبھی فوجی یا سپاہی، جو سب کا ہیرو ہوتا۔ لیکن میری ہر مہم جوئی کا انعام صرف مد رُخوں کا کوئی ٹ ہوتا۔ میرے خوابوں میں خوب صورت خواتین مجھ سے صرف چند لفظ سننے کے لیے مری جاتیں اور سب پر ایک نگاہ غلط ڈال کر مسکراتا ہوا محفل سے گزر جاتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں کبھی کسی ایک چہرے ایک گل رُخ کے لیے ہیرو نہ بنتا، بلکہ بیک وقت کئی نازنینیں میری مدح سرائی میں مشغول رہتیں۔ لیکن بات پھر خواب ہوتے ہیں۔ میں جب ان خوابوں کے سحر سے باہر نکلتا تو میری عام سی شخصیت میرا منہ لٹا۔ ادیب اور مصنف عورت کی کم صورتی اور اُس سے متعلق المیوں کا ذکر تو اپنے افسانوں میں بار بار کرتے لیکن کسی مرد کی کم تر شخصیت اور اس سے جڑے دکھوں کو آج تک کسی نے بیان کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اور بھی کیسا..... مجھ جیسا ”فریفتہ مفت“..... جسے ہر لڑکے پری رُخ کے عارض پر پھلتے گلال کے گلابی پن ضرورت رہتی تھی۔ یاد رہے کہ میں بدکردار ہرگز نہ تھا۔ مجھے تو بس خوب صورتی کے ایک احساس کی ضرورت

ہونے کی معذرت چاہتا ہوں..... لیکن میں نے سوچا کہ گھر واپس پلٹنے سے پہلے آپ سے دعا لیتا جاؤں۔“ میں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ مناسب قیمتی لباس میں ایک اویز عرق منس مودب ساسر جھکائے میرے قریب کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر چچک کے ہلکے سے داغ تھے اور ماتھے سے بال کافی حد تک اڑے ہوئے تھے۔ گہرا سانولا رنگ اور چھوٹی چھوٹی سی تیز آنکھیں۔ میں نے اپنی بے زاری چھپانے کی کوشش کی اور مولوی خضر کی جانب اشارہ کیا، جو صحن میں موجود ازرائین میں نیاز بڑانے میں مشغول تھے۔ ”آپ اُن صاحب سے مل سکتے ہیں۔ وہ میرے استاد بھی ہیں اور وہی اس درگاہ میں اس وقت سب سے معراور قابل احترام شخصیت ہیں۔ وہ آپ کے لیے ضرور دعا کریں گے، میں کسی کو دعا دینے کے قابل نہیں۔ مجھے تو خود آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ وہ شخص اپنی جگہ جم رہا۔ ”جی..... میں پہلے اُن ہی مولانا کے پاس گیا تھا، لیکن انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ دیکھیے، آپ مجھے ٹالے گا نہیں۔ میں بڑی دُور سے یہاں تک آیا ہوں۔“ میں نے حیرت سے پہلے اُسے اور پھر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ بھلا انہوں نے یہ مذہب داری مجھ پر کیوں ڈالی۔ بہر حال، مجھے وہ شخص ملتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجبوراً میں نے اُس سے پوچھا ”آپ ضد کرتے ہیں تو یوں ہی سہی، لیکن آپ کے لیے کیا دعا کروں، کوئی خاص حاجت.....؟“ وہ شخص کچھ ہچکچایا ”کچھ عجیب سی بات ہے، لیکن اب بے چینی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ہر جگہ کی دھول چاٹ چکا۔ اب آخر کار کسی نے اس درگاہ کا پتہ دیا ہے کہ یہاں میرا مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔“ میں نے دل میں سوچا کہ جس ہستی پر خدا کا یہ خاص کرم تھا، وہ تو خود اُس کی جانب پلٹ چکی۔ اب کون بھلا وہ دعائے خاص کرے گا تمہارے لیے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر اُس نے اپنا گلزار کیا اور بے شکل بولا ”میرا مرض بڑا عجیب ہے جناب۔ میں فریفتہ ہوں۔“ میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ ”جی.....؟“ وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”میرا مطلب ہے میں ”فریفتہ مفت“ ہوں۔“ ”میں اب بھی نہیں سمجھا۔“ میں نے ایک گہری سی سانس لی۔ ”جی مجھے اندازہ ہے۔ دراصل یہ بات ہی اتنی اُجھٹی ہوئی ہے کہ میں کبھی کسی کو ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں پایا۔ میرا نام بختیار ہے، لیکن میری بخت سے کبھی یاری نہیں رہی۔ ہوش سنبھالا تو متوسط طبقے کے ایک خاندان کا عام سا بچہ تھا، نین نقش بھی عام سے تھے، لیکن تب یہ چچک کے داغ میرے چہرے کی زینت نہیں بنے تھے۔ یہ جوانی کا تختہ ہے۔ البتہ رنگ تب بھی سانولا ہی تھا۔ میری طرح کے مرادوں لاکھوں بچے اس ملک کے گھرانوں میں پل بھر میں بڑھ کر جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی ڈگر پر چل پڑتے ہیں۔ بے حد اور شدید حساسیت بھی شاید ہی کبھی کسی کی راہ کی دیواری ہو یا شاید متوسط طبقے کے شب و روز ایسے بچوں سے خود بخود حساسیت چھین لیتے ہیں لیکن قدرت نے میرے اندر کچھ اور ہی جذبہ دہکار کے بے حد شرمیلا ہونے کے باوجود میں قدرت کی ہر خوب صورتی کو پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ نویں سوئس جماعت میں ٹوٹے پھوٹے شہر میں کہنا شروع کر دیے اور پھر انٹر کے بعد مجھے ایک عجیب سا دراک ہوا کہ مجھے عورت کی خوب صورتی اپنی جانب عام انسانوں سے کئی درجے زیادہ کھینچتی اور متاثر کرتی ہے۔ میرا

چکا ہے۔ یہ دنیا، بد صورت لوگوں کے لیے بڑی بد صورت جگہ ہے جناب۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر قدرت نے میرا من اتنا کول ہی بنانا تھا، تو میری شخصیت کو کبھی اتنا ہی شگفتہ کیوں نہ بنایا.....؟ قدرت نے میرے وجود کے سب ہی تاروں کو اگر سر اور موتی کی مہر تانوں سے جوڑ کر کرسوں میں عجب جہان خیز خواب دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی، تو پھر بے دقتی شخصیت کا تال میل بھی کیوں درست نہ کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میری جاہی میں، دل کے ساتھ ساتھ میری سماعت کا بھی برابر کا قصور ہے۔ جانے یہ میلوڈی ایک ہی لمحے میں میرے اندر سب کچھ اٹھل پھل کیسے کر دیتی ہے۔ میں ہل بھر میں مکروہ بھکاری سے حسین شہزادہ بن جاتا ہوں۔ ساری قدرت میرے سامنے دوڑا نو ہو جاتی ہے۔ پریاں رقص کرتی ہیں اور میرے روم روم سے فریفتگی جھلکنے لگ جاتی ہے۔ آپ ضرور مجھے کوئی دیوانہ ہی سمجھ رہے ہوں گے، لیکن یقین کریں کہ میں نے ابھی اپنی دیوانگی کا دس فی صد بھی آپ کو نہیں سنایا۔ میں اپنے اندر کے پرستان اور باہر کی بے رحم اور کانٹوں بھری دنیا کے درمیان پس کر رہ گیا ہوں۔ میں اپنے اندر راجا اندر اور باہر صرف ایک شور ہوں، جس کے لیے کسی نازنین کے دل میں کوئی جگہ نہیں.....“ بختیار اپنی بات ختم کر کے یوں ہانپنے لگا، جیسے میلوڈ دوڑ کر آیا ہو۔ سچ ہے، یہ تھکن تو ساری زندگی کی تھی۔ اندھیرا اصل چکا تھا اور بختیار کی آنکھوں میں جھلکنے والے دو آنسو اس لمحے مجھے ان دو بے مراد چراغوں کی طرح دکھائی دیئے، جو کسی گم نام کے دیوان مزار پر، کوئی ترس کھا کر جلا گیا ہو۔ میرا جی چاہا کہ میں اس جھکے ہوئے معصوم اور اندر سے بے انتہا خوب صورت شخص کے آنسو پونچھ کر اُسے بتاؤں کہ اس دنیا میں کون ہے، جو فریفتہ نہیں ہے۔ کوئی عورت پر فریفتہ ہے تو کوئی جاہ و چشم پر، کسی کو دولت کی فریفتگی ہے تو کوئی سونے کے مخلوں پر شیدا ہے۔ شاید انسان پیدا ہی ”فریفتہ صفت“ ہوتا ہے۔ پھر جن کی ظاہری صورت اور شخصیت دنیا کے معیار پر پوری اُترتی ہے انہیں تو اپنی فریفتگی کا صلہ مل جاتا ہے اور کچھ بختیار جیسے سیاہ نصیب بھی ہوتے ہیں جو اس تڑپ اور کک کی کانٹوں بھری غلش اور لا حاصل پن کے ساتھ ہی پوری زندگی جیتے ہیں۔ میں نے مزید کچھ کہے بنا دعا کے لیے ہاتھ تو اٹھا دیئے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میری پاس دعا کے لیے لفظ تھے ہی نہیں۔ شاید کچھ دعاؤں کے لیے لفظ ضروری نہیں ہوتے۔

بختیار نے پلٹنے سے پہلے مجھ سے کہا کہ وہ اگلے ہفتے دوبارہ یہاں آئے گا۔ اُس کے جاتے ہی مجھے ماما درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ شاید وہ زیادہ دیر ہونے کی وجہ سے خود ہی میرے اور پاپا کے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں آج مجھے اُن کا زرد چہرہ کچھ اور ہی داستان سنانا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پاپا بھی میرے گھٹنوں کے قریب آ بیٹھے۔ شاید وہ بھی ماما کے مضطرب چہرے کی کوئی تحریر پڑھ چکے تھے۔ بہت دیر کے بعد وہ کچھ بولنے کی ہمت جمع کر پائیں۔ ”ساحر..... آج میری زہرا سے ملاقات ہوئی تھی.....“ کوئی اور دقت ہوتا تو شاید اتنا سن کر ہی میرا دم نکل جاتا، لیکن آج میرے لیے جس ایک عجیب سی بے گانگی تھی۔ ”اچھا.....؟“ ماما کچھ دیر چپ رہی، پھر انہوں نے بتایا کہ وہ زہرا کی پرانی ہمسائی کو خصوصی تاکید

تھی، جو ہر لمحہ میرے چارنو پھیلا رہے۔ شاید میرے اندر محبوب بننے کی تمنا اپنی آخری حدود سے بڑھ گئی تھی۔ پرفسوس، میں کبھی کسی کا محبوب نہ بن سکا۔ میں ہمیشہ ان تقاریب میں سب سے پراہٹج جاتا، جہاں کسی بھی اچھے چہرے کی ایک جھلک نظر آنے کی بھی امید ہوتی۔ بظاہر میں لا پرواہ سا باہاس مختل میں ٹھہلتا رہتا، پر میری نظریں اپنا مخصوص طواف جاری رکھتیں۔ مجھے ہر دم بھی خوش فہمی گھیرے رکھتی کہ مختل سب سے حسین چہرہ میری کسی بات سے متاثر ضرور ہوگا اور قدرت میرے لیے ایسا کوئی موقع ضرور تراشی گی جب خود اُس مدہ جیں کے گھر والے مجھے اپنے ہاں کسی تقریب میں مدعو کریں گے۔ شاید کوئی مجھے اُردو شاعر میں مدد کے لیے شام کی چائے پر بلا لے..... لیکن افسوس میرا کوئی خواب پورا نہ ہو سکا اور آخر کار گھر والوں کا پسند سے میری شادی ہو گئی۔ میں کسی کا محبوب بننے سے پہلے ہی شوہر بن گیا۔ میری بیوی ایک سادہ اور نیک دل عورت تھی، پر، وہ کبھی مجھے محبوب کے درجے پر فائز ہی نہ کر سکی۔ شادی کے ایک سال بعد جب میں پہلی بار اُس کے ساتھ چند دن اس کے گاؤں میں رہنے کے لیے گیا، تو یہ چپک کے داغوں کا تھک میرا منتظر تھا۔ بار بار کے بعد میرا دل کچھ یوں اچاٹ ہوا کہ میں نے روزگار کے لیے دہی جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے۔ شاید اس کوشش کے پیچھے بھی کہیں میری فریفتگی ہی کا دخل تھا۔ مجھے امید تھی کہ پیسہ ہاتھ آنے کے بعد میں ضرور چاہا جاؤں گا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ پیسہ مرد کی تمام بد صورتیاں چھپا لیتا ہے۔ دس سال میں۔ دن رات بھلا کر دہی کے ریگ زاروں میں اپنا پسینہ بہایا اور جب میں واپس ملک لوٹا تو ایک رئیس تھا میں نے آتے ہی شہر کی مختلف سماجی سرگرمیوں میں دل کھول کر پیسہ خرچ کیا اور پھر چند ہفتوں ہی میں، میں اداہی و سماجی تنظیموں کا اعزازی صدر بن چکا تھا۔ شہر کی کوئی تقریب میری شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی، لیکن میرا مسئلہ اب بھی اپنی جگہ قائم تھا۔ میں معاشرے میں زبردستی کی عزت تو کسی نہ کسی طور کمپا چکا تھا، لیکن محبت کا ایک نظراب بھی میری واحد تلاش تھی۔ میں اپنی ساری دولت دے کر بھی صرف اس ایک ستائش بھری نظر طالب تھا، جو مجھے چند لمحوں کے لیے ہی محبوبیت کے مقام تک پہنچا دیتی۔ میں ہوائی جہاز کا سفر اس امید پر کر رہا تھا کہ شاید میری ساتھ والی نشست پر کوئی حسین بیٹھی مل جائے۔ شاید کوئی ایئر ہوسٹس، ہی میری طرف نظر بھر کر دیکھ لے۔ اسپتال میں نزلے زکام کے لیے بھی بہترین کمرہ مخصوص کر دیا تھا کہ شاید میری طیب بایز ہی چہرہ ہوں جس کے التفات کے انتظار میں میری ساری عمر کٹ گئی۔ میں جان بوجھ کر اپنے ارد گرد کسی نہ کسی بہانے حسین چہروں کا ہتھکھا لگائے رکھتا، مگر کبھی بھی اپنے دل کے اندر کسی پائل کی نازک جھٹکار سنائی نہ دی۔ کچھ میرے قریب بھی آئیں، مگر وہ صرف روپے کی پجاریں نکلیں..... میرا پیسہ بھی میری ادھوری اور بد صورت شخصیت کو مکمل نہ کر سکا۔ میں سدا سانول ہی رہا، کبھی سا جن نہ بن سکا۔ اور آج زندگی کی 68 خزاںیں جھیلنے کے بعد بھی میں یہاں اس دعا کی امید میں کھڑا ہوں، جو میرے وحشی من کو سکون کا ایک لمحہ ہی نصیب کر دے۔ مگر بے حد نڈھال ہوں۔ میرے قدم تھک کر شل ہو چکے ہیں۔ اب یہ ”فریفتہ پن“ میری جان کا روگ بن



کر چکی تھیں کہ جب کبھی زہرا کے گھروالے یا وہ خود اپنے پرانے گھر کسی بھی کام سے آئیں تو ماما کو ضرور اطلاع کر دی جائے۔ یہ بات بھی ہمسائی ہی نے ماما کو بتائی تھی کہ زہرا کے گھروالے اپنے کچھ ضروری سامان سمیت کچھ عرصے سے کہیں اور منتقل ہو چکے ہیں۔ آج شام اچانک ہی ماما کو اس ہمسائی کا فون آگیا کہ اُس نے ابھی ابھی ڈرائیور سمیت زہرا کی گاڑی کو اُن کے بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ ماما ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا گھر سے نکل پڑیں اور جب وہ وہاں پہنچیں تو زہرا واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ ماما کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا، لیکن وہ پوری تعظیم سے اُن سے ملی۔ البتہ ماما کے تمام سوالوں کے جواب میں وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی کہ ساحر کو اُس کا بس ایک پیغام پہنچا دیا جائے کہ ”شاید قدرت کو ہمارا ملن منظور نہیں۔ اور وہ قدرت کا یہ فیصلہ منظور کر چکی ہے۔ سو، بہتر ہوگا کہ ساحر بھی اس اُن ہونی کو تسلیم کر لے۔ شاید یہی ہمارا نصیب تھا۔“ لوگ کتنی آسانی سے اپنا کیا دھرا نصیب اور قدرت کی سیاہی سے جوڑ دیتے ہیں؟ ماما اُس کے سامنے بہت روئیں اور گڑگڑائیں کہ وہ بس ایک باری مجھ سے مل لے تاکہ ساحر کے وحشی من کو کچھ تو سکون نصیب ہو، لیکن زہرا نے بیگنی آنکھوں سمیت ماما کی یہ درخواست بھی نامنظور کر دی۔ میرا جی چاہا کہ میں ماما کو اُس کی بے زحنی کی اصل وجہ بھی بتا دوں کہ اُس کے ہاتھوں میں کسی اور کے نام کی مہندی رہنے والی ہے، لہذا اُسے اب ہمارے بے رنگ آنسوؤں سے بھلا کیا غرض ہو سکتی ہے؟ ماما اپنی بات ختم کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور میں یوں ہی اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگا، پل بھر میں زہرا نے مجھے بھی بختیار بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں ایک لمحے ہی میں شہزادے سے کمزور بھکاری بن گیا ہوں اور ساری دنیا مجھے حقارت کی نظر سے دیکھ کر تہقہہ لگا رہی ہے۔ میں نے پاپا کے کوٹ کی جیب میں انکا چین نکالا اور قریب پڑے ایک کانڈ پر اپنی زندگی کی پہلی تحریک کا عنوان لکھ ڈالا۔ ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے۔“ پتا نہیں یہ نظم تھی، شرتھی، یا پھر صرف چند بھٹکے ہوئے خیالات، لیکن میں لکھتا چلا گیا۔

سنو..... تمہاری وفا پہ مجھ کو.....

یوں تو پورا یقین ہے.....

پر..... زمانے کے دار کا کچھ بھر دسا نہیں ہے

سوگر کبھی ایسا ہو جائے..... اور تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....

تو ان راہوں سے نفرت نہ کرنا..... جن پر کبھی ہم اک ساتھ چلے تھے

کہ کسی کے قدموں کی بے ثباتی سے..... بھلا ان بل کھاتی راہوں کو کیا راستہ؟

ان نظاروں سے نفرت مت کرنا..... جو ہم نے کبھی اک ساتھ دیکھے تھے

کہ کسی کے وجود کی بدہمت ویرانی سے..... بھلا ان خوبصورت نظاروں کو کیا واسطہ؟

ان باتوں سے نفرت مت کرنا..... جو کبھی ہم نے تنہائی میں کی تھیں

کہ کسی کی بے توازن شخصیت کی کڑواہٹ..... بھلا اُن میٹھی باتوں کا کیا سابقہ.....؟

ان خوابوں سے نفرت مت کرنا..... جو ہم نے کبھی ایک ساتھ مل کر دیکھے تھے

کہ کسی ”پیکر بد نصیب“ کے گھناؤنے پن سے..... بھلا اُن روشن تعبیروں کا کیا رابطہ.....؟

بس مجھ ہی سے نفرت کرنا..... کہ میری رُوح کی سیاہی سے ہی..... چار سو یہ اندھیرا ہے.....

میری بد صورتی کی وجہ سے ہی..... دنیا کا ہر رنگ پھیکا ہے..... ہر راہ بے راہ ہے.....

ہر نظارہ مکروہ ہے..... ہر خواب سراب ہے.....

بس مجھ سے ہی نفرت کرنا..... کہ صرف میں..... اور بس میں ہی تھا..... تمہاری اس نفرت

اہل ہوں،،

ساحر

میں نے کانڈ لفافے میں ڈالا اور اس پر زہرا کا پتا لکھ کر پاپا کی جانب بڑھا دیا۔ ”اس پر زہرا کا پتا لکھا ہوا

ایک اور احسان کر دیں مجھ پر، گھر واپسی پر یہ لفافہ اُس کے گھر دیتے جائیے گا..... آج اس

نے کا اختتام بھی ہو ہی جائے تو اچھا ہے.....“ ماما پاپا کے چہرے سفید پڑ گئے۔

پرانی تاریخوں کے باوجود تازہ لکھے ہوئے ہوتے۔ اُس روز بھی مجھے درگاہ کے کے حجرے کی پرانی  
 ما کے پیچھے سے صفائی کے دوران ایک ایسا ہی رقعہ دھول اور کالک میں اٹالا۔ میں نے اُسے جھاڑ کر  
 کیا اور اُس کی شکستہ تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا ”جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سو سو.....“  
 مجھ مٹی ہوئی تھی اور کچھ کالک کی سیاہی سے سیاہ ہو چکی تھی۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں نے بہت دفعہ  
 بابا کو مختلف رقعہ نما کاغذوں پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن یہ کاغذیوں ایک ایک کر کے بعد میں مجھے  
 لے جائیں گے، یہ میں نے کبھی نہیں سوجھا تھا۔ ورنہ میں اُسی وقت یہ تمام پرچیاں سینت سینت کر سنبھال  
 میں تو آخری وقت تک یہی سمجھتا رہا کہ وہ ان پرچیوں پر مختلف احکامات لکھ کر بانٹ دیتے ہوں گے۔  
 نے کاغذ کی گرد کو پھر سے پھونک مار کر جھاڑا اور جو حصہ پڑے جانے کے قابل تھا، اس کا ربط جوڑنے کی  
 کی ”عصر کا وقت اہم ہے..... کہ اُس کی قسم کھائی گئی ہے..... دھیان رہے..... سائل نہ چو کے.....“  
 تا ہی سمجھ آیا۔ کیا عصر کے وقت کوئی خاص واقعہ ظہور پذیر ہونے والا تھا؟ اور یہ کس سائل کا ذکر ہو رہا تھا۔  
 کی طرح میں اپنے ذہن میں بہت سے سوالات لیے خود ہی سے اُلجھتا، درگاہ کے صحن میں آ بیٹھا۔ مولوی  
 چند سالوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں کبھی لوگوں سے اُکاتتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہتے  
 نہ ہم رزق کی طرح اپنے نصیب کے بندے بھی اُوپر سے لکھوا کر لاتے ہیں۔ سو جسے قدرت نے ہم تک  
 دیا، وہ ضرور کچھ مقصد لے کر ہی آیا ہوگا۔ مگر میں سوچتا تھا کہ میرے نصیب میں تو بس میرا قاتل ہی لکھا تھا،  
 قدرت نے اُسے میری فنا کے لیے ہی اس درگاہ پر بھیجا تھا۔

عصر کی نماز ختم ہوئی۔ ابھی مولوی خضر نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ دو افراد جلدی سے دُعا  
 نہ بتائی اٹھ کر چل دیئے اور ٹھیک اُسی لمحے دو اشخاص درگاہ کے مسجد والے حصے میں داخل ہوئے اور مولوی  
 دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے دیکھ کر جلدی سے صف کے آخر میں بیٹھ گئے اور پھر سب نمازیوں کے ساتھ ہی  
 اُن نے دُعا کر لی۔ دُعا کے خاتمے کے بعد اٹھ کر اپنی عصر کی نماز ادا کرنے لگے۔ باقی نمازیوں کے جانے  
 بعد مولوی خضر نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیوں میاں، دیکھا تم نے محنت کس کے حصے میں آئی اور انعام کے  
 ؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُن کی جانب دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ”دُعا کو عبادت کا مغز کہا  
 ہے۔ شاید ہمیں عبادت کا حکم بھی کہیں اسی دُعا مانگنے کی فضیلت عطا کرنے کی نیت سے دیا گیا ہوگا۔ وہ جو  
 ٹھاس نماز پڑھ کر بنا دُعا مانگے اٹھ کر چلے گئے، انہوں نے اپنے حصے کی مشقت تو کر لی پر انعام لیے بتائی  
 دے، اور وہ دو، جو اپنی جماعت تو قضا کر بیٹھے تھے، لیکن عین وقت پر پہنچ کر دُعا میں شامل ہو گئے، انہوں  
 محنت تو نہیں کی، لیکن قدرت نے انعام اُن کے حصے میں لکھ رکھا تھا۔ سو، انہیں دُعا میں اپنا حصہ مانگنے کا  
 مُل گیا اور کون جانے کہ یہی وہ خاص وقت دُعا ہو، جس میں دُعا میں ساتویں عرش پر سنی جاتی ہیں.....“  
 وہی خضر ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے، ساری عمر سجدے میں پڑے رہنے سے کیا فائدہ، جب وہ سجدہ ہی قضا ہو

## ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے“

پھر یوں ہوا کہ میں نے دن اور رات کا حساب رکھنا چھوڑ دیا۔ موسم میرے لیے بے معنی ہو گئے اور میر  
 زمانہ و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا گیا۔ جہاں ٹھہر جاتا، ٹھنڈوں کھڑا رہتا، اور جہاں بیٹھ جاتا، وہاں تب تک خاک  
 سے جُوار رہتا، جب تک کوئی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھانے لے جاتا۔ مجھے آئینہ دیکھنے نہ جانے کتنا زمانہ بیت چکا تھا  
 لوگ مجھے مجذوب کہہ کر پکارنے لگے۔ یہ عشق بھی ہمارے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ کیا صرف ہوش و خواہ  
 چھین جانے ہی سے کوئی مجذوب بن جاتا ہے یا پھر شاید کبھی مجذوب کسی نہ کسی ناکام عشق کی بھٹی سے تپ کر  
 نکلتے ہوں گے۔ درگاہ پر مولوی خضر ہی میرے ساتھ باقی رہ گئے۔ سب اپنی اپنی تعیناتی کی منزل کی جانب  
 پلٹ چکے تھے۔ لیکن سلطان بابا جاتے جاتے جان نشینی کا جو طوق میرے گلے میں ڈال گئے تھے، وہ اب ہم  
 میرے پیروں کی زنجیر بنا ہوا تھا، ورنہ شاید میں کب کا کسی دیرانے کی جانب کوچ کر چکا ہوتا، کیوں کہ اب یہ  
 ان انسانوں کی محفل میں گزراہ بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ میں جتنا لوگوں سے دامن بچانے کی کوشش کرتا، اُن  
 ہی مجھے اُن کا سامنا کرنا پڑتا۔ شاید ان مزاروں پر ”پہلو تھی“ انسان کو مزید معتبر بنا دیتی ہے۔ اُس رات پانچ  
 خط لے کر زہرا کے در تک پہنچے تو بہت دیر انتظار کے بعد اندر سے کوئی نوکر برآمد ہوا۔ پپانے اُس سے زہرا  
 پوچھا تو پتا چلا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر پر موجود ہے۔ پپانے اُسے میرا رقعہ دے کر زہرا تک پہنچا۔  
 کی درخواست کی اور خود پلٹ کر گاڑی میں واپسی کے لیے جا بیٹھے۔ جب اُن کی گاڑی زہرا کی حویلی کو مڑی  
 والی سڑک کے موڑ تک پہنچی تو انہوں نے حویلی کے اندر پورچ میں سے تیزی سے کسی کو حویلی کے پھاٹک ک  
 جانب آتے دیکھا تھا لیکن میری التجا کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے زہرا کے گھرانے کے کسی بھی فرد سے برا  
 راست رابطہ کرنے سے اجتناب برتا، حالانکہ انہیں فاصلہ ہونے کے باوجود یہ گمان ہوا تھا کہ باہر لپک کر آ۔  
 والی زہرا ہی تھی۔ یہ وہی رات تھی، جب میرے ماں باپ کی زبانی آخری بار میری ساعتوں میں زہرا کے نام  
 امرت اُٹھایا گیا تھا۔ اس کے بعد صرف کڑواہٹ ہی میرا نصیب تھی۔ میں اپنے خوابوں میں سلطان بابا  
 انتظار کرتا مختلف محفلوں اور دیرانوں میں بھٹکتا رہتا، لیکن وہ مجھ نہ ملتے۔ ہاں البتہ اُن کے پیغام بھی کبھار  
 تک کسی وسیلے سے پہنچ جایا کرتے۔ کئی بار اُن کے ہاتھ کے لکھے پُرانے اور اراق مجھے حجرے میں یاد درگاہ کے ک  
 اور کونے میں پڑے مل جاتے۔ وہ بظاہر تو اُن کی موت سے پہلے کی یادداشتیں تھیں، مگر دوسری یا تیسری مرتبہ  
 پڑھنے پر مجھے اپنے حال سے مطابق کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ کچھ

جائے، جس میں رب سے اُسے مانگنا تھا..... میں بھی شاید وہ مجدد قضا کر چکا تھا اور پھر میری قضاؤں کی تو کتنی بھی اب مجال تھی۔ میں تو اپنی ساری دنیا قضا کر چکا تھا اور اب دین بھی مجھ سے دھیرے دھیرے قضا ہو رہا تھا۔ تحصیل ماہی کے مزدوب کی پیش گوئی پوری ہو رہی تھی، لیکن خود میرے ہاتھ میں بھلا میرا کوئی فیصلہ کر تھا۔ عصر کے بعد مولوی خضر حجرے میں کچھ دیر آرام کے لیے چلے گئے، اور میں پھر سے اپنے وجود کی گرہیں کھولنے کی ناکام کوشش کرنے درگاہ کے صحن میں آکر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی اونچے گھرانے کی ایک عورت اپنے ڈرائیور اور دو خادماؤں سمیت درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اُس کے چہرے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ اُس نے درگاہ میں داخل ہوتے ہی ادھر ادھر کسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور پھر تیزی سے میرا جانب بڑھی۔ ”سنو لڑکے! یہاں کے بزرگ بابا کہاں ہیں.....؟“ شاید وہ مولوی خضر کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ ”وہ آرام کر رہے ہیں۔ آپ مجھے بتائیے، کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی.....؟“ وہ کچھ ہچکچاتی ”تم..... میرا مطلب ہے تم تو..... اچھا ٹھیک ہے۔ تم یہ نذر اور نیاز درگاہ پر چڑھا دو اور اپنے بزرگ۔ درخواست کرو کہ وہ چند لمحوں کے لیے میرے ساتھ نیچے بیڑھیوں تک چلے آئیں۔ دراصل میں اپنے بیٹے کے لیے خصوصی دُعا کروانا چاہتی ہوں۔ وہ یہاں تک نہیں آسکتا۔“ مجھے لگا کہ بڑے گھر کی کوئی مجبور ماں اپنے لاڈلے کے لیے دُعا کروانے آئی ہے، جو ماں کی خواہش کے باوجود اپنے قدموں کو زحمت دے کر درگاہ کی سیڑھیاں نہیں چڑھنا چاہتا۔ کبھی میں خود بھی تو ایسا ہی تھا۔ ماما مجھے پکارتی رہ جاتیں لیکن اگر میرا کہیں جانے اُموڑ نہ ہوتا تو میں کان لپیٹے پڑا رہتا۔ میں مولوی خضر کو بے آرام نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ خاتون کسی بزرگ کی تلاش میں یہاں تک آئی تھیں۔ کچھ دیر میں مولوی خضر بھی باہر نکل آئے۔ خاتون نے اپنا دم عاجز سے بیان کیا۔ مولوی خضر نے میری جانب دیکھا اور اُن کو بتایا ”یہ عبد اللہ میاں ہیں۔ یہی اب درگاہ کے متولی ہیں۔ بہر حال، آپ کہتی ہیں تو میں بھی آپ کے ساتھ نیچے چلتا ہوں۔“ عورت کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے ”تو یہ عبد اللہ ہے؟“ میں درگاہ کی سیڑھیوں کے پاس آکر ٹھہر گیا، کیوں کہ میں چاہتا تھا کہ سائل کو خواہش کے مطابق مولوی خضر ہی اُس لڑکے کے لیے دُعا کریں۔ کیوں کہ یہ اُن کے اعتماد اور یقین کا معاملہ اور دُعا پنا کامل یقین کب اپنا اثر دکھاتی ہے۔ لیکن مولوی خضر جب چند سیڑھیاں نیچے اُتر چکے اور انہوں نے مجھے ہم قدم نہیں پایا تو وہ بھی تھک کر رک گئے ”عبد اللہ میاں..... آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ ان کے صاحبزادے کو دُعا دینے.....؟“ مجبوراً مجھے بھی قدم بڑھانا پڑے۔ نیچے نئے سال کے ماڈل کی ایک چمکتی کار کھڑی تھی اور ایک نوجوان لڑکا کانوں میں ہیڈ فون لگائے کسی نغمے کی ڈھن پر اپنی انگلیوں کی تال ملانے کی کوشش کر رہا تھا، جو اس وقت گاڑی کے اسٹیرنگ کو پکڑے ہوئے تھیں۔ اُس نے ایک مسکراتی نگاہ پہلے اپنی ماں اور پھر ہم دونوں پر ڈالی لیکن وہ گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ خاتون نے ہمارا تعارف کروایا۔ ”شہزاد بیٹا..... بزرگ تمہیں دُعا دینے آئے ہیں اور یہ نوجوان اس درگاہ کا متولی ہے.....“ شہزاد مسکرایا ”واہ..... کیا بات ہے

کیا۔ آج کل درگاہوں پر بھی نئے لڑکے سی ایس ایس یا اس قسم کا کوئی دوسرا مقابلے کا امتحان پاس کر کے آنے لگے ہیں۔ آئی میں، ہی از کوائٹ ایک فارابی بیچ پلیس مام۔“ ماں نے بیٹے کو گھور کر تنبیہ کی۔ مولوی خضر نے ہنسا کچھ کہے، وہیں کار کے قریب کھڑے کھڑے شہزاد کے لیے دُعا کی اور ہم دونوں نے آمین کہہ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر لیا۔ شہزاد اب بھی اپنی جگہ کار میں جمنا بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو ماں نے ممنونیت سے ہمیں دُعا دی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ جو ماں ہمیں دُعا دے رہی تھیں وہ اپنے بیٹے کے لیے دُعا کروانے اتنی دُور چلی آئی تھی۔ ان ماؤں کو اولاد کے معاملے میں اپنی دُعاؤں پر اک ڈرا سا اعتماد بھی کیوں نہیں ہوتا۔ کسی ماں کی دُعا سے بڑھ کر کسی بھی درگاہ کے مجاور، متولی یا بزرگ کی دُعا بھلا کیا ہوگی؟ ہمارے مڑتے وقت لڑکے نے اپنی ماں سے انگریزی میں کہا ”آپ نے خد خواہ اتنی دُور آکر اپنا اور میرا وقت ضائع کیا۔ اس بوڑھے اور اس لڑکے کو تو خود دُعا کی ضرورت ہے، ورنہ یہ دونوں یہاں اس دیرانے میں نہ پڑے ہوتے۔“ میں سنی اُن سنی کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، لیکن خلاف معمول اور خلاف توقع نہ جانے مولوی خضر کیوں رک گئے اور انہوں نے شدہ انگریزی میں شہزاد کو جواب دیا۔ ”دُعا کی ضرورت کسے نہیں ہوتی۔ کوئی دُعا کی محبت میں یہاں وہاں بھٹکتا ہے اور کسی کو محبت کی دُعا کے لیے ان دیرانوں تک آنا پڑتا ہے۔ اللہ سب کی سنتا ہے، میری دُعا ہے کہ وہ تمہاری بھی سنے۔“

ہم شہزاد اور اُس کی ماں کو ہکا بکا چھوڑ کر اوپر درگاہ میں چلے آئے۔ جانے کیوں مولوی خضر مجھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آئے، لیکن میں نے حسبِ عادت انہیں کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ مغرب کے بعد میرے اندر وہی اک عجیب سی بے چینی سراپت کرنے لگی، جو اب شاید میری زندگی کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ لیکن آج بہت دنوں کے بعد زہرا کی یاد کا وہ مستقل کاٹنا سر شام ہی ٹیس دینے لگا تھا، جسے میں عموماً ساری دنیا کے سو جانے کے بعد رات کی تنہائی میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے نشتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ بے اختیار رونا آگیا اور نہ جانے کب حجرے کی دیوار سے ٹک لگائے میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں بھی میں رونا ہی رہا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ گھٹنوں سے سر جوڑے دنیا میں آنے کا انتظار کرتا ہے۔ کہتے ہیں، جسم کا یہی آسن انسان کو فطرت سے سب سے زیادہ قریب رکھتا ہے۔ کچھ لوگ ساری عمر نیند میں گھٹنے سینے کی جانب موڑے رکھتے ہیں۔ میں بھی اس وقت گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا زور ہاتھ تھا، تبھی مجھے اپنے سر کے اوپر کسی کے ہاتھ کا مانوس شفقت بھرا لمس محسوس ہوا۔ میں نے سر اٹھایا۔ وہ سلطان بابا تھے۔ ہاں..... وہی تو تھے، لیکن میں تو اُن سے رُٹھا ہوا تھا۔ اس لیے سلام کر کے چپ چاپ اپنے آنسو اپنی تھیلیوں سے صاف کر کے رُٹھا سا بیٹھا رہا۔ اُن کے ہونٹوں پر وہی دھیمی سی مخصوص مسکراہٹ تھی ہوئی تھی ”یہ کیا ساحر میاں؟ اپنے سلطان بابا سے بات بھی نہیں کرو گے کیا۔ اور یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا۔ یہود سے اتنی بڑی جنگ جیتنے والا بھی کبھی روتا ہے کیا؟“ میں نے اُن کی جانب شکایت بھری نظر ڈالی ”آپ جانتے ہیں آپ کے بنام میری ہر جیت، ہمارے۔ اور جانے

وگا۔“ مولوی خضر نے پانی کی بوتل میرے ہاتھ میں تھمادی۔ میں کچھ کہہ نہیں پایا۔ کوئی بات تو خلاف معمول ضرور تھی، ورنہ مولوی خضر مجھے اس بخار نما کیفیت میں کبھی اس عورت کے ساتھ جانے کا نہ کہتے، حالانکہ نہ جانے کیوں میں اندر سے وہاں جانے کے لیے راضی نہیں تھا۔ شہزاد کا متوجہ برتاؤ بھی میرے پیش نظر تھا، لیکن بس صرف قہقہہ کرنا جانتا تھا، لہذا پانی کی بوتل اٹھائے چپ چاپ نیچے کھڑی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ لیا۔ شہر کے مضافات کے آس پاس ہی ایک بہت بڑی سی محل نما کوشی میں گاڑی داخل ہوئی، تو کینوں کی ناست کا اندازہ بڑے باغیچے کی نہایت عمدگی سے تراشی باڑھ ہی سے ہو گیا۔ پورچ میں کچھ اور گاڑیاں بھی وجود تھیں۔ ہم مختلف راہ داریوں سے ہوتے ہوئے ایک نفیس سی خواب گاہ میں داخل ہو گئے۔ سامنے بستر پر نذرانہ پر ایک بڑا سالفا ڈالے پڑا، بخار میں جپ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ یوانگری مین! مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم می کے ساتھ آؤ گے۔ کل جب میں نے تم لوگوں کو ڈی لریڈ کرنے کی حفاقت کی تھی، مجھے اُسی وقت تمہارے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بھی میری ات سمجھ گئے ہو۔ لیکن میری توقع کے برعکس جواب تمہارے بزرگ کی طرف سے آیا۔ ہو سکے تو میری معذرت مان کر لو۔ دراصل اس بیماری نے مجھے بے حد چڑا بنا دیا ہے۔“ میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ بھول جاؤ ب کچھ..... یہ پانی پی لو..... انشا اللہفاق ہوگا.....“ شہزاد نے بے دلی سے پانی کا گھونٹ بھرا۔“ تمہیں سچ ناؤں..... مجھے ان باتوں پر بالکل یقین نہیں۔ میں بس می کی وجہ سے.....“ شہزاد کی ماں نے گھور کر اپنے بیٹے کو تنبیہ کی۔ شہزاد بادل خواستہ پانی پی گیا۔ ماں مجھ سے بولی“ بیٹا تم اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ یہ تو سدا کا پلا ہے۔ تم اپنا عمل پورا کرو۔ میں تمہارے لیے چائے کا کھہہ کر ابھی آئی۔“ میں نے جلدی سے انہیں روکا نہیں۔ چائے کی ضرورت نہیں..... اور مجھے کوئی ایسا خاص عمل نہیں کرنا۔ بس مولوی خضر کی ہدایت کے مطابق بند دُعائیں پڑھنی ہیں۔ آپ کسی تکلف میں نہ پڑیں۔ مجھے جلد واپس لوٹنا ہے۔“ لیکن مائیں بھلا کب کسی کی نئی ہیں۔ سو، وہ بھی میری سنے بغیر مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ شہزاد اپنی تمام تر زندہ دلی کے اوجود خاصہ تکلیف میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تمام بات چیت کے دوران لیٹا ہی رہا۔ میں نے دُعا کے لیے اٹھ اٹھائے تو وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دُعا ختم ہونے کے بعد اُس کا سوال ہونٹوں پر آئی گیا۔“ کیا تمہیں ہنڈ دُعا پر پورا یقین ہے.....؟“ میں نے غور سے اُسے دیکھا۔“ جب تک دُعا کے لیے اٹھ اٹھتے نہیں، تب تک میں بھی اُتنا ہی بے یقین رہتا ہوں، جتنے تم اس وقت ہو۔ لیکن اٹھ آسمان کی جانب اٹھنے کے بعد نہ جانے کہاں سے اتنا یقین میرے اندر بھر جاتا ہے کہ اٹھ گرنے سے پہلے سارا جہاں اپنی ان دو جڑی پھلیوں کے واسلے میں پڑا نظر آتا ہے۔ کبھی موقع ملے تو تم بھی آزمانا۔ یقین خود بخود تمہارے اندر کی خالی درزیں بھر دے گا دیے تمہیں ہوا کیا ہے، کوئی خاص بیماری.....؟“ شہزاد نے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری“ کہتے ہیں جس کو خلل..... خلل ہے دماغ کا..... بس یوں سمجھ لو کہ یہی خلل دماغ کی چولیس ہلا گیا ہے۔ کچھ ایسا ہی سودا میرے

آپ نے مجھ سے اتنی توقعات کیوں وابستہ کر لیں ہیں۔ اتنا مضبوط نہیں ہوں میں۔ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہوں۔ مت ڈالیں اتنے بڑے امتحان میں مجھے۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔“ منزل کے اتنے قریب پہنچ کر پلٹ جاؤ گے.....؟ واپسی کا رستہ اس ڈگر سے کہیں زیادہ طویل ہے، جو سیدھی تمہاری منزل مقصود تک جاتی ہے۔“ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ محبت کے سفینے عموماً اپنے ساحلوں کے قریب ہی غرق ہوتے ہیں۔ میری ناؤ تو ذرا کے جاتے ہی ڈوب چکی تھی اور میں لہروں سے لڑنے کی ہر کوشش بھی ترک کر چکا تھا۔ اب تو بس سمندر کی تہ میں جا لینا باقی تھا۔ وہاں کی ریت، سپہیاں اور گھونکھے ساحر کا انتظار کر رہے تھے۔ سلطان بابا نے میرا ہاتھ میرے ہی دل پر رکھ دیا۔“ جو لوگ یہاں سے سوچتے اور فیصلے کرتے ہیں انہیں زیادہ محضے نہیں ستاتے۔ اور ہاں، یاد رہے کہ ہمارے راستے پہلے سے مقرر ہیں۔ ہمیں بس قدم بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کل تمہارے قدم بھی تمہارے مقررہ رستے پر اٹھ ہی جائیں گے۔“ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے سلطان بابا کے ہاتھ سے کوئی قوت آمیز حرارت میرے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی، جسم میں منتقل ہو گئی ہے۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ میں وہیں درگاہ کی منڈیر کے پاس کھٹنے جوڑے بیٹھا ہوا تھا اور میری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی لکیریں اب بھی میرے گالوں پر جمی ہوئی تھیں۔ میرا دایاں ہاتھ ٹھیک اسی جگہ میرے دل پر اب بھی اُسی طرح جما ہوا تھا، جیسے سلطان بابا اُسے رکھ گئے تھے۔ رات ابھی نصف سے زیادہ باقی تھی اور اس سے کہیں زیادہ باقی میرے اندر کی گرہیں تھیں۔ رات تو شاید کچھ دیر بعد بیت ہی جانی تھی، لیکن یہ گرہیں کھلنے کے لیے نہ جانے کتنی صدیاں درکار تھیں۔

صبح ہوئی تو میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں آنکھیں بند کیے حجرے میں پڑا رہوں کیوں کہ مجھے سورج کی کرنیں برچھیوں کی طرح چھ رہی تھیں۔ شاید ساڑھے دس کے قریب کا وقت تھا، جب مجھے محسن سے مولوی خضر کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے بلا رہے تھے۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی کیوں کہ فجر کی نماز کے بعد خود انہوں نے ہی مجھے حجرے میں آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا، کیوں کہ وہ میری سوجی ہوئی آنکھوں سے میری ابتر حالت کا اندازہ لگا چکے تھے۔ اُن کی دوسری آواز کے ساتھ ہی میں حجرے سے باہر نکل آیا۔ محسن میں وہی گزشتہ روز والی خاتون شدید پریشان سا چہرہ لیے کھڑی نظر آئیں۔ مولوی خضر میری جانب بڑھے“ عبد اللہ میاں..... یہ بی بی اپنی ایک پریشانی لے کر آئی ہیں۔ کل تم نے ان کے بیٹے کے لیے میرے ساتھ دُعا کی تھی نا۔ آج پھر اس لڑکے کی طبیعت بہت خراب ہے، اتنی زیادہ کہ وہ چل کر یہاں تک آ بھی نہیں سکتا۔ یہ بی بی اس لیے پریشان ہیں کہ کل ان کے بیٹے نے کچھ اُلٹا سیدھا کہہ دیا تھا تو کہیں یہ اُسی کیے کی سزا تو نہیں ملی اُسے۔ میں کافی دیر سے انہیں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ فقیروں کے پاس سوائے دُعا کے اور کوئی نذرانہ نہیں ہوتا۔ بد دُعانا م کا کوئی بھی سکہ ہمارے کنٹرول میں کہاں، لیکن انہیں اطمینان نہیں ہو رہا۔ تم ایسا کرو کہ ذرا دیر کے لیے ان کے ساتھ ان کے گھر ہو آؤ۔ یہ پڑھا ہوا پانی اُس نوجوان کو پلا دینا۔ انشا اللہفاق



اسدا کا پگلا ہے۔“ شہزاد نے مسکرا کر اپنی ماں کو دیکھا اور نیکی کے نیچے سے ایک تصویر نکالی اور دھیرے سے اپنے آپ سے بولا.....“ اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق.....“ ماں نے ہنس کر بیٹے کی تصویر لی اور فخر سے اپنے بیٹے کی پسند پر نظر ڈالی اور پھر مجھ سے بولیں.....“ بیٹا! اپنے بزرگ سے کہیے کہ میرے بیٹے کی خوشیوں کے لیے بھی دُعا کریں۔ میں خود کسی دن اپنی ہونے والی بہو کو لے کر درگاہ دُں گی.....“

میں نے سلام کر کے واپسی کے لیے قدم بڑھائے اور مڑتے مڑتے میری پچھلتی سی نظر ماں کے ہاتھوں میں پکڑی بہو کی تصویر پر پڑ گئیں۔ میرے ذہن میں قیامت کا دھماکا ہوا اور زمین شق ہو گئی۔ میں چکرا کر زمین پر پڑا لیکن گرتے گرتے بھی میری زخمی نگاہ شہزاد کی ماں کے ہاتھ میں پکڑی زہرا کی تصویر پر ہی جمی رہی۔

..... وہ زہرا ہی تھی..... جو کبھی میری تھی۔

من میں بھی سا گیا ہے۔ بولو..... ہے کوئی دُعا تمہارے پاس اس خلل کو رفع کرنے کے لیے.....؟“ میں نے چونک کر شہزاد کو دیکھا۔ تو گویا یہ مرض یہاں بھی اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں شہزاد کو منج کر دوں کہ اس راستے پر قدم نہ بڑھائے۔ جتنی جلدی ہو سکے، واپس پلٹ آئے، ورنہ محبت کی ان بل کھاتی پگ ڈنڈیوں پر واپسی کے راستوں میں گھٹے جنگل اُگ آتے ہیں۔ دُکھ کی امرنیل عاشق کے قدم آگے بڑھتے ہی پیچھے یوں تیزی سے ان ٹیڑھے میڑھے راستوں سے لپٹی ہے کہ پھر کوئی مڑنا بھی چاہے تو واپسی کا کوئی راستہ سمجھائی نہیں دیتا۔ درد اور غم کے عفریت ان گھٹے جنگلوں میں سرشام ہی اہل تاس کے پیڑوں سے نیچے اُتر آتے ہیں اور واپسی کے بھٹکتے معصوم مسافروں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ محبت کے راستے پر آگے بھی موت ہے اور پیچھے بھی فنا۔ محبت وہ خونی جزیرہ ہے، جو اپنے باسیوں کے لیے پل بھر میں اُس برفیلے گلیشیر میں تبدیل ہو جاتا ہے، جو اپنے ساحل سے کٹ کر گہرے سمندر میں بہہ چکا ہے اور اب دھیرے دھیرے گھل کر خود بھی پانی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ اس جزیرے پر بسنے والوں کے لیے ایک ایک انچ کر کے پاؤں دھرنے کی جگہ ختم ہوتی جاتی ہے اور آخر کار کبھی ڈوب جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لپٹے پیچھے چلاتے، روتے، سسکیاں بھرتے، کسی برباد ہوتے ٹائی ٹینک کی طرح.....

میں جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ شہزاد کی مُمی کے کھکانے کی آواز سن کر پھر سے حال میں پہنچ گیا۔ وہ جانے کب کی چائے کی کڑائی دھکیلتی خادمہ کے ساتھ واپس آ چکی تھیں۔ شہزاد نے مسکراتے ہوئے اپنا سوال دُہرایا۔ ”کن خیالوں میں کھو گئے۔ میں نے کہا تھا تا کہ عشق لا علاج ہوتا ہے۔ اس جرثومے کا علاج دنیا کی کوئی بھی سائنس آج تک نہیں ڈھونڈ پائی۔ تم بھی اپنے زوہانی علاج کی حدیں آزما دیجھو۔“ شہزاد کی ماں نے پھر اُسے ٹوکا ”شیری! تم باز نہیں آؤ گے نا۔ کیوں مہمان کو زنج کر رہے ہو۔ یہ صرف تمہارے لیے اتنی دُور سے یہاں تک آیا ہے۔“ خادمہ نے چائے کی پیالی مجھے پیش کی، لیکن خلاف توقع شہزاد نے چائے پینے سے گریز کیا۔ میں نے جلدی میں دو چار گھونٹ حلق سے نیچے اُٹھالیے اور واپسی کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شہزاد نے لینے لینے ہاتھ بڑھایا۔ ”بھر کب ملاقات ہوگی پیری جی.....“ میں جانتا تھا کہ ”پیری جی“ کی اصطلاح صرف اُس نے الوداعی لمحات کو خوش گوار بنانے کے لیے گھڑی تھی۔ ”جلد ہوگی، لیکن پہلے تمہارے اس خلل کی کوئی ترکیب تو ڈھونڈ نکالوں حالانکہ یہ تو وہ عارضہ ہے کہ جس کے طبیب بھی بعض اوقات اس جرثومے کے زہر کا شکار ہو کر مجنوں بنے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی محبت چھوٹ کی طرح اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ سو، پہلے میں اس کا اینٹی وائرس ڈھونڈ لوں، پھر تم سے تفصیلی ملاقات ہوگی۔“ شہزاد کی مُمی حیرت سے ہم دونوں کے درمیان ہوتی اس گفتگو کو سن رہی تھیں، مسکرا کر بولیں۔ ”اس کے لیے تمہیں کوئی اینٹی وائرس ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ یہ پہلے ہی محبت کی جنگ جیت چکا ہے۔ جانے اس کے دل سے یہ بے معنی خدشات کیوں نہیں نکلتے۔ اگلے ماہ ہی تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہمارے آگن میں بہار بن کر اُترنے والی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا، میرا

## ”دوسرا رقیب“

بچے رقیب کے خلاف تعویذ گنڈے کروانے کے لیے عاملوں کے در کی خاک چھانتے پھرتے ہیں اور ایک میں فنا کہ جسے مقدر خود اپنے رقیب کے در پر لے آیا تھا کہ جا اپنے دامن میں بچا آخری اُمید کا گلاب بھی اپنے رقیب کے حوالے کر دے اور اُس کی جھولی میں بھرے سبھی کانٹے اپنے جگر میں پرو کر بولہبان اور خالی ہاتھ واپس لوٹ جا۔ سو میں خالی ہاتھ درگاہ کے محن میں دھول میں اٹا بیٹھا تھا، دھوپ نے درگاہ کی منڈیر کا ہاتھ چوما تو مولوی خضر جگرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے اپنی آواز میں چھپے طوفانِ دبا نے کی کوشش کی ”آپ جانتے تھے کہ خرم شہزادی زہرا کا ہونے والا جیون ساتھی ہے، پھر آپ نے مجھے وہاں کیوں بھیجا اُس کی تیمارداری کے لیے.....؟ کیا آپ کو بھی عبداللہ کو بار بار جیتی آگ میں جھونکنا بہت بھاتا ہے۔ ایک ہی بار مجھے مجسم کیوں نہیں کر دیا جاتا ہے۔ یہ روزِ روز کے سکتے داغ میری رُوح کو کب تک سہتا ہوں گے.....؟“ شاید میرا لہجہ کچھ زیادہ تلخ ہوتا گیا لیکن مولوی خضر حسبِ عادت چپ چاپ سر جھکائے سنتے رہے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب بولتے بولتے میرا گلا زُندہ گیا اور ازل سے بیٹھی پلکیں پھر سے نم ہونے لگیں۔ مولوی خضر نے دھیرے سے سر اٹھایا اور میرا ہاتھ تھام کر کچھ دیر تک لفظ جوڑتے رہے۔ ”یقیناً جانو، عبداللہ میاں..... میرے بس میں ہوتا تو یہ ماری آگ اپنے مقدر کے پیالے میں بھر لیتا لیکن تمہاری رُوح پر مزید کوئی ضرب نہ پڑنے دیتا۔ پر ہم دوسروں کے نصیب مول پاتے تو بات ہی کیا تھی۔ بس، اتنا سمجھ لو کہ سب پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے۔ اور ہم شدید خواہش رکھنے کے باوجود کبھی دُعا کی گئی ہے بھی کچھ بدلتا کھول نہیں پاتے.....“ مولوی خضر بونوئی چپ چاپ بیٹھے کافی دیر تک میرا ہاتھ تھپکتے رہے۔ کبھی کبھی خاموشی ہی بہترین گفتگو ہوتی ہے۔ لفظ ہلکے پڑنے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ خاموشی اور سکوت قدرت کے عطیات میں سے ایک ہیں اور لفظ اور بولی انسان کی اپنی ایجاد۔ سو، میں اور مولوی خضر بھی سکوت میں خاموشی کی آہٹوں اور سرگوشیوں والی بولی بولتے اور سنتے رہے لیکن ہمارے لب ساکت ہی رہے۔

سہ پہر کے بعد مولوی خضر کو چند زائرین نے آگھیرا تو میرا جی گھبرانے لگا اور میں نے خود کو درگاہ کی یڑھیوں سے کچھ فاصلے پر واقع بازار میں گم کرنے کا تہیہ کر کے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ بعض اوقات انجمنی ہجوم بھی ذہن کی الجھی گر ہیں انکانے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ابھی میرے قدم تیسری یڑھی ہی پر تھے کہ میں نے خرم کی ماں کو درگاہ کی جانب بڑھتے دیکھا۔ اُن کا ڈرائیور بھی اُن کے پیچھے چلا آ رہا تھا، جس کے ہاتھ میں پھلوں کی چند ٹوکریاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ خاتون کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ جلدی سے میری جانب بڑھیں ”عبداللہ..... تم کہیں جا رہے ہو بیٹا.....؟“ میں رُک گیا۔ ”جی..... بس ذرا دل گھبرا رہا تھا، سوچا کچھ دیر ٹہر آؤں.....“ انہوں نے جلدی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا ”اوہ..... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ ایسی حالت میں تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ ”اب ایسی حالت میں مجھے آرام ملتا ہے۔“ لیکن اچھا ہوا کہ میرے لب سلتے ہی رہے۔ مجبوراً مجھے اُن کے ساتھ ہی درگاہ واپس لوٹنا

جانے میں کتنی دیر اپنے حواس سے بیگانہ رہا۔ جب ہوش آیا تو شہزادی کی ماں اور گھر کے نوکر پریشانی کے عالم میں میرے اطراف کھڑے تھے۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی کہ طبیعت سنبھل جانے تک میں وہیں آرام کر لوں، لیکن میں نے بمشکل اُن سب کو یقین دلایا کہ ایسے دورے میرے لیے معمول کی بات ہیں اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں، لہذا میرا درگاہ پہنچنا ضروری ہے کہ وہاں کی بہت سی ذمہ داریاں میری راہ تک رہی ہیں۔ میرے جسم کی لرزش ابھی تک قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے ظاہر تھی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب گاڑی میں بیٹھا اور کب ڈرائیور نے مجھے درگاہ کی سیڑھیوں کے قریب لا کر اتار دیا۔ میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو مجھے زہرا کے پرانے ڈرائیور کی بات یاد آئی۔ اُس نے تو زہرا کے ہونے والے ہم سفر کا نام خرم بتایا تھا۔ تو پھر یہ شہزاد.....؟ میں فوراً واپس پلٹا۔ ڈرائیور تب تک گاڑی موڑ چکا تھا۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا ”یہ جو لڑکا بیمار تھا..... اُس کا پورا نام کیا ہے.....؟“ ڈرائیور چونکا ”کون..... چھوٹے صاحب۔ ان کا نام شہزاد ہے..... خرم شہزاد.....“ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی اور میں جیسے صدیوں پیچھے کا سفر ایک ہی پل میں طے کر گیا۔ کیا ہاتھ آیا میرے.....؟ میں تو آج بھی اُستایا تہی دامن تھا۔ میں جب تک درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر محن تک پہنچا، تب تک میرا جسم باقاعدہ کانپنا شروع کر چکا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مولوی خضر جگرے میں تھے، ورنہ بوکھلا ہی جاتے۔ میں بمشکل خود کو کسی طرح کھینٹ کر درگاہ کی منڈیر تک جا پہنچا اور وہیں ٹیک لگا کر گر سا گیا۔ کچھ ہونیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو بالکل کسی انہونی کی طرح ہم پر وارد ہوتی ہیں۔ مجھے تقریباً ایک ماہ پہلے ہی یہ خبر مل چکی تھی کہ زہرا کسی اور کی ہونے والی ہے لیکن اس کے باوجود یہ خبر میرے حواس پر آج اُسی طرح بجلی بن کر گری، جیسے مجھے آج ہی اس بات کی آگہی ہوئی ہو۔ شاید انسان کی فطرت ہی میں آخری لمحے تک طوفان ٹل جانے کی اُمید کہیں نہ کہیں باقی رہتی ہے، لیکن جن طوفانوں کو آتا ہوتا ہے..... وہ آکر ہی رہتے ہیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا طوفان بھی اچکا تھا اور کسی بے بسی تھی کہ مجھے تو کوئی سائبان بھی میسر نہیں تھا یا طوفان شاید اُن کے لیے ہی طوفان کہلاتا ہے، جو مجھ جیسے بے سائبان ہوتے ہیں۔ ساری رات میں یوں ہی درگاہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہزکتا رہا اور صبح میری آنکھوں سے پوری رات کی بھتی شبنم درگاہ کی زمین پر کھرے کے موتیوں کی صورت چمک رہی تھی۔ لیکن میرا نصیب وہی سدا کا ماندہ، مدہم اور کا لک زدہ تھا۔ مجھے جس کی سیمائی کے لیے چنا گیا تھا، وہ خود میرا ہی رقیب تھا۔ عاشق تو

پڑا۔ آج وہ بہت خوش نظر آرہی تھیں، انہوں نے خصوصی طور پر مولوی خضر کا شکریہ ادا کیا کہ خرم کی حالت اب بہت بہتر ہے اور یہ سب اُن کے بقول اس ”کراثی پانی“ کا اثر تھا، جو میں گزشتہ روز خرم کو پلا کر آتا تھا۔ مولوی خضر مسکرا کر بولے ”اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے بی بی۔ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔ میں نے تو بس اُس خالق کے لازوال کلام کی چند آیات پڑھ کر اس پانی پر چھوکی تھیں۔ اور یہ عمل آپ خود اپنے گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔ میں آپ کو چند مخصوص آیات لکھ کر دے دوں گا۔ آپ روزانہ شام کو مغرب سے پہلے اپنے بیٹے کو پانی دم کر کے پلا دیا کریں۔ اللہ شفا دے گا۔“ خرم کی والدہ میری جانب مڑیں۔ ”وہ تمہیں بھی یاد کر رہا تھا بیٹا۔ جب کبھی وقت ملے تو ہماری طرف ضرور چکر لگاتا۔ مجھے خوشی ہوگی۔“ میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر نہ جانے کیوں اُن کی آواز بھڑاسی گئی ”ہمارے پاس خوشیوں کی ویسے بھی بہت کمی ہے۔ میں تو بس اب اُس دن کے انتظار میں جی رہی ہوں جب زہرا خرم شہزادی دلہن بن کر ہمارے گھر کی رونق بنے گی۔ مجھے یقین ہے اُس دن میرے پنگے بیٹے کے ہونٹوں پر سدا قائم رہنے والی مسکان ابھرے گی اور اُس کی زندگی کا ہر درد ہر غم ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔“ زہرا کا نام سنتے ہی میرے آس پاس وہی تیز آنکھیاں چلنے لگیں، جو ہمیشہ مجھے ایک کمزور بچے کی طرح اڑا لے جاتی تھیں۔ خرم کی والدہ سچ ہی تو کہہ رہی تھیں۔ جسے زہرا نصیب ہو جائے، پھر بھلا اُسے کسی اور چاندنی کی ضرورت کہاں.....؟ کبھی وہ میرے مقدّر کا چاند تھی، جسے میں نے پا کر کھو دیا تھا۔ کچھ آنگن سدا سونے بھی تو رہتے ہیں۔ اُن کے نصیب کی چاندنی کسی اور کی منڈیر پر چٹک جاتی ہے۔ تقدیر کے گھنے کالے سائے پتیل کے پیڑ سے لپٹ کر اُس آنگن تک روشنی کی ایک نیلی کرن بھی نہیں پہنچنے دیتے اور پھر مجھے مقدّر سے گلے کرنے کا حق بھی کب تھا۔ زہرا تو جبل پور میں لاریب کی حویلی ہی میں، مجھے اپنی رُوح سوچنے کا عندیہ دے چکی تھی، لیکن میں ہی اُسے انتظار کی صلیب پر مصلوب کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ مجھے تو اُسی وقت سلطان بابا نے اجازت دے دی تھی کہ میرے سفر کا پہلا پڑاؤ آچکا لہذا میں چاہوں تو زہرا کا ہاتھ تمام کرواہیں لپٹ سکتا ہوں۔ میں نے جیھی اپنا نصیب کیوں نہیں سمیٹ لیا۔ نصیب بھی تو دسترخوان پر بیچے رزق کی طرح ہوتا ہے، اُسے زیادہ دیر انتظار کروایا جائے تو اُس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ مقدّر دُشہ جاتے ہیں، کسی اور کی تقدیر بن جاتے ہیں۔ لیکن میں بھلا کب ناشکرا تھا؟ میرے دل میں اگر کچھ بھرم تھے تو وہ بھی بلا وجہ کے تو نہیں تھے۔ زہرا کے انتظار کا بھرم، میری واپسی تک اُس کی ٹھل پٹکوں کو اپنی راہ میں بچھے دیکھنے کا بھرم، اپنی اس برباد محبت پر اعتماد کا بھرم، لیکن بھرم تو بس ٹوٹ جانے کے لیے ہی قائم ہوا کرتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ آگینے جیسے نازک بھرم اپنے دل کے اندر پالتے تو ہم خود ہیں، لیکن ان کے ٹوٹنے کی دہائی ہم اوروں کو دیتے پھرتے ہیں۔ میرا پاگل دل بھی اپنے بھرم کی شکست کا بار زہرا پر ڈالنے کے جواز ڈھونڈ رہا تھا، لیکن اب میں اپنے اس ”نادان دوست“ کے بہکاوے میں آنے والا نہیں تھا۔ زہرا اگر میرا انتظار نہیں کر پائی تو کیا ہوا۔ اُس نے کبھی ایک بار مجھے اپنی رُوح سوچی تھی۔ کیا یہ ایک اعزاز ہی میرے پورے جنم کے لیے کافی نہیں تھا، تو پھر میرا یہ دیوانہ پن ختم

کیوں نہیں ہو جاتا۔ میری کوئل رُوح کے پرزے یوں پارہ پارہ ہو کر فضا میں کیوں تحلیل ہوئے جا رہے تھے۔ آخر ہم انسان اپنے نصیب کے لمحے جی کر بھی پل پل کیوں مرتے رہتے ہیں۔ مقدّر ہمارا ظرف اتنا وسیع کیوں نہیں کر دیتا کہ ہم اپنی تمام عمر اُس ایک جادواں پل ہی میں گزاردیں، جو کبھی ہمارا نصیب تھا۔ ہم یادیں سینے کی دھن میں اتنی دُور کیوں چلے آتے ہیں کہ پھر واپسی کے خیال ہی سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے؟ خرم کی والدہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں اُن کے مستقبل کے سنہرے سپنوں کی داستان میں اپنا آج جلنے دیکھتا رہا۔ شاید محبت کی پیاس بھی پانی کی پیاس جیسی ہی ہوتی ہے۔ ہر بار سیر ہو چکنے کے بعد پھر سے پلٹ آنے والی پیاس۔ یہ تو اچھا ہوا کہ مولوی خضر وہاں موجود تھے اور وہ خاتون کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے، ورنہ میں تو بس گنگ ہی بیٹھا رہا۔ وہ نہ جانے کب میرے سر پر ہاتھ پھیر کر، دُعا دے کر چل دیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔

رات تک میرا جسم شدید بخار میں جھکنے لگا۔ بات صرف جسم تک ہی محدود ہوتی تو میرا یہ جسم ایسے کئی عذاب بیک وقت جھیلنے کی سکت رکھتا تھا، لیکن یہ حدت تو میری رُوح کے ریشوں کو بھی جھلسا رہی تھی۔ دل کچھ اس عجب انداز میں دھڑک رہا تھا، جیسے اپنی گنتی کی دھڑکنیں اس رات پوری کر کے ہی دم لے گا اور پھر اگلی صبح جب اس بے چینی کا عروج میرے زوال کا اختتامی باب لکھنے کے قریب ہی تھا کہ اچانک پھر اُسی باد نسیم کے معطر اور رخ جھونکے نے میرے تن من کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ تو وہی مانوس خوشبو تھی، جو اُس ہستی قاتل سے منسوب تھی، جس کے ہاتھوں پر میرے خون کے متبادل مہندی کا رنگ سجے کو تیار تھا۔ ہاں، یہ تو وہی مانوس ہوا تھی، جو زہرا کی آمد سے منسوب تھی۔ میں اُس وقت محن میں آنکھیں موندے پڑا تھا اور مولوی خضر میرے ماتھے پر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر پٹیاں رکھ رہے تھے۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور کراہتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ مولوی خضر ”ارے..... ارے“ ہی کرتے رہ گئے، لیکن میری نظریں درگاہ کے محن میں داخلی دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ مولوی خضر نے بھی میری نگاہوں کے تعاقب میں نظر ڈالی، لیکن داخلی راستہ تو سنسان پڑا تھا۔ مولوی خضر نے حیرت سے میری جانب دیکھا ”کیا ہوا میاں..... کس کی راہ دیکھ رہے ہو.....؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”وہ..... جس کی راہ کی دُھول بننا میرا مقدّر ٹھہر چکا ہے۔“ مولوی خضر نے دوبارہ دروازے کی جانب دیکھا۔ ”لیکن وہاں تو کوئی نہیں ہے میاں.....“ میرے دل نے آج تک پہلے کبھی اُس کی آمد کی جھوٹی گواہی نہیں دی تھی۔ لیکن آج درگاہ کا سنسان دروازہ میرا یہ بچا کھپا اور آخری مان بھی تو دینا چاہتا تھا۔ میری نظر پتھر ہونے لگی اور میری آنکھ کا جھرنا بہنے لگا اور تبھی میری دھندلائی ہوئی نگاہ نے خرم کی والدہ کی اوٹ میں اُس چاند کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میرا دل اس زور سے دھڑکا کہ جیسے سینے کا بجنر توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہاں!..... وہ زہرا ہی تھی۔ وہی سیاہ لباس میں لمبوس۔ ویسے ہی جیسے پانچوں پر تیرتی ہوئی رازِ ہنسی۔ میری آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ بصارت کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب جو کچھ بھی تھا، اضافی تھا۔ زہرا کی رنگت میں پیلاہٹ کی جھلک نمایاں تھی۔ مجھے یوں لگا کہ سارے ساحل پر سرسوں اُگ آئی ہو۔ یا پھر

درگاہ ہی پر کسی نے ہلدی کی پوری پرات الٹ دی تھی۔ وہی پکوں کی مسلسل لرزش، وہ نظریں جھکائے خرم کی والدہ کے پیچھے مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی، لیکن کبھی کبھی چند قدم بھی صدیوں کا فاصلہ بن جاتے ہیں۔ یا شاید ہمارا دوری کو ناپنے کا پیمانہ ہی سدا سے غلط ہے۔ دوریوں کا بخلافا فاصلوں سے کیا واسطہ۔ ٹھیک اسی لمحے مجھے اس دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں اور ان کی تمام لغات کے محدود ہونے کے احساس نے آگھیرا۔ ہمارے لفظ اور ہماری بولیاں صرف اور صرف ظاہری جذبوں اور احساسات ہی کو بیان کر پاتی ہیں۔ جسم سے جسم کے فاصلے کو ”دوری“ کہتے ہیں لیکن رُوح سے رُوح کے فاصلے کو کیا کہا جائے۔ جو جسم کو جلائے وہ ”آگ“ کہلاتی ہے، لیکن جو رُوح کو جھلسائے اُسے کیا نام دیا جائے۔ جو بولی زبان سے ادا ہوا ہے ”لفظ“ کہتے ہیں، لیکن جو بن بولے اور بن سنے ہی رُوح کو جھوٹو جائے اُس بولی کو کیا کہیں۔ میں بھی اپنے سامنے سر جھکائے کھڑی زہرا کی رُوح سے کچھ ایسی ہی بولی بول رہا تھا۔ وہ رُوح جو کبھی میری ملکیت تھی، لیکن آج کسی پرانے کے تصرف کے بوجھ تلے دبی نظر آرہی تھی۔ خرم کی والدہ مولوی خضر سے باتوں میں مشغول تھیں۔ ”آپ ہی اسے سمجھائیں مولوی صاحب۔۔۔۔۔۔ یہ تو یہاں آنے کے لیے کبھی راضی ہی نہ ہوتیں اگر خرم ضد نہ کرتا۔ بڑی مشکل سے اسے یہاں لائی ہوں۔ خرم کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ بھی ضرور آتا۔ لیکن آج آپ میری ہونے والی بہو اور بیٹے کے لیے کچھ ایسی دُعا کریں کہ ان کے آنے والی زندگی سے غم اور تکلیف کے سائے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں۔ ہم نے بہت غم دیکھے ہیں مولوی صاحب۔ اب اگر خوشی مل رہی ہے تو دُعا کریں کہ وہ بھی پوری اور بھرپور ملے۔“ مولوی خضر ہلکے سے بولے ”بی بی میری اللہ سے یہی دُعا ہے کہ وہ آپ کے سارے خاندان کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے اور آپ کے ساتھ سب خیر ہی کا معاملہ رہے۔ بس، اتنا جان لیں کہ خوشی نام کے جذبے کا بنیادی عنصر ہی اس کی کم یابی سے ہے۔ جو سدا کے لیے ہودہ ”خوشی“ نہیں رہتی، معمول بن جاتی ہے۔“ مولوی خضر نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے لیکن میرے ہاتھ گرے ہی رہے۔ میری دُعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا تو آج وہ کسی اور کی نہ ہوتی۔ میرے کانوں میں خرم کی والدہ کی بات کی بازگشت گونجتی رہی۔ ”یہ تو یہاں کبھی نہ آئی اگر خرم ضد نہ کرتا۔۔۔۔۔۔“ گویا آج کا یہ پھیرا بھی میرے مقدر کی دین نہیں بلکہ اُس رقیب کی دی ہوئی خیرات تھا۔ مولوی خضر نے دُعا ختم کر کے زہرا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”سدا سکھی رہو۔۔۔۔۔۔“ خرم کی والدہ واپسی کے لیے پلٹنے پلٹنے رُک گئیں۔ ”ارے ہاں عبد اللہ بیٹا! وہ تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ اُس کی بہت کم لوگوں سے اتنی جلدی بنی ہوگی۔ تم بھی ہمارے ساتھ گھر چلو۔ نا۔ خرم تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ شام سے پہلے ڈرائیور تمہیں واپس چھوڑ جائے گا۔۔۔۔۔۔“ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ مولوی خضر نے جلدی سے بات بنائی ”عبد اللہ میاں ضرور آپ کے ساتھ چلے چلتے، لیکن آج تو انہیں بخار نے بُری طرح سے گھیر رکھا ہے۔ طبیعت کچھ سنبھل جائے تو میں خود لے کر آؤں گا آپ کے دولت خانے پر۔۔۔۔۔۔“ جانے یہ میرا وہم تھا، کوئی سراب تھا یا میری خوش فہمی کہ جس وقت مولوی خضر نے میری بیماری کا ذکر کیا تو اُس بے رحم کی جھکی

اُس کی جھال میں ارتعاش کی اک لہری پیدا ہوئی تھی۔ خرم کی والدہ میرے بخار کا سن کر پریشان ہو گئیں اور اُس نے جلدی سے بڑھ کر میرے ماتھے کو چھوا ”ہاں بخار تو بڑا اتیز ہے۔ عبد اللہ تم باقاعدگی سے اپنا علاج بن نہیں کراتے۔ آخر یہ کیسا روگ ہے۔۔۔۔۔۔؟“ اور یہی وہ لمحہ تھا جب شدید ضبط کے باوجود میری زبان پھسل گئی۔ ”وفا کا روگ ہے مجھے۔۔۔۔۔۔“ آپ دُعا کریں کہ قدرت مجھے بھی بے وفائی کا مہم عطا کرے۔“ خاتون حیرت سے میری جانب دیکھا اور میں اس شکاری کی طرح پچھتایا، جس سے کمان سیدھی کرنے کے دوران تیر پھسل جائے اور وہ اندھا تیر کسی بے گناہ کی جان کے درپے ہو جائے۔ میری زبان سے پھسلے تیر نے بھی ہانچ کی شہزادی کے کورے من کو داغ دیا تھا۔ لمحہ بھر کو زہرا کی پلکیں اٹھیں اور میرا سارا جہاں ڈھس گیا۔ یہ کہانی کا آغاز بھی اسی درگاہ سے اور زہرا کی اٹھی اک ایسی ہی نگاہ سے ہوا تھا اور میرا انجام بھی وہی ایک رہی۔ پھر نہ جانے کب خرم کی والدہ نے مولوی خضر سے اجازت طلب کی اور کب وہ دونوں درگاہ سے واپس نہ گئیں، مجھے کچھ خبر نہ ہو سکی۔ میں وہیں درگاہ کے صحن میں بکھرے پتوں کی مانند پڑا رہا اور ساحل کی ہوا بے نوحے پر ہمتی رہی۔ مغرب کے قریب مولوی خضر نے زبردستی میرا ہاتھ تھام کر مجھے بیٹھا دیا اور کہیں سے نکیل لاکر میرے لرزے جسم پر ڈھک دیا، پر رُوح کی لرزش کا کیا علاج۔۔۔۔۔۔؟ اتنے میں میرے قریب ہی مومن کی آہٹ اُبھری اور شام کے ملجے اندھیرے میں کوئی سایہ میرے قریب آ کر رُک گیا۔ مجھ میں گردن ناکر دیکھنے کی ہمت بھی باقی نہیں تھی۔ پھر کسی نے اچانک بڑھ کر میرے ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا دیے۔ میں نے چہرہ پچانے کی کوشش کی۔ وہ بختیار تھا۔ ہاں۔۔۔۔۔۔ وہی ”فریفتہ نصیب“ بختیار۔۔۔۔۔۔ لیکن آج اس نے چہرے پر ایک خاص چمک نظر آرہی تھی، اس کا لہجہ ممنونیت سے بھرپور تھا۔ ”آپ کی ایک دُعا نے میری لدگی بدل دی۔۔۔۔۔۔“ مجھے ازل کے صحرا سے نکال کر اُمید کے ایک ایسے نخلستان میں پہنچایا، جہاں میں نے سب لیا ہے۔ میں آپ کا شکر یہ کیسے ادا کروں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اُس کی جانب دیکھا۔ بختیار نے بھجان میر خوشی کے ساتھ بتایا کہ آخر کار اُسے پوری کائنات کھوجنے کے بعد وہ اک نگاہ میسر ہوئی گئی، جو صرف اور صرف اُس کی مدح سرائی میں اٹھی اور پھر اُس کی لیے جھک گئی تھی۔ بختیار کے بقول وہ ایک مجسمہ ساز تھی، جس کے ادارے کا سالانہ چندہ بختیار کے ہاں سے ہی جاتا تھا۔ کچھ دن پہلے ادارے نے اُس کے مجسموں کی نمائش کا اہتمام کیا تو بختیار کو بھی بطور مہمان خصوصی وہاں مدعو کیا گیا اور تبھی بختیار کو یہ احساس ہوا کہ وہ اس سین مجسمہ ساز، سائرہ کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے، لیکن یہ تو بختیار کے لیے معمول کی بات تھی۔ پوری زندگی وہ ی فریفتہ پن ہی کا تو شکار رہا تھا۔ لیکن یہ معاملہ تب ”خلاف معمول“ تک جا پہنچا، جب سائرہ نے بختیار کی بالی اپنے فن کی تعریف سن کر شرما تے اور کچھ جھپکتے ہوئے بختیار کے چہرے کا مجسمہ بنانے کی اجازت طلب کرنا۔ بختیار حیرت زدہ سا رہ گیا لیکن وہ اس معصوم خواہش کو چاہتے ہوئے بھی رد نہ کر سکا۔ سائرہ بختیار کی ضروریات کے پیش نظر اُس کے گھر ہی پر روزانہ ایک گھنٹے کے لیے آنے لگی اور بختیار کی اپنی ذاتی آرٹ گیلری



ہی میں اُس نے کچی مٹی اور پکے سے بختیار کا بت تراشنا شروع کر دیا۔ تب زندگی میں پہلی بار بختیار کی جھلٹی رُوح پر ٹھنڈے پانی کے چند چھینٹے پڑے، جب سائرہ نے اُسے یہ بتایا کہ وہ بختیار کی سوچ، خیالات اور شاعری سے بے حد متاثر ہوئی ہے اور اسی لیے اُس نے زندگی میں پہلی بار اتنی جرأت کی ہے کہ خود کسی سے فرمائش کر کے اُس کا مجسمہ گوندھے۔ آخر کار بختیار کے چہرے کا مجسمہ تیار ہو گیا اور بختیار کے بقول اُس نے آج تک کبھی اپنے آپ پر پیار آنا محسوس نہیں کیا تھا لیکن سائرہ کے کمال فن نے اُسے بھی اتنا حسین کر دیا کہ خود بختیار کئی گھنٹے اپنے چہرے کے زاویے اور خط سرائتار ہا۔ بختیار کا یہ ماننا تھا کہ یہ سب میری دُعا کی قبولیت کی وجہ سے ہوا ہے، ورنہ سائرہ اُس کے اندر چھپے خوب صورت انسان کے چہرے کو یوں نہ گوندھا پاتی۔ میں نے بختیار کی جانب دیکھا۔ ”کاش میں اتنا معتبر ہوتا کہ میری دُعا میں بھی قبولیت کا شرف پاتیں۔ بہر حال، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کا خواب پورا ہو گیا۔“ بختیار کچھ ہچکچایا۔ ”ہاں، مگر ابھی ایک اُلجھن باقی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ آج بھی میرے حق میں دُعا کریں گے۔“ میں نے چوک کر بختیار کو دیکھا، ”کسی اُلجھن.....؟“ بختیار نے نظر میں چرائیں۔ ”آپ یہ دُعا کریں کہ قدرت کبھی سائرہ کی بیٹائی نہ لوٹائے۔“ میرے اندر ایک زور دار چھٹکا ہوا اور میری رگوں اور نسون میں وہ سب کانچ دُور تک پیوست ہو گیا۔ ”کیا.....؟ کیا مطلب..... کیا سائرہ نابینا ہے..... مگر..... مگر ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ قدرت نے آپ کو آپ کے حصے کی وہ ایک نظر بخش دی ہے، لیکن اگر سائرہ دیکھ ہی نہیں سکتی تو پھر.....؟“ بختیار نے عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھا ”ہاں..... یہ سچ ہے کہ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ سائرہ نابینا ہے۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ نظر کا واسطہ صرف بینائی ہی سے ہو.....؟“ میں نے چوک کر بختیار کو دیکھا۔ بہت بڑی بات کہہ گیا تھا وہ۔ واقعی، ضروری تو نہیں کہ بختیار کے مقدر میں صرف ”بینا نظر“ ہی لکھی ہو؟ بختیار نے اپنی بصارت چھپا رکھی ہے۔ میرے چہرے کا مجسمہ بھی اُس نے اپنی پوروں کی بینائی سے چھو کر اور محسوس کر کے گوندھا تھا۔ تب ہی اس مجسمے کے چہرے پر کوئی داغ نہیں تھا۔ کوئی سلوٹ کوئی بد نما زاویہ نہیں تھا۔ مجھے اسی شام یہ احساس بھی ہوا کہ کبھی کبھی جیسے بد بینوں کے لیے بصارت بھی کس قدر بڑا عذاب بن جاتی ہے۔ کاش میں بھی سائرہ کی طرح نابینا ہوتا اور قدرت میری اُنکلیوں کی پوروں کو بھی سائرہ جیسی خوب صورت بینائی عطا کر دیتی..... کاش.....“ بختیار بولے جا رہا تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میرے سامنے ایک ایسا شخص بیٹھا، جو اپنی محبوب کے لیے سدا کی بے بصیرتی کی بد دُعا لینے کے لیے یہاں تک آیا تھا، کیوں کہ اُسے خوف تھا کہ بینائی لوٹ آنے کے بعد اُس کے نصیب کی نظر ہمیشہ کے لیے پلٹ جائے گی۔ پھر سے وہی نفرت اُس کا مقدر ہوگی، جو جنم سے اب تک اُس کی رُوح کو چھلنی کرتی آئی ہے۔ لیکن ستم یہ تھا کہ ڈاکٹروں کے حساب سے سائرہ کی نظر واپس آ سکتی تھی۔ بات صرف اُس کے جوڑ کے خلیے والی پتلیوں کے ملنے تک کی تھی۔

بختیار یہ چاہتا تھا کہ یہ وقفہ بختیار کی موت سے پہلے تک کبھی مکمل نہ ہو۔ بختیار جانتا تھا کہ اُس کی یہ خواہش بد خود غرضی کے زمرے میں شمار کی جائے گی لیکن وہ بے بس تھا۔ شاید زندگی میں ہم سب کبھی نہ کبھی ایسی خود ی کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ بختیار نے مجھے خاموش بیٹھے دیکھ کر جلدی سے میرے ہاتھ تھام لیے۔ ”آپ بے لیے دُعا کریں گے نا..... دیکھیں میں بڑی اُمید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے مایوس نہ بھیجئے گا۔“ میں.....“ ”آپ نے ٹھیک کہا..... نظر کا بھلا بینائی سے کیا واسطہ.....؟ اور یہ بھی سچ ہے کہ کبھی بینا وہ نظر نہیں لیتے، تو پھر ہم دونوں مل کر یہ دُعا کیوں نہ کریں کہ خدا سائرہ کو بینائی کے ساتھ ساتھ آپ کے مقدر کی وہ ایک رب بھی عطا کر دے۔“ وہ بے چین سا ہو گیا ”بات صرف میری نہیں ہے۔ ہماری بصارت کی دنیا سائرہ کی دُنیا سائرہ کی دُنیا کی دنیا کے مقابلے میں انتہائی بد صورت ہے۔ یہاں صرف میں ہی بد نما نہیں۔ وہ یہ سب برداشت بن کر پائے گی۔“ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”ٹھیک ہے..... لیکن دُعا میں عرش پار کر جائیں تو پھر واپس میں پلٹا کرتیں۔ اس لیے دُعا مانگتے ہوئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کل شام ایک دوبارہ سوچ لیں۔ اگر پھر بھی آپ کا یہی فیصلہ رہا تو ہم دونوں مل کر اللہ کے دربار میں اس بد دُعا کی عرضی کی ڈال دیں گے۔“ اچانک میرے عقب سے وہی رُوح کھینچ لینے والی ملائم سی آواز ابھری ”اگر بد دُعا کسی یاہ نصیب کی دنیا کو بدلنے کا ایک واحد ذریعہ ہے تو ایک بد دُعا میرے حق میں بھی فرما دیجیے۔“ میں تڑپ کر پلٹا۔ درگاہ کے دروازے کے قریب زہرا کھڑی تھی۔

## تار عنکبوت

ہاں..... وہ زہرا ہی تھی۔ اگر بختیار میرے سامنے نہ بیٹھا ہوتا تو میں اسے ایک خواب ہی سمجھتا۔ لیکن وہ تعبیر تھی۔ میرے نہ سہی..... کسی اور کے خوابوں ہی کی سہی..... لیکن زہرا یوں شام ڈھلے اور اس طرح اکیلے یہاں..... میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ بختیار کی آنکھوں میں بھی حیرت کی جھلک تھی۔ اُس نے ایک جانب ہو کر زہرا کے لیے جگہ خالی کی اور زہرا میرے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آج بھی پلکوں کی وہی ”لرزش بے کراں“ میرے اندر کی دنیا اٹھ پھل کر رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے کائنات تھم سی گئی اور پھر اُس کے لب بے ”خرم کی ای ای آپ کا نیچے گاڑی میں انتظار کر رہی ہیں۔ خرم بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ اُد پر تک نہیں آسکتے اس لیے.....“ میرے اندر زور کا جھکڑ چلا اور میرے دل کی ڈالی پر بچا آخری پتا بھی ٹوٹ کر خاک میں جا ملا۔ گویا اب میرا نصیب بھی میرا قریب لکھ گامے۔ میں نے بختیار سے معذرت طلب کی، لیکن میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوتا چلا گیا ”معافی چاہتا ہوں..... مجھے کچھ دیر کے لیے درگاہ سے باہر جانا ہوگا۔ آپ تو بد دعا لینے کے لیے خود یہاں تک چل کر آتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کو دعا بھی اپنے دروازے پر درکار ہوتی ہے۔ وہ خود اٹھ کر کسی کے در پر نہیں آتے۔ اپنا اپنا مقدر ہوتا ہے۔“ زہرا نے میری بات کا گھاؤ محسوس کر کے بھی اپنی نظر جھکائے رکھی۔ بختیار جو حیرت سے ہم دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا، کچھ ہڑبڑا سا گیا ”جی جی..... ضرور کیوں نہیں..... میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ سائل کی سن لیں.....“ ”جانے ہم دونوں میں سے سائل کون ہے اور سوالی کون.....؟“ بختیار میری بات سن کر اٹھتے اٹھتے ایک بار پھر ٹھٹھک گیا اور پھر موفتے کی نزاکت سمجھتے ہوئے سلام کر کے وہاں سے چل دیا۔ میں اور زہرا درگاہ کے صحن میں اکیلے رہ گئے۔ زہرا کی لرزتی پلکیں کچھ خمی ہوئے لگیں۔ میں نے اُسے چلنے کا اشارہ کیا ”چلیں..... میں حاضر ہوں۔“ میں نے قدم آگے بڑھائے۔ زہرا کی آواز نے میرا تعاقب کیا ”سنیں.....“ میں رُک گیا، لیکن پلٹ کر اُسے نہیں دیکھا کہ میں جانتا تھا کہ یہ وہ طلسم ہے، جو پلٹ کر دیکھنے والوں کو پتھر بنا دیتا ہے۔ ”میں آپ سے معافی نہیں مانگوں گی، کیوں کہ کچھ جرم اپنی سزا خود اپنے آپ ہوتے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں کبھی آپ کے سامنے دوبارہ نہ آتی۔ لیکن ساری بات ہی اختیار کی ہے۔ بس اتنا جان لیں کہ میں بے اختیار اور مجبور تھی۔“ کاش وہ اتنی ہی وضاحت بھی نہ کرتی۔ جانے ہم ہمیشہ انہی ہستیوں کے سامنے اپنا سارا ضبط کیوں کھو بیٹھتے ہیں، جن کے سامنے ہمیں ضبط کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں بھی ایک لمحے کے لیے اپنا سارا ضبط کھو بیٹھا اور

پ کر پلٹا، وہ سر جھکائے اپنا کانپنا وجود سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”کم از کم آپ کی زبان سے یہ مجبوری جیلہ بہت عجیب لگتا ہے۔ میں نے آپ سے کوئی وضاحت طلب نہیں کی، نہ ہی آپ کو اپنے دل پر کسی قسم کا بھ لیے رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں لڑکیاں اپنے مستقبل کے بارے میں کافی محتاط ہوتی ہیں۔ بہ میں اگر انہیں کسی معذوری کے قریب تردیدوانے اور کسی شہزادے / امیر زادے کے درمیان کسی ایک کا چناؤ رہا ہو تو فیصلہ وہی ہوگا جو آپ نے کیا۔ ساری عمر کے لیے کسی معذوری کی بیساکھیاں بننے سے بہتر ہے کسی نبوط شائن کا سہارا بن کر زندگی گزار دی جائے۔ مجھے اس فیصلے پر آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔“ میں نے اپنی بش کے بھی تیر خالی کر دینے کے بعد دوبارہ قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ پیچھے سے دم توڑتے گھال کی خری ڈوہتی آواز سنائی دی ”آپ کو حق ہے مجھ سے نفرت کرنے کا۔ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ گھر سے چلتے دے میں نے کچھ سطریں لکھی تھیں، وقت ملے تو انہیں پڑھ لیجیے گا۔“ زہرا نے اپنے ہاتھ میں پکڑا، ایک نہ شدہ رن میرے حوالے کر دیا اور آگے بڑھ گئی۔ میں اُس سے یہ بھی نہ کہہ پایا کہ ”نفرت“ محبت کا سب سے غریب رنگ روپ ہوتا ہے اور شاید محبت سے بھی کہیں زیادہ خالص اور سچا روپ۔ میں درگاہ کی سیڑھیاں اتر کر ہیرا کے نقش قدم پر چلتا ہوا جب نیچے پہنچا تو مجھے دیکھ کر خرم کی والدہ جلدی سے گاڑی سے نیچے اتر آئیں، لیکن خرم حب معمول گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ آج بھی وہ ڈرائیور کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ کے مقابل والی نشست پر بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے سے آج پیلا ہٹ جھلک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا ”بڑے مغرور ہو برے سیجا۔ آخر مجھے ہی یہاں تک آنا پڑا۔“ خرم کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گھور کر اپنے بیٹے کی تنبیہ کی۔ ”شہزاد..... تمیز سے.....“ تب میں نے پہلی مرتبہ نوٹ کیا کہ خرم کی امی جب بہت پریشان یا عجیبہ ہوتیں تو خرم کو شہزاد بلاتی تھیں۔ ”میرے پاس غرور کے قابل کچھ نہیں ہے۔ سب مان، سارے غرور ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکے ہیں۔ میں تو اب بس خاک کا ایک ڈھیر ہوں۔ غرور اور فخر کے گہنے تو آپ جیسوں پر سجتے ہیں، جنہیں ایک کائنات میسر ہے۔ اپنا نصیب تو بس داغ ہی ہیں۔“ خرم نے چوک کر میری آنکھوں میں جھانکا ”سوری..... میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا عبد اللہ، اور سچ تو یہ ہے کہ میری کائنات میں بس ایک ہی قابل فخر گہنا ہے۔ میرے پاس بھی بس ایک غرور ہی تو باقی بچا ہے۔ جس سے میری ساری کائنات منور ہے۔“ خرم نے مسکرا کر زہرا کی جانب دیکھا۔ وہ جو کبھی میرا مان تھی، آج کسی اور کا غرور تھی۔ اس دنیا میں تخت لٹتے اور تاج بدلتے کب دیر لگتی ہے۔ کل کے بادشاہ آج کے بھکاری بنے پھرتے ہیں۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ مولوی خضر نے خرم کے لیے سہ پہر کو پانی پر دم کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے خرم کی والدہ سے کہا کہ وہ خرم کو اُد پر درگاہ ہی پر لے چلیں تاکہ مولوی صاحب ہی اُس کو وہ پانی بھی پلا دیں۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا کہ میری بات سنتے ہی اُن کے چہرے پر ایک عجیب سا تردّد چھا گیا۔ انہیں ہچکچاتے دیکھ کر میں نے خرم سے کہا کہ دو گڑھی کے لیے وہ میرے ساتھ درگاہ کے حجرے تک آجائے تاکہ مولوی خضر سے بھی اُس کی ملاقات ہو

کہتا۔ نہ جانے میں کس طرح لرزے قدموں کو سنبھالتا واپس درگاہ کے صحن تک پہنچا۔

آج سمندر کی لہروں کی بھی آپس میں کوئی جنگ چل رہی تھی شاید..... اسی لیے ان کے چنگھاڑنے رلڑنے کی آوازیں درگاہ کے اندر بھی سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن اس شور سے کئی گنا زیادہ شور اس وقت خود برے وجود کے سمندر میں اٹھ رہا تھا۔ سماعتیں معطل کر دینے والا شور۔ شاید بہت شدید اور حدوں کو پار کر جانے والا شور بھی خاموشی ہی کی ایک قسم بن جاتا ہے۔ ایسی ہی کسی لرزتی خاموشی کی ساعت میں میں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے زہرا کا دیا ہوا کاغذ کھولا۔ میں زہرا کی تحریر کو خط کہہ کر اس کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ضروری نہیں کہ ہر نامہ ”خط“ ہی ہو، یا ہر ”خط“ کسی کی تحریر ہی سے جزا ہوا؟ کچھ تعلق خط سے بڑھ کر بھی تو ہوتے ہیں اور کچھ ”خط“ لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ آنسوؤں سے بھیگی میری دھندلی نگاہ ان سیاہ موتیوں پر پھسلنے سے پہلے تعظیم کے تمام تقاضے پورے کرنا نہیں بھولی۔ وہی دل میں اُتر جانے والی تحریر اور وہی اندازِ تکلم۔ کون کہتا ہے کہ ثبات صرف اک تغیر کو ہے.....؟ اور بھی کچھ ایسا ہے کہ جس کی دل کشی سدا قائم رہنے والی ہے۔ میں نے ہشکل اپنی نظر کاغذ پر جمائی۔ ”میں جانتی ہوں کہ اب میرا کوئی بھی لفظ آپ کے زخموں کا مرہم نہ ہو سکے گا۔ شاید کچھ لوگ پیدا ہی سدا زخم دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ میری آرزو تھی کہ میں آپ کی راہ میں بھول، بچھاؤں، لیکن اپنے مقدر کے کانٹے بھی آپ کے راستے میں پرودوں کی، ایسا بھلا کب سوچا تھا.....؟ آپ کی ہر بدگمانی جائز ہے اور اگر میرا اور آپ کا دوبارہ سامنا نہ ہوتا تو شاید میں انہی بدگمانیوں کے تپتے سائے تلے اپنی باقی تمام زندگی گزار دیتی، کیوں کہ کبھی کبھی یہ بدگمانی ہی کسی کے جینے کا سہارا بن جاتی ہے۔ آپ کا مجھ سے بدگمان رہنا ہی خود آپ کے لیے بہتر تھا، لیکن میری بے بسی کی انتہا دیکھیے کہ میں اپنے حق میں کسی کی عمر بھر کی بدگمانی کی حق دار بھی نہیں رہی۔“ میری نظریں تیزی سے خط کے منظر نامے کو اپنے ذہن کے پردے پر منتقل کرنے لگیں۔

زہرا کی کہانی ٹھیک اُسی دن سے شروع ہوتی تھی، جس دن میری داستان کا اختتام لکھا تھا۔ اُس دن ”کاسا بلانکا“ کو زہرا کے شہر اُسی ساحل پر لتگر انداز ہوتا تھا، جہاں اُس کی ساحر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ زہرا کو ساحر کا پیغام مل چکا تھا کہ وہ زہرا کو بندرگاہ کے ساحل پر پہلا قدم دھرتے ہی اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے کہ یہی تو وہ ساحل تھا جہاں ساحر کے دل نے آخری بار لتگر انداز ہو کر زہرا کے قدموں میں ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ ساحر کو سفر پر نکلے آج چھ مہینے پورے ہو رہے تھے اور یہ بات صرف زہرا کا دل ہی جانتا تھا کہ اُس نے یہ چھ ماہ کس طرح پل پل کر کے کاٹے تھے۔ لیکن آج کا دن کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ جہاز سہ پہر کو لتگر انداز ہونے والا تھا مگر کبھی کبھی یہ دن اتنا طویل کیوں ہو جاتا ہے کہ اس کا پہلا پہر ہی سال ہا سال کی طرح ڈھلتا ہے۔ زہرا بھی بمشکل دوسرے پہر تک انتظار کی سولی پر خود کو ٹانگ سکی اور پھر دوپہر کو آنے والے ڈرائیور کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے گاڑی نکالی اور بندرگاہ جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ وہ اپنی دھن میں اتنی سرشار تھی کہ اُسے اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی کہ روزانہ کی طرح ایک سپورٹس بائیک پر بیٹھا ہیلمٹ پوش اُس کی گاڑی

جائے۔ خرم بھی کسی سوچ میں پڑ گیا، جیسے میں نے کوئی بہت ہی مشکل سوال پوچھ لیا ہو۔ زہرا کے چہرے پر بھی کئی رنگ آکر گزر گئے۔ کچھ دیر کے لیے وہ تینوں خاموشی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ پھر خرم نے جیسے کوئی فیصلہ کر لیا اور اس کے چہرے کی مخصوص مسکراہٹ لوٹ آئی ”اچھا چلو..... آج ہم بھی یہ معرکہ سر کر ہی لیتے ہیں، ورنہ تم یہی سوچو گے کہ یہ کیسا مغرور اور سر پھرا امیر زادہ ہے، جو خود اپنے مطلب کے لیے بھی دو قدم چل کر اُپر نہیں آسکتا۔“ خرم نے اپنے ڈرائیور کی جانب دیکھا، جو جلدی سے گاڑی سے اُتر کر خرم کے دروازے کی جانب بڑھ گیا لیکن خرم کا دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر کوئی چیز نکالی اور پھر خرم کی نشست والا دروازہ کھول دیا۔ میرے وجود کے اندر ایک زوردار دھماکا ہوا اور کچھ دیر کے لیے ارد گرد گھناٹو پ اندھیرا چھا گیا۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں دو بیساکھیاں تھیں اور گاڑی میں بیٹھے خرم کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے مصنوعی تھیں۔ ڈرائیور نے سہارا دے کر خرم کو گاڑی سے باہر نکالا اور بیساکھیاں اُسے تھما دیں۔ خرم نے کچھ لڑکھڑا کر پہلا قدم اٹھایا۔ میں سوچنے سمجھنے سمیت اپنے تمام حواس کھو چکا تھا۔ گویا خرم اپنی اس معذوری کی وجہ سے آج تک کبھی گاڑی سے نیچے نہیں اُترا تھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ بند ہونے سے پہلے کار کے کچ اور ایکسیلیٹر کا وہ مخصوص خود کار نظام بھی دیکھ لیا، جو خاص طور پر معذور افراد کی گاڑیوں میں نصب کیا جاتا ہے۔ خرم نے ڈنگا تے ہوئے دوسرا قدم اٹھایا اور ڈرائیور کے سہارے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا۔ اتنے میں اُوپر سے مولوی خضر کی گھبرائی ہوئی سے آواز سنائی دی۔ ”ارے میاں..... تم وہیں زکو میں نیچے آ رہا ہوں۔“ مولوی خضر ہاتھ میں پانی کی بوتل لیے جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئے اور انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے خرم کو چند گھونٹ پانی پلا دیا، جو ان دو قدموں کے سفر ہی میں بُری طرح ہانپنے لگا تھا۔ میں ویسے ہی اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا۔ خرم نے مسکرا کر میری جانب دیکھا ”میں نے کہا تھا نا..... میرے پاس فخر کرنے کی بس ایک ہی وجہ رہ گئی ہے لیکن یقین مانو، یہ آخری مان اور بھرم ہی اس ایک زندگی کو کنارے لگانے کے لیے کافی ہے۔“ ڈرائیور نے خرم کو پھر سے سہارا دے کر گاڑی کے اندر بیٹھا دیا۔ خرم کی والدہ اپنے آنسو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی نظر آئیں۔ زہرا ویسے ہی سر جھکائے اپنا پیلا چہرہ چھپاتی کار کی پچھلی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ مولوی خضر نے خرم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور میری جانب دیکھ کر دھیرے سے کھانے، میں جیسے کسی خواب کے اثر سے نکل کر ہوش کی دنیا میں پہنچ گیا۔ لیکن تب تک خرم کا ڈرائیور گاڑی کے انجن کو بیدار کر چکا تھا۔ میرا ہاتھ ہوا میں اٹھارہ گیا اور خرم کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں گاڑی کے پچھلے پہیوں کی رگڑ سے فضا میں اُڑتی ریت کے ساتھ ڈھول ہوتا چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ مولوی خضر نے مجھے خرم کو الوداع کہنے کے لیے کھنکھار کر ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی کہ تہذیب اور آداب کا یہی تقاضا تھا لیکن خرم کی معذوری دیکھنے کے بعد میں اپنے حواس میں تھا ہی کب.....؟ کاش دنیا کے کبھی دیوانوں کے ہاتھ پر قدرت ہوش چھیننے ہی کوئی واضح مہر ثبت کر دیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اُن کی جبین پر پڑے داغ کو دیکھ کر ہی دوسرا اُن سے کسی ادب آداب یا تہذیب کی کوئی اُمید

کے پیچھے چل پڑا ہے۔ سیاہ رنگ کا ہیملٹ پہنے یہ نوجوان گزشتہ چند روز سے زہرا کے گھر کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا اور جیسے ہی زہرا ڈرائیور وغیرہ کے ساتھ کسی بھی مقصد سے گھر سے باہر نکلتی تو وہ اُس وقت تک زہرا کی گاڑی کا طواف جاری رکھتا، جب تک وہ واپس گھر نہیں پہنچ جاتی۔ زہرا سے پہلے زہرا کے ڈرائیور نے یہ بات محسوس کر لی تھی اور اُس نے ایک آدھ بار ڈک کر موٹر سائیکل سوار سے یہ پوچھنے کی کوشش بھی کی کہ وہ کیوں گاڑی کا پیچھا کر رہا ہے۔ لیکن ڈرائیور کے گاڑی سے اترتے ہی وہ ہیوی بائیک ایک زوردار ایکسیلیٹر کے ساتھ فرائٹ بھرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھی۔ ڈرائیور نے زہرا کی توجہ بھی اس جانب مبذول کر دئی، لیکن تو زہرا کو بھی ہوئی مگر اُس نے ڈرائیور کو یہ بات گھر میں کسی کو بھی بتانے سے منع کر دیا کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے والدین بلاوجہ پریشان ہوں۔ ہاں البتہ زہرا نے خود گھر سے لکنا کم کر دیا اور اگر کسی اشد ضرورت سے گھر سے باہر جانا بھی پڑتا تو وہ دن کے اُجالے ہی میں کام منٹا کر جلد از جلد واپس گھر پہنچنے کی کرتی، لیکن اُس روز ساحر کے آنے کی خوشی میں وہ تمام احتیاطیں بھلا بیٹھی اور اُسے ہوش تب آیا، جب اُس نے ایک قدرے دیران سڑک پر اُسی نیلے رنگ کی ہیوی سپورٹس بائیک کو اپنی گاڑی کے تعاقب میں آتے دیکھا۔ زہرا کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے کیوں کہ وہ نہایت معمولی سی رفتار کے ساتھ گاڑی چلانے کی عادی تھی اور اُسے تیز رفتاری کا بالکل بھی تجربہ نہیں تھا، جب کہ اس وقت وہ بائیک سوار اُس کی گاڑی کے پیچھے پھر سے بالکل چھوٹے ہوئے اپنی بائیک کی رفتار بڑھاتا چلا آ رہا تھا۔ زہرا نے بھی بوکھلا کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ مگر فاصلہ بڑھنے کے بجائے مزید کم ہوتا چلا گیا۔ زہرا کا پاؤں ایکسیلیٹر پر دیتا چلا گیا اور مر سڈیز کا بھرپور طاقت ور انجن اپنے وحشی زور کے بل پر بے قابو ہونے لگا اور پھر جب ایک مصروف سڑک پر موڑ کاٹنے ہی اچانک اشارہ سرخ ہو گیا تو زہرا سے گاڑی سنبھالنا مشکل تر ہو گیا۔ غلٹ میں لگائی گئی بریک نے مر سڈیز کے چاروں پہیے تو تارکول کی سڑک پر پیوست کر دیئے لیکن گاڑی کی بقیہ باڈی اس اچانک جھٹکے کی وجہ سے بُری طرح جھول کر گھوٹی اور پیچھے سے آتی ہیوی بائیک زوردار آواز کے ساتھ گھومتی ہوئی گاڑی کے دروازے والی طرف سے ٹکرائی۔ موٹر سائیکل سوار اس طرح ہوا میں اُچھلا جیسے کسی توپ سے ٹکلا کوئی گولا اور فضا میں قلابازیاں کھاتا! گاڑی کے اوپر سے ہوتا ہوا، دوسری جانب سڑک پر دم سے گر کر بے سدھ ہو گیا۔ لیکن آنکھیں بند ہونے سے پہلے اُس نے بائیں جانب سے ایک کار کو تیزی سے اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ سوار نے کسسا کر اپنا وجود بچانے کی ایک آخری کوشش کے طور پر کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن کار رُکے رُکے بھی اس کی گھماں ناگوں کو روند گئی۔ فضا میں خون کے چند چھینٹے اڑے اور زہرا جس کا سر جھٹکے کی وجہ سے زوردار طریقے سے اسٹیرنگ سے ٹکرا چکا تھا یہ سب دیکھ کر وہ ہیں بیٹھے بیٹھے ڈھسے گئی اور جب اُسے ہوش آیا تو رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی اور وہ شہر کے معروف ہسپتال کے آئی سی یو میں اپنے پریشان والدین اور ڈاکٹروں کے جھوم میں گھری ہوئی تھی۔ اُس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ ساحر کا جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا ہوگا اور جب ساحر نے

اکو وہاں اپنے استقبال کے لیے نہیں پایا ہوگا، تو وہ کتنا پریشان ہوا ہوگا۔ ضرور ساحر نے زہرا کے گھر پر بھی بٹے کی کوشش کی ہوگی، لیکن گھر پر نوکروں کے سوا اور کون تھا، جو اُسے کوئی تسلی بخش جواب ہی دے پاتا۔ زہرا ڈاکٹروں سے پہلا سوال اُس سپورٹس بائیک والے گھماں کے بارے میں پوچھا لیکن جواب میں اُسے کا انجینشن ملا اور زہرا اپنے سر میں اٹھتی ٹیوس سمیت پھر سے غافل ہو گئی۔ شاید یہ ٹھیک وہی لمحہ تھا، جب مری جانب ساحر اپنے حواس کھو رہا تھا اور پھر جب تک دو دن بعد زہرا کے ہوش سنبھلے، تب تک ساحر اپنے س کے آخری دورے سے گزر کر لندن کے لیے پرواز کر چکا تھا۔ لیکن زہرا کے لیے کا آخر بھی لکھا جاتا باقی۔ ایک نئی قیامت اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں اُس کا انتظار کر رہی تھی، جہاں اُس کی گاڑی سے ٹکرا کر نکلنے والا موٹر سائیکل سوار موت و زندگی کے اس دورا پہ پر کھڑا تھا، جہاں سے کچھ کم خوش نصیب ہی واپس آئے ہیں اور یہ دیکھ کر تو زہرا کی روح ہی اُس کے بدن سے نکل گئی کہ اس نوجوان کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے پچے غائب تھیں۔ کار نے اس بُری طرح سے انہیں کچل ڈالا تھا کہ ڈاکٹروں کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ساحر مزید انتظار سارے جسم میں زہر پھیلنے کے باعث بن سکتا تھا۔ نوجوان کا نام خرم شہزاد تھا اور اُس کے حال سے والدین بھی وہیں موجود تھے۔ زہرا تو ٹھیک طرح سے انہیں آداب بھی نہیں کہہ پائی۔ پولیس کی مذاقی تفتیش کے مطابق بظاہر یہ ایک خطرناک ایکسیڈنٹ کا کیس تھا، جس میں سراسر غلطی زہرا کی تیز رفتاری پر اچانک بریک تھی لیکن خرم کے والد نے پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے سے روک دیا تھا۔ وہ خود بھی شہر نے بڑے متحمل تھے اور براہ راست زہرا کے والد حاجی مقبول کو نہ جاننے کے باوجود، وہ اُن کے بڑے خاندان رُز رُز سے واقف تھے۔ خرم نے بھی پہلی مرتبہ ہوش میں آتے ہی پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ غلطی زہرا کی تھی، وہ خود ہی نہایت تیز رفتار کا عادی تھا۔ زہرا کے والدین کو بھی اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ اگر زم کا خاندان جذبات میں آکر زہرا کے خلاف کوئی شکایت درج کر دیتا تو انہیں اپنی بیٹی کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی اور معاشرہ کس کس انداز میں انہیں اپنے تیروں کا نشانہ بناتا، لیکن یہ اُن کی بھی خوش قسمتی تھی کہ اُن کا بالاطرف والوں سے پڑا تھا۔ ہاں مگر اگلے کے طرف کا بوجھا اٹھانا بھی نہ صرف ظرف والوں ہی کا خاصہ ہے۔ جی تو زہرا کے والدین بھی گزشتہ تین روز سے خرم کے پرائیویٹ وارڈ کے دروازے سے لگے کھڑے تھے مگر جن کا جوان بیٹا عمر بھر کے لیے معذور ہو چکا ہو اُن کا دکھ کوئی کیا ہے؟ خود خرم کی اپنی دنیا ہمیشہ کے لیے لٹ چکی تھی، وہ تیز رفتار کا دلدادہ اور زندگی سے بھی ایک قدم اُگے چلنے کا عادی تھا، مگر وقت نے ایسا وار کیا کہ وہ اپنے قدم ہی کھو بیٹھا۔ مگر آفرین ہے اُس کی زندہ دلی اور ہمت پر کہ اُس نے اپنے والدین کی اکلوتی اولاد دھونے کا خوب حق ادا کیا اور اپنے ہونٹوں کی ازلی مسکراہٹ کو لبوں سے جدا نہیں ہونے دیا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ٹوٹ گیا تو پھر اُس کے ماں باپ کی کرچیاں بھی کوئی نہیں سنبھال پائے گا۔ لیکن ابھی کسی اور کے من آئینے میں دراڑ آنا باقی تھا۔ قدرت جب زندگیاں بدلنے



لے دن ہی سے بندھے ہوئے تھے لیکن زہرا نے اپنے گھر والوں کے سامنے واحد شرط یہی رکھی کہ ماضی کے نہری دھماگوں سے ناتا توڑنے کے لیے شہر والی کو بھی چھوڑ کر مصافحات والی حویلی میں بسیرا ڈالا جائے۔ پرانے لھر کے نوکروں کو بھی تاکید کر دی گئی کہ نئے ٹھکانے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے۔ زہرا کے سامنے دو ہی اتے تھے کہ ساحر کو یہ سب بتا کر اُس کے جنوں کو دیوانگی کی آخری حد تک پہنچا دے یا پھر خاموشی سے سب کچھ بہہ کر ساحر کے ٹھیک ہو کر پلٹ آنے تک خود کو کہیں چھپا لے۔ بدگمانیوں کو اس حد تک ہوا دے کہ ہلکی آنچ بڑکتی ہوئی آگ میں بدل جائے اور ساحر سے ہر شے جل کر بھسم ہو جائے۔ زہرا نے دوسرا راستہ اختیار کیا کہ اس میں اُسے سب کا بھلا نظر آیا۔ لیکن نصیب تدبیر سے ہمیشہ ایک قدم آگے کی چال چلتا ہے کہ زہرا کا سامنا ایک بار پھر ساحر سے ہوتا بھی تو اسی مقدر نے طے کیا تھا۔ ”میں نے لرزتے ہاتھوں سے زہرا کا خط تہہ کیا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب آسمان نے میرے آنسو دھونے کے لیے اپنی بوندوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ میں برقی بارش میں درگاہ کے صحن میں بیٹھا بیٹھتا رہا اور زہرا کی تحریر کے لفظ دھل کر صحن میں بہتے چلے گئے۔“ کاش میرے نصیب کی تحریر بھی اتنی ہی سچی ہوتی کہ میرے آنسوؤں سے دھل جاتی۔ میرے ذہن میں پھر اسی مجذوب کی پیش گوئی گونجی ”تجھے خدا ہی ملے گا..... نہ وصال صمن.....“

کافیصلہ کر لیتی ہے تو پھر ہر عابد عا میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ خرم نے پہلی تنہائی پاتے ہی زہرا کو بتا دیا کہ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے صرف زہرا کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پہروں اُس کی کونٹھی کے چکر کاٹا رہا ہے۔ خرم نے زہرا کو پہلی مرتبہ کتابوں کی ایک بڑی نمائش میں غالب اور میر میں گھرے دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ زہرا کا نقاب سے جھلکتا خیرہ کن حسن اُس کے دل پر بجلی کی چمک کی طرح کوند اور پل بھر میں ہی سب بھسم کر گیا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ خرم کی اُس پہلی نظر کا انجام اُس کی ازلی معذوری کی صورت نکلتے گا۔ خرم کی حالت حادثے کے دن سے لے کر اب تک بنتی بگڑتی رہی تھی۔ خون کے حد سے زیادہ اخراج اور پھر ایک طویل آپریشن نے اُس کی رگوں سے جان کھینچنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن زہرا کو دیکھتے ہی اُس کے اندر پھر سے جینے کی خواہش جاگ اٹھتی تھی اور پھر ایسے ہی ایک لمحے میں جب نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں خرم نے زہرا سے اُس کا سدا کا ساتھ مانگ لیا۔ فیصلہ کرنے کی آزادی بہر حال زہرا کو میسر تھی اور خرم نے ”نہ“ کا حق بھی اُسے تفویض کر دیا تھا، لیکن کبھی کبھی یہ حق اور یہ ”اختیار“ خود انسان کے لیے سب سے بڑی زنجیر بن جاتا ہے۔ زہرا ابھی خرم کو یہ بتا بھی نہیں پائی تھی کہ اُس کی رُوح پہلے ہی ساحر کی راہ میں ملیں۔ بچھائے منتظر ہے کیوں کہ خرم کی بنتی بگڑتی حالت کو قرار نہ تھا۔ زہرا نے خود کو گھر میں بند کر لیا۔ خرم کی معذوری ہی زہرا کی سب سے بڑی مجبوری بنتی چلی گئی، کیوں کہ وہ اب بھی کہیں نہ کہیں اُس کی اس حالت کا ذمہ دار خود ہی کو سمجھتی تھی حالانکہ کہ خرم نے خود اپنے والدین سے بارہا یہ بات کہی تھی کہ اپنی اس معذوری کے بعد وہ خود کو کسی طور بھی زہرا کے قابل نہیں سمجھتا اور زہرا کے انکار کا اُسے صدمہ ضرور ہو گا پراچنہا نہیں۔ کیوں کہ دنیا کی کوئی بھی لڑکی عمر بھر کے لیے کسی معذور کی بیساکھیاں بننا پسند نہیں کرے گی۔ زہرا تک خرم کے یہ خیالات بھی خرم کی ماں کے ویسے ہی سے پہنچے اور زہرا یہ چاہتی تھی کہ وہ خرم کو انہی کے ذریعے یہ پیغام پہنچائے کہ اُس کی ”نہ“ کی وجہ خرم کی معذوری نہیں کوئی ”اور“ ہے۔ لیکن کچھ پیغام ہمیشہ ہونٹوں میں دبے اور کچھ باتیں ہمیشہ اُن کہی رہ جاتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ زہرا انہیں کچھ بتا پاتی، خرم کی ماں نے اُس کی تازہ لمبی رپورٹ زہرا کے سامنے رکھ دی جس میں واضح درج تھا کہ خرم کی پوری صحت یابی اب دوا سے زیادہ اُس کی قوت ارادی پر منحصر ہے اور خرم کی ماں کو یہ پتا تھا کہ اُس کا بیٹا اب زندگی کی طرف تبھی لوٹ پائے گا، جب اُسے دوسرے کنارے پر زہرا اپنا انتظار کرتی ملے گی، ورنہ خرم کا بخار اب اُس کی سانس کے ساتھ ہی ٹوٹے گا۔ خرم کا پیغام آئے آج ساتواں دن تھا اور اتنے ہی دن خرم کی مسلسل اور لگاتار حرارت ہونے کو آئے تھے۔ ابھی زہرا اسی شش و پنج میں تھی کہ ہسپتال سے خرم کی والدہ کے لیے جلد پہنچنے کا پیغام آ گیا کیوں کہ خرم کی سانس پھر سے اکھڑنے لگی تھی۔ وہ سب بھاگ بھاگ ہسپتال پہنچے تو اس اتر حالت میں بھی زہرا کو اپنے سامنے دیکھ کر خرم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کمرے سے نکلتے ہی خرم کو ماں سسک پڑی اور اُس نے زہرا کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ زہرا نے روتے ہوئے اُن کے جڑے ہاتھ کھول کر اپنے مقدر کے کبھی دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔ زہرا کے والدین کے ہاتھ تو حادثے

## دُھندلے اُجالے، اُجلے اندھیرے

زہرا کی تحریر نے ایک ہی پل میں میرے اندر کی ساری دنیا لپٹ کر دی۔ سیدھ میں تو پہلے بھی کچھ نہ تھا مگر اس کا غند نے رہا سہا بھی سب اُلٹ دیا۔ کبھی کبھی انسان کی برسوں کی ریاضت بھی بس ایک لمحے کی نذر ہو جاتی ہے، دل پلٹ جاتے ہیں اور ہمیں اس وقت تک کا سب کیا دھرا محض ایک بے مقصد مشق لگنے لگتا ہے۔ شاید انسانی سوچ میں آج تک جتنے بھی انقلابات رُو نما ہوئے ہیں، وہ سب اسی ایک لمحے کی کاپی پلٹ کا کرشمہ ہیں۔ پھر کون طوفان سے لڑ کر ساحل تک پہنچے اور کون بد نصیب اس لمحے کا شکار ہو کر ہر سکون ساحل سے پیچھا چھڑا کر خود کو پھرتے طوفانوں کے حوالے کر جائے، اپنی اپنی قسمت۔ میرا دل بھی پلٹ گیا۔ ایک لمحے میں میرے اندر یہ سوال شدت سے ابھرا کہ آخر اس بے مقصد سفر کا حاصل کیا تھا۔ کیا قدرت نے یہ سارا کھیل زہرا کو خرم سے ملانے کے لیے کھیلایا؟ کیا میرا کردار اس کہانی میں بس اس قدر تھا۔ میں نے زہرا کی تحریر کا آخری صفحہ پلٹا اور تب ہی اندر سے ایک نیا شدہ رقعہ گر پڑا۔ شاید کوئی اہم بات باقی رہ گئی تھی، چسے الگ سے لکھا گیا تھا۔ میں نے اُسی بے خیالی میں رقعے کی دیکھی اور اندر لکھی تحریر نے میری رُوح کا آخری ریشہ بھی اڑھڑ دیا۔ یہ وہی نظم تھی، جو میں نے پاپا کے ہاتھ زہرا کو بھیجی تھی۔ میری نظر ڈبڈبانے لگی ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے“..... ”نظم میری اپنی، لیکن تحریر زہرا کی تھی۔ اُس نے دوبارہ وہی سطر میں مجھے لکھ بھیجی تھیں۔“ ”سنو..... تمہاری وفا پہ مجھ کو..... یوں تو پورا یقین ہے..... مگر.....“ میرے اندر کا شور بڑھتا گیا..... ”سو، تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے“..... ”نظم تو اُن راہوں سے نفرت نہ کرنا، جن پر کبھی ہم ساتھ مل کر چلے تھے.....“ تیز ہوا کا ایک جھونکا میری آنکھ سے بہتے آنسو کا رستہ بدل گیا.....؟ ”ان باتوں سے نفرت نہ کرنا جو کبھی ہم نے تنہائی میں کی تھیں..... اُن خوابوں سے نفرت مت کرنا..... جو کبھی ہم نے ساتھ مل کر دیکھے تھے.....“ مجھے ایک دم ہی وہ سب ہی تیر یاد آ گئے، جو میں نے یکے بعد دیگرے زہرا کے کول وجود میں پیوست کر دیئے تھے ”بس مجھ سے..... اور صرف مجھ سے نفرت کرنا..... کہ صرف میں..... اور بس میں ہی..... تمہاری اس نفرت کے قابل ہوں.....“ ”نفرت.....“ چار حرنی یہ چھوٹا سا لفظ اپنے اندر کتنی کاٹ، کتنے گھاؤ، کتنی جلن اور کتنی جھن چھپائے رکھتا ہے، اس کا ادراک مجھے ٹھیک اُسی لمحے ہوا تھا۔ لیکن نفرت، زہرا سے نفرت..... یہ اُس نے کیسے سوچ لیا.....؟ وہ تو میرے خون میں رنگ بن کر بہتی تھی، تو کیا کوئی خود سے بھی نفرت کر سکتا ہے۔ جن کے اپنے سنے سج نہیں ہوتے، وہ دوسروں کے خوابوں کو تعبیر دینے کا فریضہ انجام نہ دیں تو پھر بھلا اور کیا کریں۔ زہرا بھی تو یہی کر رہی تھی لیکن میرے

خواب، اُن کی تعبیر کیا ہوئی۔ سچ ہے کہ تعبیریں بھی ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتیں۔ ساری رات میں برقی بارش میں زہرا کی تحریر اپنے ہاتھ میں لیے مسم میٹھا رہا۔ تیز بارشیں کا غند کی تحریر تو دھو ڈالتی ہیں، مگر مقدر کے لکھے بھلا بہتے پانیوں سے کب دُھلے ہیں۔ اگلی صبح کی پہلی اُجلی کرن کے ساتھ ہی بختیار اپنے چہرے پر زمانے بھر کے اندھیرے سجائے درگاہ کے احاطے میں داخل ہوا۔ اُس کا انداز بچپانی تھا ”میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ کسی جھیلے میں پڑے بنا ہی میرے لیے دُعا کر ڈالیں۔ آپ نے دیر کر دی اور جانتے ہیں اب کسی نے سارہ کی آنکھوں میں بصارت پانے کا خواب بھر دیا ہے۔“ میں نے چونک کر بختیار کی جانب دیکھا، لیکن میں اُسے یہ کہہ نہیں پایا کہ کون جانے کہ یہ ”دیر“ بھی قدرت نے کسی اور کے لیے طے کر رکھی ہو۔ اور بختیار صرف ایک مہرہ ہو۔ سارہ کی کہانی کو انجام کے قریب لانے کا ایک بہانہ ہو۔ بختیار اپنی دُھن میں بولتا رہا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کوئی اور نوجوان مجسمہ ساز ہے، جو آج کل بڑی تن دی سے سارہ کی بے پنا آنکھوں کے لیے کسی جڑواں پتلی کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اُس کا آج کل زیادہ تر وقت سارہ کی آرٹ گیلری ہی میں گزرتا ہے۔ وہ جوان ہے۔ خوبصورت اور متاثر کن شخصیت کا مالک ہے۔ اور دن بدن سارہ کے بہت قریب ہوتا جا رہا ہے۔ بختیار کی پریشانی اُس کے چہرے سے واضح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آج یا کل سارہ کو اُس کی بصارت واپس مل ہی جائے گی اور تب وہ اپنے حصے کی اُس نظر کو کھودے گا، جو عمر بھر کی کھوج کے بعد اُس کا مقدر بنی ہے۔ میری اپنی حالت، رات بھر بارش میں بھیگتے رہنے کے بعد اس وقت تک اتنی دگرگوں ہو چکی تھی کہ مجبوراً مجھے بختیار سے معذرت کرنی پڑی کہ ہم اس ملاقات کو کسی اور وقت پر ٹال رکھیں تو اُس کی بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ خود بھی میری آنکھوں کی سرخی دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے واپس پلٹ گیا۔

شام تک میرا جی اس بُری طرح گھبرانے لگا کہ میرے لیے درگاہ میں نکلے رہنا ناممکن ہو گیا اور پھر جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے خود کو ساحل کی نم ریت پر چلتے پایا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر چند بچے بیٹھے ریت کے گھروندے بنانے کا کھیل کھیل رہے تھے، اس بات سے بے خبر کہ جہاں وہ بیٹھے ہیں وہاں کچھ ہی دور میں سمندر کی لہریں آگے بڑھ کر اُن کے گھر وندوں کو اپنے ساتھ بہا لے جائیں گی۔ پھر مجھے ایک عجیب خیال آیا کہ بنانے والے کو بنانے سے کام اور اڑا جانے والے کو اپنے فرض سے سروکار ہوتا ہے۔ جو بنتا ہے اُسے اُڑا ہی جانا ہوتا ہے، وقت کی کمی یا زیادتی تو بس اضافی ہے۔ اچانک دائیں جانب سے کچھ آواز کے جانے اور پھر کسی کی غصے سے بھری ڈانٹ ڈپٹ اور دھنکار کی آوازیں سنائی دیں۔ دُور ایک ٹیلے کے پاس کچھ بچے کسی عمر رسیدہ شخص کو شاید اُس کے عجیب و غریب حلیے کی وجہ سے تنگ کر رہے تھے۔ اور وہ بوڑھا انہی طرف دیکھتے ہوئے بکتا جھکتا چلا آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اُسی شرارتی ہجوم کی طرف تھا لہذا چلتے ہوئے اُسے ایک زوردار ٹھوک لگی اور وہ گر پڑا۔ عقب سے زوردار قہقہے بلند ہوئے اور میں تیزی سے اُس فقیر کو اٹھانے کے آگے بڑھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن ایک گرج دار آواز آئی ”ہٹ جا میرے سامنے سے..... جو خ

گرے ہوں، وہ دوسروں کو سہارا بھلا کیا دیں گے.....؟“ بوڑھے کا چہرہ گرنے کی وجہ سے ریت اور مٹی سے لت پت تھا۔ اُس نے زور سے اپنی دراز لٹوں کو جھاڑا اور مجھے یوں لگا کہ زمانے بھر کی گرد سے میرا جوداٹ گیا ہے۔ یہ تو وہی مجذوب تھا، جو مجھے تھا نہ ماہی کی حوالات میں ملا تھا، لیکن میں اُسے یہاں اپنے شہر کے ساحل پر یوں پالوں گا، یہ تو میرے گمان کی آخری حدوں سے بھی پرے کی سوچ تھی۔ میری لڑکھائی زبان سے بس اتنا ہی نکل سکا ”آپ..... یہاں..... کیسے.....؟“ مجذوب نے بے نیازی سے قدم آگے بڑھائے ”فقیروں کے لیے زمین کبھی تنگ نہیں پڑتی۔ تیرے لیے اگر شاندار بحری جہاز بھیجا گیا تھا، تو کوئی ٹوٹی کشتی میرے لیے بھی تو آسکتی ہے۔“ میں نے جلدی سے اُس کے قدموں سے قدم ملانے کی کوشش کی۔ ”آپ ہمیشہ آدمی بات کہہ کر کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ آج میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ میں نے قدم بڑھا کر مجذوب کا راستہ روک لیا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ شدید غصے کے عالم میں وہ زمین سے کوئی پتھر اٹھا کر مجھے دے مارے گا۔ وہ جو نبی غصے سے زمین پر بھگا، میں نے کسی متوقع گھاؤ کی امید میں آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ لیکن وہ ہنس پڑا ”تو کیا سمجھتا ہے تیری یہ ضد تجھے پار لگا دے گی۔ کبھی نہیں۔ ضد چھوڑ کر عاجز بن جا۔ عشق میں ضد نہیں چلتی۔“ ”میرے پاس ضد کرنے کے لیے بچا ہی کیا ہے.....؟“ میرے جواب پر مجذوب پھر سے غصے میں آگیا۔ ”بس، یہی تو تیری ضد ہے۔ جو تیرا ہی نہیں، اُسے اپنا سمجھنے کی زبردستی نہ کر۔ کب سے خاک چھان رہا ہے، ان درگا ہوں اور دیرانوں کی۔ تجھے سمجھاتے سمجھاتے وہ اللہ کا بندہ بھی زخمت ہوا، پر تیری عقل میں یہ بات نہ آئی۔“ مجھے ایک جھکا سا لگا، وہ ضرور سلطان بابا کی بات کر رہا تھا۔ میں اپنی آواز کو اُونچا ہونے سے نہیں روک پایا۔ ”ہاں، انہوں نے بھی مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ اگر میری ناؤ کھینا ہی تھی تو یوں بچھنور میں تنہا تو نہ چھوڑتے۔ اب میں کہاں جاؤں.....؟“ مجذوب نے مجھے ڈانٹا۔ ”لڑو! جو جتنی سانسیں لکھوا کر لاتا ہے، وہ اتنا ہی جیتا ہے۔ مجھے، تجھے، ہم سب کو واپس جانا ہے۔ اُس کا وقت پورا ہو گیا تھا، وہ چلا گیا۔ یاد رکھ، یہاں سب فانی ہے۔“ میرے اندر کا شور پھر سے باہر کو اُٹا دیا۔ ”ٹھیک ہے، تو پھر آپ میری فنا کی دُعا تو کر سکتے ہیں۔ جب راستے ہی اتنے دُھند لے ہو گئے، تو پھر منزل کی توقع بھی کیوں رکھوں؟“ مجذوب نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا..... ”فنا تو تو کب کا ہو چکا۔ چل، اب میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔ ابھی بہت کام اُدھورے پڑے ہیں۔“ میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر روؤں۔ اتنا بے بس دلا چار، میں نے خود کو آج تک کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں مجذوب کے راستے سے ہٹ گیا، لیکن شدید ضبط کے باوجود میری آنکھ سے ایک آنسو فک کر زمین کو بھر کر گیا۔ مجذوب قدم اٹھا چکا تھا، لیکن میری بھیگی آنکھیں دیکھ کر یک دم نہ جانے اُسے کیا ہوا اور وہ تیزی سے پلٹا ”روتا کیوں ہے بچے، پہلے ہی تیرے آنسوؤں نے چاروں طرف آگ لگا رکھی ہے۔ اب اور کس کس کو جلانے گا.....؟“ پتا نہیں اس کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ پھر میں اپنی رُوح سے چھلکتے اس نمکین سمندر پر مزید کوئی بند نہ باندھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کچھ دیر پہلے پتھر بنا وہ مجذوب اب

ہ یوں چپ کر رہا تھا جیسے کوئی کسی چھوٹے بچے کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس پاس سے گزرتے لوگ رت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ ایک پروانہ کسی دیوانے کے آنسو پونچھ رہا ہے۔ شاید لوگوں کو یہ پہچاننے کی دشواری ہو رہی ہوگی کہ ہم دونوں میں سے قیس کون ہے اور فرہاد کون.....؟“ میں نے کہا تھا نا، تو بہت بدی ہے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ جانے سے پہلے تجھ سے ایک ملاقات ضرور ہوگی۔ اب واپس چلا جا۔ وہ بزرگ تا تیری راہ نکتا ہوگا اور ایک بات یاد رکھنا۔ تو جس خدا کو ان درگا ہوں اور دیرانوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہے، وہ بڑے اندر موجود ہے۔ تیری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب۔ ان پتھر کی بے جان عمارتوں سے نکل اور خود کو ریافت کر..... تیری اسی دریافت کے لیے سلطان نے تجھے یہاں سے نکالا اور اپنے ساتھ لیے در بدر کی نوکریں کھائیں۔ پر تو آخر کار پھر وہیں آٹھرا، جہاں سے چلا تھا.....“ میں ہکا بکا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا اور مجذوب بی بی دُھن میں نہ جانے کیا بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ذہن میں نہ جانے کتنے سوالات کی قطار لیے جب میں درگا ہ پہنچا۔ ”تو مولوی خضر پریشان سے، میری تلاش میں نکلنے ہی کو تھے۔“ کہاں رہ گئے تھے میاں! شام ڈھلے لوٹے ہو۔“ ”کون جانے، واپس لوٹا بھی ہوں پھر خود بھی اس شام کے ساتھ کہیں ڈھل آیا ہوں۔“ مولوی خضر چوکنے ”کوئی خاص بات.....؟“ میں نے انہیں مجذوب سے ملاقات کا تمام احوال سنا دیا اور یہ بھی بتایا کہ یہ میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔ مولوی خضر بہت اریک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ ”مجبوراً مجھے ہی یہ سکوت توڑنا پڑا۔“ بتائیں نا، ان درگا ہوں کا اسرار کیا ہے؟ ہمارا ٹھکانہ زیادہ تر یہیں کیوں ملے ہے.....؟ اور رہبانیت کی حدیں کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ہم ان دیرانوں میں رہ کر خدا سے دُور ہو رہے ہیں یا اُسے پارے ہوتے ہیں.....؟“ مولوی خضر کچھ دیر تک میرے چہرے پر چسپے کچھ ٹٹولتے رہے۔

”رہبانیت کی حدود ہاں سے شروع ہوتی ہے، جب تنہائی کی کڑی دل کی دیواروں پر خود پسندی کے جال بنا شروع کر دیتی ہے۔ انسان حقوق العباد سے بیگانہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ خدا کو پانے کی چاہ میں، اُس کے بندوں کو کھانا شروع کر دیتا ہے۔ سارا فیض خود اکٹھا کر لینا چاہتا ہے، جب کہ اللہ کی مخلوق کو بے فیض رکھتا ہے۔ ایک ایسا پھل دار درخت بن جاتا ہے، جس کے ثمر سے عام شخص بے بہرہ رہتا ہے۔ مگر اس کے برعکس تنہائی ساری تربیت حقوق العباد کی ادائیگی کی اولیت کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ وہ مجذوب نہیں تھا۔ وہ اللہ کے انتہائی قریبی بندوں میں سے کوئی ایک ہوگا، جو اتنی بڑی بات کہہ گیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ یہ درگا ہیں اگر مستند ہوں تو بس اللہ کے نیک بندوں کی آرام گاہ ہیں ہوتی ہیں۔ کسی کی تقدیر بدلنے کا اعجاز بھلا کسی مقبرے کو کہاں.....؟ تقدیر صرف دُعا سے بدل سکتی ہے اور کون جانے کہ ان درگا ہوں پر مانگی گئی وہ دُعا کس جو قبولیت کا شرف پا گئیں وہ اُس کامل یقین کا انجام ہوں، جو دُعا مانگتے وقت سائل کے دل میں ٹھہرے مار رہا ہوتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ خدا دیرانوں میں رہ کر دل کے زیادہ قریب ہوتا ہے، نہ ہجوم میں دل سے دُور..... وہ ہر حال میں ہماری دھڑکن کی

میرے ذہن میں ابھی سے آنے والے وقت کی صدائیں گونجنے لگیں۔ ”ذرا دیکھو تو..... ان درگاہوں کی آڑ میں یہ کیسا کھیل کھیلا جا رہا ہے.....“ ”ہونہہ! حلیہ تو بڑا مذہبی بنا رکھا ہے اور دل کے اندر کتنا بڑا چور چھپائے بیٹھ ہے۔“ ”توبہ ہے بھئی، ان جیسے لوگوں ہی نے مذہب کا نام بدنام کر رکھا ہے۔“ ”یہ شخص تو زنا کا فرہے۔ ماتھے پر خراب سجائے ایک لڑکی کے عشق میں دیوانہ بنا پھرتا ہے۔“ ”اے تو سنگسار کر دینا چاہیے..... یہ ایمان کے دائرے سے خارج ہو چکا ہے۔“ میں نے گھبرا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی سماعتیں سلب کر لینا چاہیں لیکن کان بند کر لینے سے رُوح کی سماعت بھلا کب چوکتی ہے۔ میں نے آسمان پر شکوہ بھری نظر ڈالی کہ یا اللہ میرے اندر اپنی محبت کو اس قدر بھر دے کہ دنیا کی سبھی محبتیں جھلک کر باہر جا گریں اور یا پھر میرے ادھورے مجازی عشق کو مکمل جنون میں بدل دے تاکہ خود کو بھی بھول جاؤں۔ مجھے دودھاری تلوار پر نہ چلا میرے رب جی بھی بخشنے، پورا بخش دے۔ آدھے مذہب اور آدھی دنیا میں سے کسی ایک تو مکمل کر دے۔ ورنہ یہ آدھے جنوں اور آدھا فراق مجھے ریزہ ریزہ کر ڈالے گا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اپنے اندر کے ساحر کی موجودگی میں اپنے بقیہ نصف کے حق دار، عبداللہ سے یہ منافقت کا کھیل اب ختم کر دینا چاہیے۔ مجھے مولوی خضر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے سلطان بابا کی جان نشینی کا تاج اور درگاہ کی ذمہ داری کے اور کے حوالے کرنے کی درخواست کر کے خود پہلی فرصت میں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میری بد نصیبی کی انہی تہی کہ نہ میں ساحر ہوں اور نہ ہی عبداللہ بن سکا۔ عبداللہ کے لقب نے مجھے پورا ساحر نہ رہنے دیا اور زہرا کی محبت نے مجھے مکمل عبداللہ نہ بننے دیا۔ لیکن میں ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا تھا کہ ہم عشق مجازی آج اپنے دل میں قائم رکھتے ہوئے بھی عشق حقیقی کو کیوں نہیں پاسکتے۔ بیک وقت دونوں حدود کو اپنے میں محسوس کرنے والا دنیا کی نظر میں منافق اور گناہ گار ہی کیوں ٹھہرتا ہے، جب کہ دونوں ہی معاملوں میں اختیار کا حق کسی اور کے پاس ہے اور مجھ جیسا کمزور انسان تو مکمل بے بس ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اختیار رکھتے ہوئے بھی اس اختیار سے نااہل ہوتے ہیں، ورنہ قدرت کبھی کسی ناکردہ جرم کی سزا تو نہیں دیتی۔ کہنے میں مزید کتنی دیر خود ہی کو ڈھونڈتا رہتا، اگر بختیاری کی آواز میرے خیالات کا تسلسل توڑ نہ دیتی۔ ”کہہ کھوئے ہوئے ہیں جناب! دخل اندازی کی معذرت چاہتا ہوں.....“ سچ یہ ہے کہ اس وقت بختیاری کی آمد کسی غیبی امداد سے کم نہیں لگی۔ کبھی کبھی جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے بھی اکتا سے جاتے ہیں، تب اس میں کسی تیسرے آئینے کی موجودگی، ہمیں خود اپنی شبیہ سے چونکا کر دلا جاتی ہے۔ لیکن خود بختیاری کا کچھ کرچی کرچی محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے نہایت پریشانی اور ڈھکی دل سے مجھے بتایا کہ آخر کار اُس نوجوان مجب ساز نے سارہ کی جزاؤں آنکھ کی پتلی ڈھونڈ لی ہے اور اسی ہفتے وہ سارہ کا آپریشن کروانے کا منصوبہ بھی ہے۔ سارہ بھی بصارت پانے کے خیال سے بے حد خوش ہے اور پل پل گن کے دن کاٹ رہی ہے۔ اُس بات کی سب سے زیادہ خوشی ہے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد اپنے محسن اور مربی بختیاری کو بھی دیکھ سکے

طرح ہمارے اندر موجود رہتا ہے.....“ میرے اندر چلتے سوال باہر آنے لگے..... ”تو پھر میں اُسے اپنی شرک سے زیادہ قریب کیوں نہیں محسوس کرتا۔ مجھے اُسے محسوس کرنے کے لیے یوں در بدر کی خاک کیوں چھانا پڑ رہی ہے.....؟ کیا یہ میرے اندر کے ایمان کی کمزوری ہے۔“ ”نہیں میاں! یہ درجہ بندی تو بس وہی جانتا ہے۔ سب ہی کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ مقرر ہے۔ تمہارا رستہ زہرا کے گھر کی پگ ڈنڈی سے ہو کر گزرا ہے تو یہ بھی اُسی کی مرضی ہے۔ بس، اتنا جان لو کہ اگر عشق مجازی کی ناکامی رہبانیت کی پہلی سیڑھی بن سکتی ہے تو قدرت چاہے تو یہ ناکامی کسی کی کایا بھی پلٹ سکتی ہے۔“ مولوی خضر جاتے جاتے رُک گئے اور پلٹ کر بولے۔ ”تمہارے آخری سوال کا جواب مجھ پر اُدھار رہا۔ ہم اپنی درگاہوں اور ویرانوں میں ٹھکانہ کیوں کرتے ہیں، وقت آنے پر حقیقت بھی تم پر کھل جائے گی..... اور آج مجھے وہ وقت بہت قریب دکھائی دے رہا ہے۔“ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر آگے بڑھ گئے اور میں ساری رات اسی ادھر بن میں مبتلا رہا کہ میں زہرا کی تلاش میں عشق حقیقی کی راہ پر چل پڑا تھا یا اللہ کی راہ سے بھٹک کر دنیاوی محبتوں کے جال میں اُلجھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے اندر کے ساحر اور عبداللہ میں ایک عجیب سی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ساحر، عبداللہ کو دو غلطیوں کا طعنہ دیتا تھا کہ بظاہر اللہ کی راہ کھوجنے والا اب بھی اُسی محبت کی کھوج میں در بدر ہے، جس محبت نے ساحر سے اُس کی شناخت چھین کر اُسے عبداللہ بننے پر مجبور کر دیا تھا اور عبداللہ کو ساحر سے یہ گلہ رہتا کہ وہ بار بار سامنے آ کر عبداللہ کی راہ کھوٹی کر جاتا ہے۔ اگر ساحر کو زہرا نہیں ملی تو اس میں عبداللہ کا کیا قصور.....؟ اگر ساحر، زہرا کو نہ پاسکا تو اب انشاءً عبداللہ کے راستے میں کانٹے تو نہ بچھائے.....

صبح تک میرے اندر کی یہ جنگ اتنی شدت اختیار کر گئی کہ مجھے یوں لگنے لگا کہ میرے اندر وین اور دنیا میں نئی ہوئی یہ دُہری شخصیت کٹ کر دو حصوں میں دائیں بائیں گر جائے گی۔ آخر کار، جیت ساحر کی ہی ہوئی اور طے پا گیا کہ اس دنیا میں قدم رکھنے کا واحد مقصد اگر زہرا کی محبت کا حصول تھا تو یہ کند توبہ بام ہی ٹوٹ چکی لہذا اب عبداللہ کو میرے اندر سے رُخصت ہو جانا چاہیے۔ کیوں کہ اگر اس سال مہر سے زائد کے عرصے میں بھی وہ عبداللہ میرے اندر کے ساحر کی جگہ نہیں لے سکا تو اب اُسے ساحر کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ ٹھیک ہے ساحر، زہرا کو نہیں پاسکا مگر عبداللہ بھی تو زہرا کی چاہت کو ساحر کے دل سے نہیں مٹا پایا۔ ”مات“ اگر ساحر کے عشق مجازی کا مقدر بنی تو ”جیت“ عبداللہ کے عشق حقیقی کا نصیب بھی نہیں بن پائی۔ میرے دل میں یہ احساس پوری طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ میرا عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں ہی ایک دوسرے کی راہ کا نشان بن چکے ہیں۔ اور دونوں کی بیک وقت موجودگی اب میرے اندر کے طوفانوں کو کبھی تھمتے نہیں دے گی۔ زہرا کا نام کسی اور سے جڑنے کو تھا مگر میرا یہ پاگل دل اب بھی اپنی ضد پراڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا یہ جنوں اس عفت مآب کی کسی رُسوائی کا سبب بنے مجھے اس شہری سے کہیں دُور چلے جانا چاہیے کیوں کہ میرے دل کا معاملہ زیادہ دیر تک ان دنیا والوں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا اور یہ ظاہر پرست دنیا تو بس تیروں سے چھلنی کرنا ہی جانتی ہے۔



جس نے اُس کے فن کو ملک بھر میں پھیلانے کی ٹھان رکھی تھی، لیکن خود بختیار کی نیندیں اُڑ چکی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی صورت دیکھتے ہی سارہ کی نظر پلٹ جائے گی اور وہ اپنے نوجوان رفیق کے ساتھ مل کر اسی طرح اُس کا تسخّر اڑائے گی، جیسے آج تک باقی ساری دنیا اُڑاتی رہی ہے۔ میں نے نعل سے اُس کی ساری بات سنی۔ ”مجھے افسوس ہے اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے درگاہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے لہذا اگر میری دُعا میں خدا نے کوئی تاثیر رکھی بھی تھی تو وہ اس فیصلے کے ساتھ ہی ختم ہو جانی چاہیے۔“ بختیار ہکا بکا سا رہ گیا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ منزل پہ پہنچ کر پھر سے رخت سفر کیوں باندھ رہے ہیں؟ ایسا نہ کریں خدا را۔“ میں نے ایک گہری سانس لی ”کچھ لوگوں کا مقدر سدا مسافت ہی رہتا ہے۔ اُن کے نصیب میں منزل کا سکون نہیں ہوتا۔ وہ بھی آپ کی طرح سدا فریفتہ ہی رہتے ہیں۔ مجھے بھی اپنی اس فریفتگی کے ساتھ پھر سے دنیا کی اس بے چین بھیڑ میں کھو جانا ہے۔“ جانے کیوں میری بات سن کر بختیار کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی، اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا ”کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا، لیکن میں تو خود بھکاری ہوں۔ اور آج آپ سے ایک آخری دُعا کی بھیک مانگنے آیا تھا۔ کیا آپ جاتے جاتے میرے حق میں ایک آخری دُعا بھی نہیں کریں گے.....؟“ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”مجھے آج ہی پتا چلا ہے کہ دُعا صرف انسان کے اپنے کامل یقین سے پوری ہوتی ہے، لیکن آپ کہتے ہیں تو یونہی سہی.....“ میں نے ہاتھ فضا میں بلند کیے اور بختیار کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرا کر بولا ”آپ دُعا کریں کہ میرا رقیب مرجائے.....“ میرے اندر ایک دھماکا سا ہوا اور میرے ہاتھ نیچے گر گئے۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں کسی کی موت کی دُعا کیسے کر سکتا ہوں؟“ بختیار رو رہا ہوا تھا۔ ”تو پھر آپ یہ دُعا کریں کہ سارہ کو بصارت ملنے سے پہلے میں مرجاؤں۔ آپ نہیں جانتے، رقیب لفظ کی دھاری ہی دل جلے جگر کو پار کرنے کو کافی ہے۔ رقیب سے بڑا دشمن کوئی نہیں۔ نہ ہی رقابت سے بڑا کوئی دوسرا عذاب ہے۔“ میں چونک گیا۔ میری نظر میں خرم کا چہرہ گھوم گیا۔ میں بختیار کو کیا بتاتا کہ اس زہری کرڑا دھت سے آشنا، مجھ سے زیادہ بھلا اور کون ہوگا۔ مولوی خضر کے ہمارے طرف چلے آنے کی وجہ سے بختیار زیادہ دیر تک وہاں تک نہیں پایا، لیکن جاتے جاتے بھی اُس نے اشارے سے مجھے یاد دہانی کروادی کہ مجھے اُس کے لیے کوئی ”منت“ مانگنی ہے۔ مولوی خضر نے اس کے پلٹتے ہی مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”گویا تمہاری دُعا کی تاثیر پر لوگوں کو اعتبار ہونے لگا ہے۔“ میں نے اُن کی آنکھوں میں جھانکا ”کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ میری دُعا سن لے گا۔ جب کہ خود آپ ہی نے مجھے بتایا کہ ان جگہوں پر مانگی گئی زیادہ تر دُعا میں خود مسائل کے کامل یقین کی بنیاد پر قبول ہو جاتی ہیں۔ پھر ہم یہاں آکر دُعا کے لیے فریاد کرنے والوں کو براہ راست یہ کلیہ کیوں نہیں سکھادیتے کہ اسی اعتماد کے ساتھ وہ اپنی چوکت پر بھی ہاتھ اترائیں گے تو خدا اُن کی ضرورت نہ گنا۔ اس میں ہم جیسوں کا یا ان درگاہوں کا کوئی کمال نہیں ہے۔“ ”ٹھیک کہتے ہو میاں..... لیکن اگر ایک شخص اتنی دُور چل کر، اس اُمید میں یہاں تک پہنچا ہے کہ تم اُس کے لیے دو گھڑی ہاتھ اٹھا کر اللہ

ہے دُعا مانگ لو گے تو ایسی دُعا میں بھلا کیا حرج ہے؟ ہو سکتا ہے اللہ ہم گناہ گاروں کی صرف اس لیے سن لے لے اُس کا ایک مجبور بندہ دُعا کی آس میں اتنی دُور چل کر آیا ہے۔ کون جانے اُس کی دُعا کی قبولیت گھر بیٹھے نہ اسی ہو۔ یہاں تک چل کر آنے کی سعی کے بعد ہی لکھی ہو۔ اور کبھی کبھی خدا اپنے کسی خاص بندے کی دُعا میں ابھی ڈال دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے، عبد اللہ میاں بھی انہی خاص بندوں میں سے ایک ہوں۔“ مولوی خضر میرا سر ہتھپتا کر مسکراتے ہوئے ظہر کی نماز کے لیے چل دیے۔ ”دفعتاً مجھے درگاہ کے دروازے کے پاس سے مجذب ل آواز سنائی دی“ اپنی رخصت کا وقت ہو گیا ہے لڑکے! تجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سو، آگیا ہوں۔“ میں بلدی سے باہر نکلا تو وہ میز جیوں سے پرے کھڑا تھا ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ اُس نے سر جھٹکا ”سب ہی کو یک دن جانا ہے، تو بھی تو جا رہا ہے.....“ میں چونکا، وہ اپنی دھن میں بولتا رہا۔ ”بس ایک بات یاد رکھ، لڑنا پھوڑ دے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ صرف اپنا ماتھا ہی پھوڑے گا اور کچھ نہیں۔“ میں نے زخمی نگاہ اٹھائی ”اپنی پیشانی کی پرواہ نہیں ہے مجھے۔ ہاں اس گھاؤ سے اُڑتے خون کے چھینٹے کسی کے اُبلے دامن کو داغ دار نہ کر دیں، بس اس بات کا ڈر ہے۔ اسی لیے جا رہا ہوں۔“ مجذب نے غور سے مجھے دیکھا، اتنا بڑا دل دکھائی تو نہیں دیتا۔ تو تو دُوروں کو بھسم کرنے والوں میں سے تھا، پھر خود جل کر راکھ کیسے ہو گیا؟“ ”میں تو سدا کا راکھ تھا۔ پتا نہیں، یہاں کے لوگوں نے مجھے چنگاری کیسے مان لیا.....؟“ میری کپکپاتی آواز نے جانے اُس پر کیسا اثر کیا کہ وہ ہلال میں آگیا۔ ”تو کہے تو ابھی فیصلہ کرادوں، تجھے دنیا چاہیے نا..... جا میرے مالک نے آج سے دنیا تیرے ماتم کر دی۔ وہ تجھے مل جائے گی، لیکن اب کی بار چوکا تو پھر کبھی فریاد نہ کرنا۔ وہ تجھ سے صرف ایک بد دُعا کی دُوری پر ہے۔ تجھے اُپر والے سے یہی گلہ تھا نا کہ اُس نے تجھے آدھا دین اور آدھی دنیا کیوں دی۔ جا..... آج سے تیری دنیا پوری کر دی گئی ہے۔ اب آگے تیری اپنی ہمت ہے۔“ مجذب ایک جھٹکے سے مڑا اور مزید کچھ کہنے بنا لیے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے مجھ سے سب قضا ہو گیا ہو۔ میں بوجھل قدموں سے درگاہ لوٹ آیا، جہاں مولوی خضر پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب لپکے ”خرم کے گھر سے پیغام آیا تھا میاں! اُس کی حالت گزشتہ رات سے کافی ابتر ہے۔ جانے اُس کے ذہن میں یہ بات کیوں سما گئی ہے کہ وہ اگر صحت یاب ہوگا تو صرف تمہاری سیجائی سے۔ میرا خیال ہے تمہیں وہاں جانا چاہیے۔“ میرے ذہن میں مجذب کی آواز گونجی ”وہ صرف ایک بد دُعا کی دُوری پر ہے.....“ میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ اچانک درگاہ کے دروازے سے خرم کی ماں بوکھلائی ہوئی سی اندر داخل ہوئیں۔ جانے کیوں اُن کی حالت دیکھ کر میں پہلی مرتبہ خوف زدہ ہو گیا۔ خرم کی والدہ میری جانب لپکیں۔ ”جلدی چلو، عبد اللہ بیٹا..... خرم کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں۔ میرے بچے کو اب صرف تم ہی بچا سکتے ہو۔“ میری نظر مولوی خضر کی نظر سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا، مجذب نے کہا، ”اگر کوئی دُوری ہوئے گا تو وقت آپ بچنا ہے۔“

## ”کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا“

خرم کے گھر کی جانب جاتے ہوئے، تمام راستے مجھے مجذوب کی کبھی باتوں کی بازگشت نے گھیر رکھا اور پھر خرم کے سرہانے زہرا کو کھڑے دیکھ کر میرا دم اٹکنے لگا۔ اُس کی موجودگی میں تو اکثر میں سانس لینا بھی بھول جاتا تھا۔ کسی بیمار کے لیے دعا کیا خاک کر پاتا؟ جانے کس مشکل سے میں نے اپنے حواس یک جا کیے۔ خرم کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ پتا چلا طبی تشفیص کے مطابق حادثے کے بعد اگرچہ خرم کو فوری طور پر آپریشن تمیز پہنچا دیا گیا تھا، لیکن تمام احتیاط کے باوجود، جسم میں پھیلتا زہر اپنا اثر دکھایا گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں ٹانگیں کٹنے کے باوجود خرم دن بدن ٹھہر رہا تھا اور اس کا ہر چوہیں گھٹنے بعد پلٹنے والا بخار اب دن رات مستقل اُس کا وجود بھٹکتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر اپنی ہی تمام کوششیں کر چکے تھے۔ اُن کی آخری اُمید بیرون ملک سے منگوائی گئی ایک خاص دیکسین تھی، جو اگلی شام کے ہوائی جہاز سے لائی جا رہی تھی۔ لیکن خود خرم اپنی ہر اُمید تیاگ چکا تھا۔ اس تمام عرصے میں اُس کے جلتے بدن اور کٹتی رُوح کو اگر چند لمحے کی ٹھنڈک نصیب ہوئی تھی تو وہ صرف درگاہ سے آئے، پڑے ہوئے پانی کی مہربانی تھی۔ مولوی خضر کی بتائی ہوئی وہی چند مخصوص آیات پڑھ کر میں نے پانی کے گلاس پر پھونک دیں اور خرم نے بے تابی سے وہ پانی حلق سے نیچے اُتار لیا۔ کچھ بلہا کے لیے اُس کی انگارہ سانسوں کو قرا سائل کیا۔ میں بغور اُس کی حالت دیکھتا رہا۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں نے سنا ہے تمہاری دعا میں بڑی تاثیر ہے عبداللہ..... تم میرے لیے دعا کرو گے نا۔“ ”تمہاری جینے کی خواہش ہی تمہاری سب سے بڑی دعا ہے خرم۔ کسی بھی دعا سے کہیں زیادہ تمہاری اپنی قوت ارادی پر بھروسے کی ضرورت ہے۔“ اُس نے سر جھکا ”نہیں..... مسیحا کو عام طور پر اپنی مسیحائی کا اعجاز کم ہی ہوتا ہے۔ میں جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم دُور کہیں میری رُوح سے جڑے ہو۔ کچھ نا تو تم سے ایسا ضرور ہے جس نے مجھے یہ احساس بخشا ہے کہ میرے درد کی ہر دوا بس تمہارے پاس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر اس بار بھی تم نے میری مسیحائی نہیں کی، تو میں مرجاؤں گا۔“ خرم کی بات سن کر اُس کی ماں رو پڑی۔ میری نظر انٹھی اور زہرا کی ڈبڈبائی نظر کا سارا ترش نمک میرے حلق میں اُنڈیل گئی، پھر مجھ سے وہاں نہیں ٹھہرا گیا اور میں چپ چاپ باہر نکل آیا۔ درگاہ تک واپس پہنچتے پہنچتے رات ڈھل چکی تھی۔ مولوی خضر میرے انتظار میں صحن کے چوبارے پر بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ ”کہو میاں، کچھ آرام آیا تمہارے مریض کو.....؟“ ”آپ بھی وہی بات کہہ رہے ہیں۔ میں دوبارہ خرم کے گھر نہیں جاؤں گا۔ آخر اُن سب لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ میں

ی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ کیا میں اور کیا میری دعا۔ آپ خوب جانتے ہیں۔“ مولوی خضر نے غور سے میری نوب دیکھا ”جیسے تمہاری مرضی میاں! لیکن یاد رہے، کبھی کبھی دعا نہ دینے کا مطلب بد دعا دینا بھی ہو جاتا ہے۔“ میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ مجذوب نے بھی تو یہی کہا تھا کہ زہرا مجھ سے صرف ایک بد دعا کی دُوری پر ہے۔ نہیں، یہ وہی بد دعا تو نہیں۔ یہ کیسا قسم ہے کہ قدرت نے میرے رقیب کے نصیب کی آخری دعا میرے حصے کا رکھ چھوڑی تھی۔ اور اس دعا کی قبولیت کی پہلی اور آخری شرط میرے خلوص سے متصل کر دی گئی تھی۔ بھلا وہی اپنے رقیب کے لیے بھی پوری شدت اور کامل خلوص کے ساتھ دعا مانگ سکتا ہے؟ میں وہیں درگاہ کے پوترے پر ہاتھوں کا نکیہ بنا کر لیٹ گیا اور جانے کب آسمان پر اپنے مقدر کا دھندلا ستارہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں پھر وہی گہری دُھند تھی اور وہ وہی اک نیا دُھندلا جہاں بانہیں بیلانے میرا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن میں خواب میں بھی درگاہ کے صحن میں طزم بنا کھڑا تھا اور میری فرد جرم بڑھ کر نائی جا رہی تھی ”یہی ہے وہ سیاہ نصیب، جس نے درگاہ کے مجاور کے روپ میں محبت جیسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب لیا ہے۔ اس کا حلیہ تو بظاہر شرعی ہے لیکن اس کا اندر شدید آلودہ اور کالا لک زدہ ہے۔ بظاہر خدا کی تلاش میں مگرداں، مگر اصل میں اپنے محبوب کی چاہت میں در بدر ہے۔ یہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہتے ہوئے اور بس مقدس چار دیواریوں کے بیچ بھی بس اُسی ایک چہرہ کو سوچتا رہتا ہے۔ اسے اس کے رہبر نے زمانے کے سب ہی سرد گرم سے آشنا کرنے کی بھرپور کوشش کی، مگر اس کا من پھر بھی اُسی ایک عشق سے اٹار ہا۔ اس کا دل کبھی پوری طرح پاک نہ ہو پایا اور یہ جہاں بھی گیا، وہاں دین کی تبلیغ کے برعکس اپنی محبت کی ترویج ہی کرتا رہا۔ تو بولو، ایسے گناؤں نے جرم کی سزا کیا ہوئی چاہیے؟“ سارا مجمع چلانے لگا ”اسے سنگسار کر دو۔ اسے مار ڈالو۔“ چاروں طرف سے مجھ پر پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ میں گھٹنوں کے بل گر گیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر خود کو پتھروں سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ ”نصہرو، مجھے مت مارو..... میں نے کبھی پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ سب جانتے ہیں کہ میں تو بس اپنی محبت کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے اس دنیا تک پہنچا تھا اور مجھے اُسی محبت کو پانے کے دعوے کے ساتھ اس چوکھٹ کو پار کیا گیا تھا۔ میں نے اس تمام سفر میں کبھی اعلان بزرگیت نہیں کیا، پھر مجھ سے پائی دامان کا ٹھافا اور اُمید کیوں.....؟ اگر اس تمام سفر میں میرے دل سے اس گناہ محبت کے داغوں کو کھرچا نہ جاسکا تو اس نہ روا دیا کیوں؟ ایک بے اختیار کوسزا کیوں؟“ میں یوں ہی چلاتا رہا اور تب ہی اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

سویرا ہونے کو تھا۔ کاش، کوئی سورج ایسا بھی اُبھرتا جو دلوں کے اندھیرے دُور کر پاتا۔ دن چڑھے بختیار بھی آپہنچا۔ جانے کیوں آج اُسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے میں آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے آتے ہی دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ ”آپ نے کیا فیصلہ کیا.....؟“ میں نے اُس سے پوچھ لیا ”کیا محبت خود غرض بھی ہو سکتی ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ محبت صرف قربان ہونا جانتی ہے۔ محبت صرف خود لٹ جانے کا نام ہے۔“

اختیار میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا اٹھا۔ ”سب جھوٹ ہے۔ یہ سب بزدلوں کی پھیلائی ہوئی باتیں ہیں۔ محبت تو بس جیت لینے کا نام ہے۔ جو ہار جائیں، صرف وہی لٹ جانے کی دہائی دیتے پھرتے ہیں اور میری ایک بات ہیٹھ یاد رکھیے گا، جو اپنی محبت ہار جائے، اُسے جینے کا کوئی حق نہیں..... کہ محبت کے بنا بھی تو صرف فنا ہی اس کا نصیب ہے۔ میں ساری عمر روزمرتا آیا ہوں۔ اب اگر چند پل جینے کا موقع مل رہا ہے تو میں اُسے کسی رقیب کی بھیٹ کیوں چڑھ جانے دوں۔ کچھ لوگوں کے لیے قدرت کی جھولی میں صرف ایک ہی موقع باقی ہوتا ہے اور میں یہ آخری موقع کسی کمزور جذباتی لمحے کی نذر ہو کر برباد نہیں کر سکتا۔ ہر بار نصیب مجھ ہی سے قربانی کیوں مانگے۔ اس بار قربانی میرے رقیب کو دینی ہوگی۔“ بختیار اپنی دھن میں گتہ جانے کچھ بولتا رہا اور میرے اندر جھکڑ سے چلنے لگے۔ ہاں، ٹھیک ہی تو ہے۔ ہر بار قربانی ہمارا مقدر ہی کیوں.....؟ کہیں خرم کی یہ بیماری میرے لیے بھی قدرت کے کشکول میں بچا ہوا آخری موقع تو نہیں؟ اور اگر اس کا انجام اسی بیماری کے ہاتھوں لکھ دیا گیا ہے تو پھر میری دعا کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ بختیار اب بھی پُر امید لگا ہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ بختیار پر شادی مرگ جیسی کیفیت طاری ہو گئی، جیسے واقعی میری دعا ہی اُس کی محبت کے حصول کا آخری ذریعہ ہو۔ کاش محبتیں صرف دعاؤں سے حاصل ہو سکتیں، تو آج سارے زمانے میں کوئی نامراد نہ ہوتا۔ میں نے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو بختیار سے رہا نہ گیا۔ ”آپ نے میرے لیے کیا مانگا۔“ مجھے اپنی آواز خود اجنبی سی لگی۔ ”میں نے اللہ سے تمہارے رقیب کی قربانی مانگی ہے..... اگر تمہاری محبت کا انجام تم دونوں میں سے کسی ایک کی قربانی ہی سے وابستہ ہے تو میں نے خدا سے التجا کی ہے کہ اس بار ایثار کا یہ پہاڑ تمہارے رقیب کے کاندھوں پر رکھ دے۔“ بختیار اس چھوٹے بچے کی طرح خوش ہو گیا، جو اپنا کھلنا ٹوٹ جانے پر کسی نئے کھلونے کے بہلاوے میں آکر روتا بھول جاتا ہے لیکن میں اپنے اُس پاگل دل کا کیا کرتا، جو آخری بازی مات ہو جانے کے بعد بھی کسی ضدی بچے کی طرح چل رہا تھا اور کسی بہلاوے میں آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آج شام مجھے خرم کوئی ویکسین کا ٹیکا لگائے جانے سے پہلے مغرب سے قبل اُس کے لیے دعا کرنے جانا تھا، لیکن میرے دل اور دماغ کی جنگ سہ پہر تک اتنی شدت اختیار کر گئی کہ جسم بخار میں تپنے لگا۔ میرا دماغ مجھے خرم کے گھر جانے سے روکتا رہا اور دل اس بھرم کی دہائی دیتا رہا، جو خرم اور اُس کی ماں کو مجھ پر تھا، لیکن کیا دنیا کا کوئی بھی بھرم کوئی بھی مان اتنا ہم ہو سکتا تھا کہ جس کی خاطر میں زہرا کو دیتا۔ اس کش مکش نے عصر سے پہلے ہی میری رگوں میں انگارے بھر دیے اور جب میں لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا تو صحن میں وضو کرتے مولوی خضر میری حالت دیکھ کر فوراً میری جانب دوڑے۔ میرے ماتھے کو چھونے اور اُن کی تشویش بھرے لہجے میں کچھ بڑبڑانے کی حد تک تو میرے حواس نے ساتھ دیا اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ مجھے ہوش تب آیا، جب میں نے اپنے ماتھے پر برف میں بھگوئی بیٹیوں کی ٹھنڈک محسوس کی۔ میں درگاہ کے حجرے میں تھا اور کھڑکی سے باہر رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ میں نے ہڑبڑا کر

اٹھنے کی کوشش کی تو مولوی خضر نے مجھے روک دیا۔ ”لینے رہو میاں، ابھی تمہاری حالت سنبھلی نہیں ہے۔“ میں کسمسایا۔ ”لیکن.....“ مولوی خضر میرا مدعا سمجھ گئے۔ ”اس کام کے لیے اب دیر ہو چکی۔ خرم کی والدہ تمہیں مغرب سے پہلے لینے کے لیے آئی تھیں لیکن تم اُس وقت ہذیانی حالت میں نہ جانے کیا کچھ بول رہے تھے۔ تمہاری حالت دیکھ کر تو وہ خود گھبرا گئیں اور پھر انہی کا ڈرائیور یہاں ڈاکٹر کو بھی لے کر آیا تھا۔“ میں نے بولکھار کر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ ”میں کچھ زیادہ ہذیان تو نہیں“ ”نہیں..... وہ کچھ نہیں سمجھیں..... انہیں خرم کی پریشانی میں کچھ یاد ہی کب تھا۔ بہر حال، وہ نامراد ہی واپس لوٹ گئیں کہ شاید اُن کے بیٹے کی قسمت میں دعا نہیں۔“ میں نے ہلکے کر نیکی سے سر نکا دیا۔ کچھ فیصلے قدرت خود اپنے ہاتھ سے لے لیتی ہے، کیوں کہ ہم کمزور انسانوں کا ظرف ان کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں، میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے پھر سے کوئی اُن ہونی میرے تعاقب میں ہو۔ مولوی خضر میری اندرونی کش مکش بھانپ گئے۔ ”خود سے اتنا نہ لڑا کرو عبد اللہ میاں! دل پھٹ جائے گا تمہارا۔ سب اُوپر والے پر چھوڑ دو۔“ لیکن کاش، یہ کلیہ میرا دل بھی سمجھ پاتا۔ جب تک ہوش رہے، ہم خود ہی سے تو لڑتے رہتے ہیں۔ تب ہی قدرت ہم پر رحم کھا کر ہمیں کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ کسی کو نیند کی صورت اور کسی کو بے ہوشی کی شکل میں سکون بخش دیتی ہے۔ میں بھی شدید بخار کے زیر اثر تھک ہار کر پلکیں موند بیٹھا۔ جانے رات کے کس پہر مجھے درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے زکے کی آواز آئی اور پھر غنودگی کے عالم میں مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے مولوی خضر حجرے سے نکل کر باہر گئے ہوں۔ کچھ قدموں کی چاپ اُبھری اور پھر کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ میرا ذہن پھر سے تاریکیوں میں ڈوبنے لگا اور پھر کسی نے دھیرے سے میرا نام پکارا ”ساحر۔“ مجھے یوں لگا جیسے کوئی روشنی کی تیز کرن اندھیرے سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی گہرے پانیوں کو کاٹی، میرے دل و دماغ کو منور کر گئی ہو۔ اُس آواز کو میں لاکھوں کروڑوں کے جہوم میں پہچان سکتا تھا۔ یہ زہرا کی آواز تھی۔ میں نے کچھ اس طرح ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں جیسے پلکوں کی ذرا سی تیز حرکت سے یہ سنہرا سپنا ٹوٹ نہ جائے۔ وہ میرے سر ہانے کھڑی تھی..... ہاں..... وہ زہرا ہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے زمان و مکان کی ہر حرکت رک سی گئی۔ میری نظر اُس کی بھیگی نظر سے ٹکرائی اور مقصد حیات تمام ہوا۔ اس کے یا قوت لب پھر سے ہلے۔ ”ساحر..... آپ ٹھیک تو ہیں.....؟“ میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میں اُس کے سامنے ہوتا ہی کب تھا۔ اُس کی موجودگی تو ہمیشہ میرا پنا آپ مٹا کر رکھ دیتی تھی۔ میرے سامنے اور خود مجھ میں بس وہ ہی وہ باقی رہ جاتی تھی۔ لیکن اُس کی نظر اُبڈبائی ہوئی کیوں تھی اُس کے قریب ہی مولوی خضر بھی نہایت پریشان سے کھڑے تھے اور حجرے سے باہر درگاہ کے صحن میں بھی کسی عورت کی دبی دبی سی رونے کی آواز آرہی تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ کہیں وہ ان ہونی پیش تو نہیں آگئی۔ مولوی خضر کی لرزتی آواز نے مجھے پھر سے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ ”عبد اللہ میاں..... زہرا بی تمہیں لینے کے لیے آئی ہیں۔ خرم کی حالت بہت بگڑ گئی ہے۔ اُمید اپنے آخری دم پر ہے۔“

بہر مہن میں خرم کے والدین بھی موجود ہیں۔ میں انہیں تمہاری شدید ناساز طبیعت کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“ مولوی خضر اپنی بات ختم کر کے مجھ سے نظریں ملانے بنا حجرے سے باہر نکل گئے۔ کیا آپ نے کبھی شدید پیاس سے دم توڑتے ایسے کسی بد نصیب گھائل کو دیکھا ہے، جو اپنے ہاتھوں کے کورے میں پانی کی پچی ہوئی، آخری چند بوندوں سے اپنے لب تر کرنے والا ہو اور جب ہی کوئی دوسرا اُس سے وہ پانی مانگ لے۔ میں نے اُسی جان بہ لب بد نصیب کی نظر سے زہرا کی جانب دیکھا۔ اُس کی لرزتی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور آنسو گرنے کو تھے۔ قاتل کا تھا خضا تھا کہ مقتول خود اپنے ہاتھوں سے خنجر کی چمکتی دھار کو اپنے جگر کے پار کرے اور شرط یہ تھی کہ لبوں کی مسکان بھی نہ ٹوٹنے پائے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن کراہ کر رہ گیا۔ زہرا کپکپاتی آواز میں بولی ”آپ اس حالت میں سفر نہیں کر پائیں گے۔ میں اُن سے کہتی ہوں کہ.....“ ”زک جاییے..... قیدی اگر تختہ دار تک نہ جاسکے تو پھانسی ملتی نہیں ہو جاتی۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“ اندر سے آتی ہوئی آہٹوں کی آواز سن کر خرم کے والدین بھی مولوی خضر کے ساتھ حجرے میں آ گئے۔ نہ جانے کس طرح میں مولوی خضر کے شانے کا سہارا لے کر نیچے کھڑی گاڑی تک پہنچا۔ مولوی خضر بھی میرے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر مجھے لٹا کر سہارا دینے کے لیے بیٹھ گئے اور میں آنکھیں بند کیے اپنی ہستی کو سمیٹنے پڑا رہا۔ جب کہ میں جانتا تھا کہ یہ راہ رقیب کے گھر کو جاتی ہے اور مجھے وہاں پہنچ کر سدا کے لیے بکھر جانا ہے۔ پتا نہیں، یہ کیا امتحان تھا۔ خرم کے دل میں یہ بات کیوں گڑ گئی تھی کہ اُسے میری دعا ہی سے مسیحائی نصیب ہوگی۔ یہ کیسا بھید تھا جو کھلتا نہیں تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے خرم کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ خرم کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور اُس کا چہرہ سورج کبھی کے پھول جیسا زرد پڑ چکا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آخری دموں پر ہے۔ خرم کے سر ہانے بڑی چھوٹی میز پر در آمد شدہ ویکسین کے خالی خول (وائل) پڑے ہوئے تھے۔ مطلب یہ کہ اُسے دوا دی جا چکی تھی، تو پھر اُس کی نبض کیوں ڈوب رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اُس کے پریشان کھڑنے والدین کی طرف دیکھا۔ ”دیکھیں میں آپ لوگوں کے کہنے پر یہاں تک آ گیا ہوں اور اوپر والے کی بارگاہ میں اپنی دعا کی عرضی بھی ڈال دوں گا، لیکن میری آپ لوگوں سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ آپ مزید دیر نہ کریں۔ خرم کو فوراً پہلی اڑان سے بیرون ملک لے جائیں۔ دعا کے ساتھ مناسب دوا بھی بہت ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تک میری دعا کا بھرم ٹوٹے، تب تک بہت دیر ہو چکی ہو۔“ خرم کے والد نے ایک گہری سانس بھری ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے پہلے کبھی ان باتوں پر اعتبار نہیں تھا، بلکہ میں تو اکثر خرم کی ماں سے لڑ پڑتا تھا کہ اس جدید سائنسی دور میں ان امتحانہ باتوں پر بھلا کون یقین کرے گا لیکن پھر خرم کے معاملے میں ہر وہ بات غلط ثابت ہوتی گئی جسے ہماری ظاہری سائنس صدیوں پہلے ثابت کر چکی ہے۔ اس کا آخری نمونہ آج شام ہی ہم سب نے دیکھا ہے۔ خرم کی حالت کے پیش نظر میں نے خود ہی دنیا کی سب سے بہترین

بیمین اور تمام قابل ڈاکٹروں کی ٹیم بلوائی تھی لیکن سر شام دی جانے والی دوا کا اثر بھی تمہارے سامنے ہی ہے۔ سن لیے آج میں نے بھی خرم کی والدہ کے یقین کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اُسے بہت پہلے کسی مجذوب نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ اگر خرم کی صحت یابی مقدور ہے تو اس کا ذریعہ صرف اور صرف تمہاری دعا ہے۔ پورے خلوص اور سچے دل سے مانگی گئی ایک دعا ہی خرم کی نجات ہے۔“ مجھے سارا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ کس مجذوب کا ذکر ہو رہا تھا۔ میرے دعا کے لیے اٹھتے ہاتھ پھر سے نیچے گر گئے۔ ”مجذوب.....“ خرم کی والدہ جلدی سے آگے بڑھیں۔ ”ہاں..... وہ مجذوب وہیں ساحل پر ہی ملا تھا۔ ہم خرم کو گھمانے کے لیے ساحل کی سیر کو گئے تھے، وہیں ایک ٹوٹی دیوار کے پاس وہ مجذوب ریت اور مٹی میں انا بیٹھا تھا۔ اُس نے خرم کو دیکھتے ہی بنا اُس کی بیماری یا تکلیف جانے بغیر فوراً کہہ دیا تھا کہ تیری شفا درگاہ میں بیٹھے عبداللہ کی دعا ہی سے ہوگی۔ در نہ نہیں۔ حالانکہ اُس وقت خرم گاڑی ہی میں بیٹھا تھا اور اس مجذوب نے اس کی ظاہری حالت بھی نہیں دیکھی تھی۔“ میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی۔ یہ کب کی بات ہے۔ آپ پہلی مرتبہ کب اُس مجذوب سے ملی تھیں؟“ ”یہ اُسی دن کی بات ہے، جب ہم پہلی مرتبہ درگاہ آئے تھے۔ اُس دن کے بعد وہ مجذوب کبھی دکھائی نہیں دیا۔“ میرے وجود میں بیک وقت بہت سی سوئیاں گڑ گئیں، تو گویا یہ کھیل بہت پرانا ہے۔ میں تو بس اُس شطرنج کی بساط کا ایک معمولی سا مہرہ تھا، جو قدرت نے خرم کی زندگی اور صحت یابی کے لیے بچھا رکھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں سہائی کہ سب کچھ یونہی چھوڑ چھاڑ، وہاں سے نکل جاؤں، لیکن ٹھیک اُسی لمحے خرم نے ایک ہچکی سی لی اور اُس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ مولوی خضر نے اپنی آنکھیں بند کر کے تسبیح ختم کر دی۔ خرم کی ماں کی آنسو بھری نگاہیں، اب بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے اندر عبداللہ کی آواز گونجی ”اگر ساحر کے اس تمام سفر کا حاصل یہاں اس بیمار کے سر ہانے آ کر ایک دعا پر ہی ختم ہونا ہے تو پھر اپنی اس تمام تربیت کو بے مقصد نہ جانے دو۔ ساحر نے عبداللہ سے خدائی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو جاتے جاتے عبداللہ کا یہ آخری قرض بھی ادا کرتے جاؤ۔“ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ہاتھ نضا میں بلند کر لیے۔ ”یا اللہ! آج پھر تیرے سامنے وہی کم ظرف، گناہ گار، کمزور اور ناشکرا بندہ ہاتھ جوڑے حاضر ہے۔ تو نے ان لوگوں کے دل میں اگر میری دعا کا یقین کامل پیدا کیا ہے تو اب تو ہی اس دعا کا پردہ رکھ لے۔ یا میرے اللہ..... میرے دل کے چور اور میری دعا کی بے توقیری اور میرے خلوص اور سچائی کی کمی پر نہ جا۔ تو میری کم ظرفی اور میرے اندر کے گناہوں سے بخوبی واقف ہے۔ تجھے تیرے پیارے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ، تجھے اس ستر ماؤں سے زیادہ محبت کا واسطہ کہ خاص اپنی رحمت کے صدفے اس مجبور ماں کی بھی سن لے جو اپنے معذور بیٹے کی صحت یابی کے لیے یہاں وہاں سرگردانی پھرتی ہے۔ اس محفل میں موجود اپنے سب سے عزیز بندے کی التجا کے صدفے مجھ جیسے عاصی کی دعا سن لے اور اس نوجوان کی بیماری دُور فرما کر اسے شفا عطا کر دے۔ میں جانتا ہوں کہ آج اس وقت بھی، یہ دعا مانگتے وقت بھی میرے اندر کے دنیا پرست اور گناہوں سے لہڑنے انسان کی



اس کی عقیدت کو اتنا اتنا اس کیسے جانا۔ اُسے تو میرے اندر کے آدمی سے سروکار تھا۔ وہ بہت دیر روتی رہی اور پھر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کبھی بصارت کا آپریشن نہیں کروائے گی۔ اسے وہ نظر نہیں چاہیے جو میرے بقول اُس سے میرے حصے کی نظر چھین لے جائے گی۔ اس کے اس فیصلے نے جانے کیوں پر مجھے بہت رلایا۔ میں اور سارے بہت دیر تک روتے رہے۔ لیکن شاید وہ ہم دونوں کے آخری آنسو تھے۔“ بختیار نہ جانے کیا اور کیا کچھ بتاتا رہا مگر میرا ذہن کہیں اور ہی انک گیا تھا۔ محبت کو شاید اتنا ہی معصوم اور اتنا ہی خود غرض ہونا چاہیے تھا۔ مجھے بختیار پر رشک آ رہا تھا کہ اس کے اندر پلنے والی محبت وقت پڑنے پر خود غرض ہونا بھی جانتی ہے۔ کبھی کبھی ایسی خود غرضی بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ بختیار کے جانے کے بعد بھی میں وہیں درگاہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ شام ڈھلنے لگی۔ اس دوران مولوی خضر نہ جانے کتنی بار کسی نہ کسی بہانے درگاہ کی سیڑھیوں تک جا کر واپس پلٹتے رہے۔ میں جانتا تھا انہیں کس نتیجے کا انتظار ہے۔ آخر کار مغرب سے کچھ دیر قبل درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے رُکنے کی آواز سنائی دی اور مولوی خضر تیزی سے حجرے سے باہر نکلے۔ چند لمحوں بعد خرم کے والدین اپنے کئی نوکروں سمیت ڈھیر ساری نذر اور نیاز لیے درگاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ پتا چلا کہ فجر ہونے سے پہلے ہی خرم کی حالت سدھرنے لگی تھی اور دوپہر تک اُس کا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ ڈاکٹر اسے در آمد شدہ ویکسین کا اثر سمجھتے تھے۔ لیکن خرم کے والدین کے نزدیک یہ دعا کا کرشمہ تھا۔ اور یہ ساری کہانی لکھنے والا لکھاری وہی ایک مجذوب تھا، جو پہلے مجھے اور پھر خرم کی ماں کو ملتا تھا۔ کتنا شاندار وار پلاٹ بنایا تھا اُس نے۔ بہر حال، وجہ جو بھی رہی ہو، خرم کے والدین کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح میری ساری بلائیں اپنے سر لے لے۔ ”اب میں بہت جلد اپنے خرم کے سر پر سہرا سجاؤں گی اور آپ سب کو آنا ہوگا۔ اور عبد اللہ تم بھی تو میرے بیٹے ہونا، تو تمہیں خرم کا شہ بالا بننا ہوگا۔ ٹھیک ہے نا، دیکھو، میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔“ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں اپنی جگہ پتھر بنا کھڑا رہا۔ جانے یہ شہنائی اور ماتم کا رشتہ کتنا پرانا ہے۔ اُن کے لہجے میں شہنائی کی گونج تھی اور میری خاموشی میں ماتم رتھاں تھے۔ اُن کے جانے کے بعد میں مولوی خضر کی جانب پلٹا۔ ”میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شاید یہی میرے سفر کا آخری پڑاؤ تھا۔ آپ درگاہ کے لیے کسی نئے عبد اللہ کو منتخب کر لیں۔“ میری آواز آنسوؤں سے بندھ چکی تھی۔

مولوی خضر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ”ٹھیک ہے اگر یہی رضائے خداوندی ہے تو یونہی سہی، مگر ایک آدھ دن تو شہر جاؤ۔ جب تک میں بھی درگاہ کے انتظامات کسی کے سپرد کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔“ ”جو آپ کا حکم۔“ میں واپس پلٹ کر حجرے کی طرف بڑھا۔ ”اور ہاں عبد اللہ! تمہارا آخری سوال اُدھار تھا مجھ پر۔ تم نے پوچھا تھا کہ ہمارا امیراں دہگاہوں اور ویرانوں ہی میں کیوں کر ہے، جب کہ خدا کی خدائی کو تو شہ رگ سے بھی قریب بیان کیا گیا ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ خدا ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک رہتا ہے۔ اُس

تمام خامیاں اور کمزوریاں اپنے عروج پر ہیں اور میری اس دعا میں قبولیت لائق ایک احساس بھی شامل نہیں لیکن تیری رحمت اور تیری لازوال عطا کسی جذبے کی محتاج نہیں۔ ہمیں تیرا رحم چاہیے۔ تیرا فضل چاہیے، میرے مولا۔“ میں دل ہی دل میں گڑگڑاتا رہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرتے رہے، پھر نہ جانے کتنی دیر بعد مولوی خضر کے ہاتھ کا دباؤ اپنے کاندھے پر محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ خرم کا رنگ بدستور زرد تھا۔ مولوی خضر نے پلٹ کر خرم کے والدین سے رخصت طلب کی۔

ہمارے درگاہ پہنچتے پہنچتے سویرا جھلکنے لگا۔ میرا بخار ایک بار پھر زور پکڑ چکا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مولوی خضر نے مجھے حجرے میں آرام کی تلقین کی اور پھر کمرے سے نکلے نکلے انہیں جانے کیا ہوا کہ ایک بار پھر پلٹ کر میری جانب آگئے اور اچانک مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔ ”مجھے تم پر فخر ہے میاں! میں تمہاری حالت سے بہ خوبی واقف ہوں۔ آج تم نے سلطان بابا کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسا ظرف تو بس، عبد اللہ، ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔ جیتے رہو، آباد رہو۔“ مولوی خضر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گئے اور میں اس بارے ہوئے جواری کی طرح بستر پر ڈھے گیا، جو اپنی آخری جمع پونجی جانتے بوجھتے خود ایسے داؤ کی جھینٹ چڑھا آیا ہو، جس بازی کی مات کا اُسے پہلے ہی سے یقین ہو۔ میں آنکھیں بند کیے حجرے ہی میں پڑا رہا، حتیٰ کہ صبح کی تیز کرنوں نے حجرے کی کھڑکی سے دھوپ کی شکل اختیار کر کے میرے تاریک وجود پر روشنی کی ایک مستطیل چادر درسی تان لی۔ دن چڑھے باہر سے مولوی خضر کی آواز اُبھری ”میاں! جاگ رہے ہو تو بختیار صاحب کو تمہارے پاس اندر بھیج دوں۔ وہ کافی دیر سے بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے قریب پڑا کھس شانوں پر ڈالا اور خود ہی باہر نکل آیا۔ بختیار کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ لپک کر میرے قریب آگیا اور پریشانی سے بولا ”یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔ ایک ہی دن میں برسوں کے بیمار دکھائی دینے لگے ہیں۔“ ”ہاں..... شاید کچھ مرض ایک رات ہی میں برسوں کا فاصلہ طے کر جاتے ہیں۔ لیکن آج ماشاء اللہ آپ کا چہرہ خلاف معمول بہت کھلا ہوا لگتا ہے۔ آپ کی منت پوری ہوگئی ہے۔“ بختیار نے فرط عقیدت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”یہ سب آپ کی دعا کی بدولت ہوا ہے۔ اب کوئی مجھ سے میرے حصے کی نظر نہیں چھین پائے گا۔ سارے نے آپریشن کروانے سے انکار کر دیا ہے۔“ میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا ”کیا.....؟ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ اُسے تو بصارت کی شدید خواہش تھی نا.....؟“ ”جہاں نہیں۔ آپ شاید اسے میری شدید خود غرضی ہی سمجھیں، لیکن میں سمجھتا ہوں محبت سے زیادہ خود غرض جذبہ اس دنیا میں کوئی اور ہوگا بھی نہیں۔ اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو خود اپنے لیے خود غرض نہ ہو۔ دراصل میں اس بات سے اس قدر پریشان تھا کہ جب سارے نے مجھ سے یہ پوچھا کہ میں آج کل اتنا کھویا کھویا کیوں رہتا ہوں تو میں اُس کے سامنے خود پر قابو نہ رکھ سکا اور رو پڑا۔ وہ پریشان ہوگئی اور مجھے اسے بتانا ہی پڑا کہ میں اس بات سے خوف زدہ ہوں کہ بصارت ملنے کے بعد میں سارے کو کھو دوں گا، کیوں کہ میں انتہائی بد صورت ہوں۔ یہ سن کر تو وہ پہلے ہکا بکا سی رہ گئی اور پھر وہ بھی رو پڑی کہ میں نے

شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی پسند کی شادی نہیں ہو سکتی۔ دنیا کا کیا ہے میاں، رہبانیت سے بچو گے تو دنیا پرستی کا الزام لگائے گی اور دنیا داری سے دامن چھڑاؤ گے تو رہبانیت کا داغ تمہارے ماتھے پر سجا دے گی۔ ویسے بھی مذہب اللہ کی رضا مندی کے لیے اپنایا جاتا ہے، نہ کہ دنیا والوں کی خوشنودی کے لیے۔ بس حقوق العباد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ اور ہاں، عبد اللہ کو یہ بات سدا یاد رکھنی ہوگی کہ رشتے اور جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں۔ سو تمہارے نصیب کا جوڑم تک پہنچ کر رہے گا۔ اور جو تمہارا مقدر نہیں، اس پر کبھی افسوس نہ کرنا۔“ سلطان بابا کی آواز دھیرے دھیرے دھند میں گھونگی۔ اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سلطان بابا سے سنا تھا کہ قدرت نے نیند اور خواب کو بھی پیغام رسانی کے ذریعوں میں سے ”ایک“ مقرر کر رکھا ہے، تو گویا مجھے بھی آخری پیغام پہنچا دیا گیا تھا۔ ہمیشہ اپنے نصیب پر متشکر رہنے کا پیغام۔ چاہے وہ نصیب بنا زہرائی کے میرا مقدر کیوں نہ ہو۔

اگلی صبح مولوی خضر مجھے بہت مصروف دکھائی دیے۔ شاید وہ تمام انتظامات کو حتمی شکل دے رہے تھے۔ مہ پہر تک میرے بعد والد عبداللہ، نعمان بھی درگاہ پہنچ گیا، لیکن ابھی سب کو کسی اور کی سواری کا بھی انتظار تھا۔ میں صبح سے درگاہ کے صحن میں بیٹھا ان درو دیوار کو تک رہا تھا، جن سے شناسائی اب صدیوں پرانی لگتی تھی۔ ان دیواروں نے یہاں مجھے ساحر سے عبد اللہ تک کا سفر طے کرتے دیکھا تھا اور آج وہ اس عبد اللہ کی واپسی کا سفر بھی دیکھ رہی تھیں۔ تقدیریں کیسے پلت جاتی ہیں، یہ کوئی نہیں جان سکا۔ اور پھر خضر کے وقت وہ سواری بھی آچکی جس کا سب ہی کو انتظار تھا۔ وہ درگاہ کے صحن میں داخل ہوئے تو میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ہاں، وہ حاکم بابا ہی تھے، اپنے مخصوص جلال اور غیض و غیظ کے ساتھ۔ لیکن آج ان کے لبوں پر ایک عجیب ہی مسکراہٹ تھی۔ میں نے انہیں سلام کیا تو مجھے گلے لگا لیا۔ ”کیوں بھی نوجوان..... واپس چل دیے۔ تم نے تو ہمیں یاد نہیں کیا۔“ پر دیکھو..... ہم خود تمہیں رخصت کرنے یہاں چلے آئے۔“ میں خاموش رہا لیکن نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ حاکم بابا نے اب سلطان بابا کے فرائض سنبھال لیے ہیں کیوں کہ ان کا ہدایت دینے کا انداز اور ان کی ہر معاملے پر ہری نظر اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ اب وہ بطور سلطان تعینات ہو چکے ہیں۔ عصر کے بعد میں نے سب سے رخصت ہوئی، کیوں کہ میں مہماور پیا کو پہلے ہی اطلاع کر چکا تھا اور ان کی آمد کسی بھی وقت متوقع تھی۔ ہمیشہ کی طرح یہ ’وداع بھی میرے لیے کسی خنجر کی طرح تھا۔ رُوح میں پیوست ہونے والی دھار..... حاکم بابا دھیرے سے مسکرائے ”جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سوسو ہوتا ہے۔“ ”جار ہے ہو میاں! چلو ٹھیک ہے، تمہارا استقبال کرنے والے بھی آچکے ہیں۔ اور ہاں..... گھر پہنچ کر اس رقعے کو کھول کر پڑھ لیتا۔“ انہوں نے خاکی رنگ کا ایک لفافہ میری قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔ یہ وہی لفافہ تھا، جس کے ارے میں مولوی خضر نے گزشتہ شام مجھ سے ذکر کیا تھا۔ میں تو حاکم بابا کے منہ سے سلطان بابا کا مخصوص جملہ سن کر ہی اپنی جگہ سن سا کھڑا تھا کہ اچانک عقب سے مہما کی آواز ابھری ”ہم آگئے ہیں بیٹا.....“ میں نے

کی کھوج میں ہمیں کسی بھی درگاہ، ویرانے میں بھٹکنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ تمہیں آج ایک اور بھیڈ بھی بتا: ضروری ہو گیا ہے۔ میں..... حاکم بابا، سلطان بابا اور تم..... ہم سب ان درگاہوں پر اس لیے ہیں کیوں کہ ہماری تعیناتی کی جگہ یہی مقرر کی گئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہروں، قصبوں اور دیہات میں کوئی اور عبد اللہ، حاکم یا سلطان تعینات نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک غیر مرئی نظام رائج اور متحرک ہے۔ تم اترا عرصہ خدا کی تلاش میں نہیں بلکہ اُسی خدا کے حکم سے بھٹک رہے تھے، تمہارا خدا تو اس تمام سفر میں تمہارے ساتھ ہی تھا۔ درگاہ سے پھانسی گھاٹ، پھر یاقوط، جبل پور، کال گڑھ اور تحصیل ماہی سے لے کر لندن اور واپسی تک کے تمام سفر کا کوئی ایک مقصد ضرور تھا۔ جانتے ہو وہ مقصد کیا تھا، تم سے ”خدا کا تعارف.....“ اُس کے بندوں کے ذریعے۔ اُس کے نظام اور اُس کی قدرت کے ذریعے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس تعارف کو بخوبی نبھایا۔ تم نے واپسی کا فیصلہ کیا ہے تو یہ بھی اُسی کی مرضی ہے۔ بس اتنا یاد رہے کہ وہ ہر جگہ، ہر پل تمہارے ساتھ تھا، ساتھ ہے..... اور ہمیشہ ساتھ رہے گا۔“ مولوی خضر پلٹ کر چل دیئے اور میں وہیں چوہرے پر ڈھسے سا گیا۔ وہ اگر میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو پھر مجھے مل کیوں نہیں جاتا۔ سوچتے سوچتے میں نیند کی وادی میں پہنچ گیا، لیکن جسے میں نیند سمجھتا تھا۔ کیا واقعی وہ نیند تھی، میں تو اکثر نیند میں جاگنے سے زیادہ بیدار رہتا تھا۔

مجھے آج تک یہ معما ہی سمجھ نہیں آیا تھا کہ میں جاگتے ہوئے سوتا ہوں یا سوتے ہوئے جاگ رہا ہوتا ہوں۔ اور پھر صدیوں بعد مجھے اپنے شانے پر وہی مہربان لمس محسوس ہوا جس کی تلاش میں نہ جانے کب سے میں اپنے خوابوں میں بھٹک رہا تھا۔ ہاں! وہ سلطان بابا ہی تھے۔ وہی ملیح سی مسکراہٹ، وہی مہربان احساس۔ میں رو پڑا ”کہاں چلے گئے ہیں آپ..... آپ کو میری ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔“ سچ تو یہ ہے کہ آپ عبد اللہ سے پیار ہی نہیں کرتے۔“ وہ مسکرائے ”اچھا تو گویا عبد اللہ اپنے سلطان بابا سے رُڈھ گیا ہے، لیکن میرا ساحر تو مجھ سے خفا نہیں نا۔ وہ تو مجھ سے بات کرے گا؟“ ”آپ جانتے ہیں کہ عبد اللہ اور ساحر کی یہ تفریق مجھے کاٹ ڈالے گی۔ پھر آپ نے میرے اندر کے عبد اللہ کو کیوں جگا دیا اور اگر عبد اللہ کی حیات اتنی ہی ضروری تھی تو پھر ساحر کو پوری طرح ختم کیوں نہیں کر دیا گیا؟“ ”تمہیں ایسا لگتا ہے کہ عبد اللہ یا ساحر میں سے کسی ایک کی فحاشی دوسرے کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ یہاں پر سب ہی کے اندر آدھا ساحر اور آدھا عبد اللہ بستا ہے۔ کاملیت تو شاید صرف پیغمبر کا نصیب ہوتی ہے۔“ میں سسک پڑا ”تو پھر یہ دنیا والے ہم جیسے گناہ گاروں سے کاملیت کی توقع کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ دل پر کسی کا زور نہیں۔“ سلطان بابا پھر سے مسکرائے ”بس..... اتنی سی بات ہے۔ اپنی محبت پر شرمندہ ہو؟ مردوزن کی آپسی کشش فطرت کی طے کردہ ہے۔ میں..... تم..... ہم سب ہی ایسے ہی کسی معاشرتی رشتے کی پیداوار اور نتیجہ ہیں۔ ہاں البتہ مذہب نے ایسے بندھن کی حدود مقرر کر رکھی ہیں۔ محرم اور غیر محرم کی شرعی پابندی بھی طے شدہ ہے۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اگر کوئی رشتہ طے ہوتا ہے تو اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ مذہب کا کوئی بھی کلیہ یہ نہیں کہتا کہ کسی درگاہ کے مجاہد یا متولی کی

میکانی انداز میں گردن گھمائی اور پھر مہاپا کے ساتھ وہیل چیئر پر بیٹھے خرم اور اُس کے والدین کو ساتھ کھڑے دیکھ کر میں اپنے سارے الفاظ کھو بیٹھا۔ ”آپ سب یہاں.....؟“ تب خرم نے اپنی وہیل چیئر دھکیلی اور میرے قریب آگیا۔ اُس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ ”واہ میرے میچا! ساری مسیحائی کا اعجاز خود ہی سمیٹ لینا چاہتے ہو کیا؟ ویسے داد دینی پڑے گی تمہارے حوصلے کی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید کسی مرسلے پر میرا ظرف جواب دے ہی جاتا، لیکن تم شاید یہ بھول گئے کہ احسان جب حد سے بڑھ جائیں تو اُن کا بوجھ اگلے کو توڑ ڈالتا ہے۔ تم نے بھی مجھے توڑ ڈالا ساحر۔“ خرم کے منہ سے اپنا پہلا نام سن کر مجھے زوردار جھٹکا لگا اور میں نے مہاپا کو شکایت بھری نظر سے دیکھا۔ میں نے انہیں زہرا کے رشتے کے بارے میں بتاتے وقت سختی سے تلقین کی تھی کہ وہ کسی بھی حال میں خرم یا اُس کے والدین پر یہ بھید ہرگز نہیں کھولیں گے، لیکن شاید اس بار اُن میں سے کوئی ایک اپنا وعدہ نہیں نبھایا تھا۔ خرم میری نظروں کا مفہوم سمجھ گیا۔ ”نہیں..... تمہارے والدین میں سے کسی نے مجھے تمہارا اصلی نام نہیں بتایا۔ تمہاری اور اُن کی مٹی جو مشترک ہے۔ شاید یہ راز مجھ پر بھی کبھی نہ کھلتا۔ اگر کل سہ پہر یہ تحریر میرے ہاتھ نہ لگتی۔“ خرم نے اپنے ہاتھ میں پکڑا کوئی کاغذ لہرایا اور میرے جسم سے رہی سہی جان بھی پرواز کر گئی۔ یہ تو وہی نظم تھی، جو میں نے پاپا کے ہاتھ زہرا کو لکھ بھیجی تھی۔ خرم نے کاغذ کھولا اور زیر لب دہرایا۔ ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....“ پھر خرم نے کاغذ پلٹا اور آخر میں بے خیالی میں لکھ گئے، میرے نام پر اپنی انگلی رکھ دی۔ ”یہ نظم تمہاری ہے نا ساحر..... اتنا درد سہنا تمہارا خاصہ ہی ہو سکتا ہے۔ بولو ساحر..... چپ کیوں ہو، جواب دو مجھے.....“ میں خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پتا یہ چلا کہ کل جب دوپہر کے وقت خرم کا بخار ٹوٹ گیا تو کئی دنوں کی اکٹھاٹ آمیز جھکن اُتارنے کے لیے اُس نے اپنی ماں باپ سے کھلی نفا میں نکلنے کی ضد کی، لیکن خرم کے والدین کو منت پوری ہونے کی نیاز چڑھانے کے لیے درگاہ آنا تھا لہذا طے یہ پایا کہ راستے میں خرم کو کچھ دیر کے لیے زہرا کی حویلی میں اُتار دیا جائے تاکہ وہ زہرا کے والدین سے بھی ملاقات کر لے۔ خرم کا اُردو ادب سے ویسے تو کبھی کوئی خاص شغف نہیں رہا تھا لیکن اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُردو ادب زہرا کی شخصیت کا حصہ اور خاص طور پر نظم اور غزل تو اُس کی کمزوری ہے، لہذا اُس نے زہرا کی غیر موجودگی میں، یونہی بے خیالی میں کوئی کلیات اُٹھائی اور تب ہی اُس کے اندر سے یہ کاغذ اُس کی گود میں جاگرا۔ خرم نے جیسے ہی تحریر ختم کر کے آخر میں لکھا نام پڑھا، تب ہی زہرا کمرے میں داخل ہوئی اور خرم نے اُس سے پوچھ لیا کہ یہ ”ساحر“ کون ہے؟ یہ سوال زہرا کے لیے اس لمحے اس قدر اچانک اور ناگہانی تھا کہ وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کے چہرے کے بدلنے رنگ نے خرم کے تجسس کو ہمیز دی اور ایک ایسی بات، جسے عام حالات میں کوئی بھی چھوٹا سا بہانہ کر کے ٹالا جاسکتا تھا، بڑھتی چلی گئی۔ زہرا نے خرم سے التجا کی کہ اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ مناسب وقت آنے پر وہ خود خرم کو ساحر کے بارے میں بتا دے گی۔ لیکن اگر بات ختم ہی ہونا تھی، تو شروع کیوں ہوتی۔ خرم وہ کتاب ہی کیوں اُٹھاتا، جس میں میری نظم رکھی تھی۔ خرم نے کوئی دوسری

کتاب کیوں نہ اُٹھائی؟ کچھ مسودے قدرت صرف خالص لمحوں کے لیے ہی لکھ رکھتی ہے۔ وہ بھی شاید ایک ایسا ہی پل تھا۔ آخر کار زہرا کا صبر جواب دے گیا اور اُس نے خرم کو بتا دیا کہ ساحر وہی عبد اللہ ہے، جو گزشتہ رات خرم کی مسیحائی کے لیے اپنی شدید اہتر حالت کے باوجود اُس کے سر ہانے کھڑا دعا مانگ رہا تھا۔ خرم کے حواس جواب دے گئے اور زہرا نے شروع سے لے کر آخر تک کی داستان جب ختم کی تو تب تک خرم اپنے ہی آنسوؤں میں بھیگ چکا تھا۔ وہ رات اُس کی زندگی کی سب سے طویل رات ثابت ہوئی اور صبح کا اُجالا ہونے سے پہلے وہ اس فیصلے پر پہنچ گیا، جس کے نتیجے میں آج وہ اپنے والدین سمیت میرے سامنے موجود تھا۔ خرم نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں اس کرب کا مداوا تو نہیں کر سکتا، جس سے تم ہر پل گزرتے آئے ہو۔ لیکن یقین جانو..... کل سے میرے گھر میں بھی کسی کو ایک کروٹ آرام نصیب نہیں ہوا۔ شاید ہم سب تمہارے مجرم ہیں۔“ میں نے جلدی سے خرم کی آنکھیں پونچھیں۔ ”ایسا کیوں کہہ رہے ہو، قدرت کا یہی فیصلہ تھا۔“ خرم کی والدہ آگے بڑھیں۔ ”نہیں..... خرم کی طرح تم بھی میرے بیٹے ہو عبد اللہ اور دنیا کی کوئی ماں اپنی اولاد میں فرق نہیں رکھتی۔ زہرا تمہاری امانت تھی اور ہمیشہ تمہاری ہی رہے گی۔ بس، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میرے گھر سے خرم کی بارات جاتی تھی اور اب عبد اللہ کی جائے گی اور یہ حق میں تمہاری ماما سے پہلے ہی مانگ چکی ہوں۔ اب تم اپنی اس ماں کو انکار نہ کرنا۔“ انہوں نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مہاپا میرے دائیں بائیں یوں کھڑے تھے، جیسے بچپن میں مجھے گرنے سے بچانے کے لیے میری پہلی بانیٹھکل کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پل بھر میں یہ سب کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے تو جانے کب سے اپنے زوٹھے ہوئے مقدر سے دوستی کر لی تھی۔ لیکن قدرت یوں اچانک مجھ پر اتنی مہربان ہو جائے گی۔ زہرا کا نام پھر سے میرے نام کے ساتھ جڑ جائے گا۔ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ پپانے میری نظروں کا مفہوم جان لیا۔ ”زہرا ہمارے ساتھ نہیں آئی بیٹا..... وہ نیچے ساحل پر ہی رُک گئی تھی۔ اُس نے اپنے ہر فیصلے کو تمہارے فیصلے سے مشروط کر رکھا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج تک اُس نے جتنے بھی فیصلے کیے ہیں وہ سب کہیں نہ کہیں تمہارے لیے کسی درد کا باعث رہے ہیں لہذا اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کیا تم آج بھی زہرا کا ساتھ چاہتے ہو۔“ خرم نے مجھے سمجھوڑا..... ”جاؤ عبد اللہ..... دیر نہ کرو۔ اس بار اپنی تقدیر کو جو کئے نہ دینا۔ بہت زخم کھالے تم نے۔ بہت گھائل ہو چکے تم..... جاؤ تمہارا امر ہم تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ کہیں پھر دیر نہ ہو جائے.....“

میں ابھی تک وہیں اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا کہ اس بار حاکم بابا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”بے شک اللہ اپنے بندے کے لیے جو چاہتا ہے، وہی اُس کا بہترین نصیب ہے۔ جاؤ عبد اللہ..... تمہارا پہلا امتحان آج ختم ہوا۔ اگر تم اپنے قدموں سے چل کر اللہ کے اس بندے خرم کے لیے دعا کرنے نہ جاتے تو شاید یہ نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ اس مجذوب نے تمہیں بددعا کے امتحان میں بھی اسی اللہ کی مرضی سے ڈالا اور آج اگر تم سرخرو

کھڑے ہو تو یہ بھی اُسی کی رضا ہے۔ جاؤ، تمہارا مقدر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ حاکم بابا کی گرج دار آواز نے جیسے مجھے پھر سے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ میں تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ پیچھے مولوی خضر کی آواز سنائی دی ”ہم سے رخصت ہو کر الوداع تو کہتے جاؤ میاں..... جانے پھر کب ملاقات ہو.....؟“ میں تڑپ کر پلٹا اور تیزی سے مولوی خضر کے پاس پہنچ کر اُن کے ہاتھ تھام لیے۔ ”آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ میری رخصت کے فیصلے کے پیچھے بھی تو زہرا کے نام کا تقدس برقرار رکھنے کی آرزو ہی کا فرما تھی۔ میں آپ سب کو چھوڑ کر اب نہیں جاؤں گا۔“ حاکم بابا بولے۔ ”جانا تو طے ہو چکا ہے لڑکے..... اور تمہاری خواہش پر ہی یہ سارا انتظام کیا گیا ہے.....“ میں اُن کی بات سن کر روہانسا ہو گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے مجھے میرے ہی گھر سے بے دخل کیا جا رہا ہو۔ پھر نہ جانے کیوں ان سب ہی بزرگوں کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ حاکم بابا بولے۔ ”مولوی صاحب..... بہت ستایا آپ کے شاگرد کو۔ اب اسے اپنا فیصلہ سنا دیں۔“ مولوی خضر نے میری جانب مسکرا کر دیکھا۔ ”عبداللہ میاں..... تمہارا فیصلہ تو جانے کب سے اس خالی لفافے میں لکھ کر بند کر دیا گیا تھا، وہی لفافہ جواب تمہاری جیب میں موجود ہے۔ تم چاہو تو اسے کھول کر پڑھ سکتے ہو.....“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے غلت میں اپنی جیب سے وہ لفافہ نکالا اور تیزی سے اس پر لگی مہر کھولی۔ اندر سے ویسی ہی کاغذ کی ایک سفید پرچی نکلی، جیسی مجھے پہلی مرتبہ عبداللہ کے نام سے درگاہ میں تعینات ہونے پر ملی تھی۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے پرچی کھولی تو اس میں میرے ہی شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ صرف ایک نام..... اور کچھ نہیں۔ میں نے حیرت سے مولوی خضر اور حاکم بابا کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ”تمہیں تمہارے ہی شہر میں تعینات کر دیا گیا ہے عبداللہ..... تمہارے فیصلے سے بہت پہلے یہ فیصلہ ہو چکا تھا.....“ میں اپنی آواز سے چھلکتی خوشی چھپا نہیں پایا۔ ”گو میاں اب بھی عبداللہ ہوں..... مجھے بے دخل نہیں کیا جا رہا.....؟“ مولوی خضر نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”قدرت کے کیے گئے فیصلوں سے بے دخلی کا اختیار صرف قدرت ہی کو حاصل ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ عبداللہ صرف درگاہوں اور دیوانوں ہی میں نہیں..... زمین کے ہر خطے میں موجود ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ تمہارا ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں تبادلہ ہو گیا ہے، البتہ تمہارا کام اب بھی وہی ہے۔ اللہ کے بندوں کو حتی المقدور خدمت اور اللہ کی بندگی اور یہ دونوں فرائض تم اپنے گھر میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہوئے بھی انجام دے سکتے ہو۔ تمہارے مقدر کے بندے وہاں بھی تم تک پہنچ جائیں گے اور تم سے جو ہو سکے، اُن کے لیے ضرور کرنا۔ جاؤ اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت میں جت جاؤ تا وقتیکہ تمہیں تمہاری کسی نئی تعیناتی کا امر اسلٹل جائے۔ ہم تمہاری کسی بھی مدد کے لیے ہمیشہ موجود رہیں گے.....“ حاکم بابا، مولوی خضر اور نعمان (عبداللہ) نے فردا فردا مجھے گلے لگا کر رخصت کیا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے تنہا ہی ساحل کی جانب چل پڑا۔ مہمیا، خرم اور اُس کے والدین جان بوجھ کر ایک خاص مقام پر رُک گئے اور میں لرزتی دھڑکن لیے دُور ڈوبتے سورج کے پیش نظر میں، اپنی ہی سوچوں میں گم کھڑی زہرا کے قریب پہنچ کر کچھ

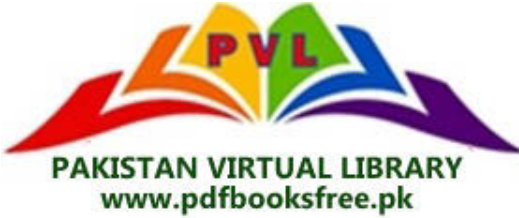
کے فاصلے پر رُک گیا۔ کہتے ہیں کچھ لمے ایسے بھی وارد ہوتے ہیں جن کا انتظار خود ”وقت“ کرتا ہے۔ بے قدموں کی آہٹ سن کر اُس ”ماہ تاب منتظر“ کی پلکیں اٹھیں اور پس منظر میں دو تباہ سورج ایک لخت پڑ گیا۔ پتا نہیں، زندگی اس پل شروع ہوئی تھی یا میری فنا کے بعد بھی میری نبض چل رہی تھیں۔ میں نیند تھا یا میرا سب سے خوب صورت خواب کھلی آنکھوں، میرے سامنے جگ گیا تھا۔ زمین پہنے لگی تھی یا سمندر ات ہو گیا تھا۔ سورج کی آخری کرنیں زہرا کے کانوں کی بالیوں سے منعکس ہو کر اُس کے چہرے کو دمکار ہی بنا۔ یا یہ زہرا کے چہرے کا نور تھا جو ان کروں کو مزید اجال رہا تھا۔ ہم دونوں چپ کھڑے رہے۔ سمندر کی لہروں نے ہمارے خاموشی کی زبان کو ایک دوسرے تک منتقل کرنے کا فریضہ اپنے سر لے لیا۔ آس پاس سرسراہٹ نے اُن کے لفظوں کو معنی پہنانا شروع کر دیئے۔ زہرا کی آنکھوں نے کہا۔ ”آپ آگئے ساحر..... میں کب آپ کی راہ دیکھ رہی تھی.....“ میں نے بندلیوں سے جواب دیا۔ ”میں تو سدا آپ کے ساتھ تھا..... آپ راہ کی دھول بن کر..... کبھی منزل نہ بننے والی راہوں کی دھول.....“ اُس کی گھنیری پلکیں تڑپ کر جھپکیں لیں..... آپ میری راہوں کی دھول بن کر نہیں، میری آنکھوں کے کاجل کی طرح میرے ساتھ تھے۔ میں راہ بھی چلتی، میری منزل کا راستہ آپ ہی سے ہو کر گزرتا۔ کبھی کبھی منزلیں راستہ بھی تو بن جاتی ہیں۔“ ہم اب بظاہر خاموش کھڑے تھے۔ گفتگو اضافی بن چکی تھی اور ہماری آنکھوں میں جھللاتے سمندر کا عکس ہماری پگلوں سے جھٹک رہا تھا۔ کوئی ہمیں دُور سے یوں کھڑے دیکھتا تو اُسے یہی لگتا کہ شاید ہم دونوں کے پاس کے لیے کوئی بات باقی نہیں رہی۔ مگر یہ ہونٹوں اور زبان کی بولی سننے اور بولنے والے ظاہر پرست بھلائی کی باتیں کیا جانیں؟ زمانہ آج تک لوگوں کے طرزِ تکلم اور مخاطب کی خوبصورتی کی مثالیں دیتا آیا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ کچھ لوگ جب محوِ سماعت ہوں تو بھی کمالِ خوب صورت لگتے ہیں، جیسے ٹھیک اُس لمحے وہ لپ پری۔ اور سماعت کا واسطہ صرف کان سے تو نہیں ہوتا، کبھی کبھی کسی کی آنکھیں، جھکتی پلکیں، جبین پر پسینے ندیں، لرزتے بند لب اور کسی کی خم کھائی زلف کا بل بھی تو ہماری اُن کئی کو پوری طرح سن رہا ہوتا ہے۔ زہرا بھی اس وقت مجسمِ سماعت تھے، ہر اُس اقرار، ہر اُس بیان کے لیے، جو ہم نے لبوں سے ادا نہیں پھر بھی ہم دونوں نے سن لیا۔ اتنے میں دُور ٹیلے سے مہما کی لہروں کے دوش پر آتی آواز سنائی دی۔ ”..... دیر ہو رہی ہے بیٹا..... چلو گھر چلیں..... میں نے زہرا سے کہا.....“ چلیں سب لوگ ہمارا انتظار ہے ہیں.....“ اس ناز آفرین نے پہلا قدم اٹھایا، لیکن میں رُک گیا۔ لیکن یہ جان کر اپنے قدم بڑھائیے گا واللہ کی مسافیتیں ابھی باقی ہیں۔ راستے دشوار اور منزلیں سراب ہیں..... تھک تو نہیں جائیں گی.....؟“ میرے سے مسکرائی۔ ”ڈر رہے یا تنبیہ کر رہے ہیں.....“ میں بھی مسکا دیا۔ ”صرف اپنے نصیب کی بلیوں سے آگاہ کر رہا ہوں۔“ تب زندگی میں پہلی مرتبہ، زہرا نے بس اک لمحے کے لیے میری آنکھوں مانکا اور میں پہلی بار پتھر نہیں ہوا۔ ”اب جو عبداللہ کی راہ ہے..... وہی زہرا کا راستہ ہے..... جب مقدر جڑ



جائیں تو نصیب کی گرحیں اپنے آپ کھل جاتی ہیں۔ آپ زہرا کو ہمیشہ ثابت قدم پائیں گے۔“ ر  
دور سمندر کے اس پار اُفتخ پر سورج ڈوب رہا تھا۔ میں نے قدم بڑھا دیئے اور زہرا میرے پیچھے چل  
پڑی۔ میرے نقش پا پر اپنے نازک قدم دھرتی..... پہلی مرتبہ عبداللہ اور زہرا کو ایک ساتھ اس ڈگر پر چلتے دیکھ  
لہریں مسکرائیں اور ڈوبتے سورج نے کہا۔ ”نئی مسافتیں..... نئے سفر اور نیا ہم سفر مبارک ہو دوست..... آ۔  
والی سحر کے ساتھ اک نئے آسمان کا سلام..... اور اس ڈھلتی شام کی جانب سے تمہیں الوداع..... الوداع  
عبداللہ..... الوداع.....“

(ختم شد)

پاکستان ورچوئل لائبریری کی پیشکش



مزید خوبصورت کتابیں اور ناول پڑھنے اور مفت ڈاؤنلوڈ کرنے کے لئے  
ابھی وزٹ کریں۔ پاکستان کی سب سے بہترین آن لائن لائبریری۔

[www.pdfbooksfree.pk](http://www.pdfbooksfree.pk)